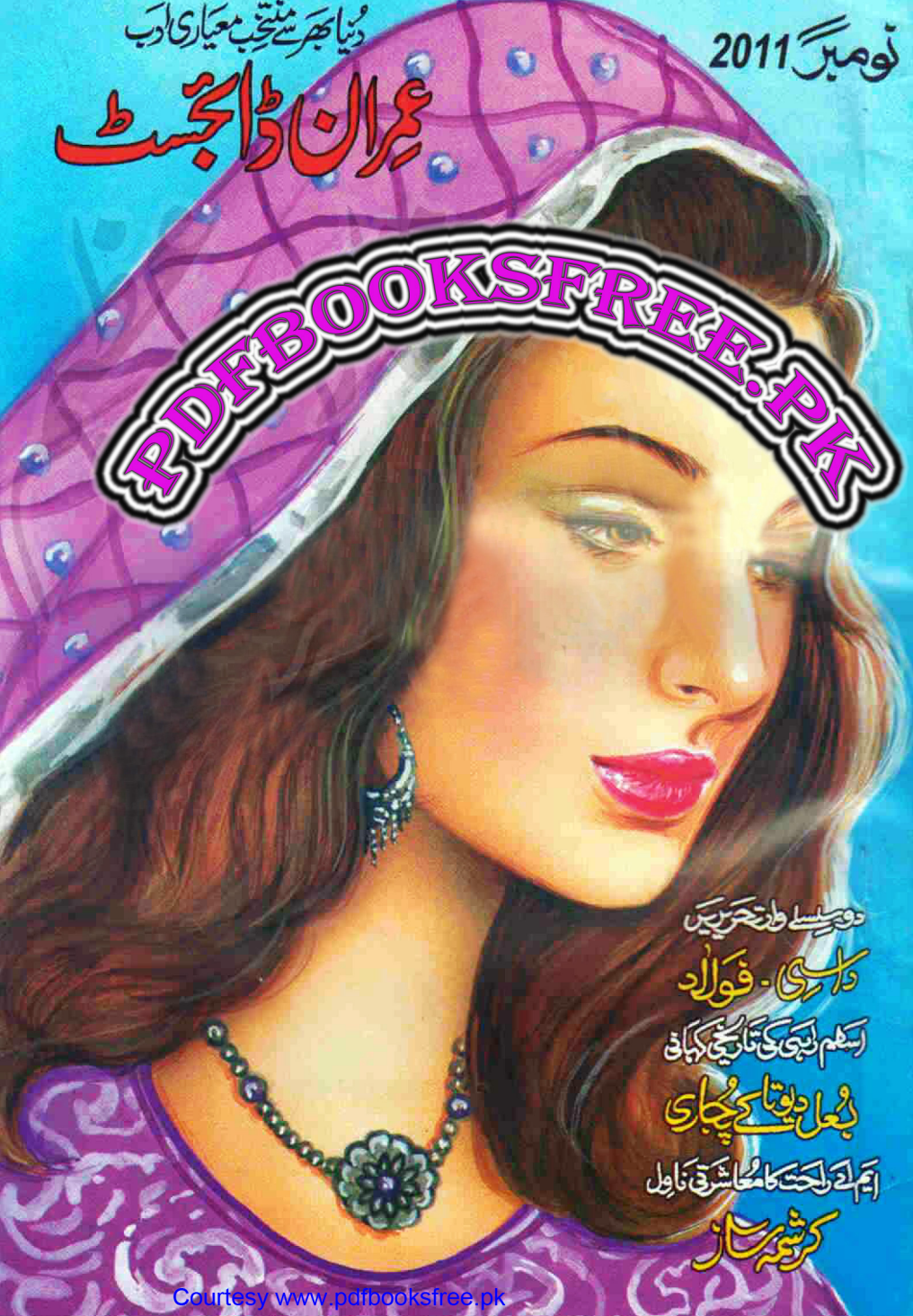

دُنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

نومبر 2011

PDFBOOKSFREE.PK

دو سلسلے وار تحریریں

داسی۔ فولاد

اسلم راہی کی تاریخی کہانی

بعل دیوتا کے پجاری

ایم اے راحت کا معاشرتی ناول

کرشمہ ساز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عمران ڈائجسٹ

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

بانی: محمود ریاض
مدیر اعلیٰ: عامر محمود
منتظم: محمد شفیع

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہونے والے مقبول ناول، مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37 اردو بازار، کراچی۔ فون 32735021

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
وہ جھلی سی دیوانی سی	آسیہ سلیم قریشی	500/-
آرزو گھر آئی	آسیہ سلیم قریشی	450/-
تھوڑی دور ساتھ چلو	آسیہ سلیم قریشی	400/-
ایمان، امید اور محبت	عمیرہ احمد	200/-
امر بیل	عمیرہ احمد	550/-
لاحاصل	عمیرہ احمد	200/-
ریگ زار تمنا	ماہا ملک	500/-
اک دیا جلائے رکھنا	ماہا ملک	300/-
میرے خواب ریزہ ریزہ	ماہا ملک	350/-
جو چلے تو جاں سے گزر گئے	ماہا ملک	150/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چوہدری	400/-
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چوہدری	250/-
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار عدنان	200/-
بھول بھلیاں تیری گلیاں	فائزہ افتخار	500/-
آئینوں کا شہر	فائزہ افتخار	500/-
پھلاں دے رنگ کالے	فائزہ افتخار	250/-
یہ گلیاں یہ چوبارے	فائزہ افتخار	300/-
ستاروں کا آنگن	تسیم سحر قریشی	450/-
تو شریک سفر رہا	تسیم سحر قریشی	350/-
میرے دل، میرے مسافر	تسیم سحر قریشی	300/-
موسم تھا بے قرار	فریدہ اشفاق	300/-
عین سے عورت	فرزانہ عزیز	200/-
شب گزیدہ	عنیزہ سید	200/-
محبت بیاں نہیں	لبنیٰ جدون	250/-
میرے اس کے بیچ سفر	زہرہ ممتاز	200/-
شہر تمنا	سائرہ عارف	500/-
زخم کو ضد تھی مسیحائی سے	فوزیہ یاسمین	250/-
دل اک شہر جنوں	آسیہ مرزا	450/-
ہمسفر	فرحت اشتیاق	350/-
میرے ہمدم، میرے دوست	فرحت اشتیاق	350/-
متاع جان ہے تو	فرحت اشتیاق	300/-
وہ جو قرض رکھتے تھے	فرحت اشتیاق	225/-
دل سے نکلے ہیں جو الفاظ	فرحت اشتیاق	225/-
بن روئے آنسو	فرحت اشتیاق	200/-
اک نکتہ ایمان	سعدیہ چوہدری	250/-

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
درد کے فاصلے	رضیہ جمیل	500/-
اک گھروندہ برف کا	رضیہ جمیل	400/-
ساگر، دریا، بادل، بوند	رضیہ جمیل	350/-
بدریا برس گئی اس پار	رضیہ جمیل	200/-
آج گگن پر چاند نہیں	رضیہ جمیل	200/-
اک لڑکی پاگل پاگل سی	رضیہ جمیل	200/-
درد کی منزل	رضیہ جمیل	200/-
دل اسے ڈھونڈ لایا ہے	آسیہ رزاقی	350/-
بکھر نہ جائے خواب	آسیہ رزاقی	200/-
برگ گل	ایم سلطانہ فخر	400/-
شام آرزو	ایم سلطانہ فخر	400/-
دل اک گلاب سا	ایم سلطانہ فخر	400/-
میری جنت	نور بانو محجوب	250/-
بھنور	شوکت رانا الطاف	200/-
زرد موسم	راحت جبیں	600/-
اے وقت گواہی دے	راحت جبیں	400/-
کلیاں، پھول اور خوشبو	راحت جبیں	225/-
رنگ، خوشبو، ہوا، بادل	افشاں آفریدی	450/-
اندھیرے سے اجالے تک	عاصمہ تقی	200/-
بار وفا	نگہت سیما	200/-
راہ جنون	نگہت سیما	450/-
خوشبو ہے ہم سفر	عاصمہ شاہد	200/-
شہر وفا	عینی ارسلان	200/-
ڈھلے چاند دل کے پار	ثمرہ بخاری	350/-
دل داد لیں	ثمرہ بخاری	350/-
تیری راہ میں رل گئی دے	میمونہ خورشید علی	225/-
گیت، گلاب اور تم	عفت عزیٰ	200/-
کوئی ایسا اہل دل ہو	نبیلہ عزیز	250/-
بساط دل	آمنہ ریاض	500/-
تم آخری جزیرہ ہو	آمنہ ریاض	200/-
اماوس کا چاند	بشریٰ سعید	200/-
اک چراغ روشن ہے	سعدیہ عزیز آفریدی	225/-
زرد زمانوں کا سویرا	نبیلہ ابر راجہ	200/-
باتیں انشاء جی کی	ابن انشاء	300/-
آپ سے کیا پردا	ابن انشاء	300/-
خواتین کا گھریلو انسائیکلوپیڈیا		750/-

باتیں آپ سے
مدیر — 8
قارئین کے محبت نامے' گزشتہ شمارے پر تبصرہ' اپنی پسند۔۔۔ چاہتیں' مدیر کے نام۔۔۔! آپ کی آراء' پسند۔۔۔ ناپسند' مشورے

لعل دیوتا کے پجاری
اسلم راہی — 10
اس تاریخی کہانی میں آپ کو جہاں جنگوں کا احوال ملے گا' وہیں محبت کی لازوال داستان بھی نظر آئے گی۔ آپ کے لیے معروف مصنف کے قلم سے

بے شناخت
احمد صغیر صدیقی — 40
کوئی گھنٹہ بھر تک وہ شمال کی طرف کوسٹل ہائی وے پر چلتے رہے۔ انہوں نے سان جیتو کو بھی پار کرلیا۔ گار تھ سوچ رہا تھا۔ نہ جانے اس کی کشتی کا کیا بنا ہوگا۔

خونی ہاتھ
ایم الیاس — 57
میں اچانک گہری نیند سے بیدار ہو گیا۔ گہری نیند سے اس طرح بیدار ہو جانے کی وجہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔۔۔ حبس تو تھا لیکن چھت کا پنکھا پوری رفتار سے چل رہا تھا۔

بند مٹھی میں خواب
کامران جاذب — 76
اور پھر اس کی زندگی بھی گھنٹوں میں بٹ گئی اور ڈالروں میں! ایک گھنٹے کے دس' آٹھ گھنٹے کے اسی اور۔۔۔ چودہ کے۔۔۔ ایک سو چالیس ڈالر۔ ایک دلگداز تحریر

بازی گر
عابد علی سید — 84
میں اندر داخل ہوا تو یہ ایک وسیع و عریض برآمدہ تھا جہاں جابجا سنگ مرمر کے مجسمے دھرے تھے' قالین بچھے تھے۔ چھتوں پر جھاڑ اور فانوس لٹک رہے تھے اور۔۔۔!

داسی
غزالہ جلیل راؤ — 94
وہ دیوتاؤں اور دیویوں جیسے حسن کی مالک تھی۔۔۔ اس کو نا جانے کون کون سی شکتیاں حاصل تھیں۔۔۔ بڑے بڑے پنڈت اور مہان شکتی مان اس کے آگے جھک جاتے تھے۔

فورس تھری
صابر علی ہاشمی — 117
یوخوف کی نظر انگریز بنڈر پر اس وقت پڑی جب وہ اس کی میز کے قریب پہنچ گیا تھا' ایک لمحے کے لیے وہ بھی سکتے میں آ گیا۔ ایک سنسنی خیز ناول کی تلخیص

زرد کتا
محمد صدیق طاہر — 152
اس نے آگے بڑھ کر لیمپ کو آتشدان میں رکھا اور مجھے لپٹا لیا۔ میری پیشانی کو بوسہ دیا اور میری خیریت دریافت کی۔ میں اس پراسرار ماحول سے اس قدر گھبرایا ہوا تھا کہ۔۔۔!

راز کی بات
وقار بن سعید — 000
پھر ساری موسیقی تھم گئی اور اسے یوں لگا جیسے کہیں فاصلے پر بادل گرج رہے ہوں۔ اس کی نگاہوں کے سامنے عجیب سر زمین ابھر رہی تھی جو ایک طرف تو دھوپ سے جگمگا رہی تھی۔

یہ غازی
محمد اکبر — 160
دوسری صبح اتوار تھا۔ اس وجہ سے وہ کافی دیر میں سو کر اٹھی۔ اس کی جرمن روم میٹ باہر جا چکی تھی۔ سب سے اوپر والے اخبار کی شہ سرخی میں وہ خوفناک خبر چھپی تھی۔

❖ نومبر 2011ء ❖ قیمت 40 روپے ❖ جلد 41 ❖ شمارہ 7

فولاد
ایم اے راحت — 182
سرزمین پنجاب کی حسین وادی جہلم کا ایک سادہ لوح جوان' جو دشمن کے لیے ناقابل تسخیر 'فولاد' بن گیا۔ عمران ڈائجسٹ کا نیا تہلکہ خیز سلسلہ

ایفا
محمد الیاس — 206
جن معاشروں کے پاس کوئی حقیقی وجہ افتخار نہ رہے' ان کے افراد اپنی بے مقصد زندگیوں کو عصبیتوں کے بلند و بالا اور تاریک قلعے تعمیر کرتے ہیں اور۔۔۔!!

قربانی کا بکرا
سید نصرت آرکیٹیکٹ — 211
ہمارے ہاں ایک روایت سی بن گئی ہے کہ عید قرباں کے موقع پر رشتہ داروں اور احباب کی نظروں میں اپنی حیثیت' اپنے مرتبے کی تشہیر کی جائے۔ عید قرباں کی سوغات

چمکیلی تصویریں
عذرا نقوی — 217
چھٹیوں میں جب حفت گھر آتی تو ابا کے کمرے کو ڈرائنگ روم کی شکل دینے کی ہر ممکن کوشش کرتی۔ چار عدد پرانی آرام کرسیاں تھیں۔ روشنی اور سراب کی آویزش کی کہانی

محبت کا چراغ
دانش کمال — 221
وہ ایک لڑکی تھی جس کا اکثر وقت مختلف لوگوں کے لیے شام سا تھ گزارنے' ان کو تلی دینے' ان کی جھوٹی باتوں پر یقین کرنے اور دیکھنا اس کی اکتاہٹ بڑی تھی۔

دل زخمی ہے
عقرب سیف آبادی — 226
عادل کو کہانیاں لکھنے کا شوق اسکول کے زمانے سے تھا۔ ایک دن شبیر رحمانی صاحب سے اس کی ملاقات ہوگئی' جو اس کی تحریر کے اسلوب سے بہت متاثر ہوئے۔

خالی ہاتھ
نوازش شاہین — 232
ماں کے جنازے میں عبدالرحیم لاہور آیا تو اسے یہ شہر اچھا لگا تھا۔ لاہور نے پہلے سے کہیں زیادہ وسعت اختیار کرلی تھی۔ اسے لاہور اچھا لگا تو اس نے یہاں رہنے کا فیصلہ کیا۔

تلافی
ہما صفدر — 243
دو دن کی بجائے سات دن گزر گئے مگر وہ کمبخت واپس نہیں آیا تھا۔ پھر یکایک پتا چلا کہ پاکستانی فوج کا کیمپ کرن پر قبضہ ہو گیا ہے' باہر والا پہرے دار بھی کہیں بھاگ گیا تھا۔

قربانی
صائمہ کاردار — 249
اب ہم ملتے تو محض پڑھائی لکھائی کی باتیں نہیں کرتے تھے۔ تھوڑا وقت نکال کر پیار و محبت کی باتیں بھی کر لیتے تھے۔ مستقبل کے بارے میں کچھ پروگرام بھی بنا لیتے تھے۔

کرشمہ ساز
ایم اے راحت — 260
یہ اتفاق ہی تھا کہ باقی رات پٹرول پمپ پر کوئی کار یا ٹرک نہیں آیا تھا۔ ورنہ شاید ڈاکے کا پتا پہلے چل جاتا۔ بہرحال صبح سات بجے کے قریب جب اسے ہوش آیا تو۔۔۔!

کرنیں
☆☆ — 000
مختلف صفحات پر چیدہ چیدہ تحریریں' اقوال' مسکراہٹیں' قارئین کے لیے بطور خاص' قارئین کی ارسال کردہ غزلیات' نظمیں وغیرہ

آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت: 37 اردو بازار' کراچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قارئین محترم ...... سلام مسنون!

نومبر کا شمارہ حاضر ہے۔ ملکی حالات اور واقعات بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں۔ اس وقت بیرونی اور اندرونی طور پر بے شمار مسائل کا سامنا ہے۔ ملک میں جہاں بارشوں اور سیلاب نے تباہ کاریاں مچائی ہیں' وہیں مہنگائی کا سیلاب بھی عوام الناس کو پریشان کیے ہوئے ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آتا کہ یہ اضافے کہاں جا کر رکیں گے۔ اس وقت بہت بے چینی اور اضطراب کا عالم ہے' ہر طبقہ فکر سے تعلق رکھنے والا ہر شخص پریشان ہے۔ دیکھیے حالات آئندہ کیا رُخ اختیار کرتے ہیں۔ فی الحال ان کے بارے میں کچھ بھی حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ ہماری جانب سے قارئین عمران ڈائجسٹ کو عیدالاضحیٰ کی مبارکباد۔

آیئے اب اپنی محفل میں چلتے ہیں۔ جہاں آپ کے محبت نامے منتظر ہیں۔

......لاہور سے شوکت علی لکھتے ہیں کہ اکتوبر کا شمارہ چند بہترین تحریروں کی وجہ سے بہت پسند آیا۔ اس ماہ کی پسندیدہ تحریروں میں احمد صغیر صدیقی کی ''دو ملک دو کہانیاں'' ایم الیاس کی ''انمول بندھن'' امجد جاوید کی ''حرمت'' عابد علی سید کی ''مقدس خواب'' کبیر احمد صدیقی کی ''بے نیاز'' کامران جاوید کی ''سہارا'' ایس اے ہاشمی کی ''امتحان'' وقار بن سعید کی ''اصول زدہ'' آغا دلاور کی ''آخری دن'' حسن علی خان کی ''نا کردہ گناہ'' سلطان جمیل نسیم کی ''روڈ میپ'' انور عنایت اللہ کی ''پالتو کبوتر'' دانش کمال کی ''میرا ارمان'' رشید امجد کی ''جنگل میں اُتری شام'' نازش شاہین کی ''پوشیدہ آنسو'' ہما صفدر کی ''سیاہ رات'' صائمہ کاردار کی ''سزا'' اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کی ''شناسا اجنبی'' کے علاوہ سلسلے وار تحریروں میں اسلم راہی کی تاریخی داستان ''بعل دیوتا کے پجاری'' ایم اے راحت کی ''فولاد'' اور سبحان راشد کی ''سحر زادی'' کی آخری قسط بہت شاندار رہیں۔

☆......شوکت صاحب! آپ کی تجاویز اور مشوروں کا شکریہ۔ آئندہ بھی اپنی محبتوں سے نوازیے گا۔

......کوٹری سے عزیز احمد اپنے محبت نامے لکھتے ہیں کہ عمران ڈائجسٹ گزشتہ دس سال سے ان کے زیر مطالعہ ہے۔ اکتوبر کے شمارے میں اردو ادب سے شہ پارے اپنی مثال آپ تھے۔ سچی داستانیں بھی اچھی تھیں۔ دیگر کہانیوں میں ''دو ملک دو کہانیاں' انمول بندھن' حرمت' مقدس خواب' بے نیاز' سہارا' امتحان' اصول زدہ' آخری دن' نا کردہ گناہ' روڈ میپ' پالتو کبوتر' میرا ارمان' جنگل میں اُتری شام' پوشیدہ آنسو' سیاہ رات' سزا'' اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کی ''شناسا اجنبی'' کے علاوہ سلسلے وار تحریروں میں اسلم راہی کی تاریخی داستان ''بعل دیوتا کے پجاری'' ایم اے راحت کی ''فولاد'' اور سبحان راشد کی ''سحر زادی'' کی آخری قسط اچھی تھیں۔

......اسلام آباد سے ارشد علی امجد لکھتے ہیں کہ اکتوبر کا عمران ڈائجسٹ پڑھا' اردو ادب سے انتخاب خوب تھا۔ دیگر تحریروں میں احمد صغیر صدیقی کی ''دو ملک دو کہانیاں'' ایم الیاس کی ''انمول بندھن'' امجد جاوید کی ''حرمت'' عابد علی سید کی ''مقدس خواب'' کبیر احمد صدیقی کی ''بے نیاز'' کامران جاوید کی ''سہارا'' ایس اے ہاشمی کی ''امتحان'' وقار بن سعید کی ''اصول زدہ'' آغا دلاور کی ''آخری دن'' حسن علی خان کی ''نا کردہ گناہ'' نازش شاہین کی ''پوشیدہ آنسو'' ہما صفدر کی ''سیاہ رات'' صائمہ کاردار کی ''سزا'' اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کی ''شناسا اجنبی'' کے علاوہ سلسلے وار تحریروں میں اسلم راہی کی تاریخی داستان ''بعل دیوتا کے پجاری'' ایم اے راحت کی ''فولاد'' اور سبحان راشد کی ''سحر زادی'' کی آخری قسط بہت شاندار رہیں۔ عمران ڈائجسٹ کا سلسلہ ''سچی داستانیں'' پسند آیا۔

......عزیز الدین بدر ہمارے پرانے قارئین میں سے ہیں، وہ بہاولنگر سے اپنے خط میں اکتوبر کے عمران ڈائجسٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس شمارے میں کہانیوں کا چناؤ بہترین تھا۔ سلسلے وار کے علاوہ دیگر کہانیوں میں ''دو ملک دو کہانیاں' انمول بندھن' حرمت' مقدس خواب' بے نیاز' سہارا' امتحان' اصول زدہ' آخری دن' نا کردہ گناہ' روڈ میپ' پالتو کبوتر' میرا ارمان' جنگل میں اُتری شام' پوشیدہ آنسو' سیاہ رات' سزا'' اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کی ''شناسا اجنبی'' کے علاوہ سلسلے وار تحریروں میں اسلم راہی کی تاریخی داستان ''بعل دیوتا کے پجاری'' ایم اے راحت کی ''فولاد'' اور سبحان راشد کی ''سحر زادی'' کی آخری قسط پڑھ کر مزا آ گیا۔ سچی داستانیں کے سلسلے کی کہانیاں جاندار تھیں۔

......نسیم انور صاحب کوئٹہ سے رقم طراز ہیں کہ سرورق کے ساتھ ساتھ فہرست کا جداگانہ انداز پسند آیا۔ اکتوبر کے عمران ڈائجسٹ میں سب سے پہلے دونوں سلسلے وار کہانیاں پڑھیں۔ دیگر کہانیوں میں احمد صغیر صدیقی کی ''دو ملک دو کہانیاں'' ایم الیاس کی ''انمول بندھن'' امجد جاوید کی ''حرمت'' عابد علی سید کی ''مقدس خواب'' کبیر احمد صدیقی کی ''بے نیاز'' کامران جاوید کی ''سہارا'' ایس اے ہاشمی کی ''امتحان'' وقار بن سعید کی ''اصول زدہ'' آغا دلاور کی ''آخری دن'' حسن علی خان کی ''نا کردہ گناہ'' سلطان جمیل نسیم کی ''روڈ میپ'' انور عنایت اللہ کی ''پالتو کبوتر'' دانش کمال کی ''میرا ارمان'' رشید امجد کی ''جنگل میں اُتری شام'' نازش شاہین کی ''پوشیدہ آنسو'' ہما صفدر کی ''سیاہ رات'' صائمہ کاردار کی ''سزا'' اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کی ''شناسا اجنبی'' کے علاوہ ایم اے راحت کی ''فولاد'' اور سبحان راشد کی ''سحر زادی'' کی آخری قسط بہترین تھیں۔ اردو ادب سے انتخاب بہت عمدہ تھا۔ سچی داستانیں کے سلسلے کی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔

......محمود طاہر، ملتان کینٹ سے لکھتے ہیں۔ اب سے چند ماہ قبل میں نے عمران ڈائجسٹ لینا شروع کیا تھا' اتنے مختصر سے عرصے میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ایک طویل عرصہ گزر گیا ہو۔ بہرحال ادارہ عمران ڈائجسٹ ہر قاری کو اہمیت دیتا ہے اور ان کی پسند کے مطابق کہانیاں شامل کرتا ہے۔ اس ماہ مجھے سب سے زیادہ ''دو ملک دو کہانیاں' انمول بندھن' حرمت' مقدس خواب' بے نیاز' سہارا' امتحان' اصول زدہ' آخری دن' نا کردہ گناہ' روڈ میپ' پالتو کبوتر' میرا ارمان' جنگل میں اُتری شام' پوشیدہ آنسو' سیاہ رات' سزا'' اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کی ''شناسا اجنبی'' کے علاوہ سلسلے وار تحریروں میں اسلم راہی کی تاریخی داستان ''بعل دیوتا کے پجاری'' ایم اے راحت کی ''فولاد'' اور سبحان راشد کی ''سحر زادی'' کی آخری قسط پسند آئیں۔

......ڈاکٹر احمد حسین ہمارے مستقل قارئین میں سے ہیں اور ہمارے ہی شہر میں رہتے ہیں، لکھتے ہیں کہ اس ماہ احمد صغیر صدیقی کی ''دو ملک دو کہانیاں'' ایم الیاس کی ''انمول بندھن'' امجد جاوید کی ''حرمت'' عابد علی سید کی ''مقدس خواب'' کبیر احمد صدیقی کی ''بے نیاز'' کامران جاوید کی ''سہارا'' ایس اے ہاشمی کی ''امتحان'' وقار بن سعید کی ''اصول زدہ'' آغا دلاور کی ''آخری دن'' حسن علی خان کی ''نا کردہ گناہ'' سلطان جمیل نسیم کی ''روڈ میپ'' انور عنایت اللہ کی ''پالتو کبوتر'' دانش کمال کی ''میرا ارمان'' رشید امجد کی ''جنگل میں اُتری شام'' نازش شاہین کی ''پوشیدہ آنسو'' ہما صفدر کی ''سیاہ رات'' صائمہ کاردار کی ''سزا'' اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کی ''شناسا اجنبی'' کے علاوہ سلسلے وار تحریروں میں اسلم راہی کی تاریخی داستان ''بعل دیوتا کے پجاری'' ایم اے راحت کی ''فولاد'' اور سبحان راشد کی ''سحر زادی'' کی آخری قسط بہترین تھیں۔ اکتوبر کا شمارہ مجموعی طور پر بہترین تھا۔

☆......محترم ڈاکٹر صاحب! پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ۔

......عبدالخالق آرائیں، فیصل آباد سے اپنے محبت نامے میں لکھتے ہیں کہ اکتوبر کے شمارے میں ادب سے انتخاب بہت عمدہ تھا، سچی داستانیں بھی بہتر تھیں۔ دیگر کہانیوں میں ''دو ملک دو کہانیاں' انمول بندھن' حرمت' مقدس خواب' بے نیاز' سہارا' امتحان' اصول زدہ' آخری دن' نا کردہ گناہ' روڈ میپ' پالتو کبوتر' میرا ارمان' جنگل میں اُتری شام' پوشیدہ آنسو' سیاہ رات' سزا'' اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کی ''شناسا اجنبی'' کے علاوہ سلسلے وار تحریروں میں اسلم راہی کی تاریخی داستان ''بعل دیوتا کے پجاری'' ایم اے راحت کی ''فولاد'' اور سبحان راشد کی ''سحر زادی'' کی آخری قسط بہت شاندار رہیں۔

......راولپنڈی سے معین احمد قارئین کی محفل میں شریک ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ اردو ادب سے انتخاب بہت پسند آیا' تاریخی کہانی بہت اچھی جا رہی ہے۔ اس ماہ کی تحریروں میں سے احمد صغیر صدیقی کی ''دو ملک دو کہانیاں'' ایم الیاس کی ''انمول بندھن'' امجد جاوید کی ''حرمت'' عابد علی سید کی ''مقدس خواب'' کبیر احمد صدیقی کی ''بے نیاز'' کامران جاوید کی ''سہارا'' ایس اے ہاشمی کی ''امتحان'' وقار بن سعید کی ''اصول زدہ'' آغا دلاور کی ''آخری دن'' حسن علی خان کی ''نا کردہ گناہ'' سلطان جمیل نسیم کی ''روڈ میپ'' انور عنایت اللہ کی ''پالتو کبوتر'' دانش کمال کی ''میرا ارمان'' رشید امجد کی ''جنگل میں اُتری شام'' نازش شاہین کی ''پوشیدہ آنسو'' ہما صفدر کی ''سیاہ رات'' صائمہ کاردار کی ''سزا'' اور آخری صفحات پر ایم اے راحت کی ''شناسا اجنبی'' کے علاوہ سلسلے وار تحریروں میں اسلم راہی کی تاریخی داستان ''بعل دیوتا کے پجاری'' ایم اے راحت کی ''فولاد'' اور سبحان راشد کی ''سحر زادی'' کی آخری قسط بہت اچھی تھیں۔

قارئین آئندہ ماہ تک کے لیے اجازت اللہ حافظ مُدیر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

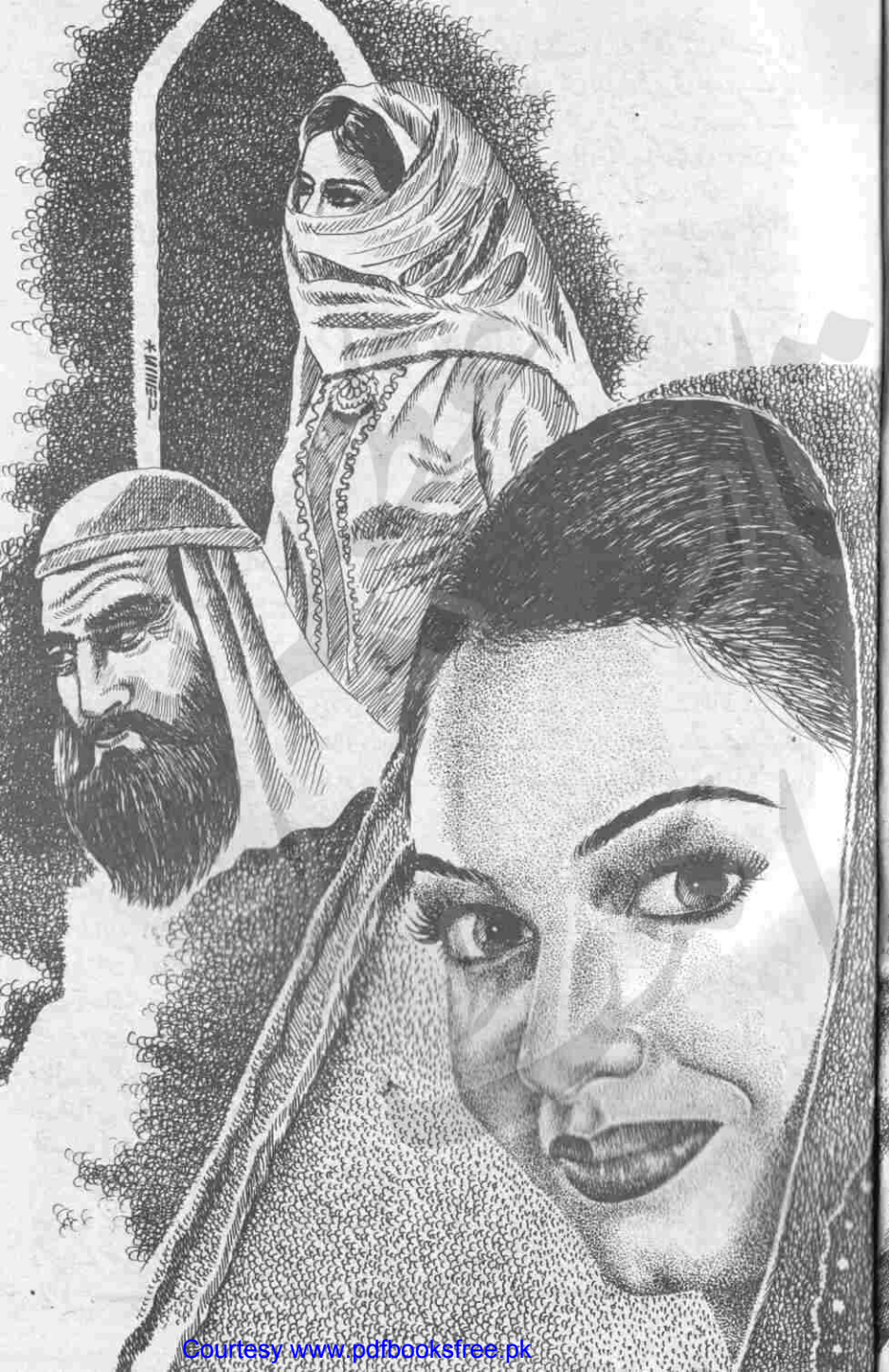

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تاریخی کہانیوں کے شائقین کے لیے بطور خاص

بُعل دیوتا کے پجاری

اسلم راہی

تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان حکمرانوں کے دور میں
سب سے زیادہ سازشیں ہوئی ہیں' اس کا اہم سبب جہاں اختیارات'
اقتدار اور دولت رہی ہے' وہیں عورت بھی ہے جو اس معاملے میں اہم
حیثیت کی حامل ہے۔ اچھے برے ہر قوم' ہر مذہب اور ہر دور میں
موجود رہے ہیں۔ اسلامی مملکتوں کی استحکام کی لیے مذہب
پر کاربند سپہ سالاروں اور جنگ جو سپاہیوں نے اہم کردار ادا
کیا۔ زیر نظر طویل تاریخی کہانی میں اپ کو جہاں
جنگوں کا احوال ملے گا' وہیں محبت
کی لازوال داستان بھی نظر آئے گی۔
مسلمان حکمرانوں نے اپنی مملکت کو مضبوط کرنے کے لیے کن کن امور پر
توجہ دی اور اسے کمزور کرنے کے لیے سازشی عناصر نے کیا کیا جتن کیے۔

مسلمان حکمرانوں کا احوال' تاریخی حقائق' طویل داستان

دوسری طرف اسرائیل کے حکمران کو بھی خبر ہو چکی تھی کہ موآب کی تباہی کا انتقام لینے کے لیے دمشق کا بادشاہ بن ہود اپنا لشکر لے کر نکلا ہے اور اس پر حملہ آور ہوگا لہٰذا اس نے اپنی مدد کے لیے یہودہ کی سلطنت کے حکمران یہوسقط کے علاوہ رومیوں کے حکمرانوں سے بھی مدد طلب کر لی تھی اور ان دونوں حکمرانوں نے اپنے اپنے لشکر اسرائیلی کی مدد کے لیے بھیج دیے تھے دوسری طرف اسرائیلی حکمران نے تیز رفتار قافلہ میوا کے حکمران ودان کی طرف بھی روانہ کیے تھے تا کہ اگر ضرورت پڑے تو بن ہود کے خلاف اس سے بھی مدد حاصل کی جائے دراصل ماضی میں جو بن ہود نے جو اسرائیلیوں کا حشر کیا تھا اس سے اسرائیل کے حکمران بڑے خوف زدہ تھے۔

چنانچہ بن ہود اور یقطان بن سلوم جب اپنا لشکر لے کر اسرائیل کی حدود میں داخل ہوئے تب اسرائیل کے علاوہ یہودہ اور ادرم کی مملکت کے متحدہ لشکر نے ان کی راہ روک لی۔

کیونکہ دونوں لشکر کی تعداد میں بہت زیادہ فرق تھا اسرائیل کے ساتھ اس کے حمایتی اس کے معاون تھے جس کی بناء پر بن ہود اور یقطان بن سلوم کے مقابلے میں ان کے لشکر کی تعداد بہت زیادہ تھی اسی بناء پر عددل فوقیت پر گھمنڈ کرتے ہوئے اسرائیل کے بادشاہ نے پہلے حملہ آور ہونے کا فیصلہ کیا چنانچہ اس نے شوق رزم آرائی میں قضا خیز بگولوں اور جسموں کے منشور سے گزر جانے والی روشنی کی ان گنت شعاعوں کی طرح اپنے لشکر کو آگے بڑھایا پھر وہ بن ہود اور یقطان بن سلوم کے لشکر پر موت کی ردا اتارتے بدترین لمحوں کی آتش فشانی۔ لہر کشید کر لینے والی ہولناک کرب خیزیوں اور فضاؤں کی سانسوں کو بوجھل کرتے عناصر کی غضب ناکی طرح حملہ آور ہوا تھا۔

اس حملے کے جواب میں سب سے پہلے بن ہود اپنے حصے کے لشکر ساتھ حرکت میں آیا اور وہ بھی دشمن کے متحدہ لشکر پر دلوں میں بدبختی کی آندھیاں سوچوں میں ہزیمت کا زہر شعور میں شکست کی کدورت روحوں میں درد کی تحریریں اور ہر شے کی ذات کے آنگن میں بدقسمتی کے بہرے گونگے اندھیرے بھر دینے والی ساگر ساگر بپھرتی موجوں اور صحرا صحرا پھیلتی آگ کی طرح ٹوٹ پڑا تھا۔

بن ہود کے پیچھے ہی پیچھے یقطان بن سلوم بھی اپنے حصے کے لشکر کے ساتھ حرکت میں آیا اور وہ مخدوش اور شکستہ کر کے ذلت کے گرداب بھر دینے والی چنگاڑتی چیختی آندھیوں تحیر کی رسدگاہوں میں فتح مندی کے بگولوں کو جنم دیتے سمندر کے غصیلے پن اور وقت کے منجدھار اور تاریخ کی رفتار میں طوق سلاسل میں جکڑ دینے والی تیزی سے پھیلتی بکھرتی آگ کی طرح دشمن کے متحدہ لشکر پر حملہ آور ہوا تھا۔

یوں اسرائیلیوں کی سرزمین میں دونوں کے لشکر کے ٹکرانے سے موت و مرگ کا ہجوم اور فضا کے سایوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا وقت کی تیرگی و اندوہنا کی اور خیر شر کا تصادم برپا ہو گیا تھا چاروں طرف روحوں سے بے نیاز کر دینے والے کھولتے قہر آلود بحر اپنا رنگ جمانے لگے تھے آشنائی کے الفاظ بے نطق انسانیت کے رشتے ویران ہونے لگے تھے وقت کی بے رحمی کے سیلاب میں رزم گاہ کے اندر قضا کا فسوں بڑی تیزی سے پھیلنے لگا تھا۔

جس وقت جنگ اپنے عروج پر آ گئی تھی اسرائیل یہودہ اور ادوم کے حکمرانوں کو قوی امید تھی کہ انہیں کیونکہ عددی فوقیت حاصل ہے لہٰذا فتح اور کامرانی انہیں کے قدم چومے گی ایک موقع پر جبکہ انہوں نے بن ہود اور یقطان بن سلوم کے لشکر کا گھیراؤ کرنا شروع کیا تھا اچانک یقطان بن سلوم حرکت میں آیا دشمن پر ضربیں لگانے کے ساتھ ساتھ وہ لشکریوں کو مخاطب کرتے ہوئے بلند آواز میں کہنا شروع ہوا تھا۔

''میرے بھائیوں میں یقطان بن سلوم بول رہا ہوں، دشمن کو اپنی عددی فوقیت پر گھمنڈ اور تکبر ہے میری تم سے التماس ہے کہ دہر کی اندھی ظلمت

میں مقتل گاہوں کی خواری اور اجل کی صبح شام کی طرح ان پر ضربیں لگاؤ وقت کے بے محیط خونی آندھیوں اور قضا کے وقار کی لامحدود وسعتی اور کوشش کی طرح ان پر نا بجھنے والی شکست کی پیاس طاری کرتے چلے جاؤ یاد رکھو تم معاملہ ہو ایک خدا اور رب کو ماننے والے ہو تمہارے مقابلے میں یہ مشرک ہیں بعل دیوتا کے پرستش کرتے ہیں، اپنے خالق حقیقی کو فراموش کر کے خود کے بناتے ہوئے معبودوں کے سامنے جھکتے میں سجدہ کرتے ہیں آگے بڑھو اور لہولہو کر دینے والے بے تعبیر خوابوں کی طرح ان کے دلوں کے اوراق پر موت کی گہری دستک دو یہ شرک ہم مواحدوں کے مقابلے میں لہروں پر بہتی بے ضرر جھاگ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

یاد رکھو معبود صرف ہمارا رب ہے وہی اب جو کرنوں کے نقاب شفق کے رخساروں سمندر کی کشادہ پیشانی سے بے کراں صحراؤں پھولوں سے لدے نا کستانوں سے چاند کی مہربان کرنوں برگ نیلوفر میں لپٹی خوشبو سے اپنی ذات کا اظہار کرتا ہے جو گلابی کرنوں کی شادابی آگ کی طرح سلگتے سورج کے طلوع اور غروب رات دن کے زوال اور عروج موسموں کے تغیر و تبدل جھوم کر اٹھتے اور برستے بادلوں اور دن کی کھولتی شورشوں رات کے بھاگتے اندھیروں سے اپنا آپ ظاہر کرتا ہے۔

وہی رب جو ہر چیز پر قادر ہے جو لاشریک ہے وہی ذرے کو ذرے سے ملا کر دشت قطرے کو قطرے سے ملا کر بحر کی صورت دیتا ہے وہی ہمارا رب ہے جو زمین کی رگوں میں اور سرخ سورج کی شعلہ خو کرنوں میں انسان کے لیے فوائد کے فرش بچھاتا ہے جو خاک کو خاکستر کر دینے والی بجلیوں کی کڑک زلزلوں کی دھمک میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے جس کے حکم سے سمندر کے سینے پر کشتیاں رواں دواں رہتی ہیں۔

اپنے اسی رب کا نام لے کر تلخ لہجوں میں فتحمند کے نعرے مارو، عزم راسخ جرات محکم عظیم اعتماد لازوال جذبوں کی طرح آگے بڑھتے ہوئے آ کو دان اسرائیلیوں کے لیے ہم نئے خونی دستور رقم کریں۔''

یقطان بن سلوم کے ان الفاظ نے لشکریوں کے اندر ایک کھولتی سی کیفیت پیدا کر دی تھی اور وہ اس کے کہنے پر تاریخ کا سرمایہ بن کر اتر جانے والے حادثوں جنگلی نعروں موت کے پیغام بن کر اپنے دشمنوں کے دلوں کو خوف سے بھرنے لگے تھے اپنے تیز حملوں سے انہوں نے بڑی تیزی کے ساتھ خستگی اور بیچارگی آتش زنی اور خونریزی طاری کرنا شروع کر دی تھی ان کے اس طرح تیز اور جان لیوا حملوں کے باعث میدان جنگ کا ذرہ ذرہ لہولہان ہونے لگا تھا تلخ حقائق زندگی کی رمق چھیننے لگے تھے رنج و غم کے کھلیانوں میں نظر نظر میں ویرانیاں بھرتے پیاسے صحرا کھڑے کرنے شروع کر دیے تھے اسرائیل یہودہ اور ددم کے لشکریوں کے لیے انہوں نے لا دردر کے بہتر موت کی چاپ اندیشوں کی ریت پھیلاتے ہوئے بے چین شراروں کے خروش کی طرح ان پر خوف طاری کر کے ان کی تعداد کو بڑی تیزی سے کم کرنا شروع کر دیا تھا۔

ان جان لیوا حملوں کے تھوڑی ہی دیر بعد اسرائیل یہودہ اور ادوم کے حکمرانوں نے متحدہ لشکر کو بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ میدان جنگ سے بھاگے یہودہ کے شکست خوردہ لشکری پروشلم اور ادوم کے لشکری اپنے علاقوں کی طرف بھاگ گئے تھے جبکہ اسرائیل کا لشکر اپنے مرکزی شہر سامرہ کے اندر محصور ہو گیا تھا۔

تین بڑی قوتوں کے خلاف بن ہود اور یقطان بن سلوم کی یہ عظیم الشان فتح تھی چنانچہ متحدہ لشکر کے پڑاؤ کی ہر چیز کو سمیٹ کر وہ آگے بڑھے اور بقول محققین اور مورخین انہوں نے سامرہ شہر کا محاصرہ کر لیا تھا۔

اس فتح کے نتیجے میں مال غنیمت کی صورت میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بن ہود اور یقطان بن سلوم کے ہاتھ اس قدر مال دولت زور جواہر اور کھانے پینے کے سامان کے علاوہ جنگی ساز اور ہتھیار لگے جو کئی برسوں کے لیے ان کے لیے کافی تھے۔

سامرہ کا محاصرہ کر کے زخمیوں کی خوب دیکھ بھال کی گئی اس طرح جب عاصرے کو دو دن گزر گئے تب یقطان بن سلوم بن ہود کے خیمے میں داخل ہوا اس وقت بن ہود اپنے خیمے میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا یقطان بن سلوم کی آمد پر اس نے خوشی کا اظہار کیا ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے اس نے اسے اپنے پہلو کی خالی نشست پر بیٹھنے کے لیے کہا یقطان بن سلوم آگے بڑھ کر خالی نشست پر بیٹھ گیا یہاں تک اس کا بغور جائیزہ لیتے ہوئے بن ہود کہنے لگا۔

"بیٹے تمہارے چہرے کی کیفیت بتاتی ہے کہ تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو۔" اس موقع پر ہلکا سا تبسم یقطان بن سلوم کے چہرے پر نمودار ہوا پھر کہنے لگا۔

"آپ کا کہنا درست ہے میں ایک کام کرنے کے لیے آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔"

یقطان بن سلوم کے اس سوال کے جواب میں گھورنے کے انداز میں بن ہود نے اس کی طرف دیکھا پھر کہنے لگا۔

"بیٹے کوئی کام کرنے کے لیے تمہیں مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے' تم صرف اتنا بتا دیا کرو کہ بس میں یہ کام کرنے لگا ہوں مجھے تمہارے کسی فعل پر کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" یہاں تک کہنے کے بعد بن ہود رکا پھر بغور یقطان بن سلوم کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"اچھا اب بتاؤ کہ تم کیا کہنا اور کیا کرنا چاہتے ہو۔" یقطان بن سلوم بولا اور کہہ رہا تھا۔

"جس وقت سامرہ شہر کے اندر میری ماں اور دونوں بھائیوں کو ہلاک کیا گیا تھا اس وقت میں نے اپنے دل میں ایک خواہش کا اظہار کیا تھا یا اسے آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ میں نے ایک عزم اور ایک ارادے کو پالا تھا کہ میں بعل دیوتا کے مندروں کو تباہ برباد کروں گا۔

اب جبکہ سامرہ کا حکمران محصور ہو چکا ہے یہودہ والے یروشلم کی طرف اور ادومی ادوم کی طرف بھاگ چکے ہیں میں چاہتا ہوں بعل دیوتا کے مندروں کے اندر جو پجاری ہیں پہلے ان کا قتل عام کروں اس کے بعد مندروں کو زمین بوس کر دوں۔

اس وقت میری نگاہ میں دو مندر ہیں ایک سامرہ شہر کے شمالی کی طرف جہاں بعل دیوتا کے پجاریوں نے اللہ کے نبی حضرت الیاس سے مقابلہ کیا تھا اور بدترین شکست اٹھائی تھی اور دوسرا مندر عقرون کے مقام پر ہے میں ان دونوں کو تباہ و برباد ویران اور کھنڈروں کا ڈھیر کرنا چاہتا ہوں۔"

جب تک یقطان بن سلوم بولتا رہا' بن ہود مسکراتا رہا اس کے خاموش ہونے پر وہ بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"اگر تمہاری یہی خوشی ہے تمہارا یہی ارادہ اور عزم ہے تو میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم چاہتے ہو اس کام میں میں بھی تمہارا ساتھ دوں تو میں اس کے لیے تیار ہوں۔"

یقطان بن سلوم نے اس موقع پر ایک گہری نگاہ بن ہود پر ڈالی پھر کہنے لگا۔

"ایسی کوئی ضرورت نہیں آپ مجھے جانے کی اجازت دیں میں لشکر میں سے چند دستے لے کر جاؤں گا دونوں مندروں کو برباد کر کے اور ان کے پجاریوں کا قتل عام کر کے شام سے پہلے پہلے آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

بن ہود نے ایسا کرنے کی اجازت دی تب یقطان بن سلوم اس کے خیمے سے نکلا جن دستوں کو اس نے اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ کیا تھا انہیں لے کر وہ آندھی اور طوفان کی طرح ان مندروں پر وارد ہوا باری باری وہ دونوں مندروں پر حملہ آور ہوا پہلے ان کے جس قدر پجاری تھے ان کا قتل عام کیا مندروں کے اندر جو قربان گاہیں بنائی گئیں تھیں

انہیں اس نے گرایا اور مندروں کی عمارتوں کو اس نے زمین بوس کر کے کھنڈروں کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا تھا اس کام کی تکمیل کے بعد اپنے ضمیر کو مطمئن کر کے یقطان بن سلوم اپنے لشکر کے پڑاؤ میں چلا گیا تھا۔

ایک روز بن ہود اور یقطان بن سلوم اسرائیل کے مرکزی شہر سامرہ پر یلغار کی منصوبہ بندی بنا رہے تھے جس خیمے میں وہ بیٹھے ہوئے تھے وہ خیمہ بن ہود کا تھا اور خیمے میں اس وقت بن ہود اور یقطان بن سلوم کے علاوہ دو افراد بھی تھے۔ وہ کہنے لگا۔

"میں سمجھتا ہوں ہمارے لشکریوں کو حملے کی ابتداء کر دینی چاہیے سامرہ کوئی ایسا ناقابل تسخیر بھی نہیں ہے کہ زیادہ دن تک ہمارے حملوں کو برداشت کر سکے اور وہ اس میں محفوظ رہ کر ہمارے مقابلے میں اپنے آپ کو محفوظ خیال کرے لہذا میں چاہتا ہوں اب جلد اپنے کام کی ابتداء کریں۔

جہاں تک ہمارے زخمی ہونے والے لشکریوں کا تعلق تھا وہ اب بالکل صحت یاب ہو چکے ہیں اسی صورت حال کو دیکھتے ہوئے میں چاہوں گا کہ کل سے محاصرے میں شدت پیدا کی جائے شہر پر حملہ آور ہوا جائے اور کسی نہ کسی طرح رسوں کی سیڑھیوں یا شہر پناہ کے دروازے توڑ کر شہر میں داخل ہوا جائے' شہر کے اندر ایسا گھمسان کا رن پڑے کہ اسرائیل کے بادشاہ اور اس کے لشکر کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیا جائے اس طرح آنے والے دور میں کسی بھی موقع پر سامرہ والوں کو ہم سے ٹکرانے اور حملہ آور ہونے کی ہمت اور جرات نہیں ہوگی اس کے علاوہ میں یہ بھی چاہوں گا....."

یہاں تک کہتے کہتے بن ہود کو رک جانا پڑا اس لیے کہ اس کے محافظ دستوں کا سالار خیمے کے دروازے پر نمودار ہوا اور بن ہود کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"ہمارا ایک مخبر جو دشمن پر نگاہ رکھنے کے لیے مقرر تھا وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کوئی اہم انکشاف کرنا چاہتا ہے۔"

ان الفاظ پر بن ہود اور یقطان بن سلوم ہی نہیں دوسرے سالار بھی چونکے تھے لہذا بن ہود کے کہنے پر مخبر کو اندر لایا گیا جب وہ بن ہود کے سامنے آیا تو بن ہود نے اسے مخاطب کیا۔

"کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو۔"

جواب میں اس مخبر نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری پھر بن ہود کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"میں ایک بری خبر لے کر آیا ہوں بری خبر یہ ہے کہ میدا کا بادشاہ ودان ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ صیدا سے نکل کر دمشق پر حملہ آور ہونے کے لیے کوچ کر چکا ہے۔" یہ خبر سن کر سب مزید چونکے تھے یہاں تک کہ مخبر نے پھر کہنا شروع کیا۔

"جس وقت ہمارا لشکر سامرہ پر حملہ آور ہونے کے لیے دمشق سے نکلا تھا تو سامرہ یہودہ اور ادوم کے حکمرانوں کے مقابلہ کرنے کے لیے تیز رفتار قاصد یہاں یروشلم اور ادوم کو بھجوا کر ان کے لشکر منگوا لیے تھے وہاں اس نے صیدا کی طرف بھی اپنے قاصد بھجوائے اور ہمارے لشکر کا مقابلہ کرنے کی استدعا کی۔ اب صیدا کا حکمران ودعان ہمارا مقابلہ کرنے کے لیے ان علاقوں کی طرف تو نہیں آیا وہ اپنا لشکر لے کر دمشق کی طرف روانہ ہوا ہے اس کا ارادہ ہے کہ دمشق پر قبضہ کر لے۔"

مخبر جب خاموش ہوا تب بن ہود نے اسے آرام کرنے کا مشورہ دیا اس کے جانے کے بعد گہری کاٹ کھانے والی خاموشی طاری ہوئی پھر بن ہود بولا اور کہنے لگا۔

"ہم جب سامرہ پر حملہ آور ہونے کی منصوبہ کر رہے تھے وہ تو ختم ہوئی اب بولو تم کیا کہتے ہو۔" بن ہود کے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے یقطان بن سلوم بول اٹھا اور کہنے لگا۔

"ہمیں یہاں قیام کر کے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہیے جہاں تک سامرہ اور یروشلم اور ادوم کا تعلق ہے تو ہم ان تینوں حکمرانوں کو شکست دے کر ان سے ایک طرح کا انتقام لے چکے ہیں فی الحال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سامرہ شہر کو فتح کرنے کا ارادہ ترک کرتے ہیں اور جس قدر جلد ممکن ہو یہاں سے پڑاؤ اٹھا کر دمشق کا رخ کیا جائے صیدا کے بادشاہ ودان کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی پہلے ہم وہاں پہنچ کر اپنے دفاع کو آخری شکل دے دیں اس کے بعد اسی ودان کے خلاف ہم جارحیت بھی اختیار کریں گے۔"

بن ہود اور دوسرے سالاروں نے یقطان بن سلوم کی اس تجویز سے اتفاق کیا تھا لہذا اسی وقت بن ہود نے کوچ کا اعلان کیا آناً فاناً خیموں اور سامان کو سمیٹ کر بار برداری کے جانوروں پر لاد دیا گیا سامرہ یروشلم اور ادوم کے حکمرانوں کو جو شکست دی تھی اس کے نتیجے میں جو مال غنیمت ملا تھا وہ بھی جانوروں پر لادا گیا جو جانور ان کے پڑاؤ سے ملے تھے اور اس سامان کو جو بھی یوداہ بیکار خیال کرتا تھا پھینک دیا گیا تاکہ دمشق کی طرف جانے کے لیے رفتار سست نہ رہے مورخین کا کہنا ہے کہ جس وقت سامرہ کا محاصرہ ترک کر کے بن ہود دمشق کی طرف چلا گیا اور بوجھ ہلکا کرنے کے لیے جو سامان اور برتن وہ پھینک کر چلا گیا وہ سامرہ کے لوگوں نے شہر سے نکل کر چننے شروع کر دیے تھے اور انہوں نے سکھ کا سانس لیا تھا کہ دمشق کا بادشاہ بن ہود ان کا محاصرہ ترک کر کے واپس چلا گیا ہے۔

بن ہود اور یقطان بن سلوم نے اپنے سالاروں اور لشکر کے ساتھ اس قدر تیزی اور برق رفتاری سے سفر کیا تھا کہ وہ دمشق کے قریب جا پہنچے دوسری طرف صیدا کے حکمران کو جب خبر ہوئی کہ سامرہ یروشلم اور ادوم تینوں حکمرانوں کو بدترین شکست دینے کے بعد بن ہود دمشق کی طرف چلا گیا ہے تو خوف کے مارے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے اس نے پیش قدمی ترک کر کے اور واپس اپنے مرکزی شہر صیدا کی طرف چلا گیا تھا۔

☆☆

دمشق کے قریب پہنچ کر حسب سابق بن ہود نے مال غنیمت کی صورت میں ملنے والے سامان کا بڑا حصہ یقطان بن سلوم کے حوالے کر دیا تھا اور جس وقت بن ہود دمشق کے قریب ایک چوراہے پر پہنچا تو اس نے اپنے لشکر کو روک دیا کیونکہ وہاں سے ایک راستہ جبل قاسیون کی طرف جاتا تھا جس کے دامن میں یقطان بن سلوم کے قبیلے نے پڑاؤ کیا ہوا تھا اور دوسرا راستہ دمشق شہر کے جنوبی دروازے کو جاتا تھا اس چوراہے پر رک کر بن ہود نے یقطان بن سلوم کو اپنے قریب بلایا پھر اس نے اپنے گھوڑے کی بڑی خرجین کے اندر سے چھوٹی چمڑے کی ایک خرجین نکالی اور اسے یقطان بن سلوم کو تھماتے ہوئے کہنے لگا۔

"بیٹے یہ اپنے پاس رکھو یہ میری طرف سے تمہارے لیے تحفہ ہے۔" یقطان بن سلوم نے بن ہود کے کہنے پر چمڑے کی وہ خرجین لے لی' اسے کھولے بغیر بولا۔

"اس میں کیا ہے۔" بن ہود مسکرایا اور کہنے لگا۔ "ذرا اسے کھول کر دیکھو۔"

یقطان بن سلوم نے اس خرجین کا منہ کھولا تو اس میں انتہائی قیمتی زیورات اور جواہرات تھے تھوڑی دیر تک یقطان بن سلوم نے ان کا جائزہ لیتا پھر بن ہود کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"میں ان چیزوں کا کیا کروں گا یہ تو آپ کو زیب دیتے ہیں یہ آپ اپنے پاس رکھیں۔"

بن ہود نے مسکراتے ہوئے پہلے نفی میں گردن ہلائی پھر کہنے لگا۔

"میرے بیٹے تم سادے کے سادے ہی رہو گے اب خانہ بدوشی کا طرز عمل کم کرو تمہاری شادی ہو چکی ہے تمہاری بیوی سامرہ کے سابق بادشاہ اخیاب کی بیٹی ہے جو چیزیں میں نے تمہیں دی ہیں یہ تمہاری بیوی کے کام آئیں گی اس لیے کہ اب وہ میری بیٹی ہے یہ خرجین مجھے میرے ایک چھوٹے سالار نے دی تھی جس وقت دشمن بھاگا تھا تو یہ خرجین اسے ملی تھی اس نے اس خرجین کو کھول کر دیکھا نہیں

ویسے کی ویسے میرے حوالے کر دی میں نے اسے کھول کر دیکھا اسی وقت میں نے ارادہ کر لیا کہ یہ خرجین میں تمہیں دوں گا تاکہ تم اسے میری بیٹی ایمن کو تحفے کے طور پر پیش کرو میرے خیال میں میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں تم سمجھ گئے ہو گے۔" یقطان بن سلوم مسکرا دیا کہنے لگا۔

"میرے پاس الفاظ نہیں۔"

یقطان بن سلوم کو رک جانا پڑا اس لیے کہ بن ہود مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

"اب تم یہ کہو گے کہ میرے پاس الفاظ نہیں جنہیں استعمال کر کے شکریہ ادا کروں تمہیں شکریہ ادا کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے تم میرے بیٹے ہو اور تمہیں شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ ڈھونڈنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔"

یہاں تک کہنے کے بعد بن ہود رکا پھر کہنے لگا۔

"اب تم اپنے لشکر کو لے کر اپنے قبیلے میں جاؤ سات دن بعد یہاں سے صیدا کی طرف کوچ کیا جائے گا اب ہمارے دل کی لوح پر صیدا کے حکمران ودان کے دو گناہ رقم ہو گئے ہیں پہلا یہ کہ اس کے سپہ سالار عفتی ایل نے دو بار تم لوگوں سے زیادتی کی ایک بار تمہارے قبیلے میں گھس کر ایمن اس کی ماں اور بھائی کو پکڑ کر لے گیا اور دوسری بار اس کے دستوں نے تمہارے لشکریوں پر حملہ آور ہو کر تمہیں نقصان پہنچایا اور عنیزہ جیسی لڑکی کا خاتمہ ہو گیا لہذا اس سے ان دو گناہوں کا ایسا انتقام لیں گے کہ آنے والے دور میں وہ کبھی ہم پر حملہ آور ہونے کے متعلق سوچ نہیں پائے۔"

یقطان بن سلوم نے اس سے اتفاق کیا اس کے بعد بن ہود شہر کی طرف یقطان بن سلوم جبل قاسیوں کی طرف روانہ ہوا تھا۔

کیونکہ فتح کی یہ خبر پہلے سے پہنچ چکی تھی لہذا پہلے ہی کی طرح شاندار انداز میں اس کا استقبال کیا گیا اس موقع پر جبکہ قبیلے کے سارے لوگ اپنے لشکر کے استقبال کو امڈ آئے تھے قبیلے کا سردار ذوانس اس کا بیٹا جرار اور کچھ عمائدین یقطان بن سلوم کے گرد جمع ہوئے پہلے سب گلے لگا کر یقطان بن سلوم کو ملے پھر ذوانس بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"ابن سلوم میرے بیٹے اس موقع پر میں تمہیں دو کاموں کی خوشخبری دوں گا پہلی یہ کہ بن ہود کے ساتھ مل کر تم نے اپنے لشکریوں کے ہمراہ اپنے دشمنوں کو بدترین شکست دی ہے اور دوسری خوشخبری یہ کہ بن ہود نے جبل قاسیوں کے دامن میں جو ہمارے قبیلے کے لیے رہائش گاہیں بنانا شروع کی تھیں وہ مکمل ہو چکی ہیں اور چند دن پہلے بن ہود کا بیٹا خزائیل اپنے کچھ سرکردہ لوگوں کے ساتھ ہمارے ہاں آیا تھا اور یہاں جمع ہونے والے سارے لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر گیا اور قبیلے کا ہر گھرانے کو ایک ایک گھر دے دیا گیا ہے لیکن ابھی تک کوئی بھی نئی رہائش گاہوں میں اس لیے منتقل نہیں ہوا کہ ہم سب نے مل کر یہ ارادہ کیا تھا کہ جب تم اپنی مہم سے فارغ ہو گے تب ہم نئے گھروں میں منتقل ہوں گے۔"

ذوانس جب خاموش ہوا تب غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے یقطان بن سلوم کہنے لگا۔

"آپ کا مستقل طور پر جبل قاسیول میں آباد ہونے کا ارادہ ہے۔" مسکراتے ہوئے ذوانس نے نفی میں گردن ہلائی پھر کہنے لگا۔

"ایسا تو سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا اس لیے کہ ہم خانہ بدوش شاہراؤں کو ناپنے ایک شہر سے دوسرے شہر جانے لمبی مسافت طے کرنے کے عادل میں ہم ایک لمبی مدت کہیں ٹک نہیں سکتے ہمارا خانہ بدوشانہ سفر پہلے کی طرح جاری رہے گا لیکن شمال کی طرف جانے کے بعد ہم پلٹا کریں گے تو ایک دو ماہ یہاں اپنی مستقل رہائش گاہوں میں قیام کریں گے اس کے بعد جنوب کی طرف نکل جائیں گے جب جنوب سے واپسی کا سفر کرتے ہوئے شمال کی طرف آئیں گے تب بھی یہاں ایک دو ماہ قیام کر لیا کریں گے کیونکہ بن ہود ہمارے ساتھ مخلص ہے اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بڑے خلوص کے ساتھ ہمارے لیے یہ رہائش گاہیں تعمیر کرائی ہیں لہذا ان رہائش گاہوں میں ہم اپنا بھاری بھرکم سامان رکھا کریں گے ہلکا پھلکا سامان لے کر شمال سے جنوب اور جنوب سے شمال کی طرف سفر جاری رکھیں گے اور پہلے کی طرح ایک شہر سے دوسرے شہر تک مال بیچ کر نفع حاصل کریں گے اور اپنے قبیلے کے اخراجات پورے کریں گے۔

اس کے علاوہ ہمارے پاس اس قدر جانور ہیں کہ مستقل طور پر دمشق کے نواح کی چراہ گاہیں ان جانوروں کے لیے پوری نہیں ہوسکتیں جس کی بناء پر ہم اپنی خانہ بدوشانہ زندگی ترک نہیں کرسکتے بیٹے آج کا دن بالکل آرام کرو لشکریوں کو بھی آرام کرنے دو میں چاہتا ہوں کل تم اپنی نگرانی میں سارے قبیلے کے لوگوں کو نئی رہائش گاہوں کی طرف منتقل کرو بن ہود کے حکم پر تمہاری اور میری رہائش گاہیں وسط میں رکھی گئی ہیں تاکہ ہم اپنے لوگوں سے اور لوگ ہم سے رابطہ قائم کرسکیں۔"

یہاں تک کہنے کے بعد ذوانس رک گیا اپنے سامنے ذرا فاصلے پر دیکھتے ہوئے مسکراتا رہا۔ پھر یقطان بن سلوم کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"یہ پیچھے دیکھو ذرا فاصلے پر ایمن کھڑی ہے تمہارا انتظار کر رہی ہے بیٹے اسے لے کر اپنے خیمے میں جاؤ آرام کرو کل اپنے کام کی ابتداء کریں گے۔"

اس پر ذوانس کو مخاطب کرتے ہوئے یقطان بن سلوم کہنے لگا۔

"آپ قبیلے کے سارے لوگوں اور لشکریوں کے ساتھ مل کر یہ مال غنیمت لوگوں میں تقسیم کریں اس میں اناج کے ڈھیر زیادہ ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ضروریات کا سامان ہے اور اس سے ہمارے قبیلے کو خوب فائدہ ہوگا۔" یقطان بن سلوم کے ان الفاظ کے جواب میں ذوانس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی پھر یقطان بن سلوم کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"تم ایمن کو لے کر جاؤ بیٹے تمہارا حصہ تمہارے خیمے میں پہنچ جائے گا۔"

یقطان بن سلوم پیچھے ہٹا ایمن کے پاس آیا ایمن نے بڑے خوش کن انداز میں اسے کامیابی پر مبارک باد دی پھر دونوں میاں بیوی اپنے خیمے کی طرف گئے جب دونوں نشستوں پر بیٹھ گئے تب ایمن کہنے لگی۔

"آپ تھکے ہارے ہوں گے نہا کر لباس تبدیل کریں میں اتنی دیر تک آپ کے لیے کھانا تیار کرتی ہوں۔"

یقطان بن سلوم نے اپنے لباس کے اندر سے وہ چرمی خرجین نکالی جو بن ہود نے اسے دی تھی اور وہ چرمی خرجین اس نے ایمن کی گود میں رکھ دی تھی ایمن نے ایک گہری نگاہ خرجین پر ڈالی پھر اس کی نگاہیں یقطان یون سلوم پر جم گئیں کہنے لگی۔

"اس میں کیا ہے۔"

"کھول کر دیکھ لو۔" یقطان بن سلوم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تھا

ہلکے ہلکے تبسم میں ایمن نے جب خرجین کو منہ کھولا تو ایک دم یقطان بن سلوم نے خرجین اس کے ہاتھ سے لے کر اس کی گود میں الٹ دی تھی' خرجین سے جو سامان نکالا تھا اسے دیکھ کر ایمن دنگ رہ گئی تھی کچھ دیر تک ان جواہرات اور ان قیمتی زیورات کا وہ جائیزہ لیتی رہی پھر سوالیہ سے انداز میں یقطان بن سلوم کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"یہ کہاں سے آئے۔" ایمن کے اس سوال پر یقطان کہنے لگا۔

"یہ جنگ کے دوران بن ہود کے ہاتھ لگے اور اس نے مجھے دے دیے اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ ایمن اب میری بیٹی ہے اور یہ اسے تحفے میں دیے جانے چاہیے۔"

کچھ دیر تک ایمن بڑے غور اور خوشی سے سب چیزوں کا جائیزہ لیتی رہی یہاں تک کہ کچھ سوچتے ہوئے اس نے یقطان کو مخاطب کیا۔

"کیا ہمارے دشمنوں کے لشکر میں عورتیں بھی

شامل تھیں۔"

یقطان بن سلوم نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہنے لگا۔

"کافی عورتیں شامل تھیں جو اپنے لشکریوں کا حوصلہ بڑھا رہی تھیں رزمیہ گیت گا کر انہیں جنگ پر اکسا رہی تھیں۔"

ایمن نے پھر سوچا کہنے لگی۔

"میرے خیال میں یہ زیورات میرے سوتیلے بھائی کی بیوی لے کر آئی ہوگی اور وہ جنگ میں شامل ہوگی اس لیے کہ ان دنوں میرا سوتیلا بھائی اسرائیل کی مملکت کا حکمران ہے یہ سارے زیور بھی میرے باپ نے میری ماں کے لیے بنوائے تھے اور جب ہم تینوں وہاں سے بھاگے تو یہ زیورات میرے خیال میں میرے باپ نے میرے سوتیلے بھائی کی بیوی کو دے دیے ہوں گے۔"

ایمن کے ان الفاظ پر بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے یقطان بن سلوم کہنے لگا۔

"اس کا مطلب ہے جس کی امانت تھی اس کے پاس پہنچ گئی ہے لہذا اب تم اس کو سنبھال کر رکھنا۔"

مسکراتے ہوئے ایمن نے بڑے پرشوخ انداز میں یقطان بن سلوم کے سر میں انگلیاں پھیریں پھر کہنے لگی۔

"یہ کیا بات ہوئی یہ تو سارا اثاثہ تو آپ کا ہے جب میں خود آپ کی ہوں تو میری ہر چیز آپ کی ہے۔" اس پر یقطان بن سلوم بھی مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تم میرا اثاثہ ہو میں تمہارا اثاثہ ہوں اور زندگی تو یونہی بسر ہوتی ہے۔"

ایمن نے جلدی جلدی سارے زیورات اور جواہرات دوبارہ خرجین میں ڈال دیے پھر کہنے لگی۔

"میں آپ کو لباس نکال کر دیتی ہوں آپ نہالیں پھر اکٹھے بیٹھے کر کھانا کھاتے ہیں۔"

یقطان بن سلوم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہنے لگا۔ "تمہیں اٹھنے کی ضرورت نہیں ہے میں خود لباس لے لیتا ہوں اور نہا لیتا ہوں۔"

ایمن نے فوراً یقطان بن سلوم کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگی۔

"میں کوئی معذور نہیں ٹھیک ہے میرے بائیں پاؤں کی انگلیاں کٹی ہیں' میں لنگڑا کر چلتی ہوں لیکن میں ایک تندرست لڑکی کی طرح آپ کی خدمت کرسکتی ہوں اور مجھے ایسا کرنا چاہیے۔"

اس کے ساتھ ہی ایمن اٹھ کھڑی ہوئی ایک لباس نکال کر یقطان بن سلوم کو دیا وہ طہارت خانے کی طرف چلا گیا اتنی دیر تک ایمن نے کھانا تیار کرلیا تھا پھر دونوں میاں بیوی بیٹھ کر کھانا کھانے لگے تھے اسی دوران ان کے مال غنیمت کا حصہ بھی ایک لشکری ان کے خیمے میں رکھ گیا تھا۔

☆☆

اگلے روز یقطان بن سلوم اور ایمن دونوں میاں بیوی صبح کا کھانا کھا کر فارغ ہوئے ہی تھے کہ خیمے کے دروازے پر ذوانس اس کا بیٹا چرار اور دوسرے لوگ نمودار ہوئے انہیں دیکھتے ہی یقطان بن سلوم جب خیمے سے باہر آیا تب ذوانس اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"بیٹے پہلے ہمارے ساتھ آؤ جبل ناسیون کے دامن میں ہمارے لیے جو رہائش گاہیں تعمیر ہوئی ہیں پہلے خود ان کا جائیزہ لو اس کے بعد منتقلی کا عمل شروع کرتے ہیں۔"

اس پر یقطان بن سلوم نے مڑ کر دیکھا اور ایمن کو مخاطب کر کے کہنے لگا میں تھوڑی دیر تک آتا ہوں اس کے ساتھ ہی وہ ذوانس جرار اور دوسرے لوگوں کے ساتھ ہولیا تھا۔

سب تیز تیز چلتے ہوئے جبل قاسیون کے دامن میں گئے جبل قاسیون اپنی ذات میں بڑی اہمیت رکھتا ہے یہ کوہستانی سلسلہ دمشق پر شمال کی جانب سے سایہ فگن ہے اس میں بہت سے غار ہیں جن میں بعض کے اندر انبیاء اکرام کی یادگاریں اور بعض میں بزرگان معالمین کی قبریں ہیں آج کل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قاسیون دمشق کا ایک بڑا محلہ ہو گیا ہے جس کی آبادی پہاڑ کے تک پھیلی ہوئی ہے اس میں بہت سے مقابر اور مدارس نظر آتے ہیں نواح میں دو مسجدیں ہیں جہاں جمعہ ہوتا ہے نیز ایک ہسپتال اور ایک منڈی بھی ہے سب سے پہلے جو لوگ یہاں آ کر بسے وہ بیت المقدس کے باشندے تھے کہ صلاح الدین کے زمانے سے پہلے فرنگیوں نے اس شہر پر قبضہ کیا تو یہ وہاں سے جان بچا کر بھاگے اور یہاں آ کر رہنے سہنے لگے پھر اور لوگوں نے بھی ان کی تقلید کی جبل ناسیون میں مغارۃ الدم نامی غار ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ حضرت آدم کے بیٹے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کا خون وہاں کرایا ایک نشان خون کا بنا ہوا ہے جسے لوگ ہابیل کا خون بتاتے ہیں جو خشک ہو گئے تھے لیکن اس کا دھبہ آج تک موجود ہے ایک پتھر بھی ہے جیسے کسی آدمی نے اٹھا کر پھینکا ہو لوگوں کا بیان ہے کہ اس سے قابیل نے اپنے بھائی کا سر پھاڑا تھا۔

دمشق شہر اور جبل قاسیون کو بڑی اہمیت حاصل ہے خصوصیت کے ساتھ عالم اسلام میں اسے بڑا معتبر خیال کیا جاتا ہے اور مورخین لکھتے ہیں کہ دمشق کے متبرک مقامات میں مولا حضرت ابراہیم بھی ہے اسے جبل قاسیون کے پہلو کے گاؤں برزہ میں بتاتے ہیں جو بہت عمدہ موضع ہے اور خود یہ پہاڑ ہمیشہ سے متبرک رہا ہے حتیٰ کہ جتنے پیغمبر یہاں ہوئے سب نے اس پر چڑھ کر دعا کی ہے یہ پہاڑ شہر کے شمال میں تقریباً ایک فرسنگ کے فاصلے پر ہے مولا حضرت ابراہیم ایک تنگ و طویل غار ہے جس پر لوگوں نے ایک مسجد اور بلند مینار تعمیر کر دیا ہے حضرت ابراہیم اس غار میں ستارے اور چاند اور سورج دیکھا کرتے تھے جیسا کہ قرآن مقدس میں اس کا ذکر ہے اس مقام میں ستر ہزار انبیاء کی قبریں ہیں اور ہر طرف قبرستان پھیلا ہوا ہے جبل قاسیون میں اور اسی مولا ابراہیم میں کے مغرب کی طرف کوئی ایک میل کے فاصلے پر ایک غار کہف الدم کہلاتا ہے جس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس پہاڑ پر قابیل نے ہابیل کا خون کیا تھا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ یہیں جبل قاسیون میں حضرت ابراہیم علیہ حضرت موسیٰ عیسیٰ' لوط نے عبادت کی اس مقام پر ایک نفیس مسجد تعمیر کر دی گئی ہے جس پر سیڑھیوں سے چڑھ کر پہنچتے ہیں یہ غلام گردش کی مانند ہے اور اس کے گرد احاطہ کر دیا گیا ہے آنے والوں کے ٹھہرنے کے لیے حجرے میں نیز غار کو ہر جمعرات کے روز روشن کرتے اور کھولتے ہیں۔

جبل قاسیون کی چوٹی پر ایک غار حضرت آدم سے منسوب ہے وہ یہاں بھی ایک عمارت بنا دی گئی ہے ایک اور غار پہاڑ کے نیچے کہف الخط کہلاتا ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس جگہ ستر پیغمبر بھوک سے ہلاک ہوئے تھے کہتے ہیں صرف ایک روٹی ان کے پاس تھی اور وہ اسے ایک دوسرے کو دیتے رہے اور خود کسی نے نہ کھائی اس جگہ بھی ایک مسجد بنا دی گئی ہے۔

پہاڑ کی چوٹی پر اور شہر کے مغرب میں تمام باغوں سے اوپر وہ پہاڑ یعنی ربوہ ہے جس کی نسبت قرآن مقدس میں آیا ہے کہ حضرت مسیح اور ان کی والدہ وہاں رہتی تھیں یہ بہت دلکش مقام ہے اور ایک قصر بلند سے ملتا ہے جس پر آپ سیڑھیاں چڑھ کر پہنچ سکتے ہیں حضرت مریم کے رہنے کی جگہ ایک چھوٹا غار حجرے کی مانند ہے اسی کے سامنے حضرت خضر کی نماز کا مقام بتاتے ہیں یہاں چھوٹے چھوٹے آہنی کواڑ لگا دیے گئے ہیں مسجد نہایت خوشنما ہے جس میں حوض بنا ہوا ہے جس کا پانی نیچے گرتا ہے۔

مشہور مورخ مقدسی لکھتا ہے کہ دمشق وہی شہر ہے جسے کبھی علم ذات العمود کا نام بھی دیا گیا تھا جس کا پرانے قصوں میں ذکر آتا ہے اس کا یہ تک بھی کہنا ہے کہ حضرت نوح کے وقت سے پہلے سے آباد تھا اور حضرت نوح جبل لبان ہی سے کشتی میں روانہ ہوئے جو کردستان میں کوہ جودی پر جا کر ٹھہری حضرت نوح

کی اولاد بڑھی تو انہوں نے غاروں کی سکونت چھوڑ دی جنہیں نمرود بن کشی نے بنایا تھا۔

جبل قاسیون کے قریب ہی بردا نام کی ندی ہے جسے توریت میں ابانا کے نام سے یاد کیا گیا ہے یہ جبل قاسیون اور دمشق کی سب سے بڑی ندی ہے۔ بردا کی نسبت مورخ مقدسی لکھتا ہے کہ شام کے سارے ملک میں متعدد دریا اور ندیاں ہیں جن میں سے اکثر بحرہ متوسط میں جا گرتے ہیں سوائے بردا ندی کے جو دمشق کے جنوب میں منقسم ہو کر سارے ضلع میں پھیل جاتی ہے اس کے بالائی حصے میں ایک شاخ پھٹ کر شہر کے شمالی ٹکڑے کے گرد پھیل گئی ہے پھر نیچے اس کی دو دھاریں الگ الگ بہتی ہیں جن میں سے ایک صحرا کی طرف چلی گئی ہے اور جھیل بن کر رہ گئی ہے مگر دوسری جنوب میں جاتی ہے اور دریائے اردن سے جا ملتی ہے۔

یاقوت کی روایت کے مطابق بردا کو بردیا بھی کہتے ہیں اور یہ دمشق کی بڑی ندی ہے اس علاقے میں ایک اور ندی باناس ہے لیکن بردا بڑی اور یہاں کی خاص ندی ہے۔ یہ کورائے زیدانی کے جو دمشق سے پانچ فرسنگ پر بعلبک کے قریب واقع ہے ایک گاؤں کنوا کی نزدیکی وادی سے نکلتی ہے اور اس وادی کے چشموں سے بن کر شیجا تک بہہ آتی ہے جو دمشق سے دو فرسنگ کے فاصلے پر ایک موضع ہے یہاں ایک اور چشمہ اس میں آ ملتا ہے اور دونوں مل کر موضع حرایا تک پہنچتے ہیں خود بردا ندی کے دمشق کے نواح میں پہنچتے ہی بہت سی نہریں اس سے کاٹی گئی ہیں اور قلابے بنا کر اس کے پانی کا رخ پلٹ دیا گیا ہے شہر کے شمال میں اور جبل قاسیون کے نیچے دو نہریں ہیں ایک نہر یزید اور دوسری نہر صورا نہر یزید کو یزید بن معاویہ نے کھدوایا تھا۔

بہرحال یقطان بن سلوم قبیلے کا سردار ذوالنس اس کا بیٹا جرار اور دوسرے لوگ جبل قاسیون کے دامن میں پہنچے یقطان بن سلوم کے ساتھ پہلے انہوں نے بن ہود کے جانب سے بنوائے جانے رہائشی مکانات کا جائزہ لیا پھر ایک جگہ جمع ہوئے ذوالنس بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"یقطان میرے بیٹے میں سمجھتا ہوں کہ بن ہود کا یہ ہم پر بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے اپنے اخراجات پر ہمارے لیے یہ رہائش گاہیں تعمیر کی ہیں اور جہاں یہ رہائش گاہیں تعمیر کی ہیں یہ جگہ بھی بہت عمدہ ہے دیکھو قریب ہی ندی کا پانی ہے چشمے بھی ہیں اور اس پانی سے ہمارے قبیلے والے ہی نہیں ہمارے جانور بھی خوب سیراب ہو سکتے ہیں اور پشت پر جو علاقہ ہے دور تک میلوں میں پھیلا ہوا ہے یہ سب چراہ گاہیں ہیں اور یہاں کئی ہفتوں تک ہمارے قبیلے کے جانور چر کر مستفید ہو سکتے ہیں بیٹے میں چاہتا ہوں آج ان مکانوں میں ہمارے قبیلے کی منتقلی مکمل ہو جائے یہ سارا کام میں تمہاری نگرانی میں ہوتا دیکھنا چاہتا ہوں کو جس وقت تم بن ہود کے ساتھ سامرہ کی طرف گئے ہوئے تھے بن ہود کے بیٹے حزائیل نے مجھے پیشکش کی تھی کہ آپ اپنے قبیلے کے ساتھ ان مکانوں میں منتقل ہو جائیں لیکن میں نے اس سے کہا کہ میرے قبیلے کا سپہ سالار یقطان بن سلوم ابھی یہاں نہیں ہے وہ واپس آئے گا اس کی نگرانی اور اس کی موجودگی میں یہ سارا کام کیا جائے گا۔

اب تم نے ساری رہائش گاہیں دیکھ لی ہیں پانی کا انتظام بھی تم دیکھ چکے ہو اور دائیں جانب جو کھلا میدان ہے وہاں بن ہود کے بیٹے حزائیل نے چھپر بھی تعمیر کر دیے ہیں اب یہ سردیوں میں ہمارے جانوروں کے کام آ سکتے ہیں اب بولو تمہارا کیا ارادہ ہے۔" اس پر یقطان بن سلوم بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"میرا ارادہ کیا ہونا ہے میرے خیال میں واپس جاتے ہیں اور قبیلے کی ان مکانوں میں منتقلی کا کام شروع کرتے ہیں۔"

یقطان بن سلوم کے ان الفاظ سے سب خوش ہو گئے تھے پھر وہ واپس گئے اور تھوڑی دیر بعد پورا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قبیلہ اپنی خیمہ گاہ کو سمیٹ کر ان مکانوں میں منتقل ہو گیا تھا کیونکہ یقطان بن سلوم کی آمد سے پہلے پہلے ذوالکس کے بیٹے اور قبیلے کے دیگر معززین نے اپنے قبیلے کے لوگوں کے لیے مکان پہلے ہی سے بانٹ رکھے تھے لہٰذا منتقلی میں کوئی زیادہ دیر نہ لگی تھی۔

جب منتقلی کا کام مکمل ہو گیا تب یقطان بن سلوم جس نے ایمن کے ساتھ مل کر اپنی رہائش گاہ کو درست کر لیا تھا اور سارا سامان جوان کے پاس تھا منتقل کر دیا گیا تھا تب یقطان بن سلوم ایمن کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"ایمن میں جانتا ہوں تم تھک گئی ہو اب تم آرام کرو میں ذوالکس سے بات کرنے کے بعد ذرا بن ہرد کی طرف جاتا ہوں تم جانتی ہو کہ بن ہرد نے یہ عہد کر رکھا ہے کہ لشکریوں کو سات دن ستانے کا موقع فراہم کرے گا اس کے بعد وہ چاہتا ہے کہ میں اور وہ ایک متحدہ لشکر لے کر صیداہ کا رخ کریں اور صیداہ سے ہمارے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا انتقام لے اس سلسلے میں تھوڑی سی میں تبدیلی چاہتا ہوں پہلے میں اس سلسلے میں بن ہود سے بات کر آؤں پھر واپس آ کر میں تم سے تفصیل کہتا ہوں۔"

یقطان بن سلوم جب خاموش ہوا تب ایمن غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"زیادہ دیر مت لگایئے گا اس مکان میں ہمارا آج پہلا دن ہے اور یہاں میں تھوڑی سی تنہائی بھی محسوس کروں گی اس لیے کہ ہمارے لیے یہ مکان بہت کھلا اور وسیع بنا دیا گیا ہے اصل بات یہ ہے کہ میں اب خیمے کی زندگی کی عادی ہو گئی ہوں اور یہ مکان مجھے عجیب عجیب سا لگ رہا ہے بہرحال بن ہود سے بات کر کے آپ جلد لوٹ آیئے گا۔"

یقطان بن سلوم نے جلد آنے کا وعدہ کیا پھر وہ اپنے گھر سے نکل گیا تھا۔

دمشق کا بادشاہ بن ہود اس روز اپنے قصر کے ایک کمرے میں اپنے بیٹے ہزائیل کے ساتھ بیٹھا کسی موضوع پر گفتگو کر رہا تھا کہ اسے یقطان بن سلوم کے آنے کی اطلاع دی گئی اس پر بن ہود نے برافروختگی اور غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"یقطان بن سلوم جب آتا ہے تو مجھے اس کی آمد کی اطلاع مت دیا کرو بلکہ اسے فی الفور میرے پاس پہنچا دیا کرو آئندہ اگر کسی نے اسے روکنے یا اس کی آمد کی مجھے اطلاع دی تو میں اس کا برا انجام کروں گا قصر میں آ کر مجھ سے مل سکتی ہے بہرحال اسے فی الفور میرے پاس لے کر آؤ۔" اس کے ساتھ ہی اطلاع دینے والا پیچھے ہٹ گیا اور تھوڑی دیر بعد یقطان بن سلوم اس کمرے میں داخل ہوا جس میں بن ہود اور اس کا بیٹا حزائیل بیٹھے ہوئے تھے۔

یقطان بن سلوم آگے بڑھا پھر بن ہود کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"کیا آپ دونوں باپ بیٹا کسی خاص موضوع پر تو گفتگو نہیں کر رہے تھے اور کیا میں کہیں مخل تو نہیں ہوا۔"

یقطان بن سلوم کے ان الفاظ کے جواب میں بن ہود نے گھورنے کے انداز میں اس کی طرف دیکھا پھر کہنے لگا۔

"بیٹے یہ تم کس قسم کی گفتگو کر رہے ہو ہمارے پاس کوئی ایسا موضوع ہی نہیں ہے جس کو ہم تم سے راز اور بھید رکھیں جس طرح حزائیل میرا بیٹا ہے ویسے بھی میں تمہیں بھی اپنا بیٹا خیال کرتا ہوں بس ہم دونوں باپ بیٹا بیٹھے اپنے گھریلو معاملات پر گفتگو کر رہے تھے۔"

اس کے ساتھ ہی یقطان بن سلوم آگے بڑھ کر بن ہود کے پہلو میں جو نشست خالی تھی اس پر ہو بیٹھا پھر بن ہود کو مخاطب کر کے وہ کہنے لگا۔

"میں آپ کے ساتھ صیدا کی مہم کے سلسلے میں گفتگو کرنے کے لیے آیا ہوں۔ دراصل ہمارا قبیلہ ان رہائش گاہوں میں منتقل ہو گیا ہے جو آپ نے ہمارے لیے تیار کروائی ہیں اس کام کے لیے ہم آپ کا جسم قدر شکریہ ادا کریں کم ہے اب کیونکہ لشکریوں کو ایک ہفتہ آرام دینا ہے اس کے بعد ہم نے کوچ کرنا

ہے لہٰذا میں صیدا کی مہم سے متعلق آپ سے گفتگو کرنے کے لیے آیا ہوں۔"

یقطان بن سلوم جب خاموش ہوا تب بن ہود کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا۔

"اس مہم سے متعلق کیا گفتگو کرنی ہے سات دن بعد اسی طرح دونوں متحدہ لشکر کو لے کر صیدا کا رخ کریں گے جس طرح سامرہ کا رخ کیا تھا کیا تم اس میں کوئی تبدیلی چاہتے ہو۔"

یقطان بن سلوم نے پہلے اثبات میں گردن ہلائی پھر بن ہود کی طرف دیکھتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

"میں اس میں خاصی بڑی تبدیلی چاہتا ہوں آپ جانتے ہیں ہمارا قبیلہ خانہ بدوش ہے اور ہمارے لیے آباؤ اجداد سے شروع یہ خانہ بدوشی ترک کرنا ایک طرح سے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے نئی رہائش گاہوں میں منتقل ہونے کے بعد جو فیصلہ ہمارے قبیلے کے سردار ذوالکس اور دوسرے سرکردہ لوگوں کی موجودگی میں میرے ساتھ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ جب ہم ایک شہر سے دوسرے شہر کے ساتھ مال کا لین دین کرتے انتہائی شمال کی طرف جائیں گے تو واپسی میں دو ماہ تک ان رہائش گاہوں میں قیام کیا کریں گے اور جب انتہائی جنوب کی طرف نکل جائیں گے یعنی دریائے نیل کے ڈیلٹا سے بھی آگے تو وہاں سے واپسی پر بھی دو مہینے ہمارا قبیلہ ان رہائش گاہوں میں قیام کیا کرے گا اس کے بعد شمال کی طرف نکل جایا کرے گا۔

دراصل یہاں قیام کے دوران ہم نے اندازہ لگایا ہے اس کے مطابق جبل قاسیون اور اس کے گردونواح میں جس قدر چراگاہیں ہیں وہ ہمارے جانوروں کے لیے لگ بھگ دو ماہ کافی ہوتی ہیں لہٰذا جب ہم شمال کی طرف نکل جائیں گے تو ہماری غیر موجودگی میں وہ چراگاہیں پھر تیار ہو جائیں گی اور پھر جنوب کی طرف نکلیں تو واپسی پر چراگاہیں پھر تیار ہوں گی اور ہم اس سے مستفید ہو جائیں گے ہم نے چونکہ شمال اور جنوب کی طرف سفر کرتے ہوئے صیداہ شہر کے پاس سے گزرنا ہوتا ہے لہٰذا صیداہ کے حکمران سے کسی طریقے کسی ڈھنگ سے نبٹا جائے گا اگر ہم اپنے لشکر کو لے کر اسی طرح صیداہ کی طرف کوچ کریں جس طرح ہم نے سامرہ کی طرف کوچ کیا ہے تو یہ طریقہ کار آج نہیں تو کل اور آنے والے دنوں میں ہمارے قبیلے کے لیے سخت نقصان کا باعث بھی بن سکتا ہے اس لیے کہ ہمارا متحدہ لشکر ایک بار صیدا کے حکمرانوں کو بدترین شکست دے کر ان پر غالب آ جاتا ہے تو پھر کوئی نہ کوئی وقت ایسا آئے گا کہ صیدا کا حکمران کوئی مناسب موقع جان کر اپنی عسکری قوت کو ہمارے خلاف استعمال کرے گا اور ہمارے لیے نقصان کا باعث بنے گا۔"

یقطان بن سلوم کو رک جانا پڑا اس لیے کہ بیچ میں بن ہود بولتے ہوئے کہنے لگا۔

"اگر یہ معاملہ ہے تو تم خود ہی کہو کیا کہتے ہو۔"

یقطان بن سلوم نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری پھر بن ہود کی طرف دیکھتے ہوئے وہ دوبارہ کہہ رہا تھا۔

"میں چاہتا ہوں دو تین دن تک کچھ ہمارے قبیلے کے اور کچھ ہمارے مخبر صیداہ کی طرف پھیل جائیں اور یہ خبر مشہور کر دیں کہ کنعانیوں کا خانہ بدوش قبیلہ جنوب کی طرف سے سفر کرتا ہوا شمال کی طرف جا رہا ہے اور وہ صیدا کے پاس سے گزرے گا۔

صیدا کے حکمران ودان اور اس کے سپہ سالار غنتی ایل کو جب یہ خبر ملے گی تب صیداہ کا حکمران ودان چاہے یا نہ چاہے لیکن غنتی ایل ضرور ہمارے خلاف کارروائی کرنے کے لیے ودان کو ابھارے گا چنانچہ وہ بھی اپنے مخبر پھیلائیں گے اور ہمارا محل وقوع جاننے کی کوشش کریں گے پھر کسی مناسب جگہ ہمارے قبیلے کو روکیں گے اور ہم سے ٹکرائیں گے اور ہم پر حملہ آور ہو کر ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یقطان بن سلوم کو پھر رک جانا پڑا اس لیے کہ بن ہود بیچ میں انتہائی غصے اور غضبناکی میں بول اٹھا۔

"ان کی ایسی تیسی کہ وہ تمہیں یا تمہارے قبیلے والوں کو نقصان پہنچائیں۔" یقطان بن سلوم مسکرا دیا اور کہنے لگا۔

"میں نے ابھی اپنی گفتگو مکمل نہیں کی میں چاہتا ہوں کہ جب ہمارا قبیلہ جنوب سے شمال کی طرف سفر کرے تو آپ اپنے لشکر کے ساتھ ہمارے ساتھ سفر نہ کریں بلکہ ہٹ کر رہیں ایک فاصلہ رکھیں اس طرح صیداہ والوں کو یہ یقین ہو جائے گا کہ صرف ہمارا خانہ بدوش قبیلہ شمال کی طرف سفر کر رہا ہے جب وہ ہماری راہ روکیں گے تو میں اپنے جنگجوؤں کے ساتھ ان سے ٹکراؤں گا وہ اس ٹکراؤ کو بڑا آسان لیں گے اس لیے کہ ان کے مقابلے میں ہمارے جنگجوؤں کی تعداد بہت کم ہو گی اور وہ یہ خیال کریں گے وہ بہت جلد ہم پر قابو پا لیں گے میں جان توڑ کر ان کے حملوں کو روکوں گا اتنی دیر تک آپ اپنی کاروائی کو مکمل کر لیں اور ان کا کسی پہلو یا پشت کی جانب سے حملہ آور ہو جائیں جب ایسا ہو گا تو پھر گھمسان کا رن پڑے گا اس لیے کہ صیدا کے لشکر کو فی الفور دو محاذ کھولنے پڑیں گے ایک سامنے کی طرف سے دوسرا اس سمت سے جس سمت سے آپ حملہ آور ہوں گے میں یہ بھی خیال کرتا ہوں کہ جو لشکر ہم پر حملہ آور ہو گا یا ہماری راہ روکے گا اس کی سالاری یقیناً ودان کے سپہ سالار اعلیٰ غنتی ایل کے پاس ہو گی اور غنتی ایل وہی شخص ہے جسے میں قتل کرنا چاہتا ہوں چنانچہ جب ان کے لیے دو محاذ کھل جائیں گے تو میں یہ دیکھوں گا کہ غنتی ایل کہاں ہے میں اپنے کچھ دستوں کو متحرک کروں گا غنتی ایل کی طرف بڑھوں گا اور ہر صورت میں اس کی گردن کاٹ کر رہوں گا۔

ایسا کرنے کے بعد غنتی ایل کے لشکر کو کاٹ کر اس کے لشکر کی تعداد خوب کم کی جائے گی اس کے بعد ہم آگے شمال میں نکل جائیں گے اور آپ دمشق کی طرف چلے آئیے گا اور جب ہم شمال سے جنوب کی طرف آئیں گے تب بلی صیدا سے دور آپ کی طرف تیز رفتار قاصد بھجوائیں گے آپ اپنے لشکر کے ساتھ صیدا کی طرف جا کر مناسب جگہ گھات میں رہیے گا صیدا کے پاس سے جب ہم گزریں گے اگر صیدا والوں نے کوئی مزاحمت نہ کی تو پھر ہمارے لیے یہ شاہراہ محفوظ ہو گی اس کا مطلب ہو گا کہ وہ آنے والے دور میں ہم سے ٹکراؤ نہیں چاہتے اور اگر انہوں نے ہماری واپسی پر اپنی شکست کا انتقام لینا چاہا تو ان کی حالت وہی ہو گی جو پہلی جنگ میں ہوئی یقینی ایک طرف سے میں اور دوسری طرف سے آپ ان پر ضرب لگائیں گے اور ہم اپنی فتح اور کامیابی اور ان کی شکست اور بربادی کو یقینی بنائیں گے۔"

یقطان بن سلوم یہاں تک کہنے کے بعد جب خاموش ہوا تب بن ہود تھوڑی دیر تک مسکراتا رہا پھر یقطان بن سلوم کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"بیٹے جو کچھ تم نے کہا ہے یہی مناسب ہے اسی پر عمل کیا جائے گا اور میرے خیال میں ایک بار اگر ہم صیدا کی طاقت اور قوت کو بدترین شکست دینے میں کامیاب ہو گئے تو آنے والے دور میں وہ کبھی تم سے مزاحمت کرنے کی کوشش اور جرات نہیں کریں گے۔"

بن ہود کے خاموش ہونے پر اس کا بیٹا ہزائیل بولا اور اپنے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"اے میرے باپ آج تک جتنی مہمیں بھی درپیش ہوئیں ان میں آپ ہی لشکر لے کر نکلتے رہے اور مجھے یہاں اپنی سرزمینوں کا نظم و نسق درست رکھنے کے لیے چھوڑتے گئے اب آپ ضعیف ہو چکے ہیں میں آپ کا بیٹا ہوں اب آپ کی جگہ میں ان مہموں پر لشکر لے کر نکلوں گا یہ مہم جو میرے بھائی یقطان بن سلوم کو درپیش ہے اس میں آپ نہیں میں جاؤں گا اور پھر آپ دیکھیے گا میں اپنے اور یقطان بن سلوم کے دشمنوں کے خلاف کیسی عمدہ اور جان لیوا کاروائی کی ابتداء کرتا ہوں۔"

☆☆

صیدہ کا حکمران ودان ایک روز اپنی رہائش گاہ کے عقبی باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا کہ اس کے محافظوں نے ایک مخبر کو اس کے سامنے پیش کیا ودان نے دیکھا مخبر کا چہرہ اترا ہوا تھا پریشان اور فکرمند تھا کچھ دیر تک ودان بڑے غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اسے مخاطب کر کے پوچھا۔

"کس سمت سے آئے ہو اور کیا خبر لائے ہو۔"

اس مخبر نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری پھر بڑی فکر گیر آواز میں ودان کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"میں آپ کے لیے ایک انتہائی بری خبر لے کر آیا ہوں اور خبر یہ ہے کہ سامرہ کے حکمران یہورام نے آپ کی بہن ایزبل کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔"

یہ الفاظ سن کر ودان چونکا تھا چہل قدمی اس نے ترک کر دی تھی جہاں رکا وہیں اس کے قدم جم کر رہ گئے تھے پھر کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد اس نے پوچھا۔

"یہورام نے ایسا کیوں کیا۔"

"اس لیے کہ وہ ایزبل کو ناپسند کرتا تھا اس بناء پر موت کے گھاٹ اتار دیا۔" لرزتی کانپتی آواز میں اس مخبر نے کہا تھا۔

دراصل سامریہ کے سابق حکمران اخیاب کی کئی بیویاں اور اس کے ستر بیٹے تھے۔ موجودہ حکمران ایزبل کے بجائے کسی اور بیوی کا بیٹا تھا ایزبل کو ناپسند کرتا تھا اس کا خاتمہ کرنے کے لیے یہورام نے دو تین خواجہ سراؤں کو مقرر کیا اور انہیں اس کی طرف بھیجا تاکہ اس کا خاتمہ کر دیں۔

چنانچہ وہ خواجہ سرا ایزبل کی طرف گئے اور اسے نیچے گرا دیا اور اسے ایک طرح سے ذبح کر ڈالا اس کے خون کی چھینٹیں دیوار پر اور گھوڑوں پر پڑیں اس کے بعد گھوڑوں سے اس کی لاش کو خوب روندا گیا جب یہ سارا معاملہ ہو چکا تب سامرہ کے حکمران یہورام نے اپنے کچھ لوگوں سے کہا۔ "جاؤ اس لعنتی

بن ہود کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"میں جانتا ہوں یقطان بن سلوم جنگ کا بہترین تجربہ رکھتا ہے دشمن کو شکست دینے کا فن بھی اس کے پاس ہے لہٰذا اس کے ساتھ کام کرتے ہوئے میں بھی اس سے بہت کچھ حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گا بابا مجھے امید ہے کہ میرا کہا مانتے ہوئے آپ میری خواہش کا احترام کریں گے اور اس مہم میں مجھے بھیجیں گے اور خود آپ دمشق میں ہی رہیں گے۔"

حزائیل کے ان الفاظ پر کچھ دیر تک بن ہود توصیفی انداز میں اس کی طرف دیکھتا رہا پھر کہنے لگا۔

"بیٹے جو الفاظ تم نے ادا کیے ہیں ان الفاظ نے مجھے خوش کر دیا ہے اگر تم اس مہم پر جانے کی خواہش رکھتے ہو تو میں تمہاری اس خواہش کو رد نہیں کروں گا یقیناً یقطان بن سلوم کے ساتھ رہتے ہوئے تم جنگی امور میں بہت کچھ حاصل کرو گے جو آنے والے دور میں تمہارے کام آئیں گی۔" حزائیل اور بن ہود کے اس فیصلے پر یقطان بن سلوم بھی خوش ہو گیا تھا پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور بن ہود کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"اب مجھے اجازت دیں میں اب جاتا ہوں جو منصوبہ بندی میں چاہتا تھا میری خوش قسمتی کہ اسے آپ نے تسلیم کر لیا ہے۔"

بن ہود نے یقطان بن سلوم کا بازو پکڑ لیا اور کہنے لگا۔ "بیٹے دوپہر ہو رہی ہے اب کھانا کھا کر جانا۔"

یقطان بن سلوم مسکرایا اور کہنے لگا۔

"آپ جانتے ہیں میری بیوی ہے اور وہ کھانے پر بڑی شدت سے میرا انتظار کرے گی لہٰذا میں اسے مایوس نہیں کرنا چاہتا۔"

بن ہود مان گیا اور اسے جانے کی اجازت دے دی اس طرح یقطان بن سلوم جبل قاسیون کے دامنے کی طرف ہو لیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عورت کو دیکھو اور اسے دفن کر دو کیونکہ بہرحال وہ صیداہ کی شہزادی ہے۔"

چنانچہ یہورام کے کہنے پر جب کچھ لوگ اسے دفن کرنے گئے تو انہوں وہاں ایزبل کی کھوپڑے اس کے پاؤں اور ہتھیلیوں کے سوا اس کے جسم کا کوئی حصہ نہ ملا سو وہ بہورام کے پاس لوٹ گئے اور اسے بتایا کہ اس کے جسم کی صرف یہ یہ چیزیں ہیں چنانچہ یہورام کہنے لگا اس کا مقدر یہی تھا جو اس کے ساتھ ہو گیا چنانچہ اس موقع پر حضرت الیاس کی پیش گوئی بھی پوری ہوئی اس لیے کہ جس وقت ایزبل نے ایک شخص کی زمین اپنے محل میں شامل کرنے کے لیے حیل سے محبت سے کام لے کر اس زمین پر قبضہ کیا تھا تب حضرت الیاس نے کہا تھا کہ اس علاقے کے کتے ایزبل کا گوشت کھائیں گے اور ایزبل کی لاش اس کے علاقے میں کھیت کی کھاد کی طرح پڑی رہے گی چنانچہ حضرت الیاس کی پیش گوئی کے مطابق ایسا ہی ہوا اس کی لاش کو کتوں نے کھایا اور وہ وہیں پڑی رہ گئی تاکہ کھیت کی کھاد بنے یہ ساری تفصیل جب اس مخبر نے ودان سے کہی تب ودان کے غصے اور غضب کی کوئی انتہا نہ تھی کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ودان آنے والے مخبر کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"کیا یہودہ کے حکمران یہوسفط نے بھی اس کام سے یہورام کو نہ روکا اس لیے کہ اس کے ہاں میری بہن کی بیٹی اور میری بھانجی ہے۔"

جواب میں مخبر کہنے لگا۔ "یہوسفط کیا روکے گا اس لیے کہ یہوسفط ہر معاملے میں سامرہ کے حکمران کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے اور ہر معرکے میں اس کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے۔"

ودان نے اس موقع پر تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"اس کا مطلب ہے یہوسفط کے ہاں میری بہن کی بیٹی کو بھی اپنی جان کا خطرہ ہے اسے مجھے وہاں سے نکال دینا چاہیے۔"

اس موقع پر ودان نے اس مخبر کو تو جا کر آرام کرنے کا مشورہ دیا پھر اسی روز اس نے تیز قاصد ادوم کے علاقے کی طرف روانہ کیے اور ادوم کے حکمران کو یہ پیغام بھیجا کہ سامرہ کے حکمران یہورام نے اس کی بہن ایزبل کو قتل کیا ہے اور میں ایک بھائی کی حیثیت سے اپنی بہن ایزبل کا انتقام یہورام سے ضرور لوں گا۔

ودان نے ادوم کے حکمران کو یہ بھی تنبیہ کی کہ میں جب یہورام پر حملہ آور ہوں اور یہورام میرے خلاف تم سے مدد طلب کرے تو تم غیر جانبدار رہنا اور اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو میں تمہیں بھی اپنا دشمن خیال کروں گا اور آنے والے دنوں میں میں تمہارے علاقوں کو بھی روندوں گا۔

اس نے ادوم کے حکمران کی طرف یہ پیغام بھی بھجوایا کہ اس ٹکراؤ میں اگر یہودہ کا بادشاہ یہوسفط یہورام کی مدد کرتا ہے تو میں ان دونوں سے تو نبٹ لوں گا لیکن ادوم کا حکمران اس معاملے میں نہ پڑے اس لیے کہ یہودہ اور سامرہ دونوں علاقوں کے حکمرانوں سے ادوم کا کوئی تعلق واسطہ رشتہ داری اور خاص رابطہ نہیں ہے۔

بہرحال ودان نے اپنے تیز رفتار قاصد ادوم کی طرف بھجوائے تھے جہاں تک ادوم کا تعلق ہے تو جس خطہ ملک میں یہ لوگ آباد ہوئے یونانی اب تک اس کو ایدومیہ کہتے ہیں۔ بحر میت اور خلیج عقبہ کا بیچ میں ان کا علاقہ واقع ہے اس کے شمال میں بحر میت اور فلسطین جنوب میں شمالی خلیج عقبہ اور مدین مغرب میں جزیرہ نمائے سینا اور مشرق میں موآب کا علاقہ ہے۔

سام اور فلسطین کی جانب جنوبی اور مغربی گوشہ میں مملکت عرب کی یہ آخری حد ہے اس علاقے میں کوہ سیعر طولاً شمال سے جنوب تک وسیع ہے اس لیے توریت میں قبیلہ ادوم کا مقام سیعر ہی بتایا گیا ہے۔

جہاں تک بنی ادوم کے آباء اجداد کا تعلق ہے تو حضرت اسحاق کے دو بیٹے تھے یعقوب اور عیسی دونوں سگے بھائی تھے عیسو فرزند اول تھے لیکن

پہلوٹھے ہونے کی برکت حضرت یعقوب نے حاصل کی چنانچہ حضرت یعقوب کا بڑا بھائی عیسو اٹھ کر اپنے محترم چچا حضرت اسمٰعیل کے پاس چلے گئے اور ان کی صاحبزادی جس کا نام یا سایا محلات تھا شادی کر لی پھر چند شادیاں اور بھی کیں جن سے متعدد اولادیں اور اولادوں کی اولادیں ہوئیں جن میں عمالیق اور عوذ مشہور ہوئیں اور انہیں کے نام سے قبیلے بھی مشہور ہوئے ان سب کو لے کر کوں سعیر میں اپنا مسکن بنایا جو شام سے انتہائی یمن تک طولاً وسیع ہے عیسو کا نام عرف عام میں ادوم یعنی سرخ تھا اس لیے اس خاندان اور ملک کا نام بھی ادوم پڑ گیا۔

چند صدیوں کے بعد یہ خاندان ایک کثیر تعداد اور قوم بن گئی جس نے سترہ سو قبل مسیح سے پہلے ایک عظیم الشان حکومت قائم کی اسی عہد میں بنی اسرائیل جب مصر سے آئے تو ادوم کی حکومت سعیر میں قائم ہو چکی تھی۔

اللہ کے نبی حضرت ایوب علیہ بھی عرب تھے اور ان کا تعلق بنو ادوم ہی سے تھا بہرحال ان دنوں ادومیوں کی اچھی خاصی طاقت اور قوت تھی اور وہ کسی بھی موقع پر یہودہ اور اسرائیل کی مملکتوں کا مقابلہ کر سکتے تھے۔

ادوم کے حکمرانوں کو جب صیدا کے حکمران ودان کا یہ پیغام ملا تو وہ اس سے متاثر ہوا قاصدوں کے ذریعے اس نے ودان کو یقین دلایا کہ اگر اسرائیل کے حکمرانوں نے ودان کی بہن کو بغیر کسی وجہ کے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے تو ودان یہ حق رکھتا ہے کہ اسرائیل پر حملہ آور ہو کر اپنی بہن کے قتل کا انتقام لے اور اگر یروشلم کا بادشاہ بھی اس سلسلے میں سامرہ کے بادشاہ کی مدد کرتا ہے تو ودان یہ بھی حق رکھتا ہے کہ وہ ان دونوں پر ضرب لگائے اگر ودان ایسا کرتا ہے تو ادوم کی سلطنت اس سلسلے میں بالکل خاموش رہے گی یہودہ اور اسرائیل میں سے کسی کی مدد نہیں کرے گی۔

ادوم کے حکمرانوں سے یہ پیغام ملنے کے بعد ودان خوش ہو گیا تھا اب وہ یہودہ اور اسرائیل پر ضرب لگانے کے لیے اپنی تیاریوں کو آخری شکل دینے لگا تھا۔

☆☆

ودان کی مہم پر جانے سے پہلے دوپہر کے وقت یقطان بن سلوم جبل قاسیون کے ایک سلسلے کے اوپر چرواہوں کے ساتھ اپنے ریوڑ کا جائزہ لے رہا تھا کہ قبیلے کا ایک لڑکا بھاگا بھاگا اس کے پاس آیا اسے اس طرح اپنی طرف آتے دیکھ کر یقطان بن سلوم چونکا تھا وہ لڑکا قریب آیا اور پھولی ہوئی سانس میں یقطان بن سلوم کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"آپ فی الفور اپنے خیمے میں جائیں آپ کی بیوی کے کچھ مہمان جو اس کی ماں کے میکے سے آئے ہیں ہمارے قبیلے میں داخل ہوئے ہیں ہمارے بہن ایمن نے ان سے ملنے سے انکار کر دیا ہے اس کا کہنا ہے کہ جب تک میرے شوہر نہ آئیں میں کسی سے نہ ملوں گی اس بناء پر سردار نے انہیں اس خیمے میں ٹھہرایا ہے جس میں مہمان قیام کرتے ہیں۔"

اس لڑکے سے یہ الفاظ سن کر یقطان بن سلوم پلٹا بڑی تیزی سے اس لڑکے کے ساتھ کوہستانی سلسلے سے نیچے اترا تقریباً بھاگتا ہوا اپنی خیمہ گاہ میں آیا جب وہ اپنے خیمے میں داخل ہوا تو ایمن خیمے میں پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر ٹہل رہی تھی یقطان بن سلوم جب خیمے میں داخل ہوا تب اس نے سکھ کا ایک لمبا سانس لیا پھر کہنے لگی۔

"آپ اتنے دیر کہاں رہ گئے تھے۔"

یقطان بن سلوم مسکرا دیا کہنے لگا۔

"میں ذرا ریوڑ کے جانوروں کو دیکھنے لگ گیا تھا پہلے یہ بتاؤ کہ مہمان کون آتے ہیں اور وہ کیا چاہتے ہیں۔"

ایمن نے کچھ سوچا پھر کہنے لگی۔

"آپ جانتے ہیں کہ ایک موقع پر میری ماں نے آپ سے کہا تھا کہ اس کا تعلق نبطی قبائل سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے میری ماں کے ماں باپ اس کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے تھے نانا نے میری ماں کو پالا تھا نانا کی اولاد صرف میری ماں کی ماں تھی۔ جبکہ میری نانی کا کوئی بھائی میری ماں کا بھی کوئی بھائی نہیں تھا حالات کی ستم ظریفی کہ میری ماں سامرہ والوں کے ہاں پھنس کر رہ گئی ماں نے پہلے بھی آپ کو بتایا تھا کہ ماں کا تعلق پیڑہ شہر سے تھا اخیاب ایک بار پیڑہ شہر کے کھنڈرات دیکھنے گیا وہاں بازار سے گزرتے ہوئے اس کی نگاہ میری ماں پر پڑی اس کی خوب صورتی اور اس کی کشش سے متاثر ہوا اور شادی کر کے اپنے ساتھ لے گیا۔

اس شادی کے بعد میری ماں واپس کبھی پیڑہ نہیں گئی بس کبھی کبھی ذکر کر دیا کرتی تھی کہ اس کا تعلق پیڑہ سے ہے جو نبطی قوم کا مرکزی شہر ہے میں خود کبھی نبطیوں کے ہاں نہیں گئی نہ ہی میں جانتی ہوں کہ نبطی کون ہیں کہاں آباد ہیں ان کے رہنے سہنے کے طریقے کیا ہیں۔"

ایمن جب خاموش ہوئی تب غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے یقطان بن سلوم کہنے لگا۔

"تمہارا خیال ہے کہ جو اشخاص آتے ہیں جو اپنے آپ کو تمہارا ماموں ظاہر کر رہے ہیں تم ان کے متعلق مشکوک ہو۔"

ایمن نے کچھ سوچا پھر اثبات میں گردن ہلاتی ہوئی کہنے لگی۔

"آپ کا کہنا درست ہے اگر یہ آج میرے ماموں بن کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں تو جس وقت میری ماں کی شادی ہوئی تھی وہ پیڑہ سے سامرہ منتقل ہوئی تھی تو اس سارے عرصے کے دوران وہ کبھی میری ماں سے ملنے کیوں نہ آئے اور جب ہم سامرہ سے بھاگ کر تینوں ادھر ادھر دھکے کھاتے رہے بھاگتے رہے تب بھی انہیں ہماری خیریت کی فکر مندی کیوں نہ ہوئی اب یہ دونوں کہاں سے اٹھ کر آ گئے ہیں میرا اپنا اندازہ ہے کہ یہ سامرہ والوں کے بھیجے ہوئے ہیں انہیں یہ تو خبر ہو چکی ہے کہ میں میری ماں اور بھائی نے آپ کے قبیلے میں پناہ لے رکھی ہے ماں اور بھائی کا تو خاتمہ ہو گیا اور انہیں یقین ہے کہ دونوں مارے جا چکے ہیں لیکن میرے متعلق وہ مشکوک تھے انہوں نے میری لاش تلاش کرنے کی کوشش کی ہو گی اور جب لاش نہیں ملی ہو گی تب انہیں یقین ہو گیا ہو گا کہ میں زندہ ہوں اور بھاگ گئی ہوں لہذا انہوں نے کھوج لگانا شروع کیا اور جب کسی مخبر نے انہیں یہ اطلاع دی ہو گی کہ میں نے یہاں قیام کر رکھا ہے تو وہ مجھ سے رشتہ ظاہر کر کے یا تو مجھے قتل کریں گے یا کسی طرح اٹھا کر اپنے ساتھ لے جائیں گے۔" یہ الفاظ ادا کرتے کرتے ایمن اداس ہو گئی تھی اس موقع پر بڑے پیارے انداز میں یقطان بن سلوم نے اس کا گال تھپتھپایا پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے ایمن کو تسلی اور تشفی دینے کے انداز میں کہنے لگا۔

"ایمن تم اکیلی تو نہیں ہو تم اب یقطان بن سلوم کی بیوی ہو تمہاری طرف وہ آئے گا۔ جو پہلے یقطان بن سلوم اور اس قبیلے سے نبٹ گا اگر تم ان سے نہیں ملنا چاہتی تو نہ سہی پھر میں جاتا ہوں اور انہیں کریدنے کی کوشش کرتا ہوں کہ وہ کون ہیں اگر پیار اور نرمی سے نہ مانے تو پھر دوسرا حربہ بھی استعمال کروں گا اور حقیقت ان سے اگلوا کر چھوڑوں گا۔"

اس موقع پر ایمن فوراً حرکت میں آئی یقطان بن سلوم کے دونوں ہاتھ اس نے اپنے ہاتھوں میں لیے پھر کہنے لگی۔

"میں آپ کو اکیلا نہیں جانے دوں گی آپ اپنے ساتھ کسی کو لے کر جائیں کم از کم تین چار مسلح ساتھی آپ کے ساتھ ہونے چاہیے انہوں نے انتقام لینے کے لیے اچانک آپ پر حملہ کر دیا تو پھر۔"

یقطان بن سلوم مسکرا دیا پھر کہنے لگا۔

"میں بچہ تو نہیں ہوں کہ وہ مجھ پر حملہ آور ہو کر مجھے نقصان پہنچائیں اگر وہ ایسا کرنے کی کوشش کریں گے تو اپنی سروں اور گردنوں سے محروم ہو جائیں گے بہر حال تم مطمئن رہو میں اپنے ساتھ

اپنے لشکر کے دو تین سالاروں کو لے کر جاؤں گا اب تم اپنے خیمے میں آرام کرو۔" یہاں تک کہتے کہتے یقطان بن سلوم کو رک جانا پڑا اس لیے کہ ایمن کو کوئی خیال گزرا فوراً یقطان بن سلوم کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

"آپ جب ان کے پاس جائیں تو آپ ان سے یہ بھی پوچھیں کہ کیا وہ ایمن کو شکل سے جانتے ہیں اگر قبیلے کی کچھ لڑکیوں کو ان کے پاس لایا جائے تو کیا ان میں سے وہ ایمن کو پہچان جائیں گے۔

جب آپ یہ سوال کریں گے تو آپ ان کے چہرے کے تاثرات دیکھیے گا اور ساتھ یہ بھی سنیے گا کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں مجھے پکا یقین ہے کہ ان کا تعلق پیڑہ سے نہیں ہے بلکہ یہ لوگ بنے ہوئے ہیں اور کسی کے بھیجے ہوتے ہیں تاکہ مجھے گرفتار کر کے لے جائیں۔"

یقطان بن سلوم نے ایمن کو پھر تسلی دی اسے آرام کرنے کے لیے کہا اور خود وہ خیمے سے باہر نکل گیا تھا۔

اپنے دو سالاروں کے ساتھ یقطان بن سلوم اس خیمے میں داخل ہوا جو مہمانوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا وہاں دو اشخاص بیٹھے تھے دونوں جوان اور توانا تھے یقطان بن سلوم کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ آمد پر وہ دونوں اپنی جگہ پر اٹھے پرجوش انداز میں مصافحہ کیا پھر یقطان بن سلوم کے کہنے پر وہ بیٹھ گئے کچھ دیر خاموشی رہی پھر یقطان بن سلوم نے ان دونوں کو مخاطب کیا۔

"تم دونوں کہاں سے آئے ہو۔" ان میں سے ایک بولا اور کہنے لگا۔

"ہم پیڑہ سے آئے ہیں اور ہم نے کہاں سے آنا ہے ہم نبطی ہیں اور وہیں سے آ سکتے ہیں۔"

لمحہ بھر کے لیے یقطان بن سلوم نے غور سے ان کی طرف دیکھا پھر اس نے سوال کیا اگر ایمن کو تمہارے سامنے لایا جائے تو کیا تم پہچان جاؤ گے میں اگر قبیلے کی کئی لڑکیوں کو تمہارے سامنے پیش کروں تو کیا تم ان میں سے بتا سکو گے کہ ایمن کون ہے۔

یقطان بن سلوم کے اس سوال پر وہ چونکے تھے کہنے لگے۔

"نہیں ہم اسے نہیں پہچان سکتے۔"

"اور تم دونوں یہ کہتے ہو کہ تم اس کے ماموں ہو۔" جواب میں جب ایک نے اثبات میں گردن ہلائی تب یقطان بن سلوم پھر بول اٹھا۔

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس کی ماں کے کتنے بھائی تھے جنہیں ایمن کا ماموں ہونے کا حق حاصل ہے۔"

"اس کی ماں کے دو ہی بھائی تھے دونوں آپ کے سامنے ہیں۔" ایک نے یقطان بن سلوم کی طرف دیکھتے ہوئے تیزی سے جواب دیا تھا۔

یقطان بن سلوم کا رنگ کچھ تبدیل ہو گیا چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار نمودار ہوئے تھے جس کے اندازہ ان دونوں نے بھی لگا لیا تھا یہاں تک کہ اس بار یقطان بن سلوم کی کسی قدر غصیلی آواز سنائی دی۔

"لیکن ایمن کی ماں کا تو کوئی بھائی تھا ہی نہیں۔" اس کے ساتھ ہی یقطان بن سلوم نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی تلوار نکال لی تھی ان دونوں کے سامنے اس نے اپنی تلوار کو ان کے سامنے لہرایا اس کے دستے پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کر کے ان دونوں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"میری یہ تلوار کاٹنے میں بڑی تیز ہے ذرا غور سے اس کی طرف دیکھو صیقل شدہ بھی ہے غصے میں لوہا بھی کاٹ جاتی ہے قبل اس کے کہ یہ بلند ہو کر تمہاری گردنوں کا رخ کرے مجھے حقیقت سے آگاہ کر دو تم کون ہو کس نے تمہیں ہمارے قبیلے کی طرف بھجوایا ہے ایمن سے یہ رشتہ تم نے کیوں ظاہر کیا ہے اور اس طرف آنے کا مقصد بھی بیان کر دو دیکھو ہمارے مخبر بھی سامرہ یہودہ ادوم اور صیدہ تک پھیلے ہوئے ہیں اگر تم حقیقت بیان نہیں کرو گے تو پھر ہمارے مخبر تمہارے متعلق حقیقت ہمیں کہہ دیں گے اس وقت تمہارے لیے معافی کا کوئی لمحہ نہیں رہے گا اور ہم تمہیں ایسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عبرتناک موت ماریں گے جو دوسروں کے لیے درس آمیز ثابت ہوگی۔"

اس کے ساتھ ہی ایک جھٹکے کے ساتھ یقطان بن سلوم نے زمین گڑی ہوئی اپنی تلوار نکالی بلند کی اور پھر گرجتی ہوئی آواز میں بولا۔

"میرے پاس وقت بہت کم ہے اور ایسے کام کرتے وقت میں بڑی عجلت سے کام لیتا ہوں لہذا زیادہ دیر تک اپنا منہ بند نہ رکھنا ورنہ ہمیشہ کے لیے بند کردیا جائے گا اب بولو نہیں بولو گے تو پھر میری تلوار تو فضا میں بلند ہو ہی چکی ہے اس انداز میں گرے گی کہ دونوں کی گردنوں کو ایک ساتھ زمین پر گراتی چلی جائے گی۔"

یقطان بن سلوم کے ان الفاظ پر دونوں بوکھلا سے گئے تھے عجیب سے انداز میں دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ایک بولا اور کہنے لگا۔

"ہمارا تعلق نبطیوں سے نہیں ہے ہمیں سامرہ کے حکمران نے بھیجا تھا کہ کسی نہ کسی طرح ایمن کو پکڑ کر سامرہ میں لایا جائے دراصل سامرہ کے حکمران طبقے کو خبر ہو چکی تھی کہ ایمن کی ماں اور بھائی مارے گئے ہیں جبکہ ایمن بچ نکلی ہے ساتھ ہی ہمارے کچھ مخبروں نے یہ بھی اطلاع کردی تھی کہ ایمن نے تمہارے قبیلے میں قیام کر رکھا ہے اس بناء پر ہمیں یہاں بھیجا گیا تاکہ ہم کسی نہ کسی طرح ایمن کو یہاں سے نکال کر سامرہ کی طرف لیجانے میں کامیاب ہوجائیں۔"

اس پر یقطان بن سلوم اپنی جگہ پر اٹھ کھڑا ہوا اپنے دونوں ساتھی سالاروں کو مخاطب کرکے کہنے لگا۔

"ان دونوں کو پکڑ لو اور سردار کے مکان تک لے چلو۔"

اس پر ان دونوں سالاروں نے ان دونوں کو ذوانس نے مکان کے سامنے لا کھڑا کیا یہاں تک کہ یقطان بن سلوم نے ذوانس اور اس کے بیٹے جرار کو باہر بلایا دونوں باپ بیٹا جب باہر تب یقطان بن سلوم نے ان دونوں سے ایمن کے ماموں ہونے کا دعوی کرنے والوں کے متعلق تفصیل بتادی تھی یہ تفصیل جان کر ذوانس اور جرار کے غصے کی کوئی انتہا نہ تھی یہاں تک کہ گرجتی ہوئی آواز میں جرار بول اٹھا۔

"اگر انہوں نے ہمیں دھوکہ اور فریب دینے کی کوشش کی ہے یہ دونوں اب تک زندہ کیوں ہیں آئندہ کے لیے جو کوئی بھی ہم سے ملنا چاہے اسے مہمان داری کے خیموں میں بھی نہ ٹھہرایا جائے پہلے اس کے متعلق پوری یقین دہانی کرالی جائے پھر قبیلے میں لایا جائے بلکہ یہ جو مہمانوں کو ہم خیموں میں ٹھہراتے ہیں یہ سلسلہ بھی ختم ہوجانا چاہیے ایک مکان اس کے لیے مختص ہونا چاہیے جہاں ان مہمانوں کو ٹھہرایا جائے اور رات کے وقت باہر سے قفل لگا دیا جائے تاکہ آنے والا ہمارے لیے کسی نقصان کا باعث نہ بنیں۔"

جرار جب خاموش ہوا تب یقطان بن سلوم کی طرف دیکھتے ہوئے ذوانس کہنے لگا۔

"بیٹے تم ان دونوں کو پکڑ کر میرے پاس کیوں لے کر آگئے ہو اب تک تو تمہیں چاہیے تھا کہ دونوں کی گردنیں کاٹ دیتے مجھے واقعے کی اطلاع کر دیتے بس اتنا ہی کافی تھا بیٹے تم قبیلے کے لشکر کے سپہ سالار ہو اور ایسے فیصلے کرنے کے تم ہی مجاز ہو۔"

اس کے ساتھ ہی اپنے دونوں سالاروں کو یقطان بن سلوم نے آنکھ کا اشارہ کیا وہ ان دونوں کو پکڑ کر ایک طرف لے گئے اور ان کی گردنیں کاٹ کر رکھ دی تھیں۔

اس سارے حادثے کے بعد یقطان بن سلوم جب اپنے خیمے میں داخل ہوا تو ایمن نے دیکھا وہ بڑا سنجیدہ اور الجھا الجھا سا تھا۔

اس کی یہ حالت دیکھتے ہوئے ایمن اداس ہو گئی آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے پھر اپنے ساتھ نشست پر بٹھایا اور غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"کیا معاملہ ہے آپ اس طرح سنجیدہ اور سوچ بچار میں کیوں ڈوبے ہوئے ہیں۔" جواب میں جو واقعہ پیش آیا تھا اس کی تفصیل یقطان بن سلوم نے ایمن سے کہہ دی تھی۔

یہ تفصیل جان کر ایمن بیچاری خوف زدہ ہوگئی تھی کچھ دیر کے لیے اپنا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا اس کی یہ حالت یقیناً یقطان بن سلوم کے لیے ناقابل برداشت تھی لہذا اس کے دونوں ہاتھ ہٹائے اور کہنے لگا۔

"ان دونوں کا خاتمہ کردیا گیا ہے اور آئیندہ کوئی بھی مہمان قبیلے میں داخل ہی نہیں ہوگا باہر ہی باہر اس سے تفتیش کی جائے گی ایمن میں تمہارے ساتھ ہوں تمہیں پریشان اور فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے۔"

ایمن کو سنبھالا دینے کے لیے آخر یقطان بن سلوم نے موضوع بدلا اور آخر ایمن کو مخاطب کرکے کہنے لگا۔

"اچھا وقت گزارنے کے لیے تم مجھے نبطیوں کے متعلق کوئی تفصیل بتاؤ اس لیے کہ تمہاری ماں کا تعلق نبطیوں سے تھا اس طرح دونوں یہاں بیوی کا وقت بھی اچھا گزر جائے گا۔"

ایمن نے اپنے آپ کو کچھ سنبھالا پھر غور سے یقطان بن سلوم کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"میں کبھی نبطیوں میں گئی ہی نہیں مجھے ان کے حالات اور واقعات کی کیا خبر ہوگی۔" یقطان بن سلوم پھر بولا اور کہنے لگا۔

"اور میں جو کچھ جانتا ہوں وہ اگر میں نبطیوں سے متعلق تم سے کہوں تو سنو گی۔"

ایمن مسکرادی بڑے پیارے انداز میں یقطان بن سلوم کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"آپ کچھ کہیں اور ایمن نہ سنے یہ ناممکن ہے آپ کہیں میں غور سے سنوں گی بلکہ اس سے میرے علم میں بھی اضافہ ہوگا۔" اس پر یقطان بن سلوم نے گلا صاف کیا پھر ایمن کو مخاطب کرتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا۔

"سنو ایمن جس طرح ہم عرب ہیں نبطی بھی عرب ہیں حضرت اسماعیل کے ایک بیٹے کا نام نابط تھا اور اس کی اولاد نبطی کہلائی قدیم روایتوں کے مطابق خانہ کعبہ کی تولیت حضرت اسماعیل کے بعد سب سے بڑے بیٹے نابط کے ہی حصے میں آئی لہذا اس نے حجاز ہی میں قیام کیا لیکن نابطہ کی کچھ اولاد عرب سے باہر بھی آباد ہوئی یہ لوگ جنہیں فرزندان نیابوط بھی کہا جاتا ہے عراق میں موجود تھے اس لیے کہ ان میں سے کچھ بدویانہ زندگی بسر کرتے رہے تھے۔

ان نبطیوں کی تفصیل زیادہ تر یونانیوں نے ہی بیان کی ہے یہ نبطی جن کو انیاط بھی کہتے ہیں ایک مدت تک دیگر عرب قبائیل کی طرح بحر احمر سے دریائے فرات تک مستقل وادیوں میں بدویانہ زندگی کے ساتھ آوارہ پھرتے رہے اس بدویت کا زمانہ دو ہزار سال قبل مسیح سے موجودہ دور تک ہے توریت نے ان نبطیوں نے فرزندان اسماعیل کے ضمن میں تحریر کیا ہے ان نبطیوں کی حکومت کی حدود و اولاؔدہ قطع ملک تھا جسے یونانی اور دیگر اقوام عرب سنگستان یعنی پیٹرا کہتے ہیں عبرانی اسے ادوم اور سعیر یعنی خلیج عقبہ سے بحر میت تک کے علاقے کو قرار دیتے ہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ نبطی مغرب میں بحر احمر اور مشرق میں خلیج فارس تک حکمرانی کرتے تھے اور اس کی درمیان کی تمام ممالک یعنی عرب سنگستان و غرب ریگستان و بعض قطعہ عرب آبادان پر قابض تھے لیکن اس طویل و عریض ملک میں نبطیوں کی اصل آبادی خلیج عقبہ اور ایلہ کے اطراف میں تھی۔

ایمن دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نبطیوں کا ملک جن حدود پر مشتمل تھا وہ درحقیقت تین قدیم ملکوں کا مجموعہ تھا ایک ملک ثمود یعنی وادی وادی القرہ جس کا دار لحکومت الحجر تھا ملک مدین جس کا پایہ تخت خود مدین شہر تھا اور ملک ادوم جس کی حکومت کا مرکزی شہر رقیم یعنی پیڑا تھا۔

نبطیوں کا پایہ تخت پہلے شہر رقیم یعنی پیڑا تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جہاں ان کے آثار اب تک باقی ہیں لیکن پہلی صدی قبل مسیح میں رومنوں نے مصر اور شام پر قبضہ کیا تو رفتہ رفتہ وہ پیٹرا یعنی رقیم پر بھی قابض ہو گئے اس کے بعد ان نبطیوں نے اپنا مرکزی شہر حجر کو بنالیا۔

ہر شائستگی کی ابتداء بدویت سے ہوتی ہے نبطیوں کو ابتدائی زندگی عام عرب قبائل کی سی سادہ اور غیر مصنوعی زندگی تھی ان کی دولت کا تنہا خزانہ مویشی تھے لیکن جب مغربی قوموں نے انہیں اپنے تمدن اور شائستگی کے بل پر شکست دینا چاہی تو ان کو بھی مجبوراً متمدن بننا پڑا اسی بناء پر مورخین ان سے متعلق لکھتے ہیں۔

نبطی کھلی ہوا میں زندگی بسر کرتے تھے اور ناقابل سکونت ہوا میں رہتے تھے ان کے ملک میں نہ کوئی دریا اور چشمہ ہے جس سے حملہ آور دشمن فائدہ اٹھا سکے ان کا قومی آئین یہ ہے کہ وہ نہ غلہ کی زراعت کریں نہ درخت لگائیں نہ شراب پئیں نہ گھر بنائیں جو اس کے خلاف کرتا ہے۔ اس کو سزائے موت دے دی جاتی ہے۔

بعض لوگ اونٹ کے گوشت پر گزر کرتے ہیں بعض بکری اور بھیڑ کے گوشت پر صحرا میں بہت سے قبائل رہتے ہیں لیکن دولت مند نبطی سب سے زیادہ اور اپنے ہمسایوں میں ان کو امتیاز حاصل ہے گو کہ ان کی تعداد دس ہزار آدمی سے زیادہ نہیں ہے ان کا ملک پانی سے خالی ہے اپنے لیے پہاڑوں میں بڑے بڑے حوض کھود کر بناتے ہیں جن کا منہ باہر سے تنگ اور اندر سے چوڑا رہتا ہے اور ان کی لمبائی دو سو پچاس فیٹ تقریباً ہوتی ہے ان حوضوں میں بارش کا پانی جمع کر کے چھپا دیتے ہیں اور ان پر کوئی نشانی بنا دیتے ہیں جب سفر کرنا چاہتے ہیں تو اپنے جانوروں کو تین روز کا فی پانی پلاتے ہیں۔ نبطی گوشت دودھ اور بعض سبزی کھاتے ہیں جنگلی شہد بھی ان کو ملتا ہے جس کو پانی میں گھول کر پیتے ہیں ان میں عرب غیر نبطی قبائل بھی شامل ہیں جن میں سے بعض شامیوں کے ساتھ گھروں میں رہنے کے علاوہ اور تمام عادات میں مماثل ہیں۔

یہ لوگ ساحلی مقامات کے بڑے حصے پر قابض ہیں بلکہ اندرون ملک میں بھی دور تک پھیلے ہوئے ہیں کیونکہ یہ زمین آباد اور نہایت شاداب ہے زمانہ سابق میں اپنے قوانین انصاف کے مطابق اپنے گلوں اور جانوروں پر مطمئن رہ کر زندگی بسر کرتے تھے لیکن جب مصر کے یونانی بادشاہوں نے خلیج کو تجارت اور جہاز رانی کے قابل بنایا تو ان قبیلوں نے شکستہ جہازوں کے ملاحوں کو جمع کیا چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر بحری ڈاکہ زنی کرنے لگے تھے۔

یونانی مورخ اسٹرابوان سے متعلق مزید لکھتا ہے شہر پیٹرا یعنی رقیم جو عمدہ قوانین رکھتا ہے اس میں شاہی حد قائدان میں سے ہمیشہ ایک بادشاہ حکومت کرتا ہے وزیر ہمیشہ اس بادشاہ کے ساتھیوں سے ایک ہوتا ہے اس لیے اس کو بھائی کہہ کر پکارتے ہیں نبطی کفایت شعارانہ ذخیرہ ملکیت کے شائق تھیں جماعت ان پر جرمانہ کرتی ہے جو اپنی دولت ضائع کرتے ہیں جو اپنی دولت بڑھاتے ہیں اس کو انعام دیتی ہے نبطیوں کے پاس غلام کم ہیں اکثر اس کی خدمت ان کے متعلقین کرتے ہیں یا ایک دوسرے کی خدمت کرتے ہیں ہر شخص اپنا نوکر آپ ہوتا ہے یہ طریقہ بادشاہوں تک میں جاری ہے جو جمہور کی رضا مندی کے اس قدر آرزو مند ہیں کہ اپنی رعایا کی خدمت کرتے ہیں بادشاہ کو انتظام ملکی کے متعلق بیانات لوگوں کو دیتے ہیں اور وہ اکثر اپنے بادشاہ کے ذاتی عادات اور حالات میں دریافت کرتے ہیں۔

ان نبطیوں کے مکانات عالیشانی اور سنگین ہوا کرتے تھے آبادیوں میں شہر پناہیں نہیں ہوا کرتی تھیں ملک کا بڑا حصہ سرسبز تھا پر ان کے علاقوں میں زیتون نہیں ہوتا تھا تاریخ کے اوراق میں نبطی سب سے پہلے سات سو قبل مسیح میں سیاسی میدان میں نظر آتے ہیں۔ اسیریا اور بنی قیدا جو برادران انباط تھے ان کے مابین اس عہد میں جنگ

بر پا ہوئی تھی بنی قیدار کا تیج شکست کھا کر انباط کی چھوٹی سی ریاست میں پناہ لیتا ہے پر بنی قیدار اور انباط کی متحدہ عسکری قوت اسیریا کے مقابلے میں آتی ہے لیکن سوء قسمت سے انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

بابل کے بعد ایران اور یونان کی قوت دنیا کی تاریخ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ انباط جہاں آباد تھا یہ وہ مقامات تھے جو اہل فارس اور یونان کی دائمی جنگ کے طبعی راستے تھے اس بناء پر ہر دو فریق نبطی عربوں کی دوستی اور ہمدردی کے طالب تھے جن کی اعانت کے بغیر ان خشک اور بے آب گیاہ ریگستانوں کو عبور کرنا ناممکن تھا۔" کچھ تفصیل بتانے کے بعد یقطان بن سلوم جب خاموش ہوا تب ایمن نے بڑی دلچسپی میں یقطان بن سلوم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھ لیا۔

"آپ نے حضرت اسماعیل کے صرف ایک بیٹے کا ذکر کیا ہے ہم کیونکہ خود حضرت اسماعیل کی نسل سے ہیں لہٰذا میں یہ جاننا چاہوں گی کہ ان کے اور کتنے بیٹے تھے۔"

جواب میں مسکراتے ہوئے یقطان بن سلوم مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

"حضرت اسماعیل کے بارہ بیٹے تھے بڑے کا نام نباد ا۔

تیماء، ہشام، اوبائیل، دوما، مشماع، مشا، مداب، حنا، یطور، نفیس اور پھر قیدماہ یہ بارہ بیٹے حسب بشارت ربانی اپنے خاندان کے بارہ رئیس تھے ان میں سب سے بڑے نباط اور سب سے چھوٹے قیدار تھے اور یہی دونوں زیادہ تر نمایاں رہے یہ تمام بھائی باپ کے زمانے میں اور ایک عرصہ بعد تک حجاز ہی میں آباد رہے اور چچا زاد بھائی کے بیٹوں یعنی فرزندان مدین سے مل کر یمن، حجاز سے شام اور مصر تک تجارتی قافلوں کے ساتھ سفر کیا کرتے تھے اور دیگر عرب تاجروں کی طرح خوشبودار چیزوں کی تجارت کرتے تھے۔"

یہاں تک کہنے کے بعد یقطان بن سلوم رکا پھر دوبارہ وہ ایمن کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"خوشبو کی چیزیں یمن سے حجاز کی راہ سے مصر اور شام کو جاتی تھیں شام اور یمن کے بیچ میں درمیانی منزل شہر مکہ تھا اس لیے اسماعیل بہت جلد تجارت میں فروغ حاصل کر سکے ہوں گے بنی اسرائیل بنو اسماعیل کو کبھی اسماعیلی اور کبھی ماں کی نسبت سے ہاجری کہتے ہیں اور توریت میں انہیں ناموں سے ان کا ذکر ہے بنو اسماعیل کا توریت میں سب سے پہلے حضرت ابراہیم کے پوتے حضرت یعقوب کے زمانے میں تجارت کی حیثیت سے نام آتا ہے حضرت یعقوب کے بیٹے حضرت یوسف کو بھائیوں نے ایک کنویں میں ڈال دیا تھا اتفاقاً ایک کاروان گزرا جس نے حضرت یوسف کو کنویں سے نکالا اور ایک امیر کے ہاتھ بیچ ڈالا یہ کاروان اسماعیلی اور مدیانی تھا تاریخ میں یہ تجارت کا سب سے بڑا قافلہ نظر آتا ہے۔"

یقطان بن سلوم جب خاموش ہوا تب کچھ دیر تک ایمن توصیفی انداز میں اس کی طرف دیکھتی رہی اس پر مزاح کرنے کے انداز میں یقطان بن سلوم اسے مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"تم اس طرح میری طرف اجنبیت میں دیکھ رہی ہو جیسے میری بیوی نہیں ہو بلکہ مجھ سے راہ رسم پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔"

اس پر ایمن کھلکھلا کر ہنس دی یہاں تک کہ یقطان بن سلوم کہنے لگا۔

"کافی دیر ہو گئی ہے آج کھانا وغیرہ نہیں پکے گا۔"

اس پر ایمن اٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی۔

"میں نے صرف روٹیاں تیار کرنی ہیں باقی ہر چیز تیار ہے۔" اس کے ساتھ ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر ایمن چولہے کی طرف چلی گئی تھی۔

☆☆

سات دن تک اپنے لشکریوں کو آرام دینے کے بعد یقطان بن سلوم کا پورا قبیلہ حرکت میں آیا اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صیدا کی طرف کوچ کیا گیا تھا یقطان بن سلوم اور بن ہود کی پہلے سے طے شدہ منصوبہ بندی کے مطابق اس بار بن ہود کا بیٹا حزائیل ایک لشکر کے ساتھ دمشق سے روانہ ہوا تھا وہ یقطان بن سلوم کے قبیلے سے ذرا ہٹ کر آگے بڑھنے لگا تھا۔

جب وقت سفر جاری تھا اس وقت ایمن یقطان بن سلوم کے ساتھ تھی ایک موقع پر اس نے سوچتے ہوئے بڑی راز داری میں یقطان بن سلوم کو مخاطب کیا۔

"کیا پورے قبیلے کے ساتھ سفر کر کے ہم غلطی نہیں کر رہے اگر اچانک ودان کا لشکر اور اس کا سپہ سالار غنتی ایل ہم پر حملہ آور ہوا تو ہمیں وہ ناقابل تلافی نقصان پہنچائے گا۔"

ایمن کی طرف دیکھتے ہوئے یقطان بن سلوم مسکرایا اور کہنے لگا۔

"ایمن تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے ہم ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت صیدا کا رخ کر رہے ہیں اور تم دیکھتی جاؤ ہم ان کا حشر کیا کرتے ہیں چند میل آگے تک تم میرے ساتھ نہیں رہو گی بلکہ پیچھے دوسری عورتوں میں چلی جاؤ گی جن کے پاس بار برداری کے سامان ہیں اور ہمارے ریوڑ کے جانور بھی پیچھے رہیں گے آگے صرف میں اور میرے لشکری رہیں گے۔"

یقطان بن سلوم کے ان الفاظ پر ایمن پر خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"صیدا والوں کا بہت بڑا لشکر ہے اور ہمارے لشکر کی حیثیت ان کے لشکر کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہو گی۔"

یقطان بن سلوم نے پھر مسکراتے ہوئے ایمن کی طرف دیکھا پھر کہنے لگی۔

"میں نے کہا نا تم مطمئن رہو اس بار میں غنتی ایل کو وہ مار ماروں گا کہ آنے والی نسلیں یاد رکھیں گی یہ بات کہیں اور نہ نکالنا اس لیے کہ ہمارا لشکر اکیلا نہیں ہے ہمارے آس پاس بن ہود کا بھی لشکر ہے اور وہ ایک خاص جگہ پہنچ کر اس وقت دشمن پر ضرب لگائے گا جب دشمن ہماری راہ روکے گا۔"

یقطان بن سلوم کے ان الفاظ سے ایمن مطمئن ہو گئی تھی چند میل اور آگے جا کر قبیلے کی ہیت کو بدل دیا گیا آگے صرف قبیلے کے لشکر کو رکھا گیا کچھ مسلح دستے بالکل عقب میں بھی تھے بیچ میں عورتوں کے علاوہ بچوں بوڑھوں جانوروں اور بار برداری کے جانوروں کو رکھا گیا تھا اس طرح صیدا کی طرف سفر جاری رہا۔

جب وہ صیدا شہر کی فصیل کے قریب پہنچے تب انہوں نے دیکھا کہ فصیل سے باہر کھلے میدانوں میں صیدا کا سپہ سالار غنتی ایل اپنے لشکر کو بالکل استوار کیے انہی کا منتظر تھا غنتی ایل کے لشکر کے سامنے جا کر یقطان بن سلوم نے اپنے قبیلے کا پڑاؤ کیا قبیلے کے ساری افراد عورتوں مردوں بوڑھوں بچوں جانوروں بار برداری کے جانوروں اور سامان کو پیچھے رکھا گیا جبکہ اس سامان کے سامنے لشکر یولھا کی صفیں درست کی جانے لگیں صیدا کے سپہ سالار غنتی ایل نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا نہ ہی اس موقع سے فائدہ اٹھایا جس وقت یقطان بن سلوم اپنے لشکر کی صفیں درست کر رہا تھا وہ اپنے لشکر کے ساتھ بالکل چپ چاپ کھڑا تھا اس کے لشکر میں نہ کوئی ہلچل تھی نہ شور شرابہ تھا ایسا لگتا تھا جیسے غنتی ایل جنگ کی ابتداء کرنے کے لیے پس و پیش کر رہا ہو یا وہ یقطان بن سلوم کے ساتھ جنگ کرنا ہی نہ چاہتا ہو۔

اس طرح جب کچھ دیر گزر گئی اور یقطان بن سلوم نے دیکھا کہ وہ کافی دیر ہو گئی وہ اپنے لشکر کی صفیں درست کر چکا ہے اور غنتی ایل کی طرف کسی ردعمل کا اظہار نہیں تب اس نے خود فضا کی اندھی پکار زہر آلود کر دینے والی کامرانیوں' تند بلا خیز آندھیوں اور ہواؤں کی چیخ پکار کی طرح نعرے بلند کرتے ہوئے اپنے لشکر کو آگے بڑھایا پھر وہ غنتی ایل کے لشکر پر یلغار کی اور کرب کے کھولتے

دشت میں ذہن کو ساری گرہیں کھول دینے والی عذاب رتوں کی نفرتوں' دردناک سموں میں پتھر فولاد کی چٹانوں تک کو ریزہ ریزہ اور کوہستانوں کا جگر تک شق کر دینے والی ہولناک تیزابی آتشیں دھاروں اور وقت کی اڑتی گرد میں لوٹے نگر کی اداسی طاری کرتے اجنبی قہر بھرے جھکڑوں کی طرح حملہ آور ہوا تھا۔

یقطان بن سلوم کے اس حملے کے جواب میں صیدا کا سپہ سالار غنتی ایل بھی خوفناک انداز میں حرکت میں آیا پھر وہ بھی گہری کہر کے غلاف میں ہر لمحے کو بے ثمر کرتی آندھیوں زلزلوں کی یورش اور امیدیوں کی گھٹاؤں کو گہرا کرتے کھولتے آتش فشانی دھانوں اور مرگ و قضا کے عناصر کی طرح حملہ آور ہوا تھا۔

غنتی ایل کا یہ حملہ بھی عجیب و غریب تھا اس کے لشکری یقطان بن سلوم کے لشکریوں کو قتل نہیں کر رہے تھے بلکہ ان کے مقابلے میں صرف اپنا دفاع کر رہے تھے یہ بات یقطان بن سلوم نے بڑی شدت کے ساتھ محسوس کی تھی اس لیے کہ کوئی مواقع پر اس نے دیکھا کہ نمتی ایل کے لشکری اس کے لشکری کا خاتمہ کر سکتے تھے لیکن انہوں نے نہیں کیا بلکہ دفاع کر کے ایک طرف ہو جاتے تھے یہ صورت حال یقیناً یقطان بن سلوم کے لیے پریشان کن تھی کہ اسی دوران ایک طرف سے حزائیل اپنے لشکر کے ساتھ کہنہ عہد تاریک سے نکل کر موت کا وجد آفرین رقص کرتے فطرت کے اجال عظیم کی طرح نمودار ہوا پھر وہ بھی غنتی ایل کے لشکر کے ایک پہلو پر منزلوں کا درد جذبوں کی محرومیاں آوارہ ابتلاء امتحان طاری کرتے آندھیوں کے تند بگولوں سا یہ حصار توریت کے سرخ طوفانوں کی طرح حملہ آور ہو گیا تھا۔

اب دونوں لشکریوں کے اس طرح ٹکرانے سے رزم گاہ کے اندر خاک و خون کے پیغام صحرا کی پراسرار اشاریت نفرت کے طوفان بے اتھاہ جنوں خیزیاں رقص کرنے لگی تھیں۔ ازم گاہ کے فریب تھکن راستوں کی گرد مقدرات کی پت جھڑ اپنا رنگ دکھانے لگی تھیں۔

چونکہ غنتی ایل کے لشکر پر دو طرفہ حملہ ہو گیا تھا سامنے کی طرف سے یقطان بن سلوم ایک طرف سے حزائیل نے حملہ کیا تھا اور حیرت کی بات کہ غنتی ایل اپنے لشکر کے ساتھ حزائیل اور یقطان بن سلوم دونوں کے حملوں کا دفاع کر رہا تھا جارحیت پر نہیں اتر رہا تھا اس کے لشکری حزائیل اور یقطان بن سلوم کے لشکریوں کو موت کے گھاٹ نہیں اتار رہے تھے۔

چونکہ یقطان بن سلوم اور حزائیل حارجیت پر اترے ہوئے تھے لہٰذا وقت کی آنکھ نے دیکھا آہستہ آہستہ غنتی ایل کے لشکر کی حالت فراموشی کے لمحوں منجمد بے چہرگی۔ خستہ روحوں کی آہ و زاری درد کی اندھی مسافتوں کی نایابی جیسی ہونا شروع ہو گئی تھی۔

ایسے میں اچانک کچھ آوازیں گونجی یہ آوازیں غنتی ایل کے لشکر کے وسطی حصے سے آئی تھیں کوئی کہہ رہا تھا میں صیدا کا بادشاہ ودان ہوں جنگ کو روک دو اس کے ساتھ ہی غنتی ایل کے لشکر میں سفید جھنڈے لہرائے جانے لگے تھے۔

صورت حال عجیب و غریب تھی سفید جھنڈے لہرائے جانے کے بعد غنتی ایل اور اس کے لشکریوں نے جنگ بندی کر دی تھی یہ صورت حال دیکھتے ہوئے یقطان بن سلوم اور حزائیل نے بھی اپنے لشکریوں کے ساتھ اپنے ہاتھ روک دیے تھے یقطان بن سلوم اور حزائیل اپنے لشکریوں کو یکجا کر کے اکٹھے ہو گئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ایک منادی کرنے والا جو اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ سفید جھنڈا اٹھائے ہوئے تھا یقطان بن سلوم کے لشکر کے قریب آیا اور یقطان بن سلوم اور حزائیل کا نام لے کر اور انہیں پکارتے ہوئے کہنے لگا۔

"صیدا کا بادشاہ ودان اور صیدا کا سپہ سالار غنتی دونوں آپ کے ایک اہم معاملے پر گفتگو کرنا چاہتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں آپ لوگ شاید شکر کا شکار ہوں کہ اس طرح آپ کو کسی فریب اور سراب میں رکھ کر دھوکہ دیا جائے گا ایسی کوئی بات نہیں ودان اور غتی ایل دونوں آپ کے لشکر میں آ کر آپ سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں ان کے ساتھ نہ کوئی محافظ ہوگا نہ کوئی مسلح جوان کیا آپ لوگ اس کی اجازت دیتے ہیں۔"

اس موقع پر جبکہ یقطان بن سلوم کا قبیلہ لشکر کے پیچھے تھا اس کے آگے لشکر تھا اور لشکر کے آگے یقطان بن سلوم اور حزائیل دونوں اپنے گھوڑوں پر سوار تھے یقطان بن سلوم نے ایک گہری نگاہ حزائیل پر ڈالی آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ ہوا پھر یقطان بن سلوم منادی کرانے والے کو کہنے لگا۔

"ہم ان سے بات کرنے کے لیے تیار ہیں وہ ہمارے لشکر میں آسکتے ہیں ان کی حفاظت کا اہتمام کیا جائے گا۔"

تھوڑی دیر بعد صیدا کے لشکر سے دو سوار نمودار ہوئے دونوں سفید گھوڑوں پر سوار تھے ان میں سے ایک صیدا کا بادشاہ ودان اور دوسرا غتی ایل تھا اپنے گھوڑوں کو دوڑاتے ہوئے وہ یقطان بن سلوم کے پاس آئے دونوں اپنے گھوڑوں سے اترے ان کی طرف دیکھتے ہوئے یقطان بن سلوم اور حزائیل بھی اپنے گھوڑوں سے اتر گئے تھے ودان اور غتی ایل کی طرف بڑھے سب سے پہلے گلے لگانے کے لیے صیدا کے بادشاہ ودان نے اپنے بازو پھیلا دیے اس طرح یقطان بن سلوم اور حزائیل پہلے باری باری ودان سے اور اس کے بعد غتی ایل سے ملے دونوں طرف سے تعارف ہوا پھر ودان زمین پر ہی بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"اگر آپ لوگ اپنی بے عزتی اور توہین محسوس نہ کریں تو یہیں بیٹھ جاتے ہیں ہم عربوں کا یہ خاصا ہے کہ ہم عموماً شہر سے باہر اسی طرح بیٹھ کر گفتگو کرتے ہیں۔"

ودان کے ان الفاظ سے حزائیل اور یقطان بن سلوم دونوں خوش ہو گئے تھے ودان کے قریب ہی بیٹھ گئے ان کے سامنے غتی ایل بیٹھ گیا تھا یہاں تک کہ گفتگو کا آغاز صیدا کے بادشاہ ودان نے کیا یقطان بن سلوم اور حزائیل کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"ان یہودیوں نے ہم عربوں کے ساتھ بڑا دھوکہ اور فریب کیا ہے اس سلسلے میں سب بڑی غلطی میرے باپ سے ہوئی جس نے میری بہن کا رشتہ سامرہ کے بادشاہ اخیاب کو دے دیا اور مزید حماقت یہ ہوئی کہ اخیاب نے میری بھانجی کا رشتہ یروشلم کے بادشاہ سے کر دیا اس طرح ان دونوں مملکت کے ساتھ ہمارا ایک رشتہ اور رابطہ قائم ہو گیا اور ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔

میرے عزیزو! میں عمر میں تم دونوں سے بڑا ہوں ان یہودیوں نے آج تک ہم عربوں کو آپس میں لڑا کر اپنے لیے فوائد حاصل کرنے کی کوشش کی ہے صیدا والے کنعانی عرب ہیں یقطان بن سلوم کا قبیلہ بھی کنعانی ہے یہ بھی عرب ہیں دمشق کا حکمران بن ہرداور اس کا بیٹا حزائیل اور دمشق کے رہنے والے لوگ بھی عرب ہیں اس طرح یہ یہودی آج تک آپس ہی میں ہمیں لڑاتے رہے اس میں زیادہ حماقتیں ہم سے ہوئیں چونکہ میری بہن کی شادی سامرہ کے حکمران سے ہوئی تھی لہٰذا سامرہ پر جب بھی بھی دمشق کے حکمرانوں کی طرف سے کوئی آفت اور مصیبت نازل ہوئی تھی تو پہلے میرا باپ سامرہ والوں کی مدد کے لیے نکلتا تھا اور اس کے بعد اپنے باپ کی طرح مجھ سے بھی یہ حماقتیں سرزد ہوئیں جو نہیں ہونی چاہیے تھیں۔

ان یہودیوں کو دیکھو ان کی صرف دو ہی مملکتیں ہیں ایک اسرائیل اور دوسری یہودہ میں اگر اپنے پورے لشکر کے ساتھ حرکت میں آؤں تو اکیلا ہی ان مملکتوں کو نیست و نابود کر سکتا ہوں لیکن یہ لوگ بڑے چالباز فریب کار ہیں نئے نئے تماشے دیکھاتے ہوئے اپنے لیے سربلندی اور عروج حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور

دوسروں کو پست کرتے چلے جاتے ہیں یہ لوگ دوسروں کے شانوں پر سوار ہو کر اپنے لیے فوائد حاصل کرتے ہیں۔

ذرا غور سے دیکھو ان دونوں یہودی مملکتوں کے مشرق اور جنوب میں عربوں کی دو مملکتیں ہیں ایک موآبی اور دوسری ادوم ادومی عرب اس وقت سے ان علاقوں میں آباد ہیں جس وقت اللہ کے نبی موسیٰ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر ان سرزمینوں تک لائے بھی نہیں تھے تب سے موآبی بھی یہاں آباد ہیں لیکن حیرت کی بات کہ ہم عربوں کے خلاف انہوں نے طرح طرح کی فریب کاریاں کیں کبھی ادومیوں کو اپنے ساتھ ملا کر دمشق کے حکمرانوں یا کنعانی خانہ بدوش قبیلے کے خلاف حرکت میں لائے کبھی موآبیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اس طرح یہ یہودی ہم عربوں کو عربوں ہی سے لڑاتے رہے اور خود ایک طرف بیٹھ کر تماشا دیکھتے رہے لیکن اب یہ تماشا زیادہ دن نہیں چلے گا میں ان دونوں مملکتوں کی ایسی اینٹ سے اینٹ بجاؤں گا کہ یہ جانیں گے کہ اگر انہوں نے آنے والے دور میں عربوں کے اندر مزید نفاق اور بے اتفاقی پھیلانے کی کوشش کی تو پھر انہیں ان کی سرزمینوں ہی سے محروم کر دیا جائے گا۔

میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم عربوں کو آپس میں ٹکرا کر اپنی قوتوں کو زائل اور منتشر نہیں کرنا چاہیے اگر ہم سب عرب حکمران آپس میں اتفاقاً اور تعاون کریں تو ان یہودیوں اور اسرائیلیوں کی ایسی تیسی پھیر کر رکھ دیں یہ چند لمحات بھی ہمارے سامنے نہیں ٹھہر سکتے یہ صرف ہماری نا اتفاقی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوائد حاصل کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کا ایک ہاتھ اپنے دشمن کے گریبان پر ہوتا ہے اور دوسرا اس کے پاؤں پر اگر انہیں ناکامی ہو تو فوراً پاؤں پکڑ لیتے ہیں اور اگر کامیابی کی امید ہو تو گلے کا جھٹکا دے کر کام تمام بھی کر دیتے ہیں۔

ہم عربوں اور اسرائیلیوں میں بڑا فرق ہے یہودیوں اور اسرائیلیوں کی نسل بھی پاک صاف نہیں ہے یہ دوغلی نسل ہے اس لیے کہ اسرائیل جب مصر میں داخل ہوئے تو حضرت یوسف سمیت ان کی کل تعداد اڑسٹھ تھی اور تقریباً پانچ سو سال بعد وہ مصر سے نکلے تو وہ لاکھوں کی تعداد میں تھے۔

بہت بڑا مبالغہ آمیز اندازہ ہوگا تو اس کے معنی یہ ہوئے نہ صرف بنی اسرائیل وہاں دس فیصد تھے کیا ایک خاندان محض تناسل کے ذریعے سے اتنا بڑھ سکتا ہے اس سوال پر غور کرنے سے ایک اہم حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ پانچ سو برس میں ایک خاندان جو اتنا نہیں بڑھ سکتا لیکن بنی اسرائیل پیغمبروں کی اولاد تھے ان کے راہنما حضرت یوسف جن کی بدولت مصر میں ان کے قدم جمے خود پیغمبر تھے ان کے بعد چار پانچ صدی تک ملک کا اقتدار انہی لوگوں کے ہاتھ میں رہا اس دوران یقیناً انہوں نے مصر میں اپنے مذہب کی خوب تبلیغ کی ہوگی اہل مصر میں سے جو لوگ ان کا مذہب قبول کر گئے ان کا مذہب ہی نہیں بلکہ ان کا تمدن اور پورا طریق زندگی غیر مسلح مصریوں سے الگ اور ان یہودیوں سے ہم رنگ ہو گیا ہوگا۔

مصریوں نے ان سب کو ایک جیسا اجنبی ٹھہرایا اور ان سب پر اسرائیل کا لفظ چسپاں کر دیا گیا اور غیر اسرائیلی خود بھی دینی، تمدنی، معاشرتی اور شادی بیاہ کے تعلقات کی وجہ سے مصریوں سی الگ اور بنی اسرائیل سے وابستہ ہو کر رہ گئے یہی وجہ ہے کہ جب مصر میں قوم پرستی کا طوفان اٹھا تو مظالم صرف بنی اسرائیل پر ہی نہیں ہوئے ان لوگوں پر ہوئے جو بغیر اسرائیلی تھے اور اسرائیل کے ساتھ مل گئے اور جب بنی اسرائیل نے ملک چھوڑا تو مصری جو ان کے ساتھ ملے تھے وہ بھی انہیں کے ساتھ ہی نکلے اور ان سب کا شمار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسرائیلیوں میں ہونے لگا۔"

یہاں تک کہنے کے بعد ودان رکا اس کے بعد اپنی بات کو آگے بڑھاتا ہوا کہہ رہا تھا۔

"میرے اس دعوے کی تائید توریت کے متعدد اشارات سے ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر 'خروج' میں جہاں بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کا حال بیان ہوا ہے۔ توریت کا مصنف کہتا ہے۔" ان کے ساتھ ایک ملی جلی گروہ بھی گئی۔ اس طرح گنتی میں وہ پھر کہتا ہے کہ ملی جلی بھیڑ ان لوگوں میں تھی وہ طرح طرح کی حرص کرنے لگے۔ پھر تبدریج ان غیر اسرائیلیوں کے لیے اجنبی اور پردیسی کی اصطلاحیں استعمال ہونے لگیں۔ چنانچہ توریت میں یہ تصریح کچھ اس طرح ملتی ہے۔

تمہارے لیے اور اس پردیسی کے لیے جو تم میں رہتا ہے نسل در نسل سدا ایک ہی آئین رہے گا خداوند کے آگے پردیسی بھی ویسے ہی ہوں جیسے تم اور تمہارے لیے اور پردیسیوں کے لیے جو تمہارے ساتھ رہتے ہیں ایک ہی شرط اور ایک ہی قانون ہو۔

توریت مزید کہتی ہے۔

جو شخص بے باک ہو کر گناہ کرے خواہ وہ دیسی ہو یا پردیسی وہ خداوند کی اہانت کرتا ہے وہ شخص اپنے لوگوں سے کاٹ ڈالا جائے۔

پھر گنتی کے باب 5 1 اور 0 3 میں توریت کہتی ہے۔

خواہ بھائی بھائی کا معاملہ ہو پردیسی کا تم ان کا فیصلہ انصاف کے ساتھ کرنا (استثنام)"

یہاں تک کہنے کے بعد ودان رکا کچھ سوچا پھر کہنے لگا۔

"حزائیل اور یقطان بن سلوم میں صیدا کا بادشاہ کی حیثیت سے آپ دونوں سے استدعا اور گزارش کرتا ہوں کہ ہم عربوں کو ان یہودیوں اسرائیلیوں کے خلاف اتحاد تعاون اور یکجہتی سے کام لینا چاہیے اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو یہ یہودی اپنی مختلف فریب کاریوں چال بازیوں اور سازشوں سے کام لیتے ہوئے ہمیں آپس میں لڑاتے رہیں گے ہماری عسکری طاقت کو کمزور کرتے رہیں گے اور اس طرح ہم پر غلبہ پاتے رہیں گے اگر ایسا ہوا تو پھر ہمیں سدا کے لیے ان کے زیر سایہ زندگی بسر کرنا ہوگی اور اگر ہم آپس میں اتفاق تعاون اور یکجہتی پیدا کر لیں تو ہم ان اسرائیلیوں کو اپنے زیر کر کے اپنا فرماں بردار اور مطیع بنا کر رکھ سکتے ہیں۔"

یہاں تک کہنے کے بعد ودان رکا پھر دوبارہ کہنے لگا۔

"میں نے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا میری بڑی خواہش تھی کہ اس وقت دمشق کا بادشاہ بن ہود بھی یہاں ہوتا اور میں اس سے گفتگو کرنے کا شرف حاصل کرتا بہرحال میں نے جو کچھ کہا ہے اس کے باوجود اگر تم دونوں میری اور میرے سالار گنتی ایل کی گردن کاٹنا چاہتا ہو تو ہم دونوں کی گردنیں حاضر ہیں تم کاٹ سکتے ہو ہم غیر مسلح ہو کر آئے ہیں ہمارے ساتھ کوئی محافظ بھی نہیں ہے۔" اس کے ساتھ ہی ودان نے اپنی گردن خم کر دی تھی ودان کی طرف دیکھتے ہوئے غتی ایل نے بھی اپنی گردن جھکا دی تھی اس موقع پر یقطان بن سلوم باری باری آگے بڑھا ودان اور گمتی ایل کو گلے لگایا جب اس نے سیدھا کیا تو اس نے دیکھا ودان کے علاوہ غتی ایل کی آنکھوں میں بھی نمی اتر آئی تھی اس موقع پر ودان نے یقطان بن سلوم کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ "مجھ سے کچھ غلطیاں اور کوتاہیاں ہوئیں۔ آپ مجھے سزا دے سکتے ہیں۔"

"جو کچھ آپ نے کہا ہے اسے سن کر اگر ہم آپ کے خلاف کوئی کارروائی کریں تو ہم جیسا بدبخت اس زمین پر ہوگا ہی نہیں جو کچھ آپ نے کہا ہے میں اور اس سے پورا اتفاق کرتے ہیں

آج سے آپ ہمارے بزرگ ہیں غتی ایل ہمارا بھائی ہے۔" اس موقع پر غتی ایل نے یقطان بن سلوم کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

"ماضی میں میرے بھائی آپ کے سلسلے میں مجھ سے جو کوتاہیاں اور غلطیاں ہوئیں میں ان کی معافی مانگتا ہوں۔"

یقطان بن سلوم نے آگے بڑھ کر غتی ایل کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے ایک بار پھر غتی ایل کو گلے لگا کر اس کی پیشانی چومی پھر کہنے لگا۔

"آج سے ہم آزاد عرب ہیں آپس میں اتحاد اور تعاون رکھیں گے بلکہ آنے والے دور میں جہاں دمشق اور صیدا کے تعلقات مضبوط ہوں گے بلکہ ہم ادومی سوکر پی عربوں سے بھی سرداب رکھیں گے اور انہیں بھی اپنے حلقہ میں لا کر عربوں کے اندر ایک یکجہتی اور اتفاق پیدا کرنے کی کوشش کریں گے میں کیونکہ خانہ بدوش قبیلے کا سالار ہوں لہٰذا یہ کام میں خود کروں گا ہم لوگ شمال سے جنوب کی طرف سفر کرتے ہیں اس سفر کے دوران میں ادومیوں اور موآسیوں میں بھی جاؤں گا اور انہیں عربوں کے اندر تعاون اور یکجہتی پیدا کرنے کی استدعا کروں گا اور مجھے امید ہے وہ ہمارا ساتھ دیں گے پھر میں دیکھوں گا کہ یہ اسرائیلی اور یہودی کب تک ہمارے خلاف فریب کاریوں کا کھیل کھیلتے ہیں۔"

یقطان بن سلوم کی اس گفتگو سے ودان اور گمتی ایل دونوں خوش ہو گئے تھے پھر ودان اٹھ کھڑا ہوا غتی ایل بھی اٹھ کھڑا ہوا پھر ودان کہنے لگا۔

"اب آپ دونوں مجھے اور غتی ایل کو جانے کی اجازت دیں اپنے تشکر کو لے کر ہم صیدا شہر کی طرف روانہ ہوتے ہیں ہمارے لشکر کے پیچھے جو ہمارا پڑاؤ ہے اس کی اندر سامان کے ڈھیر ہیں وہ سامان میں آپ دونوں بھائیوں کے حوالے کرتا ہوں۔" اس پر یقطان بن سلوم آگے بڑھا اپنی گردن کو نفی میں ہلایا پھر ودان کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"ایسا نہیں ہوگا یکجہتی اس طرح قائم نہیں رہتی جو سامان آپ لے کر آئے ہیں وہ سامان لے کر اپنے شہر صیدا جائیں میں چونکہ خانہ بدوش قبیلے کا فرد ہوں اور میرا قبیلہ جنوب سے شمال اور شمال سے جنوب کی طرف سفر کرتے ہوئے صیدا کے پاس سے گزرتا ہے اور جب کبھی میں یہاں سے گزروں گا آپ اور غتی ایل کو سلام پیش کر کے گزرتا رہوں گا۔"

یقطان بن سلوم کے ان الفاظ پر ودان اور غتی ایل خوش ہو گئے تھے پھر اپنے لشکر اور سامان کو لے کر صیدا شہر کی طرف روانہ ہو گئے تھے یقطان بن سلوم اور حزائیل نے ایک روز وہاں قیام کیا پھر صلاح و مشورہ کرنے کے بعد اگلے روز حزائیل اپنے لشکر کو لے کر دمشق کی طرف چلا گیا تھا جبکہ یقطان بن سلوم سردار ذوالس اور اس کا بیٹا جرار اپنے خانہ بدوش قبیلے کو لے کر وہیں سے مڑے انہوں نے جنوب کا رخ کیا صحرائے سینا میں تانبے کی کانوں سے گزرتے ہوئے مصری حدود میں داخل ہوئے اب وہ اس شاہراہ پر سفر کر رہے تھے جو نیل کے ڈیلٹا سے آگے بڑھتی ہوئی اس مقام تک چلی گئی تھی جہاں دریائے ارزق اور ابیض مل کر دریائے نیل کی صورت اختیار کرتے ہیں اور جہاں ایک اور دریا جس کا نام دریائے عطیرہ ہے دریائے نیل میں آ کر ملتا ہے۔

آئندہ ماہ سے نیا تاریخی سلسلہ

سرکش راجکماری

پیش کیا جائے گا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بے شناخت

احمد صغیر صدیقی

کوئی گھنٹہ بھر تک وہ شمال کی طرف کوسٹل ہائی وے پر چلتے رہے۔ انہوں نے سان جیتو کو بھی پار کر لیا۔ گارتھ سوچ رہا تھا۔ نہ جانے اس کی کشتی کا کیا بنا ہو گا۔ پھر اس نے سوچا یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کیا یہ کوئی سودے بازی ہے۔ کیا کسی کوئی اور قیدی کی جگہ اسے چھوڑا جا رہا ہے۔ مگر یہ کام کسی معمولی ماہی گیر کے مجھے کہاں ہو سکتا تھا۔ اس نے ایک سرد نفی میں ہلایا۔

امریکا کے نامور لکھاری کلارک ہوورڈ کے سنسنی خیز ناولٹ 'دی گلوبل مین' کا ترجمہ

پیٹر گارتھ اپنے کیبن کروزر پر بڑی کینوس کی فولڈنگ چیئر میں نیم دراز تھا۔ وہ اس وقت تازہ تازہ رس بیریاں کھا رہا تھا جو اس نے سانی جنتو ڈاک پر ایک لڑکے سے خریدی تھیں۔ اس وقت سہ پہر ڈھل رہی تھی اور کولٹ کے آسمان پر کچھ بھورے بادل کوسٹاریکا کے علاقے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بارش کا خطرہ تھا۔ گارتھ تقریباً سارا دن ہی پورٹ پر رہا تھا۔ اپنے ان دوسرے مچھیرے ساتھیوں کے ساتھ جو سان جنتو پر ماہی گیری کے ذریعے اپنی روزی کماتے تھے۔ یہ بیریاں ابھی تک دھوپ کی گرمی سے گرم تھیں جس میں خوانچہ فروش لڑکے نے شاید صبح کے وقت حاصل کی ہوں گی۔ ان بیریوں کے درخت یہاں کثرت سے کیلوں کے باغات کے اردگرد آگے دیکھے جا سکتے تھے۔ گارتھ تقریباً ہر روز ہی ان لڑکوں سے کچھ نہ کچھ خریدتا تھا۔ کبھی سنترے، کبھی پیاز، کبھی ٹماٹر وغیرہ لڑکے عموماً یہ سبزیاں قریب کے کھیتوں سے چرا کر لاتے تھے۔ سڑکوں پر اس طرح خرید و فروخت کی ممانعت تھی مگر پروا کوئی نہ کرتا تھا۔ حتیٰ کہ خود پولیس والے بھی ان سے خریدا کرتے تھے۔

یہ اسی وقت کی بات ہے جب گارتھ بیریاں کھا رہا تھا کہ وہ شخص ظاہر ہوا تھا۔ جس نے سر پر گاؤ بوائے ہیٹ پہن رکھی تھی یہ آدمی گارتھ کی کشتی کے پاس آ کر رک گیا۔

''گڈ آفٹرنون۔'' اس نے گارتھ کو مخاطب کیا۔ ''کیا کل کے لیے تم اپنی کشتی کرائے پر دینا پسند کرو گے۔''

''مل جائے گی۔'' گارتھ نے کہا۔ ''کس لیے۔''

''مچھلی کا شکار سورڈ یا مارلن تمہیں کسی ایسی جگہ کا علم ہے۔''

''ان سے یہ پورا سمندر بھرا ہوا ہے۔'' گارتھ نے کہا۔ ''تمہاری پارٹی کتنی بڑی ہے۔''

''ہم چار ہیں۔ کیا میں اوپر آ جاؤں۔''

''آ جاؤ۔'' گارتھ کرسی سے اٹھ گیا۔ آدمی نے کشتی پر آ کر کہا۔ ''میرا نام سام فیرل ہے۔ میں ڈلاز سے آیا ہوں۔''

''مجھے گارتھ کہتے ہیں۔''

آدمی نے پرس نکالا۔ ''ایک دن کے لیے کتنی رقم دوں۔''

''اسی ڈالر میں فیول اور چارے کا بندوبست بھی کر دوں گا۔ صبح چھ بجے نکلنا ہو گا۔ چار بجے واپسی اپنا کھانا اور ڈرنک لے کر آنا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے گارتھ کو پچاس ڈالر کا ایک نوٹ دیا۔ ''اب صبح کو ملاقات ہو گی۔''

گارتھ نے رقم جیب میں رکھ لی اور اس ٹیکساسی کو جاتے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے اپنے کیبن کا دروازہ بند کر دیا اور کشتی سے اتر گیا۔ پلیا کے اختتام پر ایک تنگ سی روڈ تھی اسی پر مڑتے ہوئے وہ سان جنتو ٹاؤن کے چوراہے کی طرف چل دیا۔ وہاں کاروبار خاصا مندا تھا۔ صرف چند سوداگر دکانوں کے باہر کھڑے تھے کچھ مٹی زو عورتیں خریداری کر رہی تھیں۔ ہر طرف سستی کی فضا تھی۔

یہاں سے چلتا ہوا گارتھ مقامی گرجے کی طرف چل دیا۔ اس نے وہاں مقدس پانی کے فوارے میں اپنی انگلی ڈبوئی اور اس سے سینے پر کراس بنایا۔ آلٹر پر دوزانو ہو کر اس نے اپنی آں جہانی بیوی کے لیے دعا کی اپنی مردہ بیٹی کے لیے دعا مانگی۔ دونوں کی موتیں خاص دردناک انداز میں ہوئی تھیں اس سے فارغ ہو کر اس نے چندے کے بکس میں کچھ رقم ڈالی۔

گرجے سے نکلتے ہوئے وہ چوراہے پر پلٹا۔ اس نے ملنے والی رقم سے جن کی ایک بوتل خریدی اور دوبارہ کشتی میں پلٹ آیا۔ ابھی وہ کشتی پر پہنچا ہی تھا کہ بارش دوبارہ شروع ہو گئی۔ اپنی کشتی میں پڑی کتاب کی بڑی سی کرسی پر بیٹھ کر اس نے جن کی بوتل کھولی ریڈیو آن کیا اور آرام سے پیر پھیلا دیے۔

☆☆

ٹھیک چھ بجے جبکہ سورج ابھی نکل ہی رہا تھا ایک پرانی پک اپ گارتھ کی کشتی کے نزدیک آ کر رکی اس میں سے تین افراد نیچے اترے دو نے پک اپ سے ایک صندوق نما تابوت اتارا اور کشتی پر پہنچا دیا۔ تیسرے نے آگے بڑھ کر گارتھ سے خود کو متعارف کرایا۔

''مجھے بڈی لیڈ کہتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''سام کی طبیعت خراب ہو گئی ہے وہ نہیں آ سکا ہے۔'' پھر اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ میکس والٹر ہے اور یہ لیولر۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گارتھ نے مذاق کی سمت دیکھا اور پوچھا۔
''یہ کیا ہے۔''
''سامان' کھانا' ٹیکلرس وغیرہ۔'' لیڈ نے کہا۔
''اک گٹھری دیکھی۔ چلو۔'' اس نے کہا۔
گارتھ نے سیٹی بجا کر پلپا پر کھڑے ایک آدمی کو متوجہ کیا جو چارہ بیچ رہا تھا۔ آواز سن کر وہ لپکا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بالٹی تھی۔ جس میں برف کے اندر مردہ مچھلیاں رکھی تھیں۔ بالٹی خرید کر گارتھ نے اپنی سیٹ سنبھالی انجن چلایا کشتی کو گھمایا اور اسے گہرے پانیوں کی طرف لے کر چل دیا۔
کوئی میل بھر اندر جانے کے بعد لیڈ اس کے کیبن میں آیا۔
''تم کیوں نہ ہمیں لیوبوس کی کھاڑی میں لے چلو۔'' اس نے دوستانہ لہجے میں کہا۔
''نہیں۔'' گارتھ نے کہا۔ ''میں لوبوس کی طرف نہیں جاسکتا' ادھر بہت نرسل کی جھاڑیاں ہیں۔ مارٹن مچھلی تو بس کھلے سمندر ہی میں ملتی ہے۔''
ابھی اس کا جملہ ختم ہی ہوا تھا کہ لیڈ نے ایک پستول نکالا اور نشانہ لیے بغیر بولا۔ ''نہیں تم ہمیں لوبوس کی کھلاڑی میں ہی لے چلو گے۔''
گارتھ نے ایک لمبی سانس بھری۔ اور کشتی کا رخ بدل دیا۔ ''کچھ بتاؤ گے۔ یہ کیا چکر ہے۔'' اس نے پوچھا۔
''تم بس کشتی چلاتے رہو۔''
''ٹھیک۔'' گارتھ نے پھر لمبی سی سانس بھری۔
بیس منٹ چلنے کے بعد گارتھ نے رفتار بہت کم کر دی۔ انہیں منزل نظر آ گئی تھی اس کے بعد اس نے انجن بند کر دیا۔
''سامنے کورول کی دیوار ہے۔ میں آگے نہیں جاسکتا۔'' گارتھ نے کہا۔
''ٹھیک ہے لنگر ڈال دو۔'' لیڈ نے کہا۔
یہ کام کرتے ہوئے گارتھ نے کھڑکی سے دیکھا کہ کنارے سے ایک بڑی سی ربڑ کی ڈونگی چار افراد کے ساتھ ادھر آ رہی ہے۔ ابھی وہ آدھے فاصلے پر ہی تھی کہ گارتھ نے دیکھا۔ ان کے عقب میں واقع جنگل سے ایک ہیلی کوپٹر ابھرا تھا۔ پھر وہ ان کے سر پر آ پہنچا۔
''یہ تو ملٹری کا لگتا ہے۔'' بکس نامی آدمی نے چیخ کر کہا۔
''اسے مار گراؤ۔'' لیڈ نے حکم دیا۔ پھر گارتھ سے بولا۔ ''کوئی حماقت مت کرنا سمجھے۔''
''ٹھیک۔'' گارتھ نے کہا۔
لیڈ ڈیک کی طرف لپکا۔ گارتھ نے کھڑکی سے دیکھا۔ والز اور ملر نے صندوق کھولا ہے اس میں سے انہوں نے لیزر گائیڈڈ راکٹ لانچر نکالے۔ لوڈ کیا اور ہیلی کاپٹر کا نشانہ لیا۔ پائلٹ نے شاید دیکھ لیا تھا اس نے غوطہ لگایا مگر اسے دیر ہو گئی تھی دوسرے لمحے ہیلی کاپٹر کے پرخچے اڑ گئے۔
گارتھ صدمے کی حالت میں اس کی برستے ٹکڑوں کو دیکھتا رہا۔ اسی وقت خلیج کے منہ کی سمت سے تین ملٹری گن بوٹ نکلیں۔ وہ پوری شکار سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ اسے کنارے پر بہت سے وردی پوش لوگ بھی نظر آئے۔ انہوں نے وہاں سے چپو والی ربر کی ڈونگی کا نشانہ لیا اور اس کے چیتھڑے بکھیر دیے۔ اس میں سوار مسافر پانی میں ڈبکیاں کھا رہے تھے۔
گارتھ کی کشتی پر والز اور ملر پھر سے لانچر تیار کر رہے تھے تاکہ آنے والی گن بوٹوں کا نشانہ لے سکیں۔ مگر ملٹری کی ان کشتیوں کی رفتار طوفانی تھی۔ دونوں نے ایک ساتھ فائر کیے اور پھر ہر چیز کا صفایا ہو گیا۔ اس میں وہ تینوں شامل تھے جنہوں نے گارتھ کی کشتی ہتھیائی تھی۔
فائر کے تو گارتھ نے تکیے کے غلاف کو پرچم کے جھنڈے کے طور پر ڈیک پر لہرایا۔ اس کی کشتی گھیر لی گئی تھی پھر چند فوجی اس پر آئے انہوں نے کوئی لحاظ کیے بغیر گارتھ کے منہ پر اپنی رائفل کا بٹ دے مارا گارتھ لہرایا اور بے ہوش ہو گیا۔

☆☆

ہفتہ بھر بعد۔
اس کا جبڑا ابھی تک سوجا ہوا تھا جس پر بٹ مارا گیا تھا۔ گارتھ ایک ملٹری کورٹ کے سامنے کھڑا تھا اور سن رہا تھا۔ اس پر مجرمانہ تعاون کا الزام لگایا جا رہا تھا۔
''کیوں اور تمہیں سزا دی جائے۔'' سینئر آفیسر نے سوال کیا۔
''میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔'' گارتھ نے کہا۔
''مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ اسلحے کی اسمگلنگ سے میرا کوئی تعلق نہیں۔''
''مسٹر گارتھ۔'' آفیسر نے کہا۔ ''تم اس ملک میں باہر سے آئے ہو۔ اپنے ملک میں تم ایک سابق ملٹری آفیسر تھے۔ تمہیں ہتھیاروں سے پوری واقفیت ہے۔ ہماری انٹیلی جنس نے تمہاری تصویر بنائی ہے جس میں تم ایک بدنام کرائے کے فوجی سے رقم لے رہے ہو تمہارے پاس بے گناہی کا کوئی ثبوت نہیں تین آدمیوں اور ایک فوجی کا پٹر کے زیاں کی ذمہ داری تمہارے اوپر ہے۔ یہ عدالت تمہیں موت کی سزا سناتی ہے۔ ایک ہفتے بعد تمہیں فائرنگ اسکوائڈ کے سامنے کھڑے کر کے گولیاں ماری جائیں گی۔'' جج نے رک اہل کاروں سے کہا۔ ''مجرم کو لے جاؤ۔''
کئی دن بعد۔
گارتھ سان ڈسماس کے قید خانے میں ایک کوٹھری کے دروازے پر کھڑا تھا۔ سلاخوں کے ادھر سے وہ ایک شخص سے بات کر رہا تھا۔ جو ایک جوان العمر آدمی تھا۔ اور اچھے لباس میں تھا۔ یہ امریکا کے قونصل خانے سے آیا تھا۔
''مسٹر گارتھ۔'' جوان نے اسے سمجھانا چاہا۔ ''امریکا کا کوئی سفارت خانہ اس چھوٹے سے ملک میں نہیں۔ یہاں بس یہی ایک قونصل خانہ ہے اس کا کام بس کاروباری امور تک محدود ہے یا امریکی سیاحوں کی دیکھ بھال کسی مجرمانہ گرمی میں ہم دخل نہیں دے سکتے۔ ہم نے بہرحال حکومت سے اجازت لی تھی کہ تم سے مل سکیں۔ ہم تمہارے لیے وکیل بھی کر دیتے مگر تمہیں سزا ہو چکی ہے اور یہاں اپیل نہیں ہوتی۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔''
''اور میں تمہیں یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ میں ایک امریکی شہری ہوں۔'' گارتھ نے ترشی سے کہا۔ ''مجھے دو روز بعد فائرنگ اسکواڈ کے سامنے بھیجا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ میں ایک میرین کور کا ساتھی فوجی بھی ہوں۔ ہماری حکومت مجھے اس طرح کیسے مرنے دے گی۔''
''ہم نے اس سلسلے میں رسمی درخواست دے دی ہے۔''
''کیا یہ درخواست مان لی جائے گی۔''
نوجوان نے نظریں گھمالیں۔ گارتھ نے دانت بھینچ کر سلاخیں تھامیں۔ ''گویا کچھ نہیں کر سکتے تم۔''
''ہاں۔'' نوجوان نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے۔'' اس کے بعد وہ عجلت سے مڑا اور چل دیا۔
گارتھ اپنی برتھ پر جا گرا اور چھت کو گھورنے لگا۔

☆☆

آدھی رات سے کچھ زیادہ کا وقت تھا باہر طوفان باد باراں کا شور ہو رہا تھا۔ گارتھ کی آنکھ اپنی کوٹھری کے قفل کے کھلنے پر کھلی اسے حکم دیا گیا کہ وہ لباس بدل لے پھر اسے گارڈ کے ساتھ باہر لایا گیا۔ یہاں اسے ایک نوجوان کیپٹن نے برسا دی کہ وہ اسے اوڑھ لے اور کوئی سوال جواب کیے بغیر اس کے ساتھ چلے۔
وہ اسی طرح باہر لایا گیا۔ پوش سے گزر کر وہ ڈرائیوے میں پہنچا جہاں ایک ملٹری سیڈان کھڑی تھی۔ اسے عقبی حصے میں بٹھا دیا گیا ایک کسی بڑے عہدے دار کے ساتھ جو سگار پی رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیپٹن ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔

پھر وہ گھوما اس نے پستول نکالا اور گارتھ کا نشانہ لے کر بیٹھ گیا۔

''چلو......'' سگار والے آفیسر نے حکم دیا اور سیڈان حرکت میں آ گئی۔

کوئی گھنٹہ بھر تک وہ شمال کی طرف کوسٹل ہائی وے پر چلتے رہے۔ انہوں نے سان جیتو کو بھی پار کرلیا۔ گارتھ سوچ رہا تھا۔ نہ جانے اس کی کشتی کا کیا بنا ہوگا۔ پھر اس نے سوچا یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کیا یہ کوئی سودے بازی ہے۔ کیا کسی کوئی اور قیدی کی جگہ اسے چھوڑا جا رہا ہے۔ مگر یہ کام کسی معمولی ماہی گیر کے مجھے کہاں ہوسکتا تھا۔ اس نے ایک سرنفی میں ہلایا۔

جب کار ہائی وے سے مڑی تو اسے وہ ائر بیس نظر آیا جس کے بارے میں گارتھ نے سنا تو تھا مگر کبھی جسے اس نے دیکھا نہ تھا۔ انٹری گیٹ پر جگہ جگہ اسے سلیوٹ مارے گئے مگر کار تیزی سے اندر چلی گئی۔ کار چلتی ہوئی ایک بوئنگ 707 تک پہنچی جو وہاں کھڑا تھا۔ ابھی تیز اسپاٹ لائٹ ہو رہی تھی۔ اس طیارے کی دم پر پانچ ستارے بنے ہوئے تھے۔ کار وہیں رک گئی۔ وہاں بورڈنگ سیڑھیاں موجود تھیں۔

چلو۔'' کیپٹن نے گارتھ سے جہاز پر چڑھنے کے لیے کہا۔ گارتھ برستی بارش میں کار سے نکلا اور سیڑھیاں چڑھتا طیارے کا دروازہ کھلا۔ اسٹیوارڈ نے سفید وردی پہن رکھی تھی۔

''آیئے اندر آ جائیں۔'' اس نے خوش اخلاقی سے کہا۔

''میں آپ کا بھیگا لباس اتار رہا ہوں۔'' اس کے بعد وہ اسے ایک عمدہ قسم کا کمپارٹمنٹ میں لے گیا۔ اس میں بہت کچھ تھا بستر......لائبریری۔

ایسا لگتا تھا یہ پلین کے مالک کی رہائش گاہ ہے پھر اسے آفس میں لایا گیا۔ جہاں ایک آدمی جس کی عمر کوئی ستر سال ہوگی موجود تھا۔ اس کی آنکھیں روشن تھیں اور ہونٹ بھنچے ہوئے۔

''بیٹھ جاؤ۔'' اس نے گارتھ سے گونجیلی آواز میں کہا۔

''جانتے ہو۔ میں کون ہوں۔''

''جنرل میکسل بوڈین۔'' بورتھ نے خوش ہوتے ہوئے جواب دیا۔

''مجھے بتاؤ تم میرے بارے میں کیا جانتے ہو۔''

گارتھ نے شانے اچھالے۔ ''وہی بس۔ جو اخباروں میں آتا رہا ہے۔''

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ اس وقت اس شخص کے سامنے بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ کیونکہ بوڈین ایک زندہ روایت سمجھا جاتا تھا۔

''چلو وہی بتاؤ۔'' جنرل نے کہا۔

گارتھ کھنکھارا۔ ''دیکھیں سر مجھے معلوم ہے آپ کبھی جوائنٹ چیف آف اسٹاف تھے۔ پھر آپ نے استعفادے دیا شاید والد محترم سے آپ کا کچھ اختلاف تھا۔ کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ آپ کروڑ پتی بن چکے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ ایک جہاز میں رہتے ہیں۔ کسی نے برسوں سے آپ کو نہیں دیکھا اخبار سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ کے اور برٹش رائل فیملی کی کسی لڑکی سے تعلقات ہو گئے تھے جس سے کوئی بچی پیدا ہوئی تھی۔ یہ خبریں آپ کو پسند نہ تھیں مگر......'' رک کر اس نے نظریں جھکا لیں۔

''بولتے رہو۔'' جنرل نے ہمت افزائی کی۔

''سر کب سے لوگ آپ کو خبطی سمجھتے ہیں۔''

جنرل ہنسا۔ ''خوب۔'' اس نے کہا۔

اسی وقت ایک اسٹیوارڈ اندر آیا اس نے میز پر کافی لگائی اور چلا گیا۔ تب جنرل نے کہا۔

''میں چند باتیں صاف کرنا چاہتا ہوں۔ میرا اختلاف آنجہانی صدر کے ساتھ بالکل ذاتی نوعیت کا تھا۔ سیاسی نہ تھا۔ اس نے مجھے خفیہ حکم دیا تھا مگر اخلاقی لحاظ سے میں یہ کام نہیں کرسکتا تھا۔

بس میں نے استعفادے دیا تھا۔ میں بعد میں کروڑ پتی بن گیا۔ میں نے اپنی رہائش اس جہاز میں اختیار کرلی میرے پاس ویسے ایک اپنا خرید کردہ جزیرہ بھی ہے۔ یہ جنوبی بحرالکاہل میں ہے۔ پچھلے برسوں سے بہت کم لوگوں نے مجھے دیکھا ہے۔ میں عوام میں شاذ ہی جاتا ہوں۔ رہا میرا خبطی ہونا تو میں کیا کہوں۔ کیا ہم سبھی تھوڑے خبطی نہیں۔''

''اور وہ برٹش لڑکی آپ کی......۔''

''ہوں۔'' جنرل نے ہنکاری بھری پھر اس نے کافی کپ لبوں سے لگا کر گارتھ کی بات اڑا دی۔ اس نے ایک لفافہ اٹھایا۔ اسے کھولا اور بولا۔

''یہ تمہارے کوائف ہیں۔ پیٹر گارتھ۔''

''اس میں بہت کچھ ہے۔ تین نسلوں کی فیملی ہسٹری۔ تمہاری پیدائش کی دشواریاں تمہارے باپ کی شراب نوشی تمہاری ابتدائی تعلیم۔ تمہارے گریڈ۔ بیس سال کے کھیل میں تمہاری شہرت۔ ایک پروفیسر کی لڑکی سے تمہارا عشق۔ کالج سے تمہارا اخراج۔ تمہاری فوجی ملازمت تمہاری ٹریننگ۔ اس دوران تمہیں ملنے والے اعزازات کی فہرست تمہاری پوسٹنگ لبنان میں جہاں تمہیں وہ عورت ملی جو تمہاری بیٹی کی ماں بنی۔ پھر دہشت گردی کی بمباری سے ماں بیٹی کی موت۔ تمہارا استعفارہ اور پھر تمہارا غائب ہو جانا اور پھر تمہاری گرفتاری اس جگہ سے تم پر اسمگلنگ کا الزام اور سزائے موت۔''

جنرل رکا تو گارتھ نے پوچھا۔ ''کیا اس فائل میں یہ نہیں لکھا ہے کہ میں بے قصور رہوں گا۔''

''نہیں اس میں صرف یہ لکھا ہے کہ تم اپنے کو بے قصور کہہ رہے ہو۔'' جنرل نے کہا۔ تم قصوروار ہو یا نہیں ہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''تو پھر مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔'' گارتھ نے رکھائی سے پوچھا۔

''میں تمہیں زندہ رہنے کا ایک موقع دے رہا ہوں۔''

جنرل نے کہا۔ ''بھاری رقم کے عوض جیل وارڈن کو خریدا جائے گا۔ تمہاری موت کا ڈراما رچا کر تمہاری جگہ ریت کے دو بورے دفن کیے جائیں گے ان کی قیمت ہوگی دس لاکھ ڈالر۔''

گارتھ ساکت انداز میں سنتا رہا۔ وہ مسلسل جنرل کو تکے جا رہا تھا۔ پھر اس نے پوچھا۔ ''اور اس کے عوض مجھے کیا کرنا ہوگا۔''

''اپنی خدمات دینی ہوں گی۔ جو کچھ میں کہوں کرنا ہوگا۔''

''وہ کیا ہیں۔''

''ٹروبل شوٹنگ کا کام ہے۔ یعنی گڑبڑ اور الجھنوں کا خاتمہ۔ تمہیں اس کی ٹریننگ پہلے سے ملی ہوئی ہے۔ تجربہ بھی ہے۔''

''کتنے عرصے تک۔''

''تمام زندگی...... تمہیں بچایا کس لیے جا رہا ہے۔''

''گویا مجھے ذاتی غلام بن کر رہنا ہوگا عمر بھر۔''

''ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ مجھے کوئی غلام نہیں۔ ایک قابل اعتماد آدمی چاہیے جس پر میں بھروسہ کرسکوں جو بین الاقوامی معاملات میں میرے کسی کام کا آدمی ثابت ہوسکے۔ تمہیں اس کام کے عوض خطیر معاوضہ ملے گا تم بہت اچھی طرح رہو گے۔ بس تم اپنا معاوضہ نہیں دے سکتے۔ سرکاری طور پر تمہارا کوئی وجود نہیں ہوگا تمہاری کوئی شناخت بھی نہیں نہ کوئی حتمی پاسپورٹ نہ کوئی ماضی تم ایک فرضی آدمی ہو گے۔ بیکار کے مگر تمہیں کسی ملک کی ضرورت ہی نہیں ہوگی تم ساری دنیا کے ہو گے۔ پوری دنیا میں جہاں چاہو کام کرسکو گے جس جگہ میں تمہیں اپنے کام سے بھیجوں گا تمہیں وہاں کے لیے ضروری کاغذات مل جائیں گے۔ سوئڈش، کینیڈین، سوئز جو چاہو گے سب۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"فرض کریں میں کہیں جا کر روپوش ہو جاؤں۔" گارتھ نے سوال کیا۔

جنرل نے سکون سے کہا۔ "میں انٹرپول کو مطلع کردوں گا کہ تم جعلی کاغذات پر سفر کررہے ہو تمہیں جلد ہی پکڑ لیا جائے گا۔ شناخت ہوگی اور تمہیں سان ڈسماس کی جیل بھیج دیا جائے گا فائرنگ اسکوائڈ کے سامنے کے لیے۔" رک کر جنرل نے کہا۔ "اور اس بار میں وہاں تمہاری مدد کے لیے نہیں ہوں گا۔"

گارتھ اٹھا۔ اس نے پلین کی کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ وہاں وہ ملٹری گاڑی ابھی تک کھڑی تھی۔

"مجھے فیصلے کے لیے کتنا وقت ہوگا۔" گارتھ نے پوچھا۔

جنرل نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور کہا۔

"صرف ساٹھ سکنڈ۔"

☆☆

گارتھ نے جنرل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ سکنڈ گزرنے کے ساتھ ہی اس کا حلق خشک ہوتا جارہا تھا۔ ایک اچٹتی نگاہ ڈال کر اس نے نیچے کھڑی گاڑی کی سمت دیکھا اسے سان ڈسماس کی جیل یاد آئی پھر اس کے ذہن میں اس کے مردہ بیوی اور بیٹی کی شبیہیں ابھریں۔ اس نے سوچا۔ "ان سب کے بعد اس کے جینے مرنے کی کیا اہمیت ہے۔ مگر یہ بات طے تھی وہ کسی فائرنگ اسکواڈ کے ہاتھوں مرنے کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ اور وہ بھی بلاقصور ایک اجنبی دیس میں۔"

جوں ہی سوئی پچیسویں سکنڈ پر پہنچی اس نے زبان سے لبوں کو تر کیا اور بولا۔ "ٹھیک ہے جنرل میں تیار ہوں۔"

جنرل نے ڈیسک کے کسی بٹن کو دبایا ایک اسٹوارڈ کمرے میں داخل ہوا۔ "کارلوس۔" جنرل نے کہا۔ "مسٹر گارتھ کو ان کے کمرے میں لے جاؤ اور لباس وغیرہ فراہم کرو۔ کھانا بھی۔" گارتھ اٹھا تو جنرل نے ایک بٹن اور دبایا۔

"کیپٹن جنسن۔ میں اپنے جزیرے جانا چاہتا ہوں۔" اس نے تیسرا بٹن دبایا۔ "مسٹر ڈیوس وہ بریف کیس ان کو دے دو جو نیچے کھڑی سیڈان کی بیک سیٹ پر ہے۔" وہ ایک اور بٹن دبانے جارہا تھا کہ اسٹوارڈ نے گارتھ کو چلنے کا اشارہ کیا۔

ایک گھنٹے بعد یہ بوئنگ طیار پرواز کررہا تھا۔ اپنے بیڈروم میں گارتھ بستر پر دراز تھا۔ وہ غسل کے بعد نئے لباس میں تھا۔ اس کے ہاتھ میں جن کا جام دبا ہوا تھا۔ وہ منتظر تھا کہ کارلوس کھانا لگادے وہ سوچ رہا تھا..... ہوسکتا ہے یہ سب کچھ زیادہ برا نہ ہو۔ ہوسکتا ہے ان خطرناک کاموں میں اس کی موت جلد واقع ہوجائے..... اس نے سوچا کم از کم یہ موت قرینے کی تو ہوگی۔

اصل بات بہرحال وقت ہی بتا سکتا تھا۔

☆☆

جزیرے کا نام تھا۔ وائی ٹی لیوو۔ یہ فجی بیسن کے شمال بعید میں واقع تھا۔ اسے فجی حکومت سے بیس سال قبل خریدا گیا تھا۔ اس وقت یہاں میلانی اور پولی نیسی باشندوں کی ایک چھوٹی سی آبادی موجود تھی۔ یہ ہلکی زرد رنگت اور سیدھے بالوں والے لوگ تھے۔ کوئی ستائیس میل زمین تھی۔

اس کے مغربی حصے میں گھنے جنگل تھے اور دوسرے سرے پر ناریل کے باغات اور گھاس کے میدان۔ اس کے چاروں طرف ایک بیچ بھی تھی جس کی ریت کا رنگ قدرے گلابی سا تھا۔ اس وقت یہاں کے باسی میلبری، کھوپرے اور کیلے وغیرہ برآمد کرتے تھے اور اسی آمدنی پر جیتے تھے۔

جزیرہ خریدنے سے قبل جنرل یہاں کے سردار سے ملا تھا اور اسے بتایا تھا کہ اس خریداری سے جزیرے پر کیا فرق پڑے گا۔ ایک نجی ہوائی اڈہ بنتا۔ جنرل کی حویلی بنتی۔ اس کے ملازمین کے کوارٹرز بنتے جزیرے پر ہر کسی کے آنے جانے پر پابندی لگتی۔ کوئی مقامی باہر جاتا تو اسے جزیرے

کے بارے میں معلومات فراہم کرنے پر پابندی ہوتی وغیرہ۔

ان پابندیوں کے عوض جنرل نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس جزیرے پر ایک جدید اسکول ایک عمدہ سا ہسپتال ایک یوتھ سینٹر ایک اسپورٹ کامپلیکس اور ایک شاپنگ مال تعمیر کرائے گا۔ جدید ترقی زرعی آلات منگائے جائیں گے تاکہ کھیتی باڑی کو فروغ مل سکے چند اشیاء کی فیکٹریاں بھی لگیں گے۔ جنرل کی موت کے بعد یہ تمام چیزیں، جزیرے کے سردار کی ملکیت ہوجائیں گی۔

"یہ تو ہمارے خوابوں کی تعبیر تھی۔" گارتھ سے اس آدمی نے بتایا جو اس کے ملازم کی طور پر اسے ملا تھا۔ اس کا نام ٹوکی تھا۔ گارتھ کو ایک جدید قسم کی کاٹج دی گئی تھی جو سمندر کے سامنے تھی۔

"یہاں ہر آدمی جنرل کا مقروض ہے۔" ٹوکی نے بتایا۔ "حتی کہ چیف شیف بھی رمارس دیت مند جیل سے رہا کرایا ہوا ایک سزایافتہ آدمی ہے۔ یہاں کے جونگراں ہیں جون اور گارشیا یہ دونوں بڑے ٹھاٹ سے رہتے ہیں بھی بہت غریب تھے۔ یہاں کا سیکورٹی انچارج کرنل برٹن ایک سابق رائل گارڈ ہے۔ اس نے اپنی بے وفا بیوی کو قتل کردیا تھا۔ اب آزادی سے یہاں رہتا ہے۔ جنرل نے اسے بچا لیا تھا اور میں..... میں خود بھی پہلے صرف ایک خاصا غریب سا مزدور تھا۔ مجھے دو سال بعد یونیورسٹی میں داخلہ دلا دیا جائے گا تاکہ اعلا تعلیم حاصل کرسکوں۔"

"اور جنرل کی موت کے بعد تم سب کا کیا بنے گا۔" گارتھ نے پوچھا۔

"سوئڈش نیشنل بینک میں ایک ٹرسٹ قائم کردیا گیا ہے جنرل کے ہر ملازم کے مفادات کا تحفظ موجود ہے۔" ٹوکی نے کہا۔ "جنرل بہت عمدہ آدمی ہے۔ یہاں کے سارے لوگ اس سے محبت کرتے ہیں۔"

گارتھ..... بہرحال عقلمند نہ تھا۔ اسے زندگی مل گئی تھی۔ یہ ایک اچھی بات تھی۔ مگر یہ جس قیمت پر ملی تھی وہ اسے پسند نہیں تھی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ میں کسی نہ کسی دن غلامی کے اس جوتے کو اپنے کاندھوں سے ضرور اتار پھینکوں گا۔ دریں اثناء بے شک وہ ان مراعات سے ضرور لطف اٹھانا چاہتا تھا جو اسے دی گئی تھیں۔

کئی ہفتوں تک وہ اپنے روز شب تیراکی، ماہی گیری، ادھر ادھر کی گشت اور جزیرے کو دیکھنے میں گزارتا رہا۔ اسے ایک جیپ ملی ہوئی تھی اور تیراکی کے لباس وغیرہ بھی۔ کچھ شامیں وہ بیان کے شوشل کلب میں گزارتا تھا جہاں جنرل کا سارا عملہ ہی تقریباً جاتا تھا۔

پائلٹ، شیف، سیکورٹی چیف۔

سیکریٹریز وغیرہ سب یہاں ایک لائبریری بھی تھی اور ٹی وی بھی اس میں لگا ہوا تھا۔ کھانے کے لیے ایک بڑا سا ڈائننگ ہال تھا۔ اکثر کھلی فضا میں سمندر کے کنارے بھی کھانا سرو کیا جاتا تھا۔ ان سروس والوں کو پیرس بھیج کر ٹریننگ دلائی گئی تھی۔ انہیں کئی زبانیں بولنی آتی تھیں۔

ایک روز جب گارتھ سیر کے لیے نکلا ہوا تھا۔ وہ جزیرے کے آخری سرے پر تھا وہاں اس نے ایک عامرہ سی کھوہ نما جگہ دیکھی وہ ادھر گیا تو اسے وہاں ایک جوان عورت دکھائی دی وہ ایک چٹائی پر بیٹھی سمندر کی سمت دیکھ رہی تھی۔ اس کے سامنے کچھ موتی پڑے ہوئے تھے۔

"ہیلو۔" گارتھ نے اسے مخاطب کیا۔

عورت کے نقش کچھ ایسے تھے کہ اسے اپنی مردہ بیوی جو بائبل یاد آگئی۔ عورت نے جواب نہیں دیا صرف مسکرا دی۔ گارتھ اس کے پاس ہی چٹائی پر بیٹھ گیا۔ "تمہارا نام کیا ہے۔" اس نے عورت سے پوچھا۔

عورت نے بھنویں سکوڑیں۔

گارتھ نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"میرا نام پیٹر گارتھ ہے۔" پھر اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عورت کی سمت اشارہ کیا۔
''اور تمہارا اور۔''
''تم پیٹر ہو میں ماریٹا..... تم جنرل کے ملازمین میں سے ہو۔''
''ہاں۔'' گارتھ نے کہا۔ ''میں جنرل کا بڑا عہدے والا ملازم ہوں۔''
عورت نے اسے دلچسپی سے دیکھا۔ گارتھ نے عورت کا جائیزہ لیا وہ خاصی خوش شکل اور سڈول جسم والی پرکشش سی عورت تھی۔ اس کے نزدیک چند مولی پڑے تھے عورت نے شاید انہیں بیچ سے چنے تھے اس نے کہا۔ ''میں فصل کی کٹائی کے لیے ہار بنا رہی ہوں۔''
گارتھ کو اس تقریب کے بارے میں علم تھا۔
''کیا تم کیلوں کے باغات میں کام کرتی ہو۔'' گارتھ نے پوچھا۔
''نہیں..... میں ریڈ کلف کالج امریکا میں پڑھتی ہوں اور ایک آرٹ میجر ہوں۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں جنرل کی منہ بولی بیٹی ہوں اور یہاں کے قبیلے کا چیف میرا باپ ہے۔ میں اس کی چھوٹی بیٹی ہوں۔'' گارتھ بری طرح کھسیانا سا ہو گیا۔
ماریٹا اسے مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔
کچھ توقف کے بعد گارتھ نے ہمت جمع کی اور ہکلایا۔
''میں معافی چاہتا ہوں۔''
''ارے نہیں۔'' ماریٹا خوش دلی سے بولی۔ ''نہیں۔ اس مذاق کے لیے تو معافی تجھے مانگنی چاہیے۔'' اس نے وہ ہار جسے وہ تقریباً بنا چکی تھی گرہ دے کر مکمل کر لیا اور اپنے گلے میں ڈال لیا۔ پھر گارتھ کی طرف آیا ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''ہم دوست ہیں ہاتھ ملاؤ۔'' پھر اس نے ایک خوب صورت ہاتھ گارتھ کے مضبوط ہاتھ میں دے دیا۔
''بہت شکریہ۔ اس عزت افزائی کا۔'' پھر دونوں کھلکھلا کر ہنس دیے۔
وہ ماریٹا کے ساتھ فصل کی کٹائی کی تقریب میں پہنچا تو اس کی ملاقات قبیلے کے چیف سے ہوئی۔ سردار روٹوما' ماریٹا کا باپ تھا۔ یہ شخص ایک اچھی شخصیت کا مالک تھا۔ تعطیلات کے مختصر سے وقفے میں ماریٹا سے اس کی دوستی خاصی بڑھ گئی تھی۔ وہ اس کے ساتھ آ کر گھومتی بھی صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ بھی گارتھ کو پسند کرنے لگی ہے۔ کبھی کبھی وہ دونوں کلب میں ساتھ ساتھ ڈانس بھی کرتے تھے۔ ایک بات ضرور تھی کہ ان کی دوستی ایک حد کے اندر ہی تھی۔
جب ماریٹا کی چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ تو گارتھ اسے جنرل کی لانچ میں لے کر نیمی کے دارالحکومت سووا تک گیا۔ وہاں سے اس نے ماریٹا کی نندی ایئرپورٹ پہنچایا۔ دونوں کو یہ جدائی خاصی شاق محسوس ہو رہی تھی۔ واپسی پر گارتھ نے خود کو خاصا تنہا محسوس کیا مگر یہاں ایک دوسری مصروفیت اس کی منتظر تھی۔
کاج میں جاتے ہی اسے ٹیبل پر ایک بڑا سا لفافہ رکھا نظر آیا۔ اسی وقت فون بجنے لگا۔ اس میں سے ایک گونجیلی آواز ابھری۔ ''مسٹر گارتھ لفافہ کھولو اور اسے سامنے رکھ لو۔''
گارتھ نے تعمیل کی سب سے اوپر ایک تصویر تھی کسی طاقت ور ہاکر کی۔
''جانتے ہو اسے۔'' پوچھا گیا۔
''ہاں یہ رائلی ہے۔ ہیوی ویٹ چیمپئن۔''
''ٹھیک۔'' جنرل نے کہا۔ ''مسلمان ہونے سے قبل اس کا نام مارشل تھا۔ یہ ایک بلیک امریکن ہے۔ کئی سال سے چیمپئن چلا آ رہا ہے۔ عمر 3 سال ہے۔ مگر اب یہ ست پڑ رہا ہے۔ اس کے نیچے والی تصویر..... یہ ڈینی ہے۔ اسرائیلی باکسر۔ رائلی کا نمبر ون حریف۔ عمر میں دس سال چھوٹا ہے۔ ابھی تک کسی سے نہیں ہارا۔ اولمپک چمپئن ہے۔ اب

اس کے پیچھے دیکھو۔''
اس تصویر تلے ایک پوسٹر کی تصویر تھی۔ جس میں ان دونوں باکسروں کے مقابلے کا اعلان تھا۔
''یہ مقابلہ آج سے پانچ دن بعد پیرس میں ہوگا۔ یہ تصویر ہٹاؤ۔''
نئی تصویر ایک ارینا کی تھی۔ بہت جدید۔
''یہ مقابلہ یہیں ہوگا۔'' جنرل نے کہا۔ ''یہ ارینا (اکھاڑا) جدید ترین کہا جا سکتا ہے اور یہ یوروپ کی جنرل انٹر پرائز کی ملکیت ہے۔ یعنی یہ میرا ہے آگے دیکھو۔''
یہ ایک اخباری تراشا تھا۔ اس میں ایک تصویر تھی تین مردوں اور ایک عورت کی۔
''یہ تینوں بلیک جولائی نامی دہشت گرد تنظیم کے ممبر ہیں۔'' جنرل نے کہا۔ ''چند مہینوں قبل انہیں گرفتار کیا گیا تھا یہ تل ابیب کے ہوائی اڈے پر بم نصب کر رہے تھے۔ انہیں عمر قید کی سزا دی گئی ہے۔ آگے۔''
آگے ایک خط تھا۔ ٹاپک کیا ہوا۔ اسے بلیک جولائی نامی تنظیم نے لکھا تھا۔
''یہ گروپ مجھ سے مطالبہ کر رہا ہے کہ میں ان کے ان آدمیوں کو جیل سے چھڑاؤں بصورت دیگر انہوں نے دھمکی دی ہے کہ پھر رینی میرے ارینا سے زندہ واپس نہیں ہوگا۔ اس طرح وہ میرے ارینا کو دنیا بھر میں بدنام کرانا چاہتے ہیں۔''
''کیا آپ تینوں کو رہا نہیں کرا سکتے۔'' گارتھ نے پوچھا۔
''نہیں۔'' جنرل نے کہا۔ ''کسی بھی طرح ممکن نہیں اسرائیل والے دہشت گردوں پر معطل نہیں کرتے۔ اس کے لیے وہ ڈینی کو مروانا پسند کریں گے۔''
''خط پڑھو۔''
گارتھ نے خط پر نظر دوڑائی۔
''یہ لکھ رہے ہیں کہ وہ فائٹ کے دوران ڈینی کو ختم کرا دیں گے۔''
''وہاں۔'' جنرل نے کہا۔ ''البتہ انہوں نے ایریکا کو تباہ کرنے کی بات نہیں لکھی ہے۔ غالباً ان کا خیال ہے کہ ایک چیمپئن کی موت زیادہ موثر ہو گی۔ اس سے کیا بات سمجھ میں آتی ہے۔''
''یہی..... کوئی بے نقص نشانہ باز۔''
''بالکل ٹھیک۔'' جنرل نے کہا۔ ''تمہیں نشانہ بازی کی تربیت ملی ہوئی ہے تم نے نشانہ بازی میں اعزازات لیے ہیں۔ تم ان کا توڑ بھی جانتے ہو ایسی جگہوں کو تلاش کر سکتے ہو جہاں سے نشانہ لیا جا سکتا ہے۔ بلیک جولائی ایک خطرناک تنظیم ہے۔ مگر میری انٹیلی جنس نے مجھے بتایا ہے کہ ان کے پاس کوئی شاندار نشانہ باز نہیں ہے اور اگر کوئی ہے بھی تو میں چاہتا ہوں تم اسے تلاش کر کے ہمیشہ کے لیے باہر کر دو۔ کوئی سوال۔''
''نہیں سر۔'' گارتھ نے کہا۔ اسے محسوس ہوا اس کے خون کی روانی بڑھ گئی ہے۔ توانائی کا ایک ریلا اس میں بہنے لگا تھا۔ یہ ایکشن کا وقت تھا۔ مقابلہ تھا اور سب کچھ حقیقت تھی۔ اس کے اندر کا جنگجو انگڑائی لے رہا تھا۔ بہت دنوں بعد پھر۔
''میرے پاس آٹھ مسافروں والے گلف لیئر جیٹ موجود ہیں۔ اسی ایئر فیلڈ پر ہیں جہاں 747 کھڑا ہے۔'' جنرل نے کہا۔ ''ان میں سے ایک گھنٹہ بھر بعد پیرس کے لیے روانہ ہوگا یہ تمہیں براستہ بگوٹا پیرس لے جائے گا۔ تم وہاں ایک سوئز رائٹر کی حیثیت سے جاؤ گے۔ رقم' لباس' پاسپورٹ اور پوری کور اسٹوری تمہیں جہاز پر مل جائے گی پیرس میں تمہیں میرے ارینا چیف سیکورٹی آفیسر مارسل لیوی مل جائے گا اسے سارے مسئلے کا علم ہے۔ وہ تمہارے ساتھ ہر طرح کا تعاون کرے گا تم جو چاہو گے تمہیں مل جائے گا ہتھیار وغیرہ سب..... اب لفافے کو پھر دیکھو اس میں ایک اور آئیٹم بھی ہے۔''
گارتھ نے دیکھا۔ یہ ایک تراشا تھا۔ مونٹی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کارلوس کے کسی ٹیبلو کا۔ اس میں جنرل کی برطانوی بیٹی بریڈا کا ایک نائٹ کلب فوٹو تھا۔ وہ مختصر سے لباس میں تھی اور کوئی وحشیانہ سے رقص میں مصروف تھی اس کے ساتھ کوئی لاطینی جوان بھی تھا۔

''تم فرانس جا رہے ہو۔'' جنرل نے کہا۔

''مونٹی کارلوس میں رک جانا اور واپسی میں اس لڑکی کو ساتھ لے آنا۔''

''اور اگر وہ آنے پر تیار نہ ہوئی۔''

''اس کی مرضی کی کوئی اہمیت نہیں۔'' جنرل نے ترشی سے کہا اور فون بند کر دیا۔

☆☆

اور لی کے نجی ایئرپورٹ پر ایئر طیارہ اترا تو گارتھ کا استقبال ارینا کے چیف سکوریٹی آفیسر مارسل سیوی نے کیا۔ یہ ایک چوڑا چکلا آدمی تھا۔ خطرناک آنکھوں والا۔ ہونٹوں پر باریک مونچھیں تھیں اور اس کے چہرے خوش مزاجی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس نے گارتھ سے مصافحہ تک نہیں کیا گارتھ اس کے ساتھ جنرل کی بلٹ پروف رینالے میں بیٹھ گیا۔ اس نے مارسل سیوی کی رکھائی کا کوئی اثر نہیں لیا اور کام کی بات شروع کر دی۔

''ڈیتھ کی جان کو خطرے کے بارے میں کتنے لوگوں کو معلوم ہے۔'' اس نے سیوی سے پوچھا۔

''صرف تین آدمی جانتے ہیں۔ جنرل میں اور تم۔''

''ٹھیک..... مجھے سارے ارینا میں گھومنے کا پاس چاہیے تم اپنے اسٹاف سے کہہ دینا میں ارینا پر کوئی مضمون لکھ رہا ہوں۔ پہنچتے ہی میں سارے اسٹیڈیم کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔''

گارتھ کو علم نہ تھا۔ ٹور کیسا ثابت ہوگا فاؤنٹن بیلو نامی یہ جدید ارینا نیا نیا بنا تھا۔ اس کا افتتاح اس بڑے مقابلے کے ساتھ ہو رہا تھا یہ مشکل میں مدور تھا۔ اس میں چھ ہزار نشستیں تھیں اس کا گنبد شفاف تھا۔ گنبد تلے لائٹوں کا بندوبست تھا اور پروجیکشن بوتھ تھے۔ کئی راستے تھے جو راہ داریوں میں تبدیل ہو کر بیرونی گیٹ تک جاتے تھے یہاں ایک پبلک ریسٹ روم بھی تھا چوکیداروں کی الماریاں تھیں لاکرز تھے۔ پاور پلانٹ بھی تھا اور کمونیکیشن ٹرمنل بھی۔

''یہ جگہ تو کسی گورکھ دھندے جیسی ہے۔''

گارتھ نے تبصرہ کیا۔ ''اس میں تو کسی نشان باز کے چھپنے کی اتنی جگہیں ہیں کہ جنگل میں بھی نہ ہوں گی۔ خود رائفل کو چھپانے کے لیے درجنوں عمدہ جگہیں موجود ہے۔ ہماری پہلی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ کوئی ہتھیار اندر نہ آنے پائے۔ کیا ہر گیٹ پر میٹل ڈی ٹکٹرز لگے ہیں۔''

''ہاں۔'' سیوی نے بے زاری سے کہا۔

''اور یہ بہت حساس ہیں۔''

''اوپر جانے والے ڈھلوانی راستے جو ناظرین کے لیے ہیں۔ ان کی تعداد کتنی ہے۔''

''سولہ۔''

''اوکے۔ کوئی 64 عدد اضافی آرمڈ پرسونل بھرتی کر دیے نئے لوگ ہونے چاہئیں ان میں سے ہر ریمپ کے تلے چار افراد پوسٹ کر دو۔ ان کے پاس دستی ڈی ٹیکٹر ہونے چاہئیں جب نظر گیٹ سے گزر جائے تو ایک بار اور اس کا اسکین ہونا چاہیے۔ یہاں کتنے بوتھ ہیں۔''

''آٹھ الیکٹریکل جار پروجیکشن۔''

''ہر ایک پر ایک مسلح گارڈ متعین کر دو اس کے علاوہ مجھے پچاس عدد مسلح مرد اور عورتیں سویلین لباس میں چاہیے تاکہ انہیں نچلے تماشائیوں کے درمیان..... اور اسی طرح دوسری سیٹوں میں..... ڈالا جا سکے۔ اگر کوئی شاٹ چلا تو انہیں دو سطحوں میں ہو سکتا ہے۔''

''گویا تم نے فرض کر لیا ہے کہ صرف گولی چل سکتی ہے۔ بم وغیرہ نہیں۔'' سیوی نے کھردرے انداز سے اعتراض کیا۔

''خط کا تجزیہ یہی بتاتا ہے۔ یہ صرف کسی ایک کو مارنے کی کوشش ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ کچھ اور۔''

''اب ڈوم یعنی گنبد۔'' گارتھ نے کہا۔ ''کیا گولی اس میں سے گزر سکتی ہے۔''

''گزر تو سکتی ہے مگر ہدف پر لگ نہیں سکتی۔''

''اوکے۔'' گارتھ نے ہونٹ بھینچے اور کچھ دیر مین لیول پر ٹہلتا رہا۔ اس کی آنکھیں ہر کونے کھدرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ آخر کار اس نے سیوی سے کہا جو بے حد بے زاری سے اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ ''ہمارے نیچے کیا ہے۔''

پہلی بار سیوی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

''تم دیکھ کر حیران ہو گے۔'' اس نے کہا۔

''آؤ۔'' وہ گارتھ کو اس جگہ تک لے گیا۔ پھر بولا۔ ''جس لکڑی کے فرش کو تم نے اوپر دیکھا تھا۔ وہ اب ٹھیک ہمارے سروں پر ہے۔ یہ جگہ باسکٹ بال' والی بال' جمناسٹک اور کورٹ مقابلوں کے لیے استعمال ہو سکتی ہے۔'' رک کر اس نے کہا۔ ''اس کمرے سے.....'' اس نے ایک گہری خم دار کمرے کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جس میں بہت سی گھاس ذخیرہ تھی۔

''ہم بارہ انچ موٹی زمین کو اٹھا کر اوپر لا سکتے ہیں۔ اس پر مصنوعی گھاس کا کمبل بچھایا جا سکتا ہے۔ اس طرح ہم آڈی ٹوریم میں رگبی فٹ بال کرکٹ اور کھلے میدان کے کھیلوں کے لیے میدان بنا سکتے ہیں۔''

وہ اسے سب لیول کے مرکز میں لاتے ہوئے بولا۔ ''اور اس جگہ ہمارے پاس ایک مستقل رنگ ہے۔ باکسنگ اور کشتیوں کے لیے۔ صرف ایک بٹن دبانے سے چوبی فرش غائب ہو جائے گا اس کی جگہ ایک رنگ یا اسٹیج ابھر آئے گا اس میں اضافی سیٹنگ ایریا موجود ہوگا۔ ہے نا یہ ایک حیرت ناک چیز۔''

''یہ تو آٹھواں عجوبہ ہوا۔'' گارتھ نے کہا۔

''ذرا مجھے جنریٹر دکھاؤ۔''

''یہ کمرہ نیچے ہے دوسرے لیول پر کیا تمہارا خیال ہے وہ ہمارے برقی نظام میں گڑبڑ پیدا کریں گے۔''

''ممکن تو ہے۔ فرض کرو وہ کسی طرح ہتھیار اندر لے آتے ہیں کوئی ٹکڑوں میں بنی رائفل جس پر انفراریڈ اسکوپ لگا ہو۔ بجلی چلی جائے تو اندھیرے میں اس رائفل سے ڈیتھ کو بہت اطمینان سے مارا جا سکتا ہے۔ شور وغل میں پھر قاتل صاف نکل سکتا ہے۔''

گارتھ نے پلازٹ کا جائزہ لیا۔

''اوکے تین مسلح محافظ دو اندر اور ایک باہر ساتھ ساتھ ایمرجنسی جنریٹر تیار رکھا جاتا۔ کون جانے وہ کامیاب ہو جائیں۔ حفظ ماتقدم ضروری ہے۔''

سیوی نے غور سے گارتھ کو دیکھا۔ اس کے بعد اس نے پہلی بار دوستانہ انداز میں اس کی سمت مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''معاف کرنا۔'' اس نے کہا۔ ''میں تمہارے بارے میں اطمینان کرنا چاہتا تھا اب مجھے یقین آ گیا ہے کہ جنرل کا انتخاب غلط نہیں۔ میں نے کسی اضافی جنریٹر کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ توجہ دلانے کا شکریہ۔''

''مصافحے کے لیے شکریہ۔'' ہنستے ہوئے گارتھ نے ہاتھ بڑھا دیا۔ ''مجھے امید ہے میں بھی تم سے کچھ نہ کچھ سیکھ سکوں گا۔'' اس نے کہا۔

''اور میں بھی۔'' سیوی نے ہنسی میں اس کا ساتھ دیا۔ اس کا رویہ ایک دم سے بدل گیا تھا۔

☆☆

فائٹ کی رات ہزاروں کی تعداد میں صرف پیرس ہی نہیں دنیا بھر سے سیکڑوں افراد نئے اور شان دار اسٹیڈیم 'فاؤنٹن بیلو' میں پہنچ رہے تھے۔ گارتھ اور مارسل سیوی دونوں علیحدہ علیحدہ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وسیع ایریا میں ادھر ادھر گھوم رہے تھے ان کے پاس کمیونکیشن یونٹ تھے۔ وہ حفاظتی چوکیوں کو چیک کر رہے تھے۔ اور ہر سرگرمی کو ٹائر نظروں سے دیکھ رہے تھے یہ موقع خاصا نازک تھا۔ بیک وقت دو ہنگامے تھے ایک عمارت کا افتتاح اور دوسرا دو بڑے باکسروں کا ٹکراؤ۔ جس وقت یہ دونوں ملے فائٹ میں صرف پندرہ منٹ باقی رہ گئے تھے۔

''کوئی خاص بات۔'' گارتھ نے پوچھا۔

''نہیں۔'' مارسل سیوی نے کہا۔

گارتھ نے بھی نفی میں سر ہلایا۔

ابھی ان میں باتیں ہو رہی تھیں کہ ڈرم کی آوازیں ابھریں۔ ارینا کی بتیاں مدھم ہوگئیں اور میزبان مقابلہ ارینا کے مرکز میں ہونے والی تیز روشنی کے تلے اترا۔

''خواتین و حضرات۔'' اس نے کہا۔ ''ہم اب معزز تماشائیوں کے لیے دنیا کی پہلی اور مستقل پرائز فائٹنگ رنگ کی پردہ کشائی کریں گے۔''

تماشائیوں کی پرتجسس نظروں تلے مرکش پیچھے کی سمت سرکا اور اس کی جگہ ایک رنگین کروم پوسٹڈ سلی لمبا والی رنگ نچلی سطح سے اوپر ابھر آئی۔ مجمع پہلے حیرت سے دوچار ہوا اور سناٹے میں چلا گیا پھر بڑے زور سے تالیاں بجیں اور زبردست شور بلند ہوا۔

سیوی نے جھک کر گارتھ کے کان میں کہا۔

''فائٹرس آرہے ہیں۔''

گارتھ نے ہونٹ سکوڑے اور کہا۔ ''اچھا ہم ذرا کچھ چکر اور لگاتے ہیں۔''

پھر وہ مختلف سمتوں میں چل دیے ان کا رخ اوپری سیٹوں کی طرف تھا جو گنبد تلے بنی ہوئی ان کے بہت نیچے اسرائیل کا قومی ترانہ بجنا شروع ہوا۔ باکسر ڈینی لمبی راہداری میں داخل ہو چکا تھا۔ گارتھ ٹھہر کر منظر پر منظر جمائی۔ اس کے دماغ میں سیکڑوں سوال گزر رہے تھے۔

کوئی چیز جو اس پر واضح نہ تھی اسے ڈنک مار رہی تھی۔ نہ جانے کیا تھی۔ وہ مسلسل سوچ رہا تھا۔

نیچے ڈینی اب رنگ میں داخل ہو کر ہاتھ پیر کھول رہا تھا۔ اسی لمحے امریکا کا کوئی ترانہ بجنے لگا دوسری طرف سے رائلی آرہا تھا وہ ایزل کی طرف بڑھا وہ ابھی رنگ میں پہنچا ہی تھا کہ گارتھ کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ ایک خاص بات اس کے ذہن میں ابھری۔ اخباری تراشا جو جنرل نے اسے پڑھایا تھا اسے یاد آیا۔

اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ تل ابیب پر بلیک جولائی گروہ نے جو حملہ کیا تھا اس میں انہوں نے زمین دوز نالیوں کو استعمال کیا تھا۔ یعنی ہدف کے نیچے سے۔

گارتھ کسی سانپ کی طرح کھلا اور قریبی راستے کی طرف دوڑا۔ اب صرف ایک جگہ رہ گئی تھی جو اس نے اور سیوی نے چیک نہیں کی تھی اور یہ وہ مشین تھی جو نچلے حصے کو تماشائیوں کے سامنے لاتی تھی۔

ادھر گارتھ دوڑ رہا تھا ادھر لوگ اما سیلی کا پرشور انداز میں خیر مقدم کر رہے تھے گارتھ پاگلوں کی طرح دوڑ رہا تھا۔ دوڑتے ہوئے ہاتھ میں دبے سیٹ کے ذریعے وہ سیوی سے رابطے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ مگر شور بہت تھا اور رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ آٹھویں لیول پر تھا اور اب چوتھے لیول تک اتر آیا تھا۔ اس نے وہاں سے رنگ پر نگاہ ڈالی وہاں مقتدر شخصیات کو باکسروں سے ملایا جا رہا تھا۔ یہ اچھی بات تھی۔ زیادہ آدمیوں کی موجودگی میں کسی کا نشانہ مشکل ہوتا ہے ممکن ہے شوٹر اس وقت تک انتظار کرے جب تک فائٹ شروع نہیں ہو جاتی۔ کیونکہ افراد ہی ہوتے ہیں۔ لڑنے والے اور ریفری۔

دوسرے لیول پر گارتھ کو دو گارڈوں نے روک دیا۔ اس نے جلدی سے انہیں پاس دکھایا اور کہا کہ وہ سیوی سے رابطہ کریں اور کہیں کہ وہ

رنگ کے نیچے دیکھے..... اتنا کہہ کر وہ دوبارہ بھاگا اور داخلے کی سیڑھی پر پہنچ گیا۔ یہاں بھی ایک گارڈ تھا اس نے جیب سے اعشاریہ چار زیرو کا وہ آٹومیٹک نکالا جو اسے سیوی سے ملا تھا اس نے پہلے لیول کے گارڈ کو ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموشی کا اشارہ دیا پھر اپنے جوتے اتارے بہت احتیاط سے اس نے وہ دروازہ کھولا جو ذیلی دو نمبر لیول تک جاتا تھا۔ اس نے گارڈ کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا پھر بے آواز قدموں سے اس نے سیمنٹ والے زینے اترنے شروع کر دیے۔

''ہونا چاہیے یہاں اسے.....'' اس کے ذہن نے کہا۔ ''اس سے بہتر جگہ نشانے کے لیے دوسری نہیں۔'' ڈینی کو یہاں سے بہ آسانی مارا جا سکتا تھا۔ بے شک درمیان لکڑی کے تختے اور کینوس وغیرہ حائل تھے..... اس نے سوچا شاید یہ حملہ اس وقت ہوگا جب ڈینی مقابلے کے لیے اترے گا۔

اور پھر گارتھ وہاں پہنچ گیا۔

ایک دیوار کے کونے میں بھاری دیو پیکر ہائیڈ رولک لفٹ کے پاس ہی عام سے بزنس سوٹ میں ملبوس ایک جوان ہاتھ میں یوزی مشین گن سنبھالے جس کا رخ اوپر کی سمت تھا گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔

''صرف ایک شاٹ۔'' گارتھ نے سوچا۔

بس اسی سے کام چل سکتا تھا۔ شوہر کی انگلی ٹریگر پر تھی۔ ذرا سا دباؤ مہلک فائر کا اسپرے کر سکتا تھا۔

اوپر لاؤڈ اسپیکر کا اعلان ہو رہا تھا۔

''اب ریفری کی طرف سے آخری ہدایات۔'' صرف ایک شاٹ۔

اب دہشت گرد اپنی یوزی کو پوزیشن میں لا رہا تھا۔ ایک مہلک فائر کے لیے۔

گارتھ نے اپنے آٹومیٹک کو دونوں ہاتھوں میں دبایا اور آگے بڑھ کر اس نے جوان شوٹر پر فائر کھول دیا۔

یہ ایک طاقت ور ہتھیار کی مار تھی۔ شوٹر کے ہاتھ سے یوزی گری اور ساتھ ہی وہ خود بھی۔

اوپر راؤنڈ شروع ہونے کی گھنٹی بج رہی تھی۔

امدلی ایئرپورٹ کے نچلے حصے میں جنرل کا لیئر طیارہ گارتھ کو لے جانے کے لیے کھڑا تھا وہیں مارسل سیوی بھی موجود تھا۔

''مجھے تمہارے ساتھ کام کر کے مسرت ہوئی گارتھ۔'' اس نے کہا۔ ''تم لاجواب آدمی ہو۔''

''میں نے تمہارے اندر ایک چوکس آدمی دیکھا ہے مارسل سیوی۔'' گارتھ نے بے تکلفی سے کہا۔ ''سنو میرا ایک کام ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ذہن میں رکھنا اور اپنے رابطوں کو بتا دینا۔ مجھے ایک سام فینزل نامی آدمی کی تلاش ہے یہ ایک کرائے کا ڈیلر ہے۔ اسلحے کا بیوپاری میں اس سے بات کرنے کا متمنی ہوں۔ مجھے اس کا پتا چاہیے۔''

''میں کہہ دوں گا۔'' سیوری نے یقین دلا دیا۔ پھر دونوں نے الوداعی مصافحہ کیا اور گارتھ طیارے میں چلا گیا۔

مونٹی کارلو پہنچ کر ایک سو ڈالر کے نوٹ سے ابتدا کرتے ہوئے گارتھ نے جیوی کے کونسرج سے کہا۔ ''برنڈ ابوڈین کے والد نے مجھے بھیجا ہے کہ میں اسے گھر لے جاؤں۔ وہ کہاں ہوگی۔''

اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کونسرج نے کہا۔ ''عموماً یہ لڑکی اس وقت 'اسکوتا وا' میں ہوتی ہے یہ ایک کسینو ہے بڑے لوگوں کا۔ جاؤ قسمت سے آزما لو۔ اس سے قبل بھی اس کا باپ دو آدمیوں کو اس کے لیے بھیج چکا ہے۔ ایک کو تو اس نے تقریباً مار ہی ڈالا تھا سمندر میں گرا کر..... دوسرے کو اس نے کسی الزام میں گرفتار کرا دیا تھا۔''

''خوب کمال لڑکی ہے۔'' گارتھ نے کہا۔

''تم ذرا محتاط رہنا۔ وہ پرلے درجے کی مکار اور عیاش لڑکی ہے۔''

گارتھ نے ڈرائیور سے کسینو چلنے کو کہا۔ یہ جگہ پرشور تھی یہاں خاصے لوگ تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

برینڈا یہاں موجود تھی اور مرکز نگاہ ہی ہوتی تھی اس کے ساتھ وہی لاطینی جوان موجود تھا جس کی تصویر اس نے برینڈا کے ساتھ دیکھی تھی۔

گارتھ جس وقت اسے غور سے دیکھ رہا تھا برینڈا ایوڈین ایک لمبے بالوں والے جوان کی میز پر رکی جو چار لڑکیوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ ان کی عمریں پندرہ سولہ سال کی تھیں۔

”یہ کون ہے جس کے ساتھ چار لڑکیاں ہیں۔“ گارتھ نے بارٹنڈر سے پوچھا۔

”یہ پرنس وان فروسٹینس ہے...... جرمن تخت شاہی کا دعوے دار۔“

”جرمن شاہی تخت۔“ گارتھ نے حیرت سے کہا۔

”پچھلے ستر برسوں سے تو میں نے اس کے بارے میں کبھی نہیں سنا۔“

بارٹنڈر نے لاتعلقی سے شانے اچھال دیے۔

”تم یہ بات اسی سے کہو۔“ اس نے طنزاً کہا۔

گارتھ کلب کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک پلان ابھر رہا تھا جو خاصا خطرناک سا بھی تھا۔

جوں ہی برینڈا اپنے ساتھی جوان کی طرف پلٹی گارتھ آگے بڑھا۔ پرنس کی میز کی طرف۔

”پرنس۔“ اس نے خم ہوتے ہوتے تعظیم دی اور کہا۔

”اجازت ہو تو میں اپنا تعارف کرادوں۔ میرا نام ہاورڈ ہوجنز ہے میں ایک عرصے سے جرمن تخت شاہی کا مداح رہا ہوں میری دعا ہے کہ آپ کو آپ کا حق مل جائے۔“ اس کے بعد اس نے پرنس کے ہاتھ کو دبایا اور عجلت کے ساتھ وہاں سے ہٹ گیا۔

اب اس کا رخ برینڈا کی طرف تھا۔

”معافی چاہتا ہوں۔“ اس نے برینڈا سے کہا۔

”تم پچیس ہزار ڈالر جیتنے میں میری مدد کرنا پسند کرو گی۔“

”تم ہو کون۔“ برینڈا نے تمکنت سے پوچھا۔

وہ بیضوی چہرے کی ایک دلکش سی لڑکی تھی۔ اس کے بال سرخ تھے جو زیادہ بڑے نہ تھے۔ اس کی آنکھوں میں ویسی ہی شاطرانہ چمک تھی جو گارتھ نے جنرل یعنی اس کے باپ کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔

”میرا نام ایلوس راک ہے۔“ گارتھ نے کہا۔

”میں وہ بھیجتا ہوں جس کا تذکرہ وہ کبھی نہیں کرتے۔ میں نے ابھی پرنس وان سے ایک شرط لگائی ہے۔“

اس نے رک کر پرنس کی طرف دیکھا اور ہاتھ ہلایا۔ پرنس اسے دیکھ رہا تھا اس نے بھی جواباً ہاتھ ہلا دیا۔

”میں نے اس سے شرط لگائی ہے کہ میں یہاں موجود سب سے خوب صورت لڑکی کو لے کر اپنے نجی طیارے میں نکلوں گا اور اسے سیر کراؤں گا۔“

”تو پھر...... تم سمجھو تم ہار گئے۔ جاؤ اور اسے رقم ادا کردو۔“ برینڈا نے تمسخر سے کہا۔

”میں جیتی کا بڑا حصہ تمہیں دے سکتا ہوں۔“

”مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”تم کہو تو میں یہ رقم خیراتی فنڈ میں دے دوں گا۔“

”مسٹر...... یکایک درمیان میں برینڈا کے لاطینی ساتھی جوان نے مداخلت کی۔ ”تم اپنا راستہ لو۔ سینورا کو کوئی دلچسپی نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ گارتھ نے کہا۔ اس نے اس شخص کو آنکھ ماری اور اس کے کان میں جھک کر اس طرح بولا کہ آواز برینڈا کو سنائی دے جائے۔ ”میں نے دیکھ لیا ہے یہ لڑکی تمہاری زیر اثر ہے۔“

”ہرگز نہیں۔“ برینڈا نے چیخ کر کہا۔

”میں کسی کے زیر اثر نہیں۔ چلو میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔“ اس نے گارتھ کا بازو تھاما اور باہر کی طرف چل دی۔

کار کے عقبی حصے میں برینڈا کے ساتھ بیٹھے ہوئے گارتھ نے کہا۔

”بہت خوب۔ میں تو سمجھا تھا تمہارے اندر اسپورٹنگ اسپرٹ نہیں ہے۔“

”تم مجھے جانتے ہو۔“

”ہاں...... مس جوڈین۔“

”تمہارا نام۔“

”ایلوس راک۔“

”کیا تم نیویارک کے ارب پتی راک فیلر کے گھرانے سے ہو۔“

”نہیں مس ہمارے خاندان میں ایک ٹیکسا کو نامی شخص ضرور تھا۔“

برینڈا کی آنکھیں سکڑ گئیں۔

”کیا...... کیا تم مجھے اغوا کر رہے ہو۔“

”نہیں۔ ان معنوں میں نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔“

”پھر کس معنی میں۔“

”مس برینڈا تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔“

برینڈا اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا اور ہونٹ بھینچ کر بیٹھ گئی۔

کار نائس کے ہوائی اڈے پر جا کر رکی۔

وہاں برینڈا کو ایک طیارہ کھڑا نظر آیا جس کی دم پر پانچ ستارے نقش تھے۔

”اچھا آ آ۔“ اس نے لمبی سانس لی۔ ”تو یہ معاملہ ہے۔“

”سمجھا نہیں۔“ گارتھ نے مسکرا کر کہا۔

اسی لمحے لڑکی نے ہاتھ گھمایا۔ مگر گارتھ شاید پہلے سے تیار تھا۔ اس نے اس کے ہاتھ کو ہوا ہی میں پکڑ لیا اور اسے ہلکا سا موڑ کر چھوڑ دیا۔ لڑکی کے لیے یہ حرکت غیر متوقع تھی وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ اس کے باپ کا کوئی نوکر اسے مار بھی سکتا ہے۔ دوسرے لمحے گارتھ نے اسے بے دردی سے گھسیٹا اور بولا۔

”چلو کار سے باہر نکلو۔“

غور وفکر

☆ شدید خواہشات لاحاصل ہوتی ہیں اور یہ ان لوگوں کا مقدر بنتی ہیں جنھوں نے کبھی اس کی حسرت بھی نہ کی ہو۔

☆ جب آپ کو اپنی شخصیت کے علاوہ کچھ نظر نہ آئے تو سمجھ جایئے کہ آپ خود پسندی کے مرض میں مبتلا ہو چکے ہیں۔

☆ عشق وہ مقام ہے جہاں کچھ پانے کے بجائے سب کچھ لٹانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

☆ بعض رشتے ایسے ہوتے ہیں جنھیں برتتے ہوئے پل صراط پر سے گزرنے کا گمان ہوتا ہے۔

☆ غلطی کرنا انسان کی اور معاف کرنا اللہ کی صفت ہے۔

”جزیرہ......“ طیارہ میں بیٹھ کر اس نے پائلٹ کو حکم دیا۔

☆☆

”میرے والد تمہیں نکال باہر کریں گے تم نے مجھے اذیت دی ہے۔ مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔“ دوران سفر برینڈا گارتھ پر چیخی۔

”وہ خدا کرے وہ واقعی مجھے نکال باہر کریں۔“ گارتھ نے کہا۔ ”پہلے میں نے صرف اپنا دفاع کیا تھا۔“

”کیا مطلب۔“ برینڈا نے اسے گھورا۔ ”تم چاہتے ہو تمہیں نکال دیا جائے۔“

”ہاں...... یہ ایک لمبی کہانی ہے۔“

برینڈا نے اسے دیکھا اور بولی۔ ”مجھے اپنی کہانی سناؤ۔“

”یہ تمہارے کام کی نہیں۔“

”تم مجھے سناؤ۔“ لڑکی بچوں کی طرح مچلی۔

گارتھ نے محسوس کیا کہ بہ ظاہر درشت اور بے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سمت سی یہ لڑکی اندر سے متعدد پے چیدگیوں کا شکار ہے۔

"مجھے اپنی کہانی سناؤ۔ پھر میں تمہیں اپنی کہانی سناؤں گی۔"

گارتھ نے اسے شراب کا ایک گلاس دیا۔

اپنی جگہ بیٹھ کر اس نے کہا۔ "میری ایک بیوی تھی اور ایک بچی تھی....." اس کی آواز میں کرب گھلنے لگا۔

پہلی بار اس نے اپنی کہانی کسی کو سنائی تھی۔ جب وہ بول چکا تو اسے احساس ہوا کہ یہ لڑکی بھی اندر سے خاصی دکھی ہے اس کی کہانی کچھ ایسی ہی تھی۔

رات بھر سفر کے بعد جب طیارہ اتر رہا تھا وہ دونوں ایک دوسرے کے ہم راز اور آشنا بن چکے تھے۔

☆☆

جزیرے کے اڈے پر ماریٹا اپنی کار میں اسے نظر آئی' گارتھ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"ارے تم یہاں..... تم اسکول سے کب آئیں۔" گارتھ نے ماریٹا سے پوچھا۔

"میرے والد کے پتے کا آپریشن ہوا ہے۔ یہ ایک ایمرجنسی کیس تھا۔"

"اچھا..... اب ان کا کیا حال ہے۔"

"ٹھیک ہیں۔" ماریٹا نے برنیڈا کی سمت دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ تمہارے ساتھ ہوگی۔"

اسی لمحے برنیڈا نے مداخلت کی اور گارتھ سے بولی۔ "تم نے اپنے سارے راز تو مجھے بتا دیے لیکن یہ کیوں نہیں بتایا کہ تم اب اسی جزیرے پر رہ رہے ہو۔"

"میں نے بتایا تو۔"

معاً ماریٹا نے اس کی بات کاٹ دی۔ "خوب تو تم لوگوں کے درمیان رازوں کا اشتراک بھی ہو چکا ہے۔" اس نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

"ماریٹا تم کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔" گارتھ نے جلدی سے اپنی صفائی پیش کرنی چاہی' صاف نظر آ رہا تھا کہ یہ دونوں عورتیں ایک دوسرے کی حریف ہیں اور خود گارتھ اب ان کے درمیان پسنے والا تھا۔

"اچھا رخصت۔" معاً ماریٹا نے گارتھ سے کہا اور اپنی کار چلا دی۔

گارتھ منہ کھولے اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ ادھر برنیڈا بھی ایک دم سے اچھلی اور اس وین پر جا چڑھی جو انہیں لینے کے لیے آئی تھی اندر پہنچ کر برنیڈا نے چیخ کر ڈرائیور سے کہا۔

"وین جاؤ۔ یہ شخص ایک سابق فوجی ہے۔ خود ہی کسی طرح گھر پہنچ جائے گا۔"

اور پھر گارتھ نے وین کو متحرک ہوتے دیکھا۔

وہ حیرانی سے کھڑا راستے کو تک ہی رہا تھا کہ اس کا ملازم لڑکا ٹو کی اس کی جیپ میں وہاں پہنچا اس نے اتر کر ایک پھولا ہوا سا بڑا سا لفافہ گارتھ کو دیا اور بولا۔

"جنرل نے کہا ہے کہ تم فوراً ہی روانہ ہو جاؤ ایک جہاز تمہارے لیے تیار کھڑا ہے۔" اس نے ہینگر کی سمت اشارہ کیا' جدھر ایک لیئر طیارہ کھڑا تھا۔

گارتھ نے فولڈر کھولا اور پڑھی ملک غالا کا ایک نقشہ تھا۔ افریقہ کے مغربی حصے میں ایک چھوٹا سا ملک جو ابھی حال ہی میں نمیبیا سے ٹوٹ کر وجود میں آیا تھا۔ یہاں پر ہیرے کی کانیں پائی جاتی تھیں ان دنوں وہاں زبردستی خانہ جنگی جاری تھی اور حکومت کے لیے تین گروپ باہم نبرد آزما تھے۔

اس نے فولڈر بند کر دیا۔ ٹو کی کا شانہ تھپکا اور جہاز کی طرف چل دیا۔

وہ سوچ رہا تھا۔ "یہ اچھا ہی ہوا کہ میں سچ مچ ایک میدان جنگ پر بھیج دیا گیا ہوں..... ورنہ یہاں تو ان دو عورتوں کے درمیان میں خود ہی ایک میدان جنگ بن جاتا۔ ہمت تیرے کی۔"

خونی ہاتھ

ایم الیاس

اس رات بھی کمرے میں گھپ اندھیرا سا تھا۔ اس لیے کہ آسمان گھرے گھرے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ مغرب کے بعد بادل اچانک چاروں طرف سے اٹھ آئے تھے اور تھوڑی دیر تک موسلا دھار بارش بھی ہوئی تھی۔ اس کے بعد بارش کا سلسلہ تھم گیا تھا۔ گرمی اور حبس کا وہی عالم تھا جو کئی دنوں سے چلا آ رہا تھا۔ میں اچانک گھری نیند سے بیدار ہوگیا۔ گھری نیند سے اس طرح بیدار ہو جانے کی وجہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آئی..... حبس تو تھا لیکن چھت کا پنکھا پوری رفتار سے چل رہا تھا۔ میں نے سونے کی کوشش کی تو لگا کہ نیند آنکھوں سے کوسوں دور ہے۔

اس شمارے کے لیے..... ایک دلگداز تحریر

نومبر کا پہلا عشرہ تھا۔ سردی کی آمد آمد تھی۔ نومبر کے آغاز سے پہلے ہی جاڑا شروع ہو جاتا تھا۔ اس مرتبہ ایسا نہ ہوا تھا۔ عالم شہاب الدین نماز فجر کے بعد سورج کے طلوع ہونے تک کلام پاک کی تلاوت کرتے رہے۔ انہوں نے ایک بات محسوس کی کہ ایک خوب صورت' وجیہہ اور دراز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قد نوجوان ایک جانب پراسرار انداز سے بیٹھا ہوا۔ وہ ان کی نظروں کی گرفت میں ہیں۔ گو انہیں اس کی ذات سے کوئی خوف ڈر اور خطرہ نہیں تھا۔ اس لیے کہ نہ تو کوئی دشمن تھا اور نہ وہ کسی کے دشمن تھے بلکہ ان کی خیر خواہوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ مسجد میں صرف وہ تھے۔ باقی سب تلاوت کر کے ان سے سلام علیک کر کے جا چکے تھے۔ وہ عموماً سب سے آخر میں مسجد سے نکلتے تھے۔ آج اب اس وقت یہ نوجوان موجود تھا۔ یہ نوجوان ان کے لیے اجنبی تھا۔ انہوں نے کبھی اسے دیکھا نہیں تھا۔ وہ اسے پہلی بار دیکھ رہے تھے۔

وہ کوئی جرم پیشہ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ اپنی وضع قطع اور چہرے مہرے سے مہذب اور متمول لگ رہا تھا۔ وہ یہ سمجھے کہ یہ کوئی کاروباری شخص ہے۔ کسی شہر سے آیا ہوا ہے۔ چوں کہ دکانیں نو بجے سے کھلنا شروع ہو جاتی ہیں شاید اس لیے وہ مسجد میں بیٹھا ہوا وقت گزاری کر رہا ہے۔ وہ اس بات پر متعجب تھے کہ اس نوجوان نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیوں کیا ہوا ہے۔

جس وقت تلاوت کلام پاک کر کے مسجد سے نکل رہے تھے وہ نوجوان بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور لپک کر ان کے پاس آیا۔ اس نے انہیں بڑے تپاک سے سلام کر کے مصافحہ کیا اور پوچھا۔ ”آپ عامل شہاب الدین صاحب ہیں نا.....“

”ہاں۔“ انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ پھر انہوں نے اسے غور سے اور ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ یہ نوجوان نہ صرف امیر کبیر ہے بلکہ با اخلاق، ملنسار اور تعلیم یافتہ بھی ہے۔ لب و لہجے سے اس شہر کا معلوم نہ ہوتا تھا بلکہ چٹاگانگ شہر کا معلوم ہوتا تھا۔ بارہ سال اور چٹاگانگ کے باشندوں کے لب و لہجے میں بڑا فرق تھا..... لیکن انہوں نے اس کے بشرے سے اندازہ کیا کہ وہ سخت پریشان اور متفکر سا ہے۔ اس کی آنکھیں بھی بہت خوب صورت اور بڑی بڑی تھیں۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ یہ شب بیداری کا نتیجہ تھی۔ انہوں نے اس کے اخلاق سے متاثر ہو کر پوچھا۔ ”میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

اس نوجوان نے انہیں بتایا کہ وہ چٹاگانگ سے شہر سے خاص طور پر ان کی خدمات حاصل کرنے آیا ہوا ہے۔ ”اگر آپ کچھ وقت دیں تو اپنا سنگین اور اذیت ناک مسئلہ بیان کروں۔ جس نے زندگی اجیرن بنا رکھی ہے۔ امید کہ وہ اسے ناامید اور مایوس نہیں کریں گے۔“

عامل شہاب الدین اسے اپنی رہائش گاہ پر لے آئے۔ اسے نشست گاہ میں بٹھا کر اندر گئے اور اپنی اہلیہ سے ناشتا تیار کرنے کے لیے کہا۔ مسجد سے گھر جاتے وقت راستے میں اس نوجوان نے انہیں بتایا تھا کہ ان کا شہرہ چٹاگانگ میں پھیلا ہوا ہے۔ لوگ بڑے عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ محفلوں میں بھی آپ کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔

نوجوان کی زبانی یہ بات جان کر انہیں بڑی حیرت ہوئی تھی۔ اس لیے کہ وہ کبھی بارہ سال سے باہر نہیں گئے تھے اور نہ ہی باہر کے کسی فرد نے ان کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ چٹاگانگ میں بڑے بڑے عامل حضرات اور بزرگ موجود تھے جن کے علم و فضل کے وہ خود بے حد معترف تھے۔ اس نوجوان کا ان پر انہیں ترجیح دینا نہ صرف تعجب خیز بلکہ ناقابل یقین بھی تھا..... جب انہوں نے چند ایک نام لے کر اس سے کہا کہ چٹاگانگ میں اتنے بڑے عامل بزرگوں کے ہوتے ہوئے تم نے میرے پاس آنے کی زحمت کیوں کی۔

اس نے جواب دیا کہ..... اس نے ان کی خدمات حاصل کی تھیں مگر ان سے اس کا مسئلہ حل نہ ہو سکا۔

اس نوجوان کی یہ بات سن کر ان کا تجسس اور اشتیاق مزید بڑھا۔ پھر ان کے کہنے پر نوجوان نے اپنی کہانی کا آغاز کیا۔

”میرا نام ہاشم خوندکر ہے۔ میں چٹاگانگ کے ضلع آٹھ ہزاری کا رہنے والا ہوں۔ میں ایک زمین دار ہوں۔ میرے والد عرصہ ہوا فوت ہو چکے ہیں بھائی کوئی نہیں ہے تین بہنیں تھیں وہ بیاہی جا چکی ہیں۔ دو بہنیں تو ڈھاکا شہر میں ہیں اور ایک بہن کھلنا شہر میں رہتی ہے۔ دو برس قبل میری شادی سندیپ جزیرے میں ہوئی تھی۔ لڑکی کے والد سعید اکبیر بھی ایک چھوٹے سے زمین دار ہیں۔ ان کی لڑکی رضیہ میری بیوی ہے۔ جو اس جزیرے کی سب سے خوب صورت لڑکی تھی۔ اس کی خوب صورتی کی تعریف سن کر میں نے اپنا رشتہ بھیجا اور وہ رشتہ قبول کر لیا گیا۔ یہ میری خوش قسمتی کہہ لیں کہ میری بیوی حسین سیرت ثابت ہوئی بلکہ وہ میرے اندازے سے کہیں زیادہ گھڑ اور سلیقہ شعار ثابت ہوئی۔ میں اپنی قسمت پر نازاں تھا..... ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ایک عورت میں بہت ساری خصوصیات جمع ہو جائیں۔ شادی کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میری بیوی میکے جانا پسند نہیں کرتی..... کبھی اس کے والد اسے لینے آ گئے اور بہت زیادہ اصرار کیا تو وہ صرف ایک دن میکے میں رہ کر اس طرح سے واپس آتی تھی جیسے زنداں سے رہائی پا کر آئی ہو۔ حالانکہ لڑکیاں شادی کے بعد میکے جانے کے لیے بے چین رہتی ہیں۔ جب وہ میکے جاتی ہیں تو اس طرح خوش ہو جاتی ہیں جیسے برسوں زندان میں رہنے کے بعد جا رہی ہوں میں اپنے تئیں یہ سمجھتا تھا کہ اسے مجھ سے بہت زیادہ محبت ہو گئی ہے اور میری جدائی اس کے لیے سوہان روح ہوتی ہے۔ اس لیے وہ میکے جانا نہیں چاہتی۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں میاں بیوی میں شدید محبت ہونا فطری امر ہوتا ہے۔

پھر میں نے محسوس کیا کہ جب بھی اس کے والدین اسے اپنے گھر ساتھ لے جانے کے لیے آتے ہیں وہ خوف زدہ سی ہو جاتی ہے۔ مختلف حیلے بہانے سے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیتی ہے۔ اس کے والد بہت زیادہ اصرار کرتے تو وہ رونے لگتی یا پھر بیماری کا بہانہ کر کے بستر سے لگ جاتی تھی۔ یہ دیکھ کر اس کے والد نے اسے اپنے ہاں لے جانا چھوڑ دیا۔ جب بھی اس کے والدین اور بھائی بہنوں کا دل ملنے کے لیے کرتا تو وہ چلے آتے..... وہ بڑی خوش ہو جاتی اور خوب آؤ بھگت کرتی۔

یہ ماہ جون کی بات ہے۔ شاید پیر کا دن تھا۔ اس رات جو موسلا دھار بارش ہوئی تو وہ رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ جس الگ تھا۔ لہٰذا میں نے کمرے کی تمام کھڑکیاں کھول دیں۔ میں آپ کو بتا دوں کہ میرا مکان دو منزلہ ہے۔ دوسری منزل پر ہماری رہائش ہے۔ پہلی منزل پر میں نے اناج کا گودام بنا رکھا ہے۔ میں گہری نیند میں غرق تھا کہ ایک دل خراش چیخ کی آواز سے آنکھ کھل گئی۔ میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا..... پھر ایک اور چیخ سنائی دی۔ یہ چیخ میری بیوی کی تھی۔ میں نے گھبرا کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا تو میرے برابر سو رہی تھی۔ اس کا چہرہ ایک دم سفید پڑتا چلا گیا تھا۔ اس کے چہرے پر لہو کی ایک بوند بھی نہیں رہی تھی۔ اس کی آنکھیں دہشت سے لٹی ہوئی تھیں اور اس کا چہرہ پسینے میں تر تھا اور اس کے سینے میں سانسیں ہچکولے کھا رہی تھیں۔

میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا ہوا رضیہ..... تم نے چیخیں کیوں ماریں۔“

وہ مجھ سے ایک دم سے لپٹ گئی۔ پھر وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔ ”ہاتھ..... ہاتھ..... وہ ہاتھ لہرا گیا۔“

”کون سا ہاتھ ہے..... کس کا ہاتھ ہے.....“ میں نے اس کا شانہ تھپ تھپاتے ہوئے دریافت کیا۔

اس نے جواب دینے کی بجائے کھڑکی کی جانب اشارہ کیا۔ اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا نہیں بلکہ میرے سینے میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔

وہ کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھڑکی کے پاس جا کر دیکھوں..... میں سمجھ گئی کہ کوئی چور تھا جو کھڑکی کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھ کر اوپر آنے کی کوشش کر رہا تھا کہ رضیہ نے دیکھ لیا۔

میں بستر سے اترنے لگا تو رضیہ نے فوراً ہی میرا بازو پکڑ لیا اور گڑگڑانے لگی۔

"خدا کے لیے آپ نہ جائیں..... کہیں وہ ہاتھ آپ کا گلا نہ دبا دے۔ وہ ہاتھ بہت خطرناک ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ خوف کی وجہ سے اپنے ہوش وحواس میں نہیں رہے..... پھر بھی میں نے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ پھر کھڑکی کے پاس جا کر باہر جھانکا۔ چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ دوسری دونوں کھڑکیوں سے بھی جھانکا اور ہر سمت دیکھا۔ وہاں دور دور تک کسی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ بارش کا سلسلہ ابھی تھما نہیں تھا..... پھر ایک اور خیال ذہن میں آیا تو میں اس کھڑکی کے پاس گیا جس کی طرف رضیہ نے اشارہ کیا تھا..... اس کی چوکھٹ پر نہ تو مٹی لگی تھی اور نہ ہی کسی ہاتھ کے نشانات تھے۔ اگر کوئی چور آیا ہوتا تو اس کے ہاتھ میں مٹی لگی ہوتی یا پھر اس کے ہاتھ گیلے ہوتے۔ اس صورت میں چوکھٹ پر دونوں میں سے کوئی ایک چیز لگی ہوتی۔ چوکھٹ اک دم خشک اور صاف تھی۔ اس پر بارش کا پانی بھی نہیں پڑ رہا تھا۔ اس لیے کہ کھڑکی کے اوپر چھجا تھا۔ بارش کا رخ دوسری طرف تھا۔

میں نے رضیہ کے پاس جا کر اسے تسلی دی کہ کوئی ہاتھ وغیرہ نہیں ہے..... تم نے شاید کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے جیسے ہی تمہاری آنکھ کھلی، تمہیں وہم ہو گیا کہ کوئی چور چوکھٹ پر ہاتھ رکھ چڑھ رہا ہے تاکہ کمرے میں گھس کر چوری کرے۔

میری بات سن کر رضیہ کا خوف قدرے کم ہوا لیکن اس نے اصرار کیا کہ میں تمام کھڑکیوں کے پٹ بند کر دوں..... پھر میں نے اسے سمجھایا کہ اس طرح تو کمرے میں گھٹن ہو جائے گی۔ اس لیے کہ

دیکھتے ہی وہ بے اختیار چیخ پڑی تھی۔ معلوم نہیں کیا بات تھی کہ ہاتھ نظر آنے سے چند لمحے پہلے اس کی آنکھ آپ ہی آپ کھل گئی تھی۔ میرے دل کے کونے میں شک پیدا ہوا کہ کہیں ایسا تو نہیں کوئی مرد رضیہ کو چوری چھپے دیکھنے یا کسی برے ارادے سے تو نہیں آ رہا۔ رضیہ کی چیخ سنتے ہی فرار ہو جاتا ہے۔ میرے بیدار میں چار پانچ منٹ لگ جاتے ہیں۔ اس کے لیے یہ لمحات بہت ہوتے ہیں۔ اس سے فائدہ اٹھا کر وہ بھاگ جاتا ہے۔

میں اس امکان کو اس لیے بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ رضیہ کی خوب صورتی کا چرچا سارے علاقے میں تھا۔ رضیہ بہت کم باہر نکلتی تھی۔ جب بھی کسی تقریب میں یا کسی سے ملنے جاتی تھی، مرد اور عورتیں اس کی ایک جھلک دیکھنے بے تاب ہوتی تھیں۔ بعض اوقات مجھے ان مردوں اور لڑکوں پر بھی سخت غصہ آتا تھا جو اسے مختلف حیلے بہانے سے گھورا کرتے تھے۔ اس کے حسن نے شاید کسی مرد کو پاگل کر دیا تھا۔ میرے پاس ایک بندوق تھی۔ میں نے اسے لوڈ کر لیا۔ تین راتیں مسلسل آخری پہر تک جاگتا رہا۔ یہ ہاتھ مجھے دکھائی نہیں دیا جس نے نہ صرف رضیہ کا چین وسکون غارت کر دیا تھا بلکہ مجھے بھی پریشان کر دیا تھا۔

پھر میں نے اسے سمجھایا کہ کوئی ہاتھ وغیرہ نہیں ہے..... یہ تمہارا واہمہ ہے۔ یہ کالی بلی ہے جو دودھ پینے کے لیے چڑھ آتی ہے اور تمہاری چیخ کی آواز سے خوف زدہ ہو کر بھاگ جاتی ہے۔ میری باتوں کا اس پر خاصا اثر ہوا۔

چوتھے روز اس نے نہا کر بال کھلے چھوڑے اور اپنا ایک بہترین بھڑکیلا سوٹ پہنا۔ پھر وہ میری خالہ سے ملنے ملازمہ کے ساتھ چلی گئی۔ دن ڈوبنے سے پہلے واپس آ گئی۔ وہ خوش تھی۔ اسے خوش دیکھ کر میں بھی بہت خوش ہوا کہ ایک اذیت سے تو نجات ملی۔ مگر میری اور رضیہ کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ اس لیے کہ اس رات ہم خوش خوش سوئے تو بارہ بج چکے تھے۔ تھکن اور نشہ سا چھایا ہوا تھا اس لیے جلدی ہی گہری نیند کے سمندر میں غرق ہو گئے تھے۔

اس رات بھی کمرے میں گھپ اندھیرا سا تھا۔ اس لیے کہ آسمان گہرے گہرے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ مغرب کے بعد بادل اچانک چاروں طرف سے اٹھ آئے تھے اور تھوڑی دیر تک موسلا دھار بارش بھی ہوئی تھی۔ اس کے بعد بارش کا سلسلہ تھم گیا تھا۔ گرمی اور حبس کا وہی عالم تھا جو کئی دنوں سے چلا آ رہا تھا۔ میں اچانک گہری نیند سے بیدار ہو گیا۔ گہری نیند سے اس طرح بیدار ہو جانے کی وجہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آئی..... حبس تو تھا لیکن چھت کا پنکھا پوری رفتار سے چل رہا تھا۔ میں نے سونے کی کوشش کی تو لگا کہ نیند آنکھوں سے کوسوں دور ہے۔ پھر میں نے رضیہ کی جانب کروٹ بدلی اور اسے دیکھنے لگا۔ وہ گہری نیند میں غرق تھی۔ جب تھکن سے اس کا بدن چور چور ہوتا تھا تب وہ اس میں گہری نیند سوتی تھی۔ رات بھی وہ تھکن سے چور چور ہوئی تھی اور اس کی جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ اس کے لانبے، چمکیلے، ریشمی سیاہ بال تکیے پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے حسین چہرے پر ایک معصوم سی حسین مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور اس کے گلابی ہونٹوں پر ایک دلاویز تبسم رقصاں تھا جیسے وہ کسی سہانے خواب میں کھوئی ہوئی ہو۔ گھپ اندھیرے میں اس کا حسن قیامت بن گیا۔ میرے جذبات میں تلاطم پیدا ہونے لگا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اس کی نیند اور آرام میں خلل ڈالنا نہیں چاہیے..... غریب رات دن میرے آرام کا کتنا خیال رکھتی ہے۔ نوکروں کو میرے کاموں کو کرنے نہیں دیتی ہے۔ گو وہ میرے جذبات کی فراوانی کے لیے انکاری تو نہیں ہو گی لیکن میرے نزدیک یہ خود غرضی ہو گی۔

دیکھتے ہی دیکھتے اندھیرا اور گہرا ہو گیا..... اتنا گہرا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ حتیٰ کہ رضیہ کا چہرہ بھی جو سرخ وسفید تھا۔ آسمان پر اور گہرے بادل چھا گئے تھے۔ دوسرے لمحے زوردار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بارش شروع ہوگئی۔ پھر میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر اس کے ہاتھ پر اس ارادے سے رکھ دیا کہ وہ بیدار ہوجائے اور ہم پھر اس بارش کا لطف اٹھائیں۔ چھ سات فٹ بہ مشکل گزرے ہوں گے میں نے اپنے ہاتھ کی پشت پر ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ میں یہ سمجھا کہ یہ رضیہ کا ہاتھ ہے لیکن دوسرے ہی لمحے محسوس کیا کہ رضیہ کے ہاتھوں میں وہ پھولوں جیسی نرمی...... محبت کی گرمی اور گداز پن نہیں ہے...... انگلیاں بھی پتلی، لمبی اور نازک سی نہیں ہیں...... یہ کوئی اور ہی ہاتھ ہے...... بے حد سرد جیسے برف کا تودہ...... اس میں کھردرا پن ہے اور فولاد کی جیسی سختی ہے...... انگلیاں موٹی اور سلاخوں جیسی ہیں...... پھر وہ ہاتھ میرے ہاتھ پر کسی کن کھجورے کی طرح رینگنے لگا۔ میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

اس لمحے سب سے پہلا خیال جو آیا وہ یہ تھا کہ کہیں یہ وہ پراسرار ہاتھ تو نہیں ہے جو رضیہ دو مرتبہ دیکھ چکی ہے...... شاید کسی بدمعاش کا ہاتھ ہے جو میرے ہاتھ کو رضیہ کا ہاتھ سمجھ کر اس پر رینگ رہا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے اپنے حواس اور اپنی ساری قوت مجتمع کی اور اپنی پوری قوت سے اپنے ہاتھ کو کھینچ کر ایک دم سے جھٹکا۔ پھر میں نے فرش پر کسی چیز کے دھپ سے گرنے کی آواز سنی۔ پھر میں بجلی کی سی تیزی سے پلنگ سے خود کر نیچے آیا اور پھر سوئچ بورڈ کی طرف بڑھا۔ سوئچ آن کیا۔ کمرا ایک دم سے روشنی میں نہا گیا۔ میں نے دیکھا، کمرے میں کوئی نہیں ہے۔ میں نے فوراً ہی فرش کی طرف اور پلنگ کے نیچے جھانک کر دیکھا۔ شاید وہ بدمعاش نیچے نہ چھپا ہو۔ پلنگ کے نیچے بھی کوئی نہیں تھا۔ معاً میری نظر سامنے والی کھڑکی پر پڑی تو میں دم بخود رہ گیا۔ ذرا دیر کے لیے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ میں نے منظر دیکھا وہ میرے لیے ناقابل یقین تھا۔ میں نے کھڑکی کی چوکھٹ پر ایک سیاہ کا انتہائی بدصورت ہاتھ دیکھا۔ یہ ہاتھ کلائی تک کٹا ہوا تھا۔ اگر میں مضبوط اعصاب کا مالک نہ ہوتا تو بے ہوش ہو کر گر پڑتا۔ جتنی دیر میں میں نے بندوق اٹھائی اتنی دیر میں وہ ہاتھ اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ کمرے میں روشنی ہونے کی وجہ سے رضیہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے مجھے جو بندوق لیے کھڑے اور پریشان سا دیکھا تو فوراً اٹھ بیٹھی۔

اس نے گھبرا کر خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔ ”کیا بات ہے......۔ یہ بندوق کس لیے کھڑے ہیں......۔“ میں نے اسے مختصر الفاظ میں وہ واقعہ سنایا تو اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

میں نے اسے سمجھایا کہ رونے کی ضرورت نہیں...... حوصلے کی ضرورت ہے۔ ہمارا کوئی دشمن ہے جو سفلی عمل سے ہماری جان لینے کی کوشش کررہا ہے۔ میں کل ہی کسی بڑے عامل سے مل کر اس کے جادو کا توڑ کرتا ہوں۔

میں فجر کی نماز پڑھتے ہی شہر چلا گیا۔ پھر میں ایک عامل کو لے کر مغرب سے پہلے گھر پہنچا تو دیکھا کہ رضیہ بے ہوشی کی حالت میں بستر پر پڑی ہے۔ اس کے پاس میری خالہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ رضیہ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے ہی رضیہ بے ہوش ہوئی تھی اور ایک نوکر ڈاکٹر کو بلانے گیا ہوا تھا۔ میں عامل صاحب کو کمرے میں لے آیا۔ انہوں نے ایک گلاس منگوا کر کچھ پڑھ کر پانی کو دم کیا اور اس گلاس کے پانی میں سے چند چھینٹے اس کے منہ پر دے مارے۔ چند لمحوں کے بعد اسے رفتہ رفتہ ہوش آنے لگا۔

رضیہ جب پوری طرح ہوش میں آگئی تو اس نے خوف زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ مجھے اور گھر والوں کو دیکھ کر اس کا خوف قدرے کم ہوا۔ پھر میں نے عامل صاحب کو نشست گاہ لے جا کر بٹھایا۔ نوکروں سے کہا کہ رات کا کھانا تیار کریں۔ جب نوکر چلے گئے تو میں اور خالہ کمرے میں آگئے۔ تب میں نے رضیہ سے پوچھا کہ

تمہارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں کچھ دیر تک بیٹھی اخبار پڑھتی رہی۔ پھر مجھے نیند آنے لگی تو میں نے دروازہ بند کیا اور سونے کے لیے بستر پر جا کر دراز ہوگئی۔ گہری نیند سو گئی۔ سونے سے پہلے میں نے تمام کھڑکیاں بند کرلی تھیں۔ میری آنکھ کھلی تو میں نے دروازے پر دستک کی آواز سنی۔ میں سمجھا کہ آپ آگئے ہیں۔ میں نے بستر سے نکل کر بال اور لباس درست کیا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھولا بھی نہیں تھا کہ پھر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ فوراً ہی کھول دیا۔ پھر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ باہر کوئی بھی نہیں ہے۔ راہ داری خالی پڑی ہے۔ سامنے والے کمرے کے دروازے بند تھے اور باہر سے ان کی کنڈی لگی ہوئی تھی۔ معاً میری نظر فرش پر پڑی تو میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ ایک خوفناک انتہائی بدصورت اور کٹا ہوا ہاتھ میرے پیروں کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ اس ہاتھ کو دیکھ کر میری جان ہی نکل گئی۔ اس لمحے معلوم نہیں کہاں سے مجھ میں اتنی طاقت آگئی کہ میں نے اس ہاتھ کو ایک لات رسید کی وہ ہاتھ کمرے سے باہر ہوگیا۔ اس کے باہر ہی میں نے جھٹ سے دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی لگا دی۔ پھر دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی اور آنکھیں بند کر کے لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ میرا بدن پسینے سے بری طرح بھیگ گیا۔ چند لمحوں کے بعد میری سانسیں اور دل قابو میں آیا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ پھر میں کھڑکی کی طرف بڑھی تاکہ کھڑکی کا پٹ کھول کر نوکروں کو آواز دے کر بلاؤں۔ کھڑکی کی طرف بڑھتے ہوئے میرے قدم رک گئے اور میرے جسم کا سارا خون خشک ہو کر رہ گیا۔ وہ کٹا ہوا ہاتھ قالین پر کھڑا ہوا تھا اور میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے ایک زور دار چیخ ماری اور پلٹ کر دروازے کی طرف بھاگی۔ میں نے جلدی اور بدحواسی کے عالم میں چٹخنی گرائی۔ دروازہ کھولا ہی تھا کہ اس ہاتھ نے میرے دائیں پیر کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس ہاتھ کی گرفت اتنی سخت تھی کہ مجھے اپنے پیر کی ہڈی چٹختی محسوس ہوئی۔ میں زور زور سے چیخنے لگی۔ دوسرے لمحے دہشت سے بے ہوش ہوگئی۔ پھر کیا ہوا مجھے نہیں معلوم...... میری خالہ نے جو رضیہ کی زبانی کٹے ہوئے ہاتھ کا واقعہ سنا تو وہ خوف سے بے ہوش ہوگئیں۔ وہ کمزور دل کی تھیں۔ اتنی دیر میں ڈاکٹر آگیا تھا۔ اس ڈاکٹر نے انہیں انجکشن دیا۔ وہ ہوش میں آئیں تو اس قدر خوف زدہ تھیں کہ ایک لمحے کے لیے بھی میرے ہاں رکنا نہیں چاہتی تھیں۔ میں نے ایک نوکر کے ہاتھ انہیں ان کے گھر روانہ کردیا۔ پھر عامل صاحب کو جا کر رضیہ کے ساتھ پیش آنے والا تازہ واقعہ بھی سنایا۔ عامل صاحب نے کہا کہ وہ رات میرے کمرے میں گزاریں گے۔ ہم سب سے نیچے والے کمرے میں آگئے۔ برابر کے کمرے میں نوکر میاں بیوی تھے۔ ان کے کانوں میں کٹے ہوئے ہاتھ کا قصہ پڑ چکا تھا۔ اس لیے وہ دونوں میاں بیوی بھی بے حد خائف اور پریشان تھے۔

عامل صاحب نے رات کمرے میں جانے سے پہلے ہم سے ایک لوہے کا یا لکڑی کا صندوقچہ طلب کیا تھا۔ ہم نے ایک لوہے کا صندوقچہ ان کے حوالے کردیا تھا۔ ساری رات ہم نے آنکھوں پر کاٹی...... رات کے دو بجے ہم نے اوپر والے کمرے سے عامل صاحب کی گرج دار آوازیں سنیں...... بھیانک اور قہقہوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں...... فجر کی اذان کے بعد عامل صاحب نیچے آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک صندوقچہ تھا۔ انہوں نے بتایا کہ اس ہاتھ کو اس صندوقچے میں قید کردیا ہے۔ لہٰذا اسے لے جا کر سمندر میں پھینکنا ہوگا...... صبح ناشتا کرنے کے بعد میں اور عامل صاحب چٹاگانگ روانہ ہوگئے۔ انہوں نے مجھے راستے میں بتایا کہ یہ کٹا ہوا ہاتھ تمہارا نہیں تمہاری حسین و جمیل بیوی کا دشمن تھا۔ وہ تمہاری بیوی کی عزت سے کھیلنے کے درپے تھا۔ وہ ہاتھ ایک مرد کے روپ میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آتا..... اس نے تمہاری بیوی کو تالاب یا پھر گھر کے کسی ایسی جگہ نہاتے دیکھ لیا تھا۔ وہ بے لباس نہا رہی تھی۔ جس سے وہ پاگل ہو گیا تھا۔ اب میں نے اسے قید کر دیا ہے۔ اب یہ کبھی تنگ نہیں کرے گا۔ میں نے تمہاری بیوی کے اس درندہ دشمن کو جو اس علاقے میں چھپا ہوا تھا اسے یہ علاقہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔ عامل صاحب نے مجھے یہ بھی بتایا کہ دشمن تمہارے سسرالی رشتہ داروں میں ہے۔ اس نے تمہاری بیوی کا رشتہ مانگا تھا۔ اسے رشتہ دینے سے انکار کر دیا گیا۔ وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکا۔ اس نے ایک سفلی علوم کے ماہر سے جادو سیکھ لیا۔ وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتا جب تک اپنا مقصد حاصل نہ کرتا..... وہ ہاتھ بن کر آتا رہا تھا۔ اسے موقع نہ ملا۔ موقع ملتا تو وہ پھر اپنے اصل روپ میں آ جاتا۔

چٹا گانگ کی بندرگاہ پہنچ کر میں نے ایک تیز رفتار لانچ کرائے پر حاصل کی' کوئی تیس میل دور جانے کے بعد اس صندوقچے..... کو سمندر میں پھینک دیا۔ پھر واپس آ گئے۔ پھر میں عامل صاحبہ کو ان کے گھر چھوڑ کر واپس آ گیا۔

دوسرے دن جمعہ تھا۔ میں نے اس شیطان ہاتھ سے نجات پانے کی خوشی میں قرآن خوانی منعقد کی۔ عورتوں کو بلا کر میلاد کیا۔ غریبوں میں نہ صرف کھانا کھلایا بلکہ ان میں کپڑے بھی تقسیم کیے۔ نوکروں کو بھی جوڑے دیے۔

دو مہینے کا عرصہ خیر و عافیت سے گزر گیا۔ ایک تو دل سے اس ہاتھ کا ڈر اور خوف نکل گیا تھا اور دوسرا ان روح فرسا واقعات کو بھول چکے تھے۔ دو ایک مرتبہ مجھے کاروبار کے سلسلے میں گومیلا' رنگ پور' سید پور اور کھلنا شہر جانا پڑا تھا۔ رضیہ نے نوکرانی کی نوجوان بیٹی کو اپنے کمرے میں سلا لیا تھا۔ اسے کسی قسم کا ڈر اور خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ اس کا حوصلہ اور اعتماد لوٹ آیا تھا۔

ستمبر کا پہلا ہفتہ تھا۔ تین دن قبل رضیہ کے والدین' بھائی اور بہنیں اس سے مل کر اور دو دن رہ کر گئے تھے۔ اس نے اپنے گھر والوں سے کہا تھا کہ وہ آئندہ ہفتے اپنے میکے آ کر ایک ہفتہ رہے گی۔ سبھی کو بڑی حیرت اور خوشی ہوئی تھی۔ اس کی زبان سے یہ بات سننے کے لیے بھی ترس گئے تھے اور کب سے ترس رہے تھے۔ میں نے اور رضیہ نے انہیں دانستہ اسے کٹے ہوئے ہاتھ کا واقعہ دانستہ نہیں سنایا تھا۔

رضیہ خوش تھی۔ اسے خوش دیکھ کر میں بھی خوش ہوتا تھا۔ آخر میں کیوں نہ خوش ہوتا۔ یہی تو ایک ہستی تھی جو مجھے جان سے زیادہ عزیز تھی۔ ایک رات ہم دونوں ایک دوست کی بہن کی شادی میں جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ یہ چودھویں کی رات تھی۔ چاند اپنے شباب کی آخری منزل پر تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحے بھی نہیں گزرے تھے کہ رضیہ نے میرا شانہ ہلایا۔

دوسرے لمحے مسکرا کر آنکھیں کھول دیں اور اس کی طرف دیکھا..... دوسرے لمحے اس کا زرد چہرہ اور دہشت سے پھٹی پھٹی آنکھیں دیکھ کر میری مسکراہٹ کافور ہو گئی۔ اس نے اپنے مرتعش ہاتھ سے اس کھڑکی کی طرف دیکھا اور اشارہ کیا جس میں سے چاند جھانک رہا تھا۔ اس کھڑکی کی چوکھٹ پر وہی خوف ناک قسم کا مکروہ کٹا ہوا ہاتھ کھڑا تھا اور اس کا سایہ فرش پر پڑ رہا تھا۔ ایک سرد مہر کسی خنجر کی نوک کی طرح میری ریڑھ کی ہڈی کو چیرتی ہوئی اتر گئی..... میں ششدر تھا کہ یہ ہاتھ صندوقچے..... اور سمندر سے کیسے نکل آیا۔ یہ وقت ان باتوں کو سوچنے کا نہیں تھا۔ میں نے فوراً بستر سے نکل کر سوچ آن کیا۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ ہاتھ کسی ڈھیٹ بچے کی طرح اپنی جگہ کھڑا تھا۔ ایسا لگا جیسے وہ مجھ پر ہنس رہا ہو۔ میرا مسخرا اڑا رہا ہو..... ورنہ یہ ہاتھ روشنی ہوتے ہی غائب ہو جاتا تھا۔ اس ہاتھ کو اس رخ دیکھ کر ایک عجیب ہی سنسناہٹ میرے سارے بدن میں پھیل گئی۔ میں نے بندوق اٹھا کر اس کی طرف شست باندھی تھی کہ وہ ایک دم

سے غائب ہو گیا۔ میں لپک کر کھڑکی کے پاس پہنچا اور باہر جھانکا۔ چاروں سمتوں کی طرف دیکھا۔ دور دور تک اس ہاتھ کا پتا نہیں تھا۔ میں پلٹ کر بستر کے پاس آیا تو دیکھا کہ میری بیوی گھٹنوں میں سر دیے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے۔

دوسرے دن صبح آٹھ بجے ایک دردناک خبر ملی کہ جبل میاں کی جوان لڑکی عابدہ تالاب کے پاس بے لباس اور مردہ حالت میں پڑی ہوئی ملی۔ وہ سورج نکلنے سے پہلے حسب معمول نہانے کے لیے تالاب پر گئی تھی۔ اس وقت اس کے سوا وہاں کوئی نہ تھا۔ عابدہ نہ صرف نوجوان تھی بلکہ اس کا گاؤں کی حسین لڑکیوں میں شمار ہوتا تھا۔ گاؤں کے بہت سارے گھرانے اسے اپنی بہو بنانا چاہتے تھے۔ کئی لڑکے اس کی محبت میں گرفتار بھی تھے..... پولیس کا کہنا تھا کہ اسے تالاب میں بے لباس نہاتے اور تنہا دیکھ کر کسی ہوس پرست نے اپنی خواہش کا نشانہ بنا دیا۔ اپنی حسرت پوری کرنے کے بعد افشاء راز کے خوف سے اس کا گلا دبا کر جان سے مار دیا۔ وہ گاؤں کا ہی کوئی مرد یا لڑکا تھا لیکن جب پوسٹ مارٹم آئی تو معلوم ہوا کہ اس پر کوئی آنچ نہیں آئی ہے۔ جب کہ یہ قیاس آرائی بھی ہوئی تھی کہ عابدہ کسی لڑکے کی محبت میں گرفتار تھی۔ جب ان دونوں نے وہاں ملاقات کی تو لڑکا شاید اسے بے لباس اور اکیلا دیکھ کر جذبات پر قابو نہ پا سکا اس کے بے حرمتی کر دی۔ عابدہ نے مزاحمت کی ہوگی کیوں کہ اس کی چہرے اور جسم پر تشدد کے نشانات تھے۔ تاہم اس کی عزت کا بچ جانا حیرت کی بات تھی۔

سارے گاؤں میں عابدہ کی اس دردناک موت سے خوف و ہراس پھیل گیا۔ لڑکیوں اور عورتوں نے اکیلے تالاب پر جا کر نہانا بند کر دیا۔ عابدہ جس تالاب پر نہاتی تھی وہ صرف عورتوں کے لیے مخصوص تھا۔ وہاں مردوں کو جانے کی اجازت نہیں اور نہ ہی گاؤں کے مرد اور لڑکے وہاں جاتے تھے۔ کیوں کہ ان کی مائیں' بہنیں' لڑکیاں اور بیویاں بھی تیرتی اور نہاتی تھیں۔ بڑی آزادی' سکون اور اطمینان سے اس بات کو جانتے ہوئے کہ انہیں کوئی بے لباس نہاتے اور تیرتے نہیں دیکھتا ہے۔

ہر کسی کا یہ خیال تھا کہ اس کٹے ہوئے ہاتھ نے عابدہ کی جان لے لی ہے۔ جب پولیس کو بتایا گیا تو اس نے اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ پولیس کا یہ کہنا تھا کہ قاتل کو اس کی عزت لوٹنے کا موقع نہیں ملا۔ اس نے کسی کو اس طرف آتے دیکھا تو وہ فرار ہو گیا۔ اس نے شک کی بنا پر ان تین لڑکوں کو گرفتار کر لیا جو عابدہ کو چاہنے والے اور اس سے شادی کے خواہش مند تھے لیکن بعد میں پولیس نے ان سے پوچھ گچھ اور عدم ثبوت کی بنا پر رہا کر دیا۔ اس کے تیسرے دن پولیس انسپکٹر کی حسین و جمیل نوجوان بیوی اپنے کمرے میں مردہ پائی گئی۔ وہ بے لباس تھی۔ اس کا لباس ایک طرف تہ کیا ہوا تھا۔ جس سے یہ اندازہ ہوا تھا کہ گرمی اور حبس کی وجہ سے اور گھر میں اکیلے ہونے کے باعث وہ بے لباس ہی ہو گئی۔ اس کے چہرے اور جسم پر جو تشدد کے نشانات تھے اس سے یہ ایسا لگتا تھا کہ قاتل نے اس کے ساتھ من مانیاں کیں۔ اس کی عزت تباہ کر دی لیکن جب اس کی پوسٹ مارٹم آئی تو وہی تھی جو عابدہ کی تھی۔ اس رات پولیس انسپکٹر ایک قاتل کے تعاقب میں چٹا گانگ گیا ہوا تھا۔ پولیس کا کہنا تھا کہ کوئی جنونی قاتل ہے جو حسین' نوجوان اور پرکشش گداز بدن کی لڑکیوں اور عورتوں کے صرف جسم کا دیوانہ ہے..... وہ دست درازیوں اور من مانیوں سے اپنی تسکین کرتا ہے۔ عزت سے نہیں کھیلتا ہے۔

لڑکیوں اور عورتوں نے گھروں سے اکیلے نکلنا اور تالاب پر جانا چھوڑ دیا تھا..... جو نوجوان لڑکیاں اور حسین عورتیں تھیں وہ بہت زیادہ پریشان اور خوف زدہ ہو گئی تھیں۔ ہر لمحہ ہراساں اور دہشت زدہ سی رہنے لگی تھیں۔ بہت ساری لڑکیاں اور عورتیں گاؤں چھوڑ کر شہروں میں اپنے رشتہ داروں کے ہاں چلی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گئی تھیں۔

ادھر سب سے برا حال تو میری بیوی کا تھا۔ ایک اور واقعہ نے دہشت پھیلا دی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ ایک گھر میں رات کے وقت اس نے اپنے سارے جسم پر رینگتا اور حساس حصوں کو چیرتا محسوس کیا تھا۔ اس وقت وہ لباس میں نہیں تھا۔ شوہر اس کے پہلو میں لیٹا ہوا تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ اسے بے لباس ہاتھ نے ہی کیا تھا۔ وہ یہ سمجھی تھی کہ اس کے شوہر نے یہ حرکت کی ہے۔ وہ اس حرکت کی عادی تھی۔ اس کا شوہر جب اس کے قرب کی ضرورت محسوس کرتا تھا تب وہ یہ حرکت ضرور کرتا تھا لیکن اس نے شوہر کی حرکت میں ایک عجیب سی بات محسوس کی تھی۔ اسے بڑی حیرت ہوئی تھی، ہاتھ اس قدر سخت کیسے ہوگیا۔ اس میں نہ صرف لکڑی کی سی سختی، کھردرا پن تھا بلکہ وحشیانہ پن اور تشدد کا سا انداز تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا ہاتھ اس کے جسم کو نچوڑ رہا تھا۔ بھن بھوڑ رہا تھا۔ اس میں نرمی اور لمس بالکل نہ تھا...... اسے ایک دم سے غصہ آ گیا...... یہ حرکت اور بیمانہ انداز پسند نہ آیا۔ جب اس نے شوہر کو ٹوکنا چاہا تا کہ وہ باز رہے تب اس نے شوہر کے خراٹوں کی آواز سنی...... ایسی گہری نیند میں ایسی حرکت ناممکن تھی۔ وہ تکلیف اور اذیت برداشت نہ کر سکی۔ اس نے ہاتھ کو ایک طرف جھٹکے سے ہٹایا۔ بستر سے نکل کر سوئچ بورڈ کی طرف بڑھی۔ اس نے سوئچ آن کیا تو کمرا روشنی میں نہا گیا۔ اس نے اپنے جسم کے فراز پر اس ہاتھ کو دیکھا جو جونک کی طرح چمٹا ہوا تھا...... خوفناک، کالا اور کلائی تک کٹا ہوا...... اس نے ایک دل خراش چیخ ماری اور خوف و دہشت سے اس کی رگوں میں لہو منجمد ہو گیا۔ اس نے پوری طاقت جمع کر اس ہاتھ کو پکڑ کر بہ دقت تمام جسم سے الگ کیا۔ اس ہاتھ نے جسم کے حصے کو دبوچ رکھا تھا۔ اسے فرش پر ہاتھ مارا اس کی چیخ سن کر شوہر بیدار ہو گیا۔ اس ہاتھ کو دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ لیکن اس نے جب بیوی کو فطری حالت میں کھڑے اور خوف و دہشت سے کانپتے دیکھا تو وہ بستر سے نکل آیا وہ ہاتھ اس کی بیوی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے فوراً ہی لاٹھی اٹھالی اور اس ہاتھ پر حملہ آور ہوا تو وہ ایک دم سے غائب ہو گیا۔ بیوی دوڑ کر اس سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔ بیوی نے جب بعد میں قصہ سنایا تو پہلے تو وہ یہ سمجھا کہ کوئی بدروح تھی جو اس کی بیوی کی بے حرمتی کرنے آئی تھی۔ لیکن جب اس کی بیوی نے عابدہ اور دوسری عورت کے ساتھ پیش آنے والے واقعات سنائے وہ مسجد پیش امام کو بلا لایا۔ انہوں نے یہ کہا کہ یہ کوئی بدروح ہے۔ پھر انہوں نے کچھ پڑھ کر تمام کمروں میں پھونکا اور کہا کہ اب وہ روح نہیں آئے گی۔ بہرحال اس واقعہ نے ایسی دہشت پھیلائی کہ ہر کوئی خوف زدہ اور محتاط ہو گیا۔ رات کو پورا گھر روشن رکھنے لگے۔ لیکن رضیہ کہتی تھی کہ میں ایک لمحے کے لیے اس کے سامنے سے نہ جاؤں۔ اس نے یہ تجویز پیش کی کہ وہ کچھ دنوں کے لیے جھکے جانا چاہتی ہے۔ میں بھی ساتھ چل کر رہوں لیکن یہ میرے لیے بہت مشکل تھا۔ کیوں کہ برسات کا موسم ختم ہوا تھا اور میری غیر موجودگی سے میرا کاروبار بھی متاثر ہو سکتا تھا۔

رضیہ نے دن میں بھی کمرے میں اکیلے رہنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اوپر نیچے آتی جاتی تو اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی آتا جاتا تھا۔ کوئی چار پانچ دنوں سے اس ہاتھ نے ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ میں مسلسل پانچ راتوں سے برابر جاگ رہا تھا...... ادھر گاؤں والوں دو تین عاملوں کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ اس ہاتھ نے ایک عامل صاحب کی کلائی ہی توڑ کر رکھ دی تھی۔ اس عامل کا یہ حشر دیکھ کر دوسرے عامل حضرات خوف زدہ ہو کر گاؤں چھوڑ کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے دوسرے دن ایک اور جوان عورت دن کے ایک بجے کھیتوں میں مردہ پائی گئی۔ اس ہاتھ نے اس عورت کے ساتھ وہی حرکت کی تھی جو اب تک دوسری عورتوں کے ساتھ کر چکا تھا۔ یہ پولیس کانسٹیبل کی بیوی تھی۔

پولیس نے میری یا گاؤں والوں کی بات کو تسلیم کرنے کی بجائے مشتبہ افراد کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ پولیس کے نزدیک یہ توہم پرستی تھی...... ان کا کہنا تھا کہ ان عورتوں کی آبروریزی اس وجہ سے نہ ہو سکی تھی کہ عین وقت کوئی نہ کوئی آ گیا تھا۔ وہ درندہ صفت شخص صرف دست درازیاں اور من مانیاں کر سکا...... حقائق پر پردہ اس لیے ڈالا جا رہا ہے کہ وہ اس جنونی شخص سے خوفزدہ ہیں۔

پولیس کو تب عقل آئی تھی...... جب تھانے دار کی جوان بیٹی نے رات کے وقت سونے کے لیے بستر پر جانے سے پہلے لباس تبدیل کیا۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد اس کی نگاہیں معاً کھڑکی کی طرف اٹھی تو اس نے دیکھا کہ چوکھٹ پر ایک کٹا ہوا ہاتھ اسے اس طرح سے دیکھ رہا ہے جیسے کوئی آدمی دیکھتا ہے۔ اس نے فوراً ہی چیخیں مارنا شروع کر دیں۔ سارا گھر بیدار ہو کر اس کے کمرے میں پہنچا۔ وہ خوف و ڈر کی حالت میں کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ تھانے دار کی بیٹی گریجویٹ بھی تھی۔ باپ کو اپنی بیٹی کی بات کا یقین کرنا پڑا اور پھر انہیں مشتبہ افراد کو رہا کرنا پڑا۔

گاؤں پر ایسی دہشت مسلط ہو گئی تھی کہ لوگ دن ڈوبنے سے پہلے ہی اپنے گھروں میں جا کر چوہوں کی طرح دبک جاتے تھے۔

ایک روز میں کسی کام سے سویرے چٹاگانگ گیا ہوا تھا۔ رضیہ اپنے کمرے میں بیٹھی بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ بوا فرش پر بیٹھی پیاز کاٹ رہی تھی۔ صبح کے دس بجے کا وقت تھا۔ رضیہ نے بالوں میں کنگھی کرنے کے بعد جوڑا باندھا۔ پھر اس نے اچانک اپنی گود میں کوئی بھاری چیز محسوس کی تو اس نے چونک کر دیکھا تو اس کی جان ہی نکل گئی۔ حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔ وہی کٹا ہوا ہاتھ اس کی گود میں پڑا تھا...... خونی ہاتھ...... جو اب تک کئی عورتوں کی جانیں لے چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس مکروہ اور منحوس ہاتھ کو جھٹکتی اس نے ایک دم سے اچھک کر رضیہ کا گلا پکڑ لیا اور دبانے لگا۔ رضیہ نے چیخنے کی کوشش کی تو چیخ نہ سکی۔ اس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کٹے ہوئے ہاتھ کو پکڑ لیا اور اپنے گلے کو اپنے اس ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش کی اور پوری طاقت سے جدوجہد کرنے لگی۔ اس نے اپنا پورا زور لگا دیا تھا۔ اس لیے کہ وہ لحہ لحہ موت کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ پھر اس کوشش میں وہ پلنگ سے فرش پر گر پڑی...... اس خونی ہاتھ کی گرفت رفتہ رفتہ گلے پر سخت ہوتی گئی اور اس کا دم سینے میں گھٹنے لگا۔ پھر اس کے کانوں میں بھیانک قہقہے گونجنے لگے جیسے وہ اس کی بے بسی پر خوش ہو رہا ہوں تمسخر اڑا رہا ہو۔ اس کی نظروں میں ایک انتہائی مکروہ اور خبیث چہرہ گھومنے لگا...... بوا نے جو یہ منظر دیکھا تو لمحے کے لیے اس کے اوسان خطا ہو گئے اور پیروں میں جان ہی نہ رہی۔ دوسرے لمحے معلوم نہیں اس میں کہاں سے اتنی ہمت آ گئی کہ اس نے اپنی مالکن کو ہر قیمت پر بچانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے اندر نفرت اور غصے کی تیز لہر اٹھی...... اسے یک لخت وہ معصوم لڑکیاں اور عورتیں یاد آ گئیں جنہیں اس خونی ہاتھ نے موت کے منہ میں پہنچایا تھا۔ وہ کسی غضب ناک شیرنی کی طرح اپنی جگہ سے اٹھی اور پیاز کاٹنے والی چھری لے کر رضیہ کے پاس پہنچی اور اس سے کہا کہ وہ اپنے ہاتھ اس خونی ہاتھ پر سے ہٹا لے۔ اس وقت رضیہ کی طاقت جواب دے چکی تھی۔ اس کے ہاتھ آپ ہی آپ بے جان ہو کر گود میں گر پڑے تھے بوا نے فوراً ہی چھری کی نوک اس خونی ہاتھ کی پشت پر اپنی پوری قوت سے جھونک دی۔ اس چھری کی نوک کا اس خونی ہاتھ کی پشت میں چبھنا تھا کہ وہ ایک دم سے غائب ہو گیا۔ اس ہاتھ کے غائب ہوتے ہی بوا نے رضیہ کی طرف دیکھا۔ رضیہ بے ہوشی کی حالت میں گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ فوراً ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ بروقت طبی امداد سے رضیہ کی جان بچ گئی۔ دوسرے دن بوا اپنی کوٹھری میں مردہ پائی گئی۔ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کٹے ہوئے خونی ہاتھ نے بوا سے انتقام لے لیا تھا۔ اس نے بوا کو بھی دوسری عورت کی طرح گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا تھا۔

بوا کی اس دردناک موت کا رضیہ نے بہت اثر لیا۔ وہ اس قدر دہشت زدہ ہوگئی تھی کہ مجھے ایک لمحے کے لیے اپنے پاس سے ہٹنے نہیں دیتی تھی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میں اسے اپنے ساتھ جزیرہ سندیپ لے گیا اور اسے اس کے میکے چھوڑ کر چلا آیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ کٹا ہوا ہاتھ نظر نہیں آیا اور نہ ہی قتل کی کوئی واردات ہوئی۔ دس روز کے بعد ہی اسے لینے کے لیے اس کے میکے پہنچا۔ رضیہ نے بتایا کہ وہ خونی ہاتھ یہاں بھی پہنچ گیا ہے۔ ایک روز اس نے اپنے کپڑے نکالنے کے لیے اٹیچی کھولی تو وہ خونی ہاتھ اس کے کپڑوں میں لپٹا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی حرکت کرنے لگا اور ایک دم سے اچھل کر کپڑوں پر کھڑا ہوگیا..... اس کے تیور سے ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی پل اچھل کر اس کا گلا پکڑ کر دبانے لگے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ خونی ہاتھ اس اٹیچی سے باہر آتا رضیہ نے اٹیچی بند کر دی اور پھر شور مچا کر گھر والوں کو جمع کر لیا..... اس کے والد، بھائی اور پڑوسی اور محلے کے چند لڑکے چاقو چھرے اور ڈنڈوں سے مسلح ہو کر اٹیچی کے گرد کھڑے ہوگئے۔ جب اٹیچی کا منہ کھولا گیا تو اس میں وہ خونی ہاتھ نہیں تھا۔ غائب ہو چکا تھا۔

اس کے دوسرے دن اس خونی ہاتھ نے سندیپ جزیرے کے ایک جج کی حسین و جمیل بہو کا گلا دبوچ لیا تھا۔ اتفاق سے اس عورت کا شوہر گھر پر موجود تھا۔ اس نے ایک کٹے ہوئے ہاتھ کو بیوی کا گلا دباتے دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے اور وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچا پھر اس نے اپنی بیوی کو درد تکلیف سے تڑپتے دیکھا تو اس نے خونی ہاتھ کو پکڑ لیا۔ پھر اس کی ایک انگلی پکڑ کے پوری طاقت سے اپنی طرف کھینچا..... وہ ہاتھ ایک دم سے غائب ہوگیا۔ اس کی بیوی دہشت و صدمے سے بے ہوش ہوگئی۔

وہ پورا ایک دن مسلسل بے ہوش رہی۔ اس کے ہوش میں آتے ہی اس کا شوہر اسے علاج کے لیے ڈھاکا شہر لے گیا۔ اس لیے کہ وہ لرزے کی مریض بن گئی تھی۔ اس واقعے کے تیسرے روز رضیہ نے اپنے بھائی کے ہاتھ سے مچھلی منگوائی۔ بھائی نے وہ تھیلی جس میں مچھلی تھی لا کر رضیہ کے ہاتھ میں تھما دی زینب نے تھیلی میں ہاتھ ڈال کر مچھلی نکالی۔ اس کا ہاتھ باہر آیا مچھلی منگوائی۔ بھائی نے وہ تھیلی جس میں مچھلی تھی لا کر رضیہ کے ہاتھ میں تھما دی۔ زینب نے تھیلی میں ہاتھ ڈال کر مچھلی نکالی۔ اس کا ہاتھ باہر آیا مچھلی کی بجائے اس کے ہاتھ میں خونی ہاتھ تھا۔ رضیہ نے حواس باختہ ہو کر وہ خونی ہاتھ پھینک دیا۔ وہ ہاتھ ندی میں جا گرا۔ پھر وہ ندی کے راستے غائب ہوگیا۔

سندیپ میں اس روز شام کے وقت دریا کے کنارے ایک ہٹ کے عقب میں ایک حسین اور نوجوان لڑکی کی لاش بے لباس کی حالت میں ملی تو پورے جزیرے سندیپ میں ایک کہرام مچ گیا۔ اس کا لباس دھجیاں ہوگیا تھا جیسے اسے بے لباس کرنے کے لیے اس کا لباس چاک کرنے کے لیے بری طرح پھاڑ دیا گیا تھا۔ اسے قتل کا کیس قرار دے کر اس لڑکے کو شبے میں گرفتار کر لیا گیا جو اس لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو کر محبت بھرے خط لکھتا تھا..... پولیس کا یہ کہنا تھا کہ اس لڑکے نے محبت کی ناکامی سے دلبرداشتہ ہو کر اس لڑکی کی آبروریزی کر کے پھر گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا۔ جب کہ لڑکا بے قصور تھا۔ قتل خونی ہاتھ نے کیا تھا۔ پولیس نے اس بات کو تسلیم نہیں کیا..... لڑکی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بتایا گیا کہ اس کی آبروریزی نہیں ہوئی۔ البتہ تشدد کے نشانات چہرے اور پورے جسم پر ہیں۔ پولیس کو لڑکے کو رہا کرنا پڑا۔ کیوں کہ وہ قتل کی واردات سے دو دن پہلے چٹاگانگ گیا ہوا تھا اور اس واردات کے دوسرے دن آیا تھا۔ اس کی عدم موجودگی کا ثبوت چٹاگانگ سے مل گیا تھا۔

میں رضیہ کو اپنے ہاں لے آیا۔ سندیپ جزیرے کے ایک عامل نے ایک تعویز لکھ کر دیا جسے میں نے رضیہ کے گلے میں ڈال دیا۔ انہوں نے ایک اور تعویذ گھر میں رکھنے کے لیے دیا۔ لیکن ان کے تعویذوں سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کوئی تین روز پہلے کی بات ہے میں اور رضیہ نے رات کے وقت گھڑکی کی چوکھٹ پر دو کٹے ہوئے ہاتھ دیکھے..... ایک ہاتھ پہلے ہی کیا کم تھا اور اس نے فتنہ مچا رکھا تھا اور جینا حرام کر دیا تھا اب دوسرا ہاتھ بھی نظر آنے لگا تھا۔ یہ دونوں ہاتھ دیکھ کر میں نے بندوق اٹھالی اور ان پر پے در پے دو فائر جھونک دیے۔ ان گولیوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا..... دوسرے لمحے ایک انتہائی خوفناک قہقہہ گونجا جو انتہائی انداز استہزائیہ تھا..... گویا تمسخر اڑایا جا رہا ہو ہماری بے بسی، ڈر اور خوف کا..... کانوں میں گرم گرم سیسہ پگھلتا محسوس ہوا۔ پھر یہ دونوں ایک دم غائب ہوگئے۔ غائب ہوتے ہوئے انہوں نے وہ دو گولیاں پھینک دیں جو میرے بندوق سے نکلی تھیں۔

یہ خوف ناک، مکروہ اور خونی ہاتھ کی دہشت ناک اور لرزہ خیز کہانی ہے جس نے نہ صرف کئی جانیں لے لیں بلکہ ہماری اور گاؤں کی زندگی عذاب ناک اور حرام کر کے رکھ دی ہے۔ گاؤں میں اس قدر خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے کہ ہر شخص بیمار اور غم زدہ ہو کر رہ گیا ہے۔ خصوصاً نوجوان کنواری لڑکیوں کے باپ اور ان کے شوہروں کا..... ہر شخص نے اپنے تئیں ہر طرح کی کوشش کر لی لیکن وہ ناکام رہی۔

اس نوجوان ہاشم نے انہیں جو کہانی سنائی تھی وہ ان کے لیے نہ صرف حیرت انگیز سنسنی خیز بلکہ دردناک بھی تھی.....

انہوں نے اس کی کہانی سن کر اسے تسلی دی کہ..... "گھبرانے ہراساں اور پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے..... اللہ کی ذات بہت بڑی ہے۔ اس نے بڑے سے بڑے جادو کا توڑ پیدا کیا اور یہ کالا جادو ہے۔ اللہ نے چاہا تو ایک دن میں ہی اس خونی ہاتھ سے نجات مل جائے گی۔ ویسے تم صحیح جگہ آئے ہو۔ میں آج ابھی اور اسی وقت تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

ان کی اہلیہ نے ناشتا تیار کر دیا تھا۔ ناشتا کرنے کے بعد چائے پینے کے دوران اس نوجوان نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکال کر ان کی طرف بڑھایا تو انہوں نے اس کی طرف تعجب سے دیکھا اور پوچھا۔ "یہ کیا ہے۔"

اس نے نہایت انکساری سے جواب دیا۔ "ایک حقیر سا نذرانہ ہے۔ اسے قبول کر لیا تو یہ میرے لیے عزت کی بات ہوگی۔"

انہوں نے لفافہ لے کر کھول کر دیکھا تو اس میں پانچ ہزار کی رقم تھی جو بہت بڑی رقم تھی..... انہوں نے اس میں سے پانچ سو تا کا نکال کر اس رقم کی ایک رسید بنائی اور اسے ساڑھے چار ہزار کی رقم واپس کرتے ہوئے بولے۔

"میں نے یہ رقم دینی مدرسے کے لیے لی ہے..... اللہ نے مجھے اس قدر نوازا ہوا ہے کہ میری گزر بسر بڑی آسانی سے کسی نہ کسی طرح ہو جاتی ہے..... میں نے اپنی زندگی بنی نوع انسان کے لیے وقف کر دی ہے۔ اللہ تمہیں دولت اور اولاد سے نوازے..... اس خبیث ہاتھ پر قابو پانے کے بعد یہ رقم اللہ کی راہ میں صدقہ کر دو تو آفات اور حادثات سے محفوظ رہو گے۔"

وہ دونوں چٹاگانگ والے اسٹیمر سے چٹاگانگ کے لیے روانہ ہوئے..... اس نے راستے میں ان سے کہا کہ اللہ کا بڑا کرم اور احسان ہے کہ اللہ نے میری بیوی کو اس خونی ہاتھ سے محفوظ رکھا ہوا ہے..... ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ وہ اب تک اس خونی سے کیسے محفوظ رہی..... جب کہ دوسری معصوم لڑکیاں اور عورتیں بچ نہ سکیں۔

انہوں نے اسے جواب دیا اصل بات یہ ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ...... جب تک انسان کی زندگی باقی ہے اس کی زندگی کوئی نہیں چھین سکتا زندگی' رزق اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے...... تمہاری بیوی جواب تک اس خونی ہاتھ سے محفوظ رہی' اس کی وجہ یہ ہے کہ تم پابندی سے پانچ وقت کی نماز پڑھتے ہو...... زکوٰۃ ادا کرتے ہو...... تمہاری یہ نیکیاں تمہارے اور تمہارے گھر کے کام آرہی ہیں۔ آئندہ اس نیک کام کو جاری رکھنا...... ایک اور بات یاد رکھو۔ جتنا خیرات کرو گے اللہ تمہیں خوب نوازے گا۔ تمہارے مال میں کوئی کمی نہ ہوگی۔"

دوسرے دن سہ پہر کے وقت ہم آٹھ ہزاری پہنچے۔ انہوں نے اس کی جو کہانی سنی تھی اس کہانی میں ایسا کوئی واقعہ نہیں تھا جو کسی مرد کے ساتھ پیش آیا ہو...... اس خونی ہاتھ نے صرف لڑکیوں اور عورتوں کی جانیں لی تھیں...... اور وہ رضیہ کی جان لینے کے درپے تھا۔ اس خونی ہاتھ نے کسی وجہ سے اب تک رضیہ کی جان نہیں لی تھی۔ وہ اسے دفن کیے جا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اسے ترسا ترسا کر مارنا چاہتا ہے اس لیے وہ اس کے پیچھے سائے کی طرح لگا ہوا تھا۔

انہوں نے غسل کر کے عصر کی نماز پڑھی۔ پھر چائے کا ایک کپ پینے کے بعد انہوں نے ہاشم سے کہا۔

"میں تنہائی میں تمہاری بیوی رضیہ سے کچھ ضروری باتیں اور پوچھنا چاہتا ہوں۔ اس کے بغیر میں کوئی قدم اٹھا نہیں سکتا۔"

تھوڑی دیر کے بعد وہ تیسری منزل کی نہایت آراستہ نشست گاہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ رضیہ ان کے سامنے بیٹھی تھی۔ رضیہ بلا کی حسین تھی۔ انہیں بذات خود وہ ایک جادو محسوس ہوئی تھی۔ اس کے بے حد لانبے چمکیلے ریشمی سیاہ...... اس کی بڑی بڑی بھونرا جیسی بے حد حسین آنکھیں...... اس کے چہرے کے تیکھے تیکھے نقش و نگار اور نکلتا ہوا قد...... آدمی کو نہ صرف مسحور کر دینے والے تھے بلکہ دل پر قیامت گرا دینے والے تھے...... اس کا پرشکوہ سراپا بجلی گرا دینے والا تھا...... انہوں نے اس قدر حسین لڑکی اپنی زندگی میں شاید دیکھی تھی۔ اس کی آواز میں اس کی طرح سندر تھی۔ قدرت نے اسے بڑی فیاضی سے بنایا تھا۔

انہوں نے رضیہ سے کہا یہ تم مجھے ایک عامل نہیں بلکہ اپنے بھائی' باپ اور دوست کی جگہ سمجھو...... میں یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنی زندگی کا وہ واقعہ سناؤ جو تم نے آج کسی کو نہیں سنایا ہے...... حتیٰ کہ اپنے شوہر اور کسی قریبی ہم راز سہیلی کو بھی...... اور اپنی ماں اور بہن کو بھی نہیں...... تم نے اپنے سینے میں دفن کر رکھا ہے جس کو یاد تمہارے لیے اذیت ناک کرب بن جاتی ہے۔" ان کی بات سن کر رضیہ بڑے زور سے چونکی۔ اس نے اپنا جھکا ہوا خوش نما سر اٹھا کر ان کی طرف غیرت سے دیکھا اور پوچھا۔

"کون سا واقعہ......" اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور چہرے پر استعجاب چھا گیا۔

"وہ واقعہ جس نے اس خونی ہاتھ کو جنم دیا...... وہ ہاتھ جو تمہاری جان کا دشمن بنا ہوا ہے...... محض اتفاقات اور حالات کی وجہ سے تم اب تک اس سے بچتی رہی ہو...... کل ایسا بھی ممکن ہے کہ یہ ہاتھ تمہاری نظروں کے سامنے تمہارے سہاگ اجاڑ دے...... وہ پھر اسی پر اکتفا نہ کرے...... بلکہ تمہارے والدین' بھائی اور بہنوں کو بھی نشانہ بنا دے...... تم مجھ پر بھروسا رکھو...... میں تمہاری کہانی کسی کو نہیں سناؤں گا۔ میں اس راز کو اپنے سینے میں دفن رکھوں گا۔ اللہ نے چاہا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس خونی ہاتھ کا خاتمہ ہو جائے گا۔ نہ صرف تم بلکہ سندیپ اور اس بستی کے لوگ بھی سکون کا سانس لیں گے۔"

ان کی باتیں سن کر رضیہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد اپنے آنسوؤں اور جذبات پر قابو پانے کے بعد اس نے اپنی کہانی

رندھی ہوئی آواز میں سنانے لگی۔

"آپ تو جانتے ہیں کہ میں جزیرہ سندیپ کی رہنے والی ہوں۔ اپنی بہنوں' اپنے خاندان بلکہ پورے جزیرہ سندیپ میں سب سے حسین ترین لڑکی تھی۔ جب میں چھ سات برس کی تھی تب سے ہی میرے حسن کا چرچا ہونے لگا تھا۔ میری اٹھان' آسودگی اور فراغت کی زندگی نے مجھ میں اور حسن پیدا کر دیا تھا۔ جب میں نے پرائمری اسکول پاس کر کے مڈل اسکول میں داخلہ لیا تو وہاں کی لڑکیوں نے میرا نام میرے حسن کی مناسبت سے میرا نام رانی رکھ دیا تھا۔ میں رانی کے نام سے اتنی مشہور ہوئی کہ لوگ میرا اصل نام بھول گئے لیکن میرے گھر والے مجھے رضیہ ہی کہہ کر پکارتے تھے۔ جب میں نے نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو میرا حسن جوانی کے سہارے سے اور قیامت خیز ہوگیا۔ میں نے مڈل پاس کرنے کے بعد کالج میں داخلہ لے لیا۔ میں محسوس کرنے لگی تھی میرے جزیرے کے لڑکے مجھ میں دلچسپی لینے لگے ہیں اور مجھے اپنانے کے خواہش مند ہیں مجھ میں پندار حسن نہیں تھا اور نہ ہی میں نے اپنے آپ کو بہت حسین سمجھا تھا۔ مجھ میں بڑی سادگی تھی۔ مجھ سے کوئی بات کرتا اور کوئی ایسی بات کہہ دیتا تو جو ہنسی کی ہو تو میں اسے اپنی ہنسی پیش کر دیتی...... یہ دیکھ کر کچھ لڑکوں نے مجھے محبت بھرے خط لکھنے شروع کر دیے۔ میں چوں کہ اس مزاج کی نہیں تھی اور نہ ہی میں نے کبھی کسی بھی لڑکے کو مرد کے تناظر سے دیکھا تھا۔ میں نے ابتدا میں صرف دو ایک عشقیہ خط پڑھے تھے جو انتہائی گھٹیا' فحش' سطحی اور بے ہودہ قسم کے تھے۔ اس کے بعد میں نے خط پڑھے بغیر پھاڑ کر پھینکنا شروع کر دیا...... مجھے ایسے لڑکوں سے سخت ترین نفرت تھی جو لڑکیوں کو ندیدی نظروں سے گھورتے اور ان پر فقرے کستے تھے اور مجنوں کے انداز سے مکالمے بولتے تھے۔ میں ان لڑکوں اور ان کے عشقیہ خطوط سے سخت پریشان تھی۔ میں اس بات سے ڈرتی تھی کہ اگر کوئی خط میرے گھر والوں کے ہاتھ لگ گیا تو وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔ جبکہ انہیں مجھ پر بڑا اعتماد تھا...... بے چاری وہ لڑکیاں بھی بڑی خوف زدہ' ہراساں اور پریشان تھیں جو حسین اور نوجوان تھیں۔ انہیں بھی یہ لڑکے خط لکھتے تھے۔ دو ایک لڑکیوں کے خط پکڑے گئے تھے تو ان کے والدین نے گھر بٹھا لیا تھا۔ ہر چند کہ ان لڑکیوں نے والدین کو باور کرایا تھا کہ وہ نہ تو خط پڑھتی ہیں اور نہ ہی ان سے محبت کرتی ہیں۔ وہ تو ان کی شکل دیکھنا تو درکنار ان کے منہ پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی ہیں۔

میں بھی اس بات سے بہت ڈرتی تھی کہ اگر انہوں نے کسی خط کے ہاتھ لگنے پر مجھے کالج سے نکال کر گھر بٹھا لیا تو یہ میرے لیے بڑے دکھ کی بات ہوگی۔ کیوں کہ مجھے صرف تعلیم سے جنون کی حد تک عشق تھا' میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ڈاکٹر یا لیکچرار بننا چاہتی تھی۔ اس لیے میں بناؤ سنگھار کی بجائے...... تعلیم پر توجہ دیا کرتی تھی۔ کچھ ہم جماعت لڑکیاں اور سہیلیاں جو خوب صورت اور پرکشش تھیں انہیں تعلیم سے زیادہ عشق و محبت سے دلچسپی تھی اور ان کی آنکھوں میں ان جانے خواب لہراتے رہتے تھے...... وہ نہ صرف لڑکوں سے محبت کرتی تھیں بلکہ ان سے ان کی باقاعدگی سے خط و کتابت بھی ہوتی تھی۔ وہ مجھے لڑکوں کے لکھے ہوئے خط دکھایا کرتی تھیں۔ ان خطوں کو پڑھ کر بھی میرے دل میں کبھی کوئی ہل چل نہیں ہوئی تھی۔ جب کہ دوسری لڑکیاں آہیں بھرتی تھیں کہ ان کی زندگی میں رومانس نہیں ہے میں چوں کہ دوسرے مزاج کی لڑکی تھی میں ان لڑکیوں کو جو محبت میں اور خط و کتابت میں گرفتار تھیں اور ان جانے خواب دیکھنے والی لڑکیوں کو بھی بڑی بوڑھیوں کے انداز میں سمجھاتی رہتی تھی کہ وہ ان چکروں میں نہ پڑیں کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے۔ داغ نہ آ جائے۔ داغ جو ایک بار لگ جائے تو وہ مٹتا نہیں ہے...... آنسوؤں کا خزانہ رہ جاتا ہے اور ساری زندگی پچھتاوے اور اذیت کا سبب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بن جاتا ہے..... لڑکوں سے زیادہ تعلیم میں دل چسپی لیا کریں۔ محبت غریب لڑکیوں کو راس نہیں آتی ہے۔ وہ میری سنتی نہیں تھیں۔ دو ایک مثالیں تھیں کہ لڑکیاں محبت کے اندھے جنون میں لڑکوں سے دھوکا کھا گئی تھیں۔ لڑکوں نے جو سانپ صفت تھے انہیں ڈس لیا تھا۔

سندیپ میں ایک مولوی صاحب تھے۔ وہ ایک مسجد کے پیش آمام تھے۔ ان کا نام سید محمد خطیب ہے۔ وہ بڑے نیک اور شریف النفس بزرگ تھے۔ ایک مرتبہ چیچک کی وبا پھیلی تو ان کی بیوی اس کی نذر ہوگئی لیکن ان کا بیٹا جعفر بچ گیا تو لیکن وہ بے انتہا بدصورت ہوگیا۔ اس کا چہرہ چیچک کے دانوں سے بھر گیا۔ بیوی کی وفات کے بعد انہوں نے شادی نہیں کی۔ ان کی بیوی صرف ایک لڑکے کو چھوڑ کر مری تھی۔ انہوں نے اس خیال سے دوسری شادی نہیں کی تھی کہ ان کا اکلوتا اور بدصورت بیٹا جعفر کہیں سوتیلی ماں کے ظلم و ستم کا شکار نہ ہو جائے۔ جعفر جوان ہوا تو احساس محرومی کے باعث میری محبتوں کا شکار ہوگیا۔ وہ آوارہ، بدمعاش اور لچا لفنگا بن گیا۔ لوگ کہنے لگے کہ ولی کے پیٹ میں شیطان پیدا ہوا۔ باپ نے اسے سدھارنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ راہ راست پر نہیں آیا۔ ایک روز وہ اس غم میں چل بسے۔

سندیپ میں ایک شخص تھا اس کا نام تھا زرجان داس..... وہ سفلی علوم کا بڑا ماہر تھا..... جادو ٹونے کے کام کو اس نے اپنا پیشہ بنا رکھا تھا۔ کالے جادو کا نہ صرف توڑ جانتا تھا بلکہ کالا جادو اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بہت سارے جادو میں اسے بڑی مہارت حاصل تھی۔ جعفر نے باپ کی موت کے بعد اس خبیث شخص نے جس کی شاگردی قبول کرلی..... تین چار برسوں میں اس نے زرجان سے بہت کچھ سیکھ لیا۔ وہ کبھی نہ کبھی موقع پر اپنے کمالات کا مظاہرہ کر کے لوگوں کو مرعوب اور متاثر کرتا رہتا تھا۔ زرجان داس جب تک زندہ رہا اس نے نہ تو کسی کو بلاوجہ پریشان کیا اور نہ ہی جعفر کو اس بات کی اجازت دی کہ اس علم سے کسی کو ہراساں اور پریشان کرے۔ اس کی موت کے بعد جعفر آزاد ہوگیا۔ اس کی حرکتوں سے لوگ نالاں اور پریشان رہنے لگے۔ اس کے والد کے دوست اسے سمجھاتے تھے تو اس کے کان پر جوں نہیں رینگتی تھی۔

وہ ایک بدنیت شخص تھا۔ لڑکیاں اور عورتیں اس کی بڑی کم زوری تھی۔ اس نے اپنے جادو کے زور سے کئی لڑکیوں اور عورتوں کو تباہ و برباد کیا۔ اس میں ان لڑکیوں اور عورتوں کی غلط تھی..... کیوں کہ وہ اس کے پاس اپنے خوابوں اور گھریلو جھگڑوں سے نجات پانے کے لیے تعویذ گنڈے حاصل کرنے گئی تھیں تو اس نے فائدہ اٹھایا تھا۔ اس نے ان پر ایسا جادو کیا کہ وہ بے بس ہو کر رہ گئیں اور انہیں وہ خوب صورت لگا تھا۔ لڑکیاں اس کی شکل دیکھ کر خوف کھاتی تھیں۔ اس کی عادتوں میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ لڑکیوں اور عورتوں پر آوازیں کستا..... انہیں دیکھ کر ہنستا اور معنی خیز اشارے کرتا تھا..... گو اس نے ایسی کوئی حرکت کبھی میرے ساتھ نہیں کی..... البتہ وہ مجھے دیکھ کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیتا تھا اور سرد آہیں بھرنے لگتا تھا۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا جو وہ مجھے خط نہ لکھتا ہو میں نے صرف اس کا ایک ہی خط پڑھا جس میں اس نے مجھے لکھا تھا کہ..... میں اس سے رات کے وقت مکان کے پچھواڑے آ کر ملوں۔ اگر میں نے اس کا حکم نہیں مانا وہ نہ صرف میری بلکہ گھر والوں کی بھی زندگی اجیرن کر کے رکھ دے گا..... اس کے علاوہ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ تمہاری چال بڑی مستانہ اور دل کش ہے۔ انگ انگ میں بجلیاں بھری ہوئی ہیں..... سراپا ہیجان خیز ایسا ہے کہ راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے۔ میں تصورات کی ان جانی دنیا میں بہت دور چلا جاتا ہوں۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم قریب سے اور رات کے وقت کتنی حسین معلوم ہوگی..... تمہارے حسن و شباب کا جادو ایسا ہے کہ اس کے آگے میرا جادو کچھ بھی نہیں ہے..... میں

نے اس کا خط پھاڑ کے پھینک دیا۔ بعد میں جو خط بھی آئے میں انہیں پھاڑ کے پھینکتی رہی پڑھے بغیر..... میں نے اپنے والدین سے اس بات کو چھپایا کہ یہ ملعون مجھے روزانہ خط لکھتا ہے۔ ان سے کہنا بھی فضول تھا۔ کیوں کہ وہ اس کا بال تک بیکا نہیں کر سکتے تھے۔

میں رات گیارہ بجے تک جاگ کر پڑھتی رہتی تھی۔ میرا کمرا سب سے نیچے اور کونے میں تھا۔ اس کا ایک دروازہ اور کھڑکی عقبی راستے کی طرف کھلتی تھی۔ عقبی دروازے کے پاس تین چار کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ ان میں غلہ اور لکڑیاں رکھی تھیں۔ اس روز چاندنی رات تھی۔ اس روز آسمان پر چودھویں کا چاند روشن تھا۔ اس کی دودھیا کرنیں منجمد دریا بنی ہوئی تھیں۔ نا جانے میں کتنی دیر تک گہری نیند سوتی رہی۔ نہ صرف میں بستر پر بے ترتیب تھی بلکہ میرا لباس بھی..... چوں کہ میں کمرے میں تنہا ہوتی اور سوتی تھی اس لیے بھی کہ کوئی میرے کمرے میں بغیر اجازت نہیں آتا تھا۔ میرے گال پر مچھر نے کاٹا تو میں نیند سے بیدار ہوگئی۔ میں بستر پر اٹھ بیٹھی اس کو سخت پیاس لگ رہی تھی۔ جب میں نے اپنے لباس کو دیکھا تو خجل سی ہوئی کہ ایسا بھی کیا کہ میں اس قدر بے ہوش سوئی ہوں۔ یہ حالت میرے خود کے لیے شرمندگی کی تھی۔ خیال آیا کہ کسی نے مجھے اس حالت میں دیکھ تو نہیں لیا..... میں نے چونک اور گھبرا کر دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ دل کو ڈھارس سی ہوئی کہ کسی نے نہیں دیکھا۔ میں نے فوراً ہی لباس درست کیا۔ میں نے وہ کتاب اٹھائی جو بستر پر دراز ہو کر پڑھتے پڑھتے سینے پر رکھ کر سو گئی تھی کہ اسے شیلف میں رکھ دوں۔ معاً میری نظر کھڑکی پر پڑی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ جعفر کھڑکی کے پاس سلاخوں کے پیچھے کھڑا مجھے ہوس بھری نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کی کینہ توز نظروں کی گرفت میں میرا چہرہ اور سراپا تھا۔ نظروں میں جذب کیے جا رہا تھا۔ جانے وہ کب سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔ اگر کھڑکی میں سلاخیں نہ ہوتیں تو وہ یا جی' کمینہ اور ملعون کھڑکی کے راستے کمرے میں گھس آتا اور میں اپنی عزت سے محروم ہو جاتی پاک رب العزت کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری عزت محفوظ رہی۔

اسے دیکھتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ گئی کہ اس خبیث اور کمینے کی یہ مجال کہ میرے گھر میں گھس آیا..... میں نفرت اور غصے سے کانپنے لگی۔ میں نے اسے نفرت بھری نظروں سے گھورتے ہوئے چیخنا چاہا تو میرا منہ کھل نہ سکا۔ اس نے جادو کے زور سے میرا منہ بند کر دیا تھا۔ دوسرے لمحے میں نے اس کی آنکھوں سے تیز روشنی نکلتی دیکھی۔

پھر دوسرے لمحے اس کی آنکھوں سے شعاعیں پھوٹنے لگیں اور میری آنکھوں میں داخل ہو کر آنکھیں چکا چوند کرنے لگیں۔ وہ آہستہ آہستہ کچھ پڑھتا جا رہا تھا۔ شاید کوئی منتر پڑھ رہا تھا۔ اس نے میری آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ پھر میرا غصہ اور نفرت جھاگ کی طرح بیٹھ گئی ہے۔ چند لمحوں کے بعد اس کی آنکھوں میں ایک تیز چمک بجلی کی طرح کوند گئی۔ ہر چند لمحے بعد اپنی بھونڈی آواز میں آہستہ سے پکارا۔

"میری رانی..... میری جان تمنا.....! ادھر تو آؤ۔ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آؤ..... میں تمہارا شہزادہ ہوں..... میں کتنی صدیوں سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں..... تمہارے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا ہوں..... مجھے مایوس نہ کرو۔"

میں کسی معمول کی طرح دروازے کی طرف بڑھی..... دروازے کی چٹخنی کھول کر باہر آئی۔ باہر جعفر نہیں تھا..... میرے قدم آپ ہی آپ لکڑی والی کوٹھری کی طرف اٹھ گئے۔ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوئی۔ میں نے دیکھا کونے میں ایک اونچی جگہ لالٹین رکھی ہے وہ جل رہی تھی' میں نے فرش پر بستر دیکھا۔ اس نے تین خالی بوریاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھول کر بچھا دی تھیں اور اس پر وہ چادر ڈال دی تھی جو صحن میں رسی پر سوکھ رہی تھی۔ میں اس کی طرف سحر زدہ اور بے اختیار بڑھنے لگی تھی۔ اس نے اپنے بازو فضا میں پھیلا رکھے تھے۔ اس کی آنکھوں سے شیطانیت جھانک رہی تھی اور چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ مجھے اس بات کا ہوش نہیں تھا کہ وہ میری عزت خاک میں ملانے والا ہے۔ اور پھر اس کا چہرہ بہت ہی خوب صورت نظر آنے لگا۔ ایک وجیہہ دراز قد اور پرکشش آدمی لگ رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ لپک کر اس کے بازوؤں میں سما جاؤں میں اس کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بڑھ رہی تھی..... مجھے ایک دم سے ٹھوکر لگی۔ ٹھوکر میرے پیر کے انگوٹھے میں لگی تھی۔ ٹھوکر لگتے ہی میرے منہ سے ایک کراہ نکلی۔ میں درد کی شدت سے بلبلا کر فرش پر بیٹھ گئی۔ میں نے دیکھا فرش پر کلہاڑی پڑی ہے۔ اس کے پھل کی نوک سے میرا انگوٹھا لگا تھا۔ دوسرے لمحے میں اپنی تکلیف بھول کر ایک دم سے اچھل پڑی تھی اور ششدر سی ہوگئی کہ میں یہاں کیسے آ گئی۔ ٹھوکر لگ کر خون نکلتے ہی جادو کا اثر ٹوٹ گیا تھا۔ جس کے زیر اثر میں آئی تھی۔

میں نے جعفر کو تیزی سے اپنی طرف آتے دیکھا تو میں نے جھٹ سے کلہاڑی اٹھالی اور سیدھی ہو کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے مجھ پر جست لگائی تو میں سرعت سے ایک طرف ہٹ گئی..... وہ لکڑیوں کے ڈھیر پر گر پڑا۔ اس لمحے معلوم نہیں مجھ پر کیسا اندھا جنون سوار ہوگیا۔ آج بھی سوچتی ہوں تو حیران ہوتی ہوں۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے کلہاڑی کو مضبوط پکڑ لیا..... اور پھر آنکھیں بند کر کے پوری قوت سے اس پر وار کر دیا۔ اسے اتنی مہلت بھی نہیں مل سکی تھی کہ اٹھ کر بیٹھ سکے۔ اس کے منہ سے ایک دل خراش چیخ نکلی۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو لرز کر رہ گئی۔ جعفر کا دایاں ہاتھ کلائی سے کٹ کر زمین پر پڑا ہوا تھا وہ درد سے تڑپ رہا تھا۔ تڑپتے تڑپتے وہ نڈھال ہونے لگا..... دوسرے لمحے اس کا کٹا ہوا خون آلود ہاتھ دیکھ کر میں بے ہوش ہوگئی۔ معلوم نہیں کتنی دیر بعد مجھے ہوش آیا۔ میں ہوش میں آئی تو میں اس کوٹھری میں ہاتھ کے پاس زمین پر پڑی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں کیا کروں۔ پھر ایک خیال آیا کہ گھر والوں کو جگا کر اس لرزہ خیز واقعہ کے بارے میں بتادوں۔ میں نے سوچا کہ اللہ جانے گھر والے کیا نتیجہ اخذ کریں۔ نوکروں کو بھی اس واقعہ کے بارے میں کسی نہ کسی طرح پتا چل جائے گا۔ طرح طرح کے قصے کہانیاں عام ہو جائیں گی۔ میرے اور میرے گھر والوں کی بڑی بدنامی ہوگی۔ بہتر ہے کہ زبان بند رکھی جائے۔

میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی تو میں نے اس کوٹھری کے ایک کونے میں کلہاڑی کی مدد سے فرش کی کھدائی کی چوں کہ اس کا فرش کچا تھا اس لیے ایک گڑھا بن گیا۔ پھر میں نے اس کٹے ہوئے ہاتھ کو اس گڑھے میں دبا کر فرش اوپر سے برابر کر دیا۔ جن لکڑیوں پر خون کے چھینٹے پڑے تھے انہیں مٹا دیا تھا۔ میں نے صابن کو گیلے کپڑے پر لگا کر انہیں جتنا پونچھ سکتی تھی پونچھ کر صاف کر دیا۔ پھر اپنے کمرے میں آ کر انگوٹھے کے زخم کو صاف کیا۔ تھوڑی دیر بعد سونے کے لیے بستر پر لیٹی تو یہ سب کچھ کسی ڈراؤنے خواب کی طرح لگ رہا تھا اور میرے سارے جسم میں ایک عجیب اور وحشت ناک سنسناہٹ بھری ہوئی تھی۔

میں نے اس ہولناک واقعہ کا کسی سے ذکر نہیں کیا۔ دوسرے دن میں کالج نہیں گئی۔ اس روز سے جعفر کہیں دکھائی نہیں دیا۔ وہ اچانک اور پراسرار طور پر لاپتا ہوگیا تھا۔ اس کا گدھے کے سر کے سینگ کی طرح غائب ہو جانا میرے اور لڑکیوں کے لیے خوشی اور طمانیت کا باعث تھا۔

اس طرح ایک برس بیت گیا۔ اس واقعہ کے ایک برس بعد ہی میری شادی بھی ہوگئی۔ پھر میں یہاں آ گئی۔ میری شادی کو دو برس کا عرصہ بھی نہیں

گزرا کہ وہ یہاں مجھ سے انتقام لینے کے لیے آ گیا۔ وہ اپنے اس ہاتھ سے میری جان لینے کے درپے ہے جس ہاتھ کو میں نے کاٹ دیا تھا۔ اس مزدور نے کتنی نوجوان اور حسین لڑکیوں اور عورتوں کی جانیں لی ہیں۔ خدا اس مردود کو ایسی عبرتناک سزا دے کہ وہ کتے کی موت مرے۔'' رضیہ اپنی کہانی سنا کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

انہوں نے رضیہ کو تسلی و تشفی دی ادھر رضیہ نے اپنی کہانی ختم کی ادھر مغرب کی اذان ہونے لگی۔ انہوں نے مغرب کی نماز پڑھی پھر سب نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد انہوں نے میاں بیوی سے کہا کہ وہ جعفر کی تلاش میں جا رہے ہیں۔ آپ سکون و اطمینان سے سوئیں۔ وہ ان دونوں کی بات سن کر گھبرا گئے۔ رضیہ بولی کہ خدا کے لیے آپ یہاں سے مت جائیں۔ کیوں کہ اب تو دو دو ہاتھ آنے لگے ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ وہ ہماری جان لے کر ہی چھوڑیں گے۔ انہوں نے ان دونوں میں بیوی سے کہا کہ..... اس گھر میں جتنے افراد ہیں وہ سات مرتبہ آیت الکرسی پڑھیں اور سورۃ فلق بھی..... وہ ہاتھ قریب بھی نہیں آئے گا..... اور کالا جادو بھی اثر نہیں کرے گا۔ جب وہ صبح واپس آئے تو ہاشم نے بتایا کہ..... ان کے جانے کے ایک گھنٹہ بعد وہ دونوں ہاتھ آئے تھے لیکن وہ کمرے میں گھس نہ سکے۔ انہوں نے کمرے میں گھسنے کی بڑی کوشش کی تھی۔ بڑا زور لگایا تھا لیکن ان کی ہر کوشش ناکام رہی تھی۔ کوئی نادیدہ طاقت انہیں اٹھا کر باہر پھینک دیتی تھی۔

وہ جعفر کی تلاش میں شمال کی جانب چل پڑے تھے۔ اس کے موکل نے انہیں بتایا تھا کہ وہ ملعون ایک ویرانے میں ایک تالاب کے کنارے کٹیا ڈالے پڑا ہے۔ جب وہ اس کی کٹیا میں داخل ہوئے تو وہ انہیں دیکھ کر اچھل پڑا۔ ایک نوجوان لڑکی عریاں حالت میں فرش پر بے ہوش پڑی تھی۔ اس کے سامنے ایک گولا رکھا تھا۔ اس گولے میں رضیہ اور اس کا شوہر' کمرا اور دونوں کٹے ہوئے ہاتھ نظر آ رہے تھے۔ وہ اپنے جادو کے زور سے ان دونوں ہاتھوں سے کام لینا چاہ رہا تھا۔ اس کا جادو کلام الٰہی کے آگے بے بس ہو رہا تھا۔ اس مردود نے انہیں دیکھتے ہی اپنے جادو کا سارا زور ان پر صرف کر دیا۔ اس کے شیطانی چیلوں نے انہیں اپنے نرغے میں لے لیا۔ جب وہ اپنی طاقت آزما چکا اور اپنی تمام کوششوں کو لاچکا تو انہوں نے اس کا جادو اس پر الٹ دیا۔ پھر اس معصوم جوان لڑکی کو ہوش میں لا کر اس کے گھر پہنچا دیا۔ اس مردود کے پاس جو دوسرا کٹا ہوا تھا وہ ایک ایسے شخص کا تھا جو ٹرین کے نیچے آ کر کٹ گیا تھا۔ وہ اس کٹے ہوئے ہاتھ کو اٹھا لایا تھا۔

آپ جب کبھی چنا گانگ شہر جائیں تو ریاض الدین بازار سے ریلوے اسٹیشن کی عمارت سے سو قدم پر ایک فقیر نظر آئے گا جس کی دونوں آنکھیں نہیں ہیں۔ آنکھوں کی جگہ اس میں گڑھے نظر آئیں گے۔ اس کے علاوہ ایک ہاتھ اور ایک پیر سے بھی محروم ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ پیدائشی طور پر عجیب الخلقت ہے۔ اس کا دایاں ہاتھ نہیں ہے۔ صرف بازو ہے۔ لوگ خیرات دینا تو درکنار اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے ہیں..... وہ ہر کسی سے چیخ کر کہتا ہے کہ اسے خیرات نہیں دولت چاہیے..... اسے گولی مار دو..... وہ گڑگڑا کر اللہ سے موت مانگتا ہے اسے موت نہیں آتی ہے..... وہ پانچ برسوں سے عذاب الٰہی سہہ رہا ہے۔ قدرت نے اسے ایسی بھیانک سزا دی ہے کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے کالے جادو نے اسے مقام تک پہنچایا۔

وہ شخص کون ہے.....؟ وہ جعفر ہے۔

رضیہ اور ہاشم ایک خوش گوار زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ دو بچوں کے باپ ہیں جن سے گھر میں رونق اور خوشیاں ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بند مٹھی میں خواب

کامران جاذب

اور پھر اس کی زندگی بھی گھنٹوں میں بٹ گئی اور ڈالروں میں! ایک گھنٹے کے دس' آٹھ گھنٹے کے اسی اور..... چودہ کے..... ایک سو چالیس ڈالر۔ وہ کبھی نہ ختم ہونے والی دوڑ میں شریک ہوگیا۔ سب اندھا دھند بھاگ رہے تھے' بنا رکے' بغیر کہیں ٹھہرے۔ وہ روزانہ پندرہ گھنٹے کی سبکی اور ذلت اٹھاتا اور مہینے کے پندرہ سو ڈالر نذیر خواجہ کی انگلیوں کو چھو کر چچا کی واسکٹ کی جیب میں کہیں گم ہو جاتے۔

اس شمارے کے لیے.....ایک دلگداز تحریر

ایک روز اس نے مٹھی کھولی تو بلک بلک کر رو پڑا۔ بند مٹھی سے خواب کہیں سرک گئے تھے اور نیندیں.....وہ تو فاروق آباد کی گلیوں میں چھوڑ آیا تھا۔

''ہفتے میں کتنے کما لیتے ہو۔'' اس نے سریندر سے پوچھا تھا۔

''پانچ' ساڑھے پانچ سو۔''

''مہینے کا دو ہزار۔''

''دو ہزار!'' سریندر تمسخر سے ہنسا۔ ''گیارہ سو۔''

''گیارہ سو۔'' اسے سریندر کے دماغ میں رسولی کا گمان گزرا۔ اتنا غلط حساب۔

''ساڑھے چار سو فلیٹ کا کرایہ اور چار پانچ سو کھانے کا خرچہ.....ہم ہزار ڈالر سے اوپر نہیں جاتے۔'' دلجیت سنگھ نے ہونٹ بھینچ کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ اس کا پہلا دن تھا اور اس پہلی رات وہ پانچ سو کو چار سے ضرب دے کے دو ہزار' دو ہزار میں سے ساڑھے چار سو اور چار پانچ سو تفریق کر کے گیارہ سو اور گیارہ سو کو پچاس سے ضرب دے کر ہزار والے کرارے پچپن..... پچپن ہزار..... پاکستانی پچپن ہزار بناتا رہا۔ سریندر اور دلجیت تھکن بھری نیند میں غرق تھے اور وہ ان کے پیروں میں لیٹا ڈالر اور روپے کے پتے پھینٹ رہا تھا۔

سریندر بنگالی تھا' دلجیت انڈین اور وہ پاکستانی۔ وہ تینوں بالٹی مور کے ایک گندے علاقے میں ایک تنگ فلیٹ میں اکٹھے تھے۔ سریندر ٹیکسی چلاتا تھا اور دن رات چلاتا تھا۔ اس نے گھر بیچ کے ماں اور بہن کو تایا کے گھر میں بٹھا دیا تھا اور کل پونجی ایجنٹ کی ہتھیلی پہ رکھ دی تھی۔ شنو اس کی چھوٹی بہن نے اس کے گھٹنوں کو چھو کر گیلی آنکھوں سے اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا تھا۔ ''ہم سوکھی کھالیں گے' بھوکے رہ لیں گے' مگر تایا کے گھر..... مت جاؤ۔'' اور اس کی ماں نے بڑے حوصلے سے اس کا شانہ تھپتھپا کر کہا تھا۔

''ماں کی یاد ستائے تو لوٹ آنا۔'' وہ شنو کے کہنے پر رکا نہیں تھا اور نہ ماں کی یاد ستانے پہ اپنے گھر

کی سوکھی کھانے لوٹ گیا تھا۔ بس رات کے آخری پہر گھٹنوں میں سر دیے ہچکیاں لے لے کے روتا رہتا تھا اور جب سٹاپ پہ دبلی سی ایک لڑکی چپ چاپ سر جھکائے بس کے انتظار میں کھڑے ہوتی تو سریندر کی ٹیکسی بڑے پیار سے اس کے پاس آ کے رکتی۔ پہلی بار اسے دیکھ کے سریندر کی پلکیں بھیگ گئی تھیں اور سینے میں ایک عجیب سا درد اٹھا تھا ''شنو! کم آن پلیز!'' اس نے منت سے کہا تھا۔ اسکرٹ والی دبلی پتلی نے حیرت سے اس سانولے ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھا تھا جس کی آنکھیں گیلی گیلی تھیں اور وہ چپ چاپ دروازہ کھول کے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ تب وہ شنو نہیں' جینی تھی۔ مگر جب اگلے روز دوبارہ اسی جگہ اسی اسٹاپ پر اس سے پہلے سانولے رنگ کا ٹیکسی والا بھیگی پلکیں لیے اس کا منتظر تھا تو وہ بھی شنو بن گئی۔ اس شام سریندر نے فون پہ شنو سے کہا تھا۔ ''شنو! میری جان! یہاں مجھے شنو مل گئی ہے' میں اسے اسکول چھوڑنے جاتا ہوں اور وہ ہر روز میرے ساتھ ڈھیروں باتیں کرتی ہے۔''

جواب میں ایک سسکی سی ابھری تھی اور شنو نے کہا تھا۔ ''بھیا! میری جان! یہاں کوئی سریندر نہیں ہے' کوئی میرے ساتھ باتیں نہیں کرتا۔'' سریندر کی چھاتی میں بڑے زور کا درد اٹھا تھا اور اس کا جی چاہا تھا ٹیکسی کو آگ لگا دے اور ڈالروں پہ تھوک کے اپنی ننھی سی شنو سے باتیں کرنے لوٹ جائے۔ مگر دلجیت نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کے اس کی آنکھوں سے ٹپکے قطرے پونچھتے ہوئے اسے یاد دلایا تھا کہ ڈھاکہ میں اس کی ماں اور بہن تایا کے گھر میں رہتی ہیں۔ اس کا اپنا کوئی گھر نہیں' ٹکے اور روپے سے مکان نہیں بنتے اور نہ بہن کی رخصتی..... ڈالر ڈالر۔

اور وہ دلجیت کے گلے سے لگ کر دیر تک روتا رہا تھا۔

دلجیت جالندھر سے آیا تھا۔ قد کاٹھ اور مضبوط ہڈ پیر والا۔ دل کا بڑا اچھا۔ سرداروں والی زندہ دلی' ہنس مکھ۔ شریکے نے اس کے سارے خاندان کو آگ میں جھونک دیا تھا وہ اکیلا بچا تھا۔ ٹھنڈے اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹھوکریں کھاتا اس جہنم سے نکل آیا۔ فلنگ سٹیشن پہ گاڑیوں میں گیس بھرتا اور اکثر ترنگ میں آ کے ٹپے اور ماہیے گاتا۔

تتی ریت کڑاہیاں دی
مڑ آ وے ڈھولا
تیں لوڑ کمائیاں دی
اور پھر لمبی تان میں............!!
ٹاہلی وچ لیکاں نے
کوئی تینوں جا دسے
بس تیریاں اڈیکاں نے

اور آہستہ آہستہ اس کی آواز ڈوبنے لگتی۔ عجیب سا درد کمرے میں پھیل جاتا۔ جیسے چڑیا گھونسلے سے گرنے والے بچے کے غم میں رو رہی ہو، جیسے بوڑھی ماں جواں مرگ پہ ماتم کناں ہو جیسے...... سریندر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیتا اور بڑے دکھ سے کہتا ’کیوں روتا ہے یار! تو تو بڑا اچی دار ہے سردار۔

اور سردار دلجیت سنگھ رندھی ہوئی آواز میں کہتا۔ ”آپاں رونڈے تے تیں پر رون آ جاندا۔“

اور پھر وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ کے خوب روتے۔

پہلے روز وہ سہما سہما تھا‘ ڈرا ڈرا‘ جھجکا‘ جھجکا‘ دلجیت سنگھ کے جوڑے اور سریندر کے سانولے پن سے۔ شام ڈھلے جب سریندر نے ”چٹھی آئی ہے‘ وطن سے چٹھی آئی ہے“ کی تان لگائی اور دلجیت سنگھ نے کان پہ ہاتھ رکھ کے۔

تالے تالے تالے
اساں رل گئے جیویں یار
تیں رلدے نصیباں والے

کی ہوک اٹھائی تو اسد کو لگا اس کے سر پہ بھی جوڑا اگ آیا ہے اور اس کی رنگت بھی سریندر کی طرح سانولی ہو گئی ہے۔ وہ بھول گیا کہ وہ تین ماہ ذلت کے سفر میں آبلہ پا ہو کر منزل پہ پہنچا ہے اور اس کے باپ نے اسے دس لاکھ کے عوض گروی رکھ دیا ہے۔ اس نے کبھی خواہش نہیں کی تھی ڈالر اور پاؤنڈ کمانے کی وہ تو چار ہزار کی کلرکی میں قانع تھا مگر چار ہزار میں تین منزلہ مکان نہیں بنتے جو اس کی گلی میں کھمبیوں کی طرح اگ آئے تھے۔ لمبی گاڑیاں اور جیب میں موبائل نہیں رکھے جا سکتے جو اس کے چچا زاد بھائیوں کے پاس تھے اور اتنی تنخواہ میں گولڈ لیف کے سگریٹ نہیں پھونکے جا سکتے جو اس کے باپ کو پسند تھے اور اس کا چچا بیک وقت دو پیکٹ جیب میں ڈالے گولڈن لائٹر انگلیوں میں گھماتا رہتا تھا۔

اس کے دو کزن امریکہ میں تھے اور درختوں سے ڈالر توڑ توڑ کر باپ کو بھیج رہے تھے۔ چچا نے دس لاکھ ایجنٹ کی جھولی میں ڈال کے اسد کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی تھی۔

”پچپن میں سے چالیس...... اگر چالیس ہزار ہر مہینے گھر بھیجے اور چالیس میں سے تیس...... تیس ہزار ہر ماہ چچا کو واپس ہو تو...... تین سال میں...... تین سال میں یہ بیڑی اتر جائے گی۔“ اس نے چھت کو گھورتے ہوئے سوچا۔

”پھر تین سال میں مکان...... تین منزلہ مکان......! گاڑی اور...... گولڈ لیف کے سگریٹ......“ کم از کم چھ سال وہ نہیں لوٹ سکتا تھا۔ ان گلیوں میں جہاں وہ دن بھر دوڑا پھرتا‘ ان راستوں پہ جو قدموں کو ازبر تھے اور ان لوگوں میں جہاں اس کی اپنی ایک شناخت تھی۔

سریندر آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا۔ ”گھر یاد آ رہا ہے۔“

”ہاں! کام کب ملے گا۔“

”فکر نہیں! کام بڑا۔“

اور آٹھویں روز جب دلجیت سنگھ نے اسے فلنگ سٹیشن پہ لا کھڑا کیا تو اس کا جی چاہا سب کچھ چھوڑ کے واپس بھاگ جائے فاروق آباد کے چھوٹے سے ڈاکخانے کی ادھڑی ہوئی کرسی پہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے ٹھاٹھ سے اور اپنے والد محترم نذیر خواجہ سے صاف صاف کہہ دے ”مجھے یہ ذلت قبول نہیں! آپ حقہ پی لیا کریں اور کچے کوٹھے کے کچے ویہڑے میں کھری چارپائی پہ لیٹ کے لمبے لمبے خراٹے لیا کریں۔ میں واپس آ رہا ہوں۔“

مگر دس لاکھ کا پھندہ اس کے گلے میں پڑا تھا۔ وہ اس سولی سے اتر نہیں سکتا تھا۔

آٹھ گھنٹے وہ صلیب پہ ٹنگا رہا اور جب دو بسیں بدل کے میل بھر پیدل چل کے فلیٹ پہ پہنچا تو سریندر انگلیوں سے میز بجا رہا تھا اور دلجیت سنگھ آنکھیں موندے لمبی تان لگا رہا تھا۔

”چٹھی اج دی سجن دی نہ آئی“

میز پہ وہسکی کی آدھی بوتل پڑی تھی اور دو خالی گلاس جن کی تہہ میں ذرا سی وہسکی اونگھ لے رہی تھی۔ اس کو ابکائی سی آ گئی۔ وہ ان کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا۔ سریندر نے اس کے ماتھے پہ لکھی ناگواری کی تحریر پڑھ لی اور بوتل کو اٹھا کے سرہانے کے نیچے ڈھانپ دیا۔

”پلا ساڈے یار نوں!“ دلجیت نے خالص خالصہ انداز میں کہا۔

سریندر نے گھور کے اسے دیکھا اور اسد کو کلائی سے پکڑ کے اپنے پاس بٹھا لیا۔

”پی سوہنیا! رج رج پی!“ نشہ دلجیت کے دماغ کو چڑھا ہوا تھا۔ اسد کا دم گھٹنے لگا۔

”نشے میں ہے! برا مت ماننا۔“ سریندر نے سر جھکا کے ہولے سے کہا۔

”کہو‘ کیسا رہا۔“ اس نے نرمی سے پوچھا۔

”میں کل سے نہیں جاؤں گا!“ اسد نے ہونٹ بھینچے ہوئے کہا۔

”کیا۔ کیوں۔“ وہ حیرت زدہ رہ گیا۔

”اچھا نہیں لگا۔“ اس نے بجھے بجھے لہجہ میں کہا۔

”کیا۔ کیا اچھا نہیں لگا۔“

”وہاں گورے آتے ہیں‘ گاڑیوں میں۔ مجھے لگا میری طرف دیکھ کے طنزیہ ہنستے ہیں۔ میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ مجھے ہتکی محسوس ہوئی......“ اس نے انگلیاں مسلتے ہوئے کہا۔

”دلجیت کو جانتے ہو۔“ سریندر نے اسد کی آنکھوں میں جھانکا۔ دلجیت سنگھ نشہ میں اونگھ رہا تھا۔

اسد نے حیرانی سے سریندر کو دیکھا۔

”جالندھر میں لاکھوں کی جائداد ہے‘ بہت بڑی حویلی۔ میرے جیسے کئی اس کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے مگر وقت نے...... آج ایک اٹڈین کا ملازم ہے۔ ہندوستانی گاڑیوں میں آتے ہیں اور یہ ان کی کاروں میں گیس بھرتا ہے۔ ہفتے کے پانچ سو ڈالر کے لیے۔ اسے کبھی ہتکی محسوس نہیں ہوئی۔ شاید ہوتی ہو...... شراب پی کے ان سب کو گالیاں دیتا ہے۔ شرم چھپانے کے لیے گلا پھاڑ پھاڑ کے ماہیے گاتا ہے۔“

اسد نے ترحم بھری نظروں سے دلجیت سنگھ کو دیکھا جو بیٹھے بیٹھے لڑھک گیا تھا۔

”اور میں! خنزیروں کے لیے جھک کے دروازہ کھولتا ہوں! ماں اور بہن تائے کی چوکھٹ پہ بیٹھی راستہ دیکھ رہی ہوں تو جھکنا پڑتا ہے۔“ سریندر نے بڑے دکھ سے کہا۔

”ڈھاکہ کی سڑکوں پہ کتنی ٹیکسیاں چلتی ہیں‘ سینکڑوں! شائد ہزاروں! کتنے سریندر رات کو خالی ہاتھ گھر کو لوٹ جاتے ہیں‘ بیشار! مگر ان کی مائیں‘ ان سب کی بہنیں بھاگ رہی ہوتی ہیں‘ منتظر۔ خالی ہاتھ‘ تھکے ہاروں کے لیے منتظر! ہاتھوں میں پانی کے کٹورے لیے‘ نیند سے بوجھل آنکھوں میں پیار لیے‘ گرم چپاتی اور کبھی نہ ختم ہونے والی دعاؤں کے ساتھ...... اور میں! بارہ گھنٹے کی تھکن اور جیب میں بہت سے ڈالر لے کے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھتا ہوں تو...... تو سناٹا ڈراؤنی شکلیں بنا بنا کے مجھے ڈراتا ہے اور تنہائی۔“

اسد نے اس کا ہاتھ اپنی مٹھی میں لے لیا۔

”شنو کہتی ہے بھیا! میں ساری رات پانی کا کٹورا لیے جاگتی ہوں۔ کب آؤ گے۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سریندر کا سر ڈھلک کے اسد کے شانے پہ ٹک گیا۔

دلجیت اور سریندر ایک پلیٹ میں کھاتے تھے۔ ایک ہی کھابہ۔ دلجیت سنگھ نے ترکاری کی پلیٹ اسد کے سامنے رکھی تو اسد کو کھن آ گئی۔ اس نے خاموشی کے ساتھ ہاتھ بڑھا کے پلیٹ پرے سرکا دی۔

"نخرے ماواں اگے چنگے لگدے نے مسلیاں!" دلجیت نے کہا۔

اسد خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہ گیا اور جب اس نے چچا کے گھر فون کر کے اماں سے بات کی تو سب سے پہلے دبی آواز میں اسے بتایا۔ "میں دلجیت کے ساتھ رہتا ہوں' انڈیا کا سکھ ہے..... اور سریندر بنگالی' ہندو۔"

"اللہ خیر! پتر خیال کریں!" اماں نے فوراً پریشانی سے کہا۔

"بھانڈے۔"

"ان کے برتن علیحدہ ہیں....." اس نے سرگوشی میں کہا۔

سریندر نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا اور اٹھ کے ٹی وی آن کر دیا۔ دلجیت سنگھ نے ہاتھ روم میں گھس کے زور سے دروازہ بند کیا۔ اسد کو یوں لگا جیسے سریندر کہہ رہا ہو ہمارے ٹی وی علیحدہ علیحدہ نہیں ہیں اور دلجیت سنگھ نے جتلایا ہو کہ ہمارا باتھ روم ایک ہے' مشترک۔

اور اسی رات سریندر نے ڈھاکہ فون کیا تو شنو سے کہا۔ "اسد پاکستانی ہے' بڑا اچھا' دلجیت جیسا۔"

پھر شنو کی بات سن کے پلٹا اور اسد سے کہا۔ "بھائی! تمہیں سلام کہہ رہی ہے۔"

اسد بھونچکا رہ گیا۔ سریندر نے ریسیور دلجیت کی طرف بڑھا دیا۔ "تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔"

"کاکی! کی حال آ تیرا۔ راضی باضی.....! آہو آپاں وی ٹھیک آں....." دلجیت کے چہرے پہ خوشی رقص کر رہی تھی۔ اسد حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔

"ماں جی ناں گل کر۔"

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ اسد دلجیت کے چہرہ کو ٹک ٹک دیکھے جا رہا تھا جس پہ روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

"پرنام ماں جی!" دلجیت کے لہجہ میں ایک دم عاجزی آ گئی' سر جھک سا گیا۔

"ستے خیراں..... دعاواں تہاڈیاں! اک ہور بھرا آ گیا' فکر نہ کیتا کرو۔"

اور جب سریندر نے ماں جی سے بات کر کے ریسیور اسد کے کان سے لگایا تو وہ جیسے گونگا ہو گیا۔ اس کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا اور جب سریندر کی ماں نے "جیتا رہ!" کہا تو اسے یوں لگا وہ اس کی اپنی اماں کی آواز تھی۔ وہی میٹھی میٹھی' رس بھری۔

پہلے ہفتے کے ساڑھے چار سو ڈالر جیب میں ڈال کے اسد فلیٹ پہ پہنچا تو اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور سارے جسم پر بیزاری کے سرکنڈے اگ آئے تھے۔ ڈالر فرش پہ رکھ کے اس نے جوتے کے تلوے سے مسل ڈالے اور پھر بڑی حقارت سے حلق بھرا تھوک ان پہ اگل دیا۔ سریندر اور دلجیت چپ چاپ اسے دیکھتے رہے۔

"ان کی خاطر..... صرف ان کے لیے.....!" اس نے بڑی نفرت سے ٹھڈا مارا۔

اور پھر اس کی زندگی بھی گھنٹوں میں بٹ گئی اور ڈالروں میں! ایک گھنٹے کے دس' آٹھ گھنٹے کے اسی اور..... چودہ کے..... ایک سو چالیس ڈالر۔ وہ کبھی نہ ختم ہونے والی دوڑ میں شریک ہو گیا۔ سب اندھا دھند بھاگ رہے تھے' بنا رکے' بغیر کہیں ٹھہرے۔ وہ روزانہ پندرہ گھنٹے کی سکی اور ذلت اٹھاتا اور مہینے کے پندرہ سو ڈالر نذیر خواجہ کی انگلیوں کو چھو کر چچا کی واسکٹ کی جیب میں کہیں گم ہو جاتے۔

دلجیت کہتا "تھوڑا دوڑ مترا۔"

اور وہ کہتا "گھنٹے تک مجھے بھاگ لینے دو۔ دس لاکھ مجھے رکنے نہیں دیتے۔"

سریندر کہتا "فضول ہے! پانچ سال تو پکے ہیں..... کاغذ ملنے تک....." ..... وہ بے یقینی سے پوچھتا "مل جائیں گے۔"

دلجیت کہتا "شاید۔"

سریندر ڈھارس بندھاتا "یقیناً۔"

"اور اگر نہ ملے تو....."

"تے کون مائیاں بیٹھی اے تیرے لئی!" دلجیت اسے چھیڑتا۔

کوئی مائیوں نہیں بیٹھی تھی اس کے لیے مگر اس کا دل وہیں فاروق آباد میں کہیں دھڑکتا تھا۔ ڈاکخانے کی ادھڑی ہوئی کرسی اور فٹبال کی گراؤنڈ میں۔

سریندر چھ سال سے گھر نہیں لوٹا تھا بس ہر مہینے ہزار ڈالر ماں کو بھجوا دیتا اور ہر ہفتے فون پر شنو کو تسلی "دو چار ماہ میں پکے کاغذ مل جائیں گے تو تجھے ملنے آؤں گا۔ دلجیت بھی آئے گا اور اسد بھی!" یہ وعدہ وہ چھ سال سے کرتا چلا آیا تھا اور شنو ہر بار اس کا یقین کر لیتی۔ دلجیت کو کہیں نہیں جانا تھا جالندھر بھی نہیں۔ اسے گرین کارڈ مل گیا تھا مگر وہ اپنے زخم ہرے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسد ٹھنڈی آہ بھرتا "اوئے سردارا! گرین کارڈ مجھے دے دے۔"

دلجیت ہنس کے کہتا۔ "کاکا! سرتے جوڑا بناتے لے لے۔"

سریندر کہتا۔ "تیری ماں تجھے گھر میں داخل نہیں ہونے دے گی۔ تیرے برتن علیحدہ کر دے گی۔"

دلجیت ہوکتا۔ "اوجھلیا! کدی ماواں وی بھانڈے وکھ کردیاں۔ ماں پیو دی کلی اولاد' تولین کی آیا۔"

ماں ہر بار فون پہ اسے کہتی۔ "بس کر کمائیاں! اب آ جا۔"

اور وہ سریندر کی طرح ہر بار کہہ دیتا۔ "دو چار ماہ میں گرین کارڈ۔"

اس کے برتن علیحدہ تھے۔ سوچ مختلف تھی مگر ایک ساتھ رہنے کی مجبوری تھی۔ وہ اکیلا فلیٹ افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔

جس روز سریندر کی ماں کو فالج نے پچھاڑ دیا' وہ تینوں گلے لگ کے روتے رہے تھے۔ جیسے فالج ان تینوں پہ گرا ہو۔ سریندر گم صم ہو گیا تھا اور جب شنو نے اس سے کہا۔ "بھیا! اب تو ماں بھی میرے ساتھ نہیں بولتی!" تو وہ ریسیور کان سے لگائے بلک بلک کے رو پڑا تھا اور تب دلجیت سنگھ نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے ہولے سے منت بھرے انداز میں کہا۔ "بھرا! میں ماں جی نوں دیکھ آواں۔"

سریندر' دلجیت سنگھ کے گھٹنوں پہ سر رکھ کے جھک گیا تھا اور ساتویں روز جب وہ دونوں دلجیت کو ایئرپورٹ پہ چھوڑنے آئے تو سریندر نے پنچوں کے بل کھڑے ہو کے دلجیت کی پیشانی پہ بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ "ویرا! میری بہن نوں میرے ولوں....." دلجیت نے بڑی عقیدت کے ساتھ اپنی پیشانی پہ ہاتھ رکھ لیا جیسے سریندر کی امانت اس کی بہن تک پہنچانے کے لیے محفوظ کر رہا ہو۔

دسویں روز ڈھاکہ سے دلجیت کا فون آیا۔ "آپاں تے واپس کوئی نئیں آنا' ماں جی تے شنو دے نال رہنا۔"

بیس روز بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے پاس سریندر اور اسد کے لیے بیشمار تحفے تھے' ماں جی کی ان گنت دعائیں اور شنو کا ڈھیر سارا پیار۔

پانچ سال بہت طویل ہو گئے تھے۔ جب آخری قسط چچا کی مٹھی میں پہنچی تو اسد نے پہلی بار فلنگ سٹیشن سے چھٹی کی۔ وہ سارا دن لمبی تان کے سویا رہا' جیسے صحرا کا مسافر کسی چشمے سے سیر ہو کے سوتا ہے۔ دوسری بار وہ تب سکون سے سویا تھا جب تین منزلہ مکان کے باہر اسد خواجہ کے نام کی تختی لگی تھی۔ رات ایک بجے سریندر نے جھنجھوڑ کر اسے جگایا۔ دلجیت صوفے سے ٹیک لگائے دوزانو ساکت بیٹھا تھا اور سریندر کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی تھی۔ وہ اٹھ کے بیٹھ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اسد!" سریندر نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ وہ اسد سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔

"اوں۔" اس نے تساہل سے کہا۔

دلجیت اٹھ کے ان کے قریب آ گیا۔ "اک بری خبر اے!" اس نے اسد کی طرف دیکھا۔

"کیا۔" وہ بھی چونک پڑا۔

"او..... اباجی دا....." دلجیت اٹک گیا۔ اسد کا دل اچھل کے حلق میں آ گیا۔

"ایکسیڈنٹ!" سریندر نے تھوک نگل کے بات ادھوری چھوڑ دی۔

اسد کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ دلجیت اسد کے گلے میں بازو ڈال کے ہچکیاں لینے لگا۔ سریندر کا چہرہ بھی پانی میں تر تھا۔

تین منزلہ مکان میں نذیر خواجہ کو قدم رکھنا نصیب نہیں ہوا۔ وہ اس روز مکان کی خوشی میں مٹھائی لینے نکلا تھا اور ویگن نے اسے سڑک کے درمیان پچھاڑ دیا تھا۔ لوگ اسے چارپائی پہ ڈال کے نئے گھر کی دہلیز پہ لائے تھے۔

تب پانچ سال بعد اسد پہلی بار سکون کی نیند سویا تھا اور اس کا باپ ہمیشہ کی نیند..... اس روز اسد نے مٹھی کھولی تو بلک بلک کے رو پڑا۔ بند مٹھی میں سے خواب کہیں سرک گئے تھے اور نیندیں..... وہ تو فاروق آباد کی گلیوں میں کہیں چھوڑ آیا تھا۔ اس کے ہاتھ خالی تھے' وہ بے اختیار تھا۔

وہ نئے گھر میں اپنے باپ کی میت کو کندھا دینے نہیں جا سکتا تھا' اپنی اماں کے بین نہیں بانٹ سکتا تھا۔ اس کے آنسو نہیں پونچھ سکتا تھا اور جب وہ اپنی بے بسی پہ دھاڑیں مار مار کے رو رہا تھا تو دلجیت سنگھ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کے آہستگی سے کہا۔ "میں تیری تھاں روآواں۔"

اسد نے بڑی عجیب نظروں سے دلجیت سنگھ کو دیکھا۔

"میں اپنے بھانڈے نال لے۔"

اسد نے دلجیت سنگھ کو اپنے سینے سے چمٹا لیا۔

دلجیت سنگھ واپس آیا تو چھوٹی سی ایک پوٹلی اور رکابی اسد کے ہاتھ میں تھما دی۔ اسد نے پوٹلی کھولی تو تازہ مٹی کا ایک ڈھیر قالین پہ جم گیا۔

"تیرے باپو دی قبر دی مٹی....." اسد نے مٹی کو آنکھوں سے لگا لیا۔ باپ کے سانسوں کی مہک کے ساتھ گولڈ لیف کے سگریٹوں کی خوشبو اس کے اندر اتر گئی۔

"ماں جی ایس رکابی وچ کھاندے سی' کہندے سی تنوں بھرا ایدے وچ کھایا کرو۔"

اسد نے نمناک آنکھوں سے دلجیت سنگھ کو دیکھا۔

"بیلیا! بس کر کمائیاں! وڈے مکان وچ کلی ماں کو کدی پھر دی آ۔" دلجیت سنگھ نے بھرائی ہوئی آواز میں منت سے کہا۔ اسد کا جی چاہا اڑ کر ماں کے قدموں میں جا گرے۔ مگر 'دو چار ہفتے میں گرین کارڈ.....' کی آس نے ہمیشہ کی طرح پیروں میں زنجیر ڈال دی۔ وہ فون کرتا تو ماں کہتی 'مجھے بند کمروں سے خوف آتا ہے' ساری ساری رات نیند نہیں آتی۔

وہ کہتا۔ "بس اماں! سال ڈیڑھ! ہمیشہ کے لیے لوٹ آؤں گا۔"

سریندر کو گرین کارڈ مل گیا وہ نو سال کے بعد ماں کی گود میں سر رکھ کے رونے چلا گیا تھا اور شنو کی نو سال تک تالو سے چپکی ہوئی باتیں سننے کے لیے۔ دلجیت کو ایک عجیب سی چپ لگ گئی تھی۔ اس کے ماہیے اور ٹپے کہیں کھو گئے تھے۔ بس رکابی کو سینے سے لگائے کھویا کھویا رہتا۔

سات سال بعد بڑے میں گرین کارڈ اور بریف کیس میں ڈالر لیے وہ چپ چاپ لاہور کے ایئرپورٹ پہ اترا تو اس وقت رات کا ایک بجا تھا۔ بغیر رکے صبح تین ساڑھے تین بجے وہ فاروق آباد پہنچ سکتا تھا۔ باہر شدید دھند تھی اور سردی۔ اس نے جیب سے موبائل نکالا اور گھر کا نمبر ڈائل کیا مگر پھر اچانک اس نے موبائل آف کر دیا۔

"سرپرائز دوں گا!" اس نے گولڈ لیف کا سگریٹ سلگاتے ہوئے سوچا۔

"آج ابا زندہ ہوتے تو مجھے لینے آتے۔"

اس نے دھوئیں کا کڑوا گھونٹ بھرا۔ آنکھوں میں نمی سی اتری اور اس نے رات کو رکنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پہ نیم دراز وہ پیچھے کی طرف دوڑ رہا تھا۔ ٹیکسی آگے کو بھاگ رہی تھی اور وہ سات سال پیچھے کی طرف۔ تب اس کا چھوٹا سا گھر تھا' چھوٹی چھوٹی خواہشیں' چھوٹے چھوٹے خواب۔ ماں باپ' سنگی ساتھی' ڈاکخانے میں چھوٹی سی ادھڑی ہوئی کرسی..... اور..... سات سال بعد وہ گرین کارڈ بٹوے میں ڈالے لوٹ آیا تھا۔ گرین کارڈ نے بہت کچھ چھین لیا تھا..... باپ بھی۔

صبح چار بجے وہ فاروق آباد پہنچ گئے۔ سات سالوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ گلیاں اور راستے بھی مگر اپنی گلی کا راستہ اس کے پیروں کو ازبر تھا۔ دھند نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور اندھیرے کی بکل بھی ابھی اتری نہیں تھی۔ اس کا دل سینے میں دھک دھک بج رہا تھا۔ اندھیرے میں اسے ٹھنڈا لگا اور وہ منہ کے بل گرتا گرتا بچا۔ اسے یاد آیا سات سال پہلے اسی جگہ ٹھڈا کھا کے اس نے دو دانت گنوائے تھے۔ گلی کی اینٹیں وہاں سے ابھی تک ابھری ہوئی تھیں۔ مکانوں کی اونچی دیواروں نے ہوا اور روشنی کا راستہ روک لیا تھا۔ دھند میں اسے صاف نظر نہیں آیا' دھندلے دھندلے سے نقوش ابھرے۔ سامنے جہاں دروازے کے سامنے پیری ہوتی تھی' دو مضبوط ستون کھڑے تھے اور ان کے اوپر کنکریٹ کی چھت۔ وہ گیراج تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور پھر ٹھٹک کے رک گیا۔ خوب صورت منقش گیٹ کے دونوں کواڑ کھلے تھے اور ہڈیاں جما دینے والی سردی میں ننگے سر' ننگے پاؤں کواڑ سے سر لگائے اس کی نظریں گلی کے موڑ پہ جمی ہوئی تھیں۔ وہ جو وڈے مکان وچ کو کدی پھر دی سی۔

اسد کے ہاتھ سے بریف کیس چھوٹ کے گلی

مسکرائیے

☆ کوریئر سروس کا ایک ہرکارہ دوڑتا ہوا اپنے دفتر سے نکلا اور دروازے سے اس نے فٹ پاتھ پر ایک لمبی چھلانگ لگائی۔ دھپ سے وہ پشت کے بل فٹ پاتھ پر گرا اور چند لمحے کے لیے گویا چکرا سا گیا۔ ایک راہ گیر نے اسے اُٹھایا۔ اس کے کپڑے جھاڑے، اس کا ڈاک کا تھیلا اُٹھا کر اسے دیتے ہوئے ہمدردی سے پوچھا: "زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔؟"

"چوٹ کو چھوڑیے۔" ہرکارہ پیٹھ سہلاتے ہوئے بولا۔ "اگر آپ نے دیکھا ہو تو یہ بتا دیجیے کہ وہاں سے میری موٹر سائیکل کس نے ہٹائی ہے جہاں میں نے چھلانگ لگائی تھی؟"

☆ جو لوگ کچھ پانا چاہتے ہیں' وہ کوشش کرتے ہیں' اور جو کوشش نہیں کرتے' وہ پانا ہی نہیں چاہتے۔

میں دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ گھٹنے زمین پہ ٹیک کے اس نے وہ یخ چہرہ اپنے گرم ہاتھوں میں لے لیا مگر ان ٹھہری ہوئی پتلیوں میں کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ وہ منتظر ننگا سر ڈھلک کے اسد کے کندھے پہ جا ٹکا۔

مردہ ہاتھ کی بے جان مٹھی میں تین منزلہ مکان کی چابیوں کا گچھا دبا ہوا تھا۔ گلی میں دلجیت سنگھ کی رندھی ہوئی آواز سرسرا رہی تھی۔

"تینوں ریت کڑھاہیاں دی۔"

پردیس کے ڈالر حاصل کرنے والے بہت کچھ کھو دیتے ہیں شاید۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بازی گر

عابد علی سید

پورٹیکو میں داخل ہوتے ہی شیشے کے دروازے سے ملازم برآمد ہوا' کار کا دروازہ کھولا' مجھے خوش آمدید کہا۔ دروازہ کھول کر مودب انداز سے اندر جانے کے لیے قدرے جھک کر ہاتھ سے راستہ بنایا۔ میں اندر داخل ہوا تو یہ ایک وسیع و عریض برآمدہ تھا جہاں جا بجا سنگ مرمر کے مجسمے دھرے تھے' قالین بچھے تھے۔ چھتوں پر جھاڑ اور فانوس لٹک رہے تھے اور پولیس ماحول میں عجیب مرعوب کن سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔

اس شمارے کے لیے.....ایک دلچسپ تحریر

میں ہوائی سفر تو کرتا ہی رہتا ہوں لیکن کبھی ہوائی بیمے کی نوبت نہیں آئی یوں بھی موت وزیست اللہ کے ہاتھ ہے۔ بیمہ کرائیے یا نہ کرائیے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ بیمہ کی صورت میں آپ کو کچھ رقم فوری طور پر دینا پڑتی ہے بلکہ خوامخواہ تمام سفر نا خوشگوار گزرتا ہے اور ذرا ذرا سی بات پر موت کا تصور بندھتا رہتا ہے اس وقت سے جب کہ آپ سفر کی تیاری میں پٹیاں باندھ لیتے اور جہاز ایک غیر معمولی تیزی سے اٹھتا ہے اور جب موسم کی خرابی کے باعث اس میں ہچکولے ہوتی ہے یا کسی مقام پر فضا میں کسی ہوائی خلاء کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے حتیٰ کہ زمین پر واپس آتے آتے انسان خواہ مخواہ ہولیں کھاتا رہتا ہے اور سفر کا مزہ نہیں آتا۔ لیکن اس بار جیسے ہی میں نے گاڑی کو پورٹیکو میں چھوڑ کر ہوائی اڈے پر لاؤنج میں قدم رکھا کہ لاؤڈ اسپیکر پر اعلان ہونے لگا کہ ڈھاکے کی پرواز کے لیے جہاز تیار ہے۔ میں جھپا جھپ تمام مراحل طے کر کے جلدی سے جہاز تک پہنچنا چاہتا تھا کہ اسی وقت ایک نوجوان خوب صورت لڑکی مسکراتی ہوئی میرے پاس آئی اور بڑی خوش اخلاقی سے بیمے کے لیے درخواست کرنے لگی ایسا بارہا ہوا ہے اور میں نے بیمہ والوں کو جھڑک دیا ہے لیکن اس قدر عجلت کے باوجود میں نے اس درخواست کو رد نہیں کیا بلکہ فوری طور پر مطلوبہ رقم اس کے حوالے کر کے رسید جیب میں ٹھونسی اور یہ جا وہ جا لڑکی کی مترنم آواز دیر تک میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ ''شکریہ'' حتیٰ کہ جہاز زمین سے اٹھا فضا میں آیا اور نہ معلوم کتنی قسم کی آوازیں میں نے اور بھی سنیں لیکن ان تمام آوازوں پر جیسے وہ آواز چھائی ہوئی تھی۔ ''شکریہ۔''

ایسی من موہنی صورتیں بھی کم دیکھی ہیں جیسی اس بیمہ کمپنی کی ایجنٹ نے پائی تھی۔ یوں غور کیجیے تو کچھ بھی نہیں۔ وہی حوا کی بیٹی' رنگ روپ کی اچھی اور نکھ سکھ کی درست' اللہ اللہ خیر سلا لیکن کوئی ایک بات اس میں ایسی ضرور تھی کہ ایک بار دیکھ کر پھر دیکھنے کو بے تحاشا ضرور جی چاہتا تھا اور آج بیمہ کی رسید ہاتھ میں لیے ہوئے نہ مجھے موت کا تصور ستا رہا تھا اور نہ مجھے کسی طرح کی کوئی وحشت ہو رہی تھی۔ میں تو یوں محسوس کر رہا تھا جیسے وہ میرے ساتھ ہے' اس کی خوشبو

میرے اندر جذب ہے اور وہ لمحہ جو انتہائی اضطراری اور عجلت کی کیفیت کا حامل تھا اور جو حقیقت میں بے حد مختصر تھا میرے لیے بے حد جاں بخش اور فرحت زا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ لمحہ جس میں وہ میرے پاس آئی۔ درخواست کی رقم لے کر رسید دی اور چلی گئی اپنے اندر بہت کچھ رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک وہ میرے ساتھ ساتھ تھی۔ اس کی مسکراہٹ' اس کی چال اور مورنی کی طرح آواز کی جھنکار جس میں کیا کیا کیفیتیں چھپی ہوئی تھیں ان کا تجزیہ ممکن نہیں۔ میرے سفر پر وہ چھائی ہوئی تھی۔

ڈھاکے کا سفر بارہا کیا ہے۔ کاروبار کے سلسلے میں لاہور' ڈھاکہ' کراچی' پنڈی میرے لیے کوئی خاص معنی نہیں رکھتے لیکن اس بار ڈھاکے کے چند دن گزارنے دشوار ہو گئے۔ لاہور کے ہوائی اڈے کا لاؤنج مجھے برابر کھینچتا رہا اور کام پورا کر کے اپنی جان چھڑا کے میں بھاگا تو سیدھا لاہور پہنچ کر میں نے دم لیا۔ دھڑکتے ہوئے دل سے لاؤنج میں قدم رکھا۔ میری طرح نہ معلوم کتنے مسافر اور بھی آئے تھے۔

بیمہ کمپنی کے چھوٹے سے اسٹال نما دفتر پر نگاہ ڈالی ادھر ادھر نگاہوں میں اسے تلاش کیا۔ لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی۔ میرا سامان باہر نکل آیا۔ میں نے الوداعی نظروں سے تمام ہجوم میں اسے تلاش کیا لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی۔ میرا سامان باہر نکل آیا۔ میں نے الوداعی نظروں سے تمام ہجوم میں اسے تلاش کیا۔ لیکن وہ نہ ملی اور میں بادل نخواستہ گھر واپس آ گیا۔

حسن اتفاق سے مجھے پنڈی جانا پڑ گیا۔ میں یہ سفر ریل یا موٹر سے کر سکتا تھا لیکن عجلت میں نے ہوائی سفر کو ترجیح دی۔ کچھ دیر پہلے ہی سے ہوائی اڈے پر پہنچ گیا اور لاؤنج میں پڑے ہوئے ایک صوفے پر جا بیٹھا اور اسے نگاہوں نگاہوں میں تلاش کرنے لگا۔ معاً کوکا کولا کے اسٹال پر وہ مجھے نظر آئی' اس کے ہمراہ ایک اور لڑکی تھی' دونوں کوکا کولا پی رہی تھیں۔ کسی نے مجھے نہیں دیکھا تھا اس وقت کوئی جہاز آیا ہوا تھا۔ مسافر مسلسل باہر آ رہے تھے۔ آنے والے مسافروں سے بیمہ والوں کو بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی ہے اس لیے وہ نہایت اطمینان سے مسکرا مسکرا کر کوکا کولا پی رہی تھیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور باتیں بنا رہی تھیں۔ میرے جی میں آیا کہ جاؤں اور کچھ نہیں تو ایک کوکا کولا لے کر پاس کھڑے ہو کر پینے لگوں۔ مجھے یہ بات بڑی بھونڈی اور چھچھوری سی معلوم ہوئی۔ میں بدقسمتی سے جس ماحول میں رہا ہوں اس میں ہر بات کو وقار اور سلیقے سے کیا جاتا ہے۔ لہٰذا میں اس وقار اور سلیقے پر غور کرنے لگا۔ معاً اس نے مجھے دیکھا اور یوں دیکھا جیسے ہاں کہیں دیکھا ہے' شاید اس نے مجھے نہ پہچانا ہو۔ بھلا ہزاروں مسافروں کی ریل پیل میں کوئی کب تک کس کو یاد رکھ سکتا ہے یا شاید اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا ہو۔ غرضکہ اس کی سہیلی نے کسی بات پر اسے ہلکے سے ایک دھکا رسید کیا اور وہ اس طرح کھلکھلا کر ہنسی کہ ہزار ہا نقرئی گھنٹیاں بج اٹھی ہوں' اس کے باوجود اس طرح بیباکی سے اس کا ہنسنا اچھا معلوم نہ ہوا۔ اس کی دوست پر بھی غصہ آیا جو خواہ مخواہ سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ تھی..... کوکا کولا ختم کر کے دونوں بیمہ کمپنی کے اسٹال نما دفتر میں چلی گئیں اور کیبن کے اندر غروب ہو گئیں۔

لاؤنج اب صاف ہو گیا اور آنے والوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ معاً اس لڑکی کی سہیلی باہر آئی بیمہ کے لیے لوگوں سے درخواستیں کرنے لگی۔ میں ٹہلتا ہوا بیمہ کمپنی کے اسٹال پر چلا گیا اور اندر جھانک کر دیکھا تو وہ بڑی دل جمعی کے ساتھ بیٹھی ہوئی کچھ لکھ رہی تھی۔ کاغذات اس کے سامنے بکھرے پڑے تھے۔ ابھی بہت وقت تھا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ میرے اور اس کے درمیان شیشے کی ایک دیوار حائل تھی۔ اس نے اٹھ کر چھوٹا سا دروازہ کھولا اور بڑے اخلاق سے بولی۔

"اندر تشریف لے آیئے۔"

میں چلا گیا۔ اس نے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا اور پوچھا کہ وہ میری کیا خدمت کر سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سارا اخلاق اور تمام باتیں کاروباری نوعیت کی تھیں۔ میں نے بیمہ کرایا۔ اس نے شکریہ ادا کیا لیکن اس شکریے میں جیسے یہ بھی اشارہ تھا کہ اب بس ملاقات ختم ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ بیمہ کمپنی کا دفتر تھا۔ نہ کلب تھا نہ ڈرائنگ روم لہٰذا میں نے بھی خوش اخلاقی سے شکریہ ادا کیا اور مسکراتا ہوا باہر آ گیا۔ اعلان کا انتظار کر ہی رہا تھا کہ وہ باہر آ گئی اس نے میرا بریف کیس سنبھال رکھا تھا۔

"مسٹر غنی یہ آپ کا بریف کیس۔"

آپ یقین کیجیے میں نے عمداً بریف کیس وہاں نہیں چھوڑا تھا کیونکہ اس میں بے حد قیمتی کاغذات تھے۔ اس بریف کیس کو تو میں جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا لیکن اس کی مسحور کن شخصیت میں کچھ ایسا جادو تھا کہ میں اٹھا اور یوں ہی چلا آیا۔ بریف کیس اس سے لے کر میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔

"اس بریف کیس کے بغیر یہ سفر بالکل فضول ثابت ہوتا۔"

"شکر ہے کہ آپ کے جانے کے بعد میری نگاہ آپ کی کرسی پر پڑ گئی۔"

"میں ممنون ہوں' باقاعدہ شکریہ پنڈی سے واپسی پر ادا کروں گا۔"

میری یہ بات سن کر وہ مسکراتی ہوئی اپنے کیبن میں واپس چلی گئی اور جب میں دوسرے دن لوٹا تو وہاں نہیں تھی۔ نہ لاؤنج میں نہ کیبن میں۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ میں باہر نکلا تو بیمہ کمپنی کی مائیکرو بس میں میں نے اسے سوار ہوتے ہوئے دیکھا۔ بالکل اتفاقیہ میری گاڑی بھی اسی وین کے پیچھے چلتی رہی۔ گلبرگ کے ایک عالیشان بنگلے میں وہ وین داخل ہو گئی اور میری گاڑی آگے بڑھ گئی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد جب وین واپس ہو کر میری گاڑی کے پیچھے پیچھے چلنے لگی تو میں نے دیکھا وہ اس میں نہیں تھی۔ یعنی وہ اس عالیشان مکان میں رہ گئی تھی۔

اس طرح گویا مجھے اس کا مکان تو معلوم ہو گیا تھا۔ جانے کے لیے ایک بہانہ بھی تھا لیکن دو قباحتیں تھیں۔ ایک تو یہ یقین کرنے کو دل کسی طرح بھی تیار نہیں تھا کہ اتنے عالیشان مکان میں رہنے والی بیمہ ایجنٹ ہو سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ رسید پر اس کے

دستخط واضح نہ ہونے کے سبب اس کا نام معلوم نہیں تھا۔ لیکن پہلی وجہ بہت گمبھیر تھی۔ یہ طلسم سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مکان کی اگر وہ مالکہ ہے تو ظاہر ہے کہ وہ لکھ پتی ہو گی اسے بیمہ ایجنٹ بننے کا کیا شوق چرایا تھا اور اگر وہ کرایہ دار تھی تو وہ ہزاروں روپیہ ماہوار کہاں سے لاتی ہو گی۔ جو سینکڑوں روپیہ ماہوار محض مکان کا کرایہ ادا کر سکے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے وہ کسی سہیلی سے ملنے گئی ہو اور وہ اس کا مکان نہ ہو' یا بیمہ کے سلسلے میں کسی سے ملاقات کرنے گئی ہو۔ بہرحال کوئی بات واضح نہ ہو سکی اور میں شش و پنج میں پڑا رہا کہ مجھے پھر کچھ عرصے بعد ایک اور سفر درپیش ہوا۔ میں سیدھا اس کے کیبن میں اس کی میز کے سامنے جا بیٹھا اور بڑی بے تکلفی سے کراچی کے ٹکٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے بیمہ کمپنی کی مطلوبہ رقم اس کے سامنے رکھ دی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور ایک ادا سے اس نے مجھے سلام کیا اور میں بولا۔

"محترمہ' میں آپ کا دوہرا شکر گزار ہوں۔"

"وہ کیسے۔" اس نے پوچھا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میں بیمے کا قائل نہیں تھا لیکن ہونا پڑا۔"

"اچھا....." اس نے کہا۔ "مگر وہ کیسے۔"

"بس نہ پوچھیے۔ ہو گیا ایک روز قائل۔"

"اچھا چلیے' دوسری بات۔" اس نے دلچسپی سے کہا۔

"دوسری بات' وہی بریف کیس..... بات دراصل یہ ہے کہ مجھے آپ کا مکان تو معلوم ہے۔"

اتنی بات سن کر اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ میں گھبرا گیا اور اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا۔ "چونکہ ایک بار میری گاڑی آپ کی بیمہ وین کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔" بات بنتی نظر نہ آئی تو میں نے کہا۔ "میں وہیں گلبرگ میں رہتا ہوں' بس ذرا آپ سے آگے..... دراصل میں آپ کے گھر جا کر آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا..... لیکن ڈرا کہ مبادا آپ کو بن بلائے مہمان کا آنا۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں' شکریہ کی کیا بات ہے۔ غنی صاحب' وہ تو میرا فرض تھا۔ گھر آپ کا ہے جب جی چاہے آیئے۔ اماں کو آپ سے مل کر بڑی خوشی ہو گی۔ لیکن ابھی تو آپ کراچی جا رہے ہیں۔"

"میں چار روز کے بعد واپس آ جاؤں گا مس....." میں نے بڑی بے چینی سے اس کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر بولا۔

"معاف کیجیے گا' آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔"

"نام کی کیا ضرورت ہے' ویسے مجھے فوزیہ کہتے ہیں۔" وہ بولی۔

"مس فوزیہ آپ کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔ میں ضرور آؤں گا۔"

یہ کہہ کر میں اٹھ بیٹھا۔ اس نے بریف کیس اٹھا کر میرے ہاتھ میں دے دیا اور میں بے اختیار ہنسنے لگا اور اسے بھی ہنسی آ گئی اور آج غالباً پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ اس کی نگاہیں بھی مجھ پر مرکوز ہیں۔ میں چلتا ہوا لاؤنج کے آخری سرے پر پہنچ گیا۔ ایک بار بھی گھوم کر پیچھے نہ دیکھا لیکن مجھے یہ محسوس ہوا کہ وہ نگاہیں مجھے برابر دیکھ رہی ہیں میری نگراں ہیں' میری پیٹھ میں گڑی ہوئی ہیں اور اگر میں نے مڑ کر ذرا بھی دیکھ لیا تو سیدھی دل میں جا کر پیوست ہو جائیں گی۔ لاؤنج سے رن وے کی طرف جاتے ہوئے میں نے ایک بار دیکھ ہی لیا۔ اف میرے اللہ وہ سچ مچ مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے رن وے کی طرف مڑنے سے پہلے بھرپور نگاہوں سے اسے دیکھا تو اس نے ہاتھ اٹھا کر الوداع کہا۔ میں ذرا سا جھکا اور ہاتھ ہلاتا ہوا چل دیا۔ سفر اچھا گزرا۔ کراچی ہمیشہ میرے پاؤں جکڑ لیتا تھا۔ وہاں کے عمدہ عمدہ ہوٹل' وہاں کے کھانے' رقص اور شرابیں میرے لیے بڑے جذب و کشش کے حامل ہوتے تھے لیکن اس مرتبہ تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ یار دوستوں نے بہت کچھ لالچ دیے۔ ایک بڑے اچھے ڈنر کی دعوت ملی' وہ رد کر دی اور سیدھا لاہور آ پہنچا اور میری توقع کے عین

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مطابق فوزیہ میری منتظر تھی۔ اس نے آتے ہی مجھ سے کہا۔

"آپ آ گئے..... بڑا اچھا ہوا..... پرسوں شام کو آپ میرے غریب خانے پر چائے نوش کیجیے..... اماں اور بھائی احسان آپ کے منتظر ہوں گے۔"

میں پھولا نہ سمایا۔ یہ کیسا اچھا مژدہ تھا۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا بالآخر اللہ اللہ کر کے وقت معینہ سے کچھ پہلے ہی تیار ہو کر ٹہلنے لگا۔ گاڑی تیار کھڑی تھی۔ میں لپکتا ہوا پورٹیکو میں گیا۔ شوفر کو گاڑی میں نہ بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود ہی گاڑی میں جا بیٹھا اور چند ہی سیکنڈ میں فوزیہ کا گھر آ پہنچا۔

جیسا میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ وہ ایک عالیشان مکان تھا۔ جن لوگوں نے لاہور دیکھا ہے اور گلبرگ کے مکانات بھی دیکھے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ گلبرگ میں مکانات کس تکلف اہتمام سے بنے ہوئے ہیں جس وقت کسی ایک مکان کو دیکھیں اور خوب داد دے چکیں تو یہ سوچیں گے اب اس سے بہتر کوئی اور مکان کیا ہوگا۔ لیکن یہاں ایک سے ایک عمدہ مکان نکلتا چلا آئے گا اور آپ دیکھتے دیکھتے تھک جائیں گے اور یہ فیصلہ کریں گے کہ گلبرگ میں مکان اچھے ہی اچھے ہوتے ہیں برے نہیں ہوتے سو یہ مکان بھی گلبرگ میں واقع تھا۔ باہر سے دیکھتے تو سبزہ زار پر سپید سپید شبنم کے قطرے کی طرح دمکتا نظر آئے گا' اندر آ جائیے تو قدم قدم پر حسن و خوب صورتی کے جلوے بکھرے نظر آئیں گے اور آپ کی توجہ کو جذب کر لیں گے۔ پورٹیکو میں داخل ہوتے ہی شیشے کے دروازے سے ملازم برآمد ہوا' کار کا دروازہ کھولا' مجھے خوش آمدید کہا۔ دروازہ کھول کر مودب انداز سے اندر جانے کے لیے قدرے جھک کر ہاتھ سے راستہ بنایا۔ میں اندر داخل ہوا تو یہ ایک وسیع و عریض برآمدہ تھا جہاں جا بجا سنگ مرمر کے مجسمے دھرے تھے' قالین بچھے تھے۔ چھتوں پر جھاڑ اور فانوس لٹک رہے تھے اور پولیس ماحول میں عجیب مرعوب کن سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ جہاں خود بخود انسان تکلف پر مائل ہونے لگتا ہے۔ قدم بھی ناپ ناپ کر اور تول تول کر اٹھاتا ہے اور پھونک پھونک کر چلتا ہے میں جہاں پر کھڑا سوچ رہا تھا اور عالم محویت میں تھا کہ اس کی بغل سے ایک بڑا ہی نفیس چوبی زینہ جس پر قالین بچھے ہوئے تھے اوپر چلا گیا تھا۔ فوزیہ میری طرف آتی ہوئی نظر آئی۔ اس نے صرف نیلگوں ساری باندھی تھی۔ نیلگوں بلاؤز اور نیلے آویزے کانوں میں ہلکورے لے رہے تھے۔

"ہلو مسٹر غنی..... آیئے آیئے۔" بڑی مترنم آواز گونجی' کچھ میں بڑھا' کچھ وہ بڑھی اور ہم نے خلاف توقع بے تحاشا ہاتھ ملائے' اوپر کا ماحول اس سے بھی زیادہ پرتکلف تھا۔ ہم ڈرائنگ روم میں پہنچے جس کے اہلو پہلو کشادہ لاؤنج تھے اور بہترین بلوریں دیواریں تھیں۔ لکڑی کا نفیس فرش جس پر قالین بچھے ہوئے کہ چلتے تو آواز مطلق نہ ہو اور ڈرائنگ روم اس قدر کشادہ اور وسیع کہ اسے چھوٹا موٹا ہال کہیے۔ یہاں بھی جھاڑ فانوس اور بلوریں چیزیں اور قیمتی آرائشی سامان موجود تھا۔ میری نگاہیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اللہ اکبر یہ فوزیہ آخر کیا بلا ہے۔ میں سوچنے لگا۔ صوفے دیکھیے تو دیکھتے ہی رہ جایئے۔ قدیم اور جدید دونوں وضعوں کے مختلف سیٹ' بے حد آرام دہ نوم کے کشنوں سے آراستہ..... تو یہ ہے فوزیہ۔

میں سوچنے لگا اور آج پہلی بار موازنہ کرنے لگا کہ ابھی تک مکان کو باہر سے دیکھ کر اسے لکھ پتی سمجھا تھا' اب تو اس کے سونے میں کلام نہیں اور ایک میں ہوں کہ سال کے سال محض دو تین لاکھ کما لیتا ہوں تو گویا زمین پر پاؤں نہیں دھرتا۔

"آپ تشریف رکھیے' میں ذرا اماں کو بلا لوں' انہیں آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے۔"

"ضرور..... ضرور..... مجھے بھی ہے۔"

میں بیٹھ گیا اور ہر شے کو بغور دیکھنے لگا۔ میرے سامنے ہی سے فوزیہ گزر گئی۔ ساری میں ملبوس وہ ایسی سبک روی سے چلتی ہوئی دروازے تک گئی جیسے دریا کی سطح پر موج۔ فوزیہ میرے لیے بڑی پراسرار بن گئی

تھی۔ کہاں ایک بیمہ ایجنٹ اور کہاں یہ عالیشان محل اور یہ ساز و سامان۔ ڈرائنگ روم میں وسیع و عریض پینٹنگز لگی تھیں جو قطعی غیر ملکی مصوروں کے مولقم کا نتیجہ تھیں۔ ان میں سے کسی پینٹنگ کی قیمت دس پندرہ ہزار سے کم نہ ہوگی۔ اصلی ریشم اور مخمل کے پردے پڑے ہوئے تھے اور جگہ جگہ پر ایسا نفیس آرائشی سامان چنا ہوا تھا کہ دیکھتے رہیے' میں اٹھ بیٹھا۔ شمالی پردوں کو اٹھایا تو ایک ڈائننگ ہال نظر آیا۔ جہاں بیک وقت چالیس پچاس آدمی کھانا کھا سکتے ہیں۔ طرح طرح کے قیمتی شلوز اور کراکری اور کٹلری سے آراستہ اور تصاویر سے مزین..... جنوبی پردہ اٹھایا تو کونے میں بار بنا ہوا تھا۔ جہاں عمدہ عمدہ شرابوں کے قرابے لگے ہوئے اور نفیس بوتلوں' شیشوں اور پیمانوں سے چھلکتے ہوئے' سامنے چار لمبے لمبے اسٹول دھرے ہوئے تھے۔ گویا صرف پردے شمالی اور جنوبی کھینچ دیجیے تو ڈرائنگ روم ہال روم اور بار روم میں تبدیل ہو سکتا تھا..... تو یہ ہے فوزیہ..... میں نے سوچا کہ اس مکان کا صرف اتنا قصور ہے کہ بدقسمتی سے اسے مشرق بعید کے ایک ایسے حصے میں بنایا گیا ہے جہاں فضاؤں میں ہواؤں میں مشرقیت ہے۔ مکان کی ایک ایک تہہ میں مغربیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ آپ یورپ کے کسی امیر کبیر گھرانے میں آ گئے ہوں۔ تو یہ فوزیہ ہے کیا بلا..... اور میں کہاں آ گیا ہوں۔ اللہ اللہ ہمارا ملک کتنی ترقی کر چکا ہے۔ سچ ہے جو قوم تاج محل' لال قلعہ' فتحپور سیکری لاہور اور کشمیر کے باغات لگا سکتی ہے وہ ایسے مکانات بھی تعمیر کرا سکتی ہے۔ میں نے سوچا کہ میں بلاوجہ حسد میں مبتلا ہو گیا ہو سکتا ہے کہ چند سال میں میں بھی لکھ پتی سے کروڑ پتی بن جاؤں اور ایک ایسا ہی مکان میں بھی بنوا سکتا ہوں..... لیکن فوزیہ ایک بیمہ ایجنٹ کیا وہ ایسے مکان کی مالک ہو سکتی ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ مکان فوزیہ کے بھائی کا بھی تو ہو سکتا ہے۔ ابھی میں یہ باتیں بیٹھا سوچ ہی رہا تھا کہ فوزیہ اپنی اماں کو ہمراہ لے کر داخل ہوئی اس کی اماں سفید ساڑی میں ملبوس تھی۔ پینتالیس اور پچاس کے پیٹے میں ہوں گی۔ سبک سبک ناک نقشہ جو پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ جوانی میں وہ فوزیہ سے مشابہ تھا۔ سرخ و سپید رنگت' وہ سراپا خلوص و محبت کا پیکر تھیں۔ میں سروقد کھڑا ہو گیا۔ صاحب سلامت کی اور بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک باوردی ملازم ٹرالیاں دھکیلتا ہوا آیا اور سامان سج گیا۔

فوزیہ کی اماں نے میرا انٹرویو لینا شروع کیا۔

"فوزیہ نے تمہاری بڑی تعریف کی ہے غنی میاں۔"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دوں۔ میں نے بلاشبہ اس سے بھی زیادہ نفیس اور قیمتی ماحول دیکھا ہے لیکن یہ سب کچھ خلاف توقع تھا۔ میں اکثر تجارتی وفود میں شامل ہو کر غیر ملکوں کی سیر بھی کرتا رہا ہوں اور سرکاری اور غیر سرکاری دعوتیں ہزاروں کی تعداد میں چکھی ہیں لیکن فوزیہ کے بارے میں جو تصورات میں نے قائم کیے تھے اور مستقبل کے کچھ منصوبے بنائے تھے وہ دھڑام سے نیچے گرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ میں نے جواباً کہا

"دراصل میں فوزیہ کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ....." میں خود ہی سٹپٹا گیا کہ اب کیا کہوں اور یہ کہ میں کہنے والا کیا تھا۔ بھلے کو زبان رک گئی۔ میں نے میزوں پر پھیلے ہوئے چائے کے پرتکلف سامان کی طرف اشارہ کیا۔ "آپ لوگ اتنا تکلف کریں گے۔"

"تکلف کیا ہے بیٹا..... ذرا سی نگوڑی چائے پئے آدمی تو کچھ ڈاڑھ تو گرم کرے۔"

سامان اس قدر وافر تھا اور اس قدر متنوع کہ ایک نہیں اکٹھا بارہ آدمیوں کے پیٹ کا تنور بھی اس سے گرم کیا جا سکتا تھا۔ ڈاڑھ کا کیا ذکر ہے۔ خیر میں نے تھوڑا بہت کھایا۔ چائے پی گئی اور ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اسی اثناء میں ایک نوجوان نے پردہ ہٹا کر جھانکا۔ مجھے خیال آیا کہ اسے کہیں میں نے دیکھا ہے۔ نوجوان نے منہ اندر ڈال کر کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اماں' میں کلب جا رہا ہوں۔ فوزیہ تم وہیں آجانا۔"

"اچھا۔" فوزیہ نے اثبات میں گردن ہلا دی' اماں کچھ نہ بولیں اور نوجوان چلا گیا۔

فوزیہ بولی۔ "یہ میرے بھائی جان ہیں۔ کلب کے بڑے رسیا ہیں۔" پھر بولی۔ "غنی صاحب آپ کلب نہیں جاتے۔"

میں فوزیہ کے بھائی جان کی بد اخلاقی پر غور کرتے ہوئے بولا۔ "کبھی کبھار چلا جاتا ہوں۔"

اماں بولیں۔ "احسان تو کلب کے پیچھے دیوانہ ہے' اپنے ساتھ فوزیہ کی مٹی بھی پلید کر رہا ہے' کیا کہوں۔"

اماں کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ مگر کہہ نہ سکیں۔ فوزیہ نے اسی لمحے انہیں گھورا' وہ چائے کی پیالی میں چینی ملا کر گھمانے لگیں چائے پی کر میں نے چلنے کا قصد کیا تو فوزیہ بولی۔

"غنی صاحب' کیا آپ مجھے کلب تک پہنچا دیں گے۔"

"کیوں نہیں۔" میں نے خوش اخلاقی سے کہا۔ لیکن طارق کی بد اخلاقی مجھے بدستور کھٹک رہی تھی۔ وہ مغرور تھا۔ وہ مجھے حقیر سمجھتا تھا۔ بہر حال میں نے اماں سے اجازت لی اور گاڑی میں میرے پہلو بہ پہلو فوزیہ آ بیٹھی اور جب میں کلب اسے چھوڑنے گیا تو بات مجھے اور بھی بری لگی طوہاً و کرہاً میں نے اسے وہاں پہنچایا اور خود چلا آیا۔ گھر واپس آیا۔ جس خوشی سے فوزیہ سے ملنے گیا تھا وہ خوشی کافور ہو چکی تھی۔ معلوم نہیں کیوں فوزیہ کی شخصیت میں مجھے گرہیں پڑی ہوئی نظر آ رہی تھیں اور ان گانٹھوں کو کھولنا اچھا خاصا مسئلہ تھا۔ میں دیر تک گھر میں ٹہلتا رہا۔ اماں نے پریشانی کا سبب بھی پوچھا۔ میں ٹال گیا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر میں نے دوسرا لباس تبدیل کیا۔ گاڑی لی اور کلب جا پہنچا۔ اب رات ہو چلی تھی گھنے گھنے تناور درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ کلب کی سادہ عمارت کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے تھے۔ میں نے نہ بلیئرڈ کی طرف رخ کیا نہ پنگ پانگ اور دوسرے اسی قسم کے کھیلوں کی طرف' سیدھا بار روم کی طرف چلا گیا۔ سامنے ہی مجھے دو مردوں کے بیچ میں جو تیسری ہستی نظر آئی وہ فوزیہ کی تھی لیکن اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ میں گردن جھکائے بار پر جا پہنچا اور اسٹول پر جا بیٹھا چند جرعے چڑھا کر رخصت ہو جانا چاہتا تھا کہ مجھے اپنی پیٹھ کے پیچھے جو آواز سنائی دی وہ احسان کی تھی۔ وہ فوزیہ کو لے کر ایک طرف ہو گیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"مجھے تو بالکل چڑی کا غلام لگتا ہے۔"

فوزیہ بولی۔ "نہیں..... لکھ پتی ہے۔"

اچنبھے کے ساتھ آواز آئی۔ "سچ کہو۔"

"بالکل سچ ہے بھیا۔"

"پھر تو سونے کی چڑیا ہے۔"

"ہاں مگر۔"

"آدمی شریف ہے۔"

"ہنہ۔" مرد کی آواز تھی..... "خیر سیدھی انگلیوں گھی نہ نکلے تو انگلیاں ٹیڑھی کرنا ہی پڑتی ہیں۔"

معاً دونوں کی آوازیں آنا بند ہو گئیں اور ان دونوں پر ایک اور مردانہ آواز غالب آ گئی۔

"ہلو فوزی..... یہاں کون سی سازش کر رہے ہو تم دونوں۔"

"ہلو ہلو....." فوزیہ بولی۔ "آیئے آیئے جناب اللہ والا کب آئے آپ کراچی سے..... سازش تو آپ ہی کے خلاف ہو رہی ہے۔"

اللہ والا کا قہقہہ گونجا۔ "اچھا اچھا....." بھئی میں آج ہی آیا ہوں' کل چلا جاؤں گا..... سنا ہے آج یہاں خاص رقص ہو گا۔"

"جی جناب' کیا آپ ناچیں گے۔" فوزیہ نے پوچھا۔

"جب تم نچاؤ گی تو بھلا کیوں نہ ناچیں گے' آخر کتنوں کو نچایا ہے تم نے..... کیوں احسان میاں....."

احسان نے بے حیائی کے ساتھ ایک قہقہہ

لگایا۔

اب میری باری تھی۔ میں نے جام تو میز پر دھرا اور مڑ کر دو قدم چل کر ان کے پاس پہنچ گیا اور مجھے دیکھتے ہی فوزیہ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے' زرد پڑ گئی۔ "آپ..... آپ یہاں کب آئے۔"

پھر اس نے میرا سب سے تعارف کرایا اور میں معذرت کر کے باہر چلا آیا۔ گاڑی میں بیٹھا تو سر چکرا رہا تھا کہ اب کیا کروں اور کہاں جاؤں۔ مجھے نہیں معلوم کہ کس طرح میری کار خود بخود ایک بار پھر فوزیہ کے گھر جا پہنچی۔ خلاف توقع صرف پورٹیکو کی بتی جل رہی تھی اور سارے گھر میں سناٹا تھا۔ پہرے دار دوڑ کر آیا اور اندھیرے میں مجھے پہچان نہ سکا۔ میں بھی گاڑی میں بیٹھا رہا۔ اس نے گاڑی میں منہ ڈال کر کہا کہ۔

"صاحب لوگ تو بہت دن سے ولایت گئے ہوئے ہیں۔"

"کون صاحب لوگ۔" میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ "وہی صاحب جو ہمارے مالک ہیں' علی فتح جنگ اور کون..... جن کا مکان ہے۔"

اب مجھے خیال ہوا کہ شاید میں کسی غلط مکان میں آ گیا ہوں میں نے پہرے دار سے کہا۔

"اچھا اچھا..... تو وہ احسان اور فوزیہ کہاں رہتے ہیں۔"

"وہ..... وہ۔" پہرے دار نے کہا اور کسی معنکہ خیز طریقے سے کہا۔ "صاحب وہ تو اس مکان کے پیچھے جو ایک گیراج پڑا ہوا تھا' اس میں رہتے ہیں..... لیکن وہ اس وقت آپ کو ملیں گے نہیں..... ہاں ان کی اماں ہوں گی..... وہ صاحب بڑی نیک بی بی ہیں..... آیئے میں لے چلوں۔"

میں گاڑی سے نکل آیا۔ "چلو۔" میں نے کہا۔ اور گیراج کے پاس پہنچ کر جو شے مجھے سب سے پہلے یاد آئی وہ تو بتہ النصوح کے مرزا ظاہر دار بیگ کی معنکہ خیز حالت تھی۔ پہرے دار کو رخصت کرنے سے پہلے میں نے اس سے کہا۔ "سنو آج اس بڑی کوٹھی میں ایک نوجوان آیا تھا' اس کی دعوت ہوئی تھی۔"

وہ بولا۔ "ہاں ہاں ہوئی تھی۔" پھر زور سے ہنسا اور راز دارانہ انداز میں بولا۔ "احسان میاں کی صاحب سے دوستی ہے نا' کبھی کبھی ان کا کوئی دوست یہاں آ جاتا ہے۔"

"اچھا۔"

دروازہ کھٹکھٹایا۔ بوڑھی عورت نے آ کر پوچھا۔ "آپ کون صاحب ہیں۔"

میں نے کہا۔ "غنی۔"

دیر تک کوئی جواب نہیں ملا یا عورت بے چاری پہچان ہی نہ سکی یا سناٹے میں آ گئی۔

میں بولا۔ "اماں کیا میں اندر آ سکتا ہوں۔"

رندھے ہوئے گلے سے بولی۔ "آ جاؤ بیٹا۔"

میں اندر چلا گیا۔ گیراج میں تین چارپائیاں' ایک نماز کی چوکی' دو ٹوٹی پھوٹی کرسیاں' ایک میز چند ٹرنک اور کچھ کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ عورت جو آج ہی مجھ سے ایک عالیشان ڈرائنگ روم میں مل چکی تھی' اس اچانک تغیر پر نہایت پریشان تھی اور ضبط نہ کر سکی' رونے لگی۔

میں نے کہا۔ "اماں اس میں دکھ کی کوئی بات نہیں بڑے بڑے ہادی اور نبی بھی غریب رہے ہیں۔"

"دکھ کی بات یہ نہیں ہے غنی میاں۔" اس نے پھٹے ہوئے دوپٹے سے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔ "دکھ کی بات یہ ہے کہ فوزیہ اور احسان کو اپنی اس حالت پر شرم آتی ہے اور اس حالت کو ظاہر کرتے ہوئے وہ ڈرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کوئی ان کی عزت نہیں کرے گا۔ انہیں وہ مرتبہ نہیں ملے گا جو آج سوسائٹی میں انہیں حاصل ہے۔"

میں ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ "ہمیں یہی تو دکھ ہے کہ ہمارے معاشرے میں بڑا کھوکھلا پن ہے۔ ہم اس نمائش اور دکھاوے میں کچھ سے کچھ بن گئے ہیں..... جو ہم نہیں ہیں جو ہم نہیں بن سکتے۔ وہ ہم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بننے کی کوشش کیوں کرتے ہیں..... آخر جو ہم ہیں وہی کیا برے ہیں..... یہ بات ہماری سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔"

"بیٹا....." اماں نے نماز کی چوکی پر پاندان کھول لیا' ڈلی کترتے ہوئے بولیں۔ "تم سے اب کیا پردہ۔ ہم پہلے بھی رئیس ابن رئیس نہیں تھے۔ چٹنی روٹی کھا کر موٹا جھوٹا پہن کر مگن رہتے تھے۔ یہاں بھی دونوں بہن بھائی ہزار بارہ سو کما لیتے ہیں لیکن کس کام کے کپڑے' پارٹیاں' کلب' یہ وہ' خاک ڈھول' بلا اور گھر دیکھو تو خاک پر بسم اللہ' خاک اللے نہ پلے پانی سے پیٹ بھر لے۔ کہو کہ بھائی کیا غضب کرتے ہو جوان جہاں' بہن ہے اس کا شادی بیاہ کرنا ہے تو الٹے صاحبزادے بھی لڑتے ہیں اور صاحبزادی بھی قائل معقول کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔" عورت نے ڈلی پھانک کر زور سے ہاتھ جھاڑے۔ "اچھا بابا تم جانو تمہارا کام جانے ہمارا کام سمجھانا تھا سو بتا دیا۔ اب تم لوگ خود اپنے ہاتھ منہ کے ہو اپنے خود مالک و مختار ہو جو چاہو سو کرو..... ملمع ملمع ہی ہوتا ہے۔ کبھی نہ کبھی اترتا ہے تو آدمی کی ساکھ ختم ہو جاتی ہے۔ سو بیٹا تم ہی ذرا کہہ دو انصاف سے کہ ملمع کی گاڑی کب تک چلے گی۔ علی فتح جنگ کے رحم و کرم پر کب تک یہ دھندا چلے گا..... اور یہ کلب جانا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔" عورت دیر تک بڑبڑاتی رہی۔ جب ذرا تھمی تو میں نے وہ بات جو ہر شخص کہنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ میں نے کہا۔

"اماں' میں کوئی بڑا آدمی تو نہیں ہوں۔ لیکن ہاں اللہ نے اس قدر دیا ہے کہ کھا پہن سکتا ہوں..... اگر آپ مجھے فوزیہ کے لیے اپنی فرزندی میں لے لیں تو..... میں خود کو بے حد خوش نصیب سمجھوں گا۔ شاید اس طرح سارے حالات ٹھیک ہو جائیں۔"

میری یہ بات سن کر عورت پر خاص اثر ہوا۔ رقت طاری ہو گئی لیکن اسی حالت میں وہ اٹھی۔ اس نے مجھے گلے سے لگا لیا پیشانی چومی' صدقے قربان گئی اور کہا۔ "مجھے ہر طرح منظور ہے۔"

میں نے محبت یا عشق کے ماتحت یہ سودا کر ڈالا۔ "نہیں ایسا ہرگز نہیں بلکہ فوزیہ کے خاندان کی تباہی سے بچانے کا میرے نزدیک اس سے بہتر کوئی اور طریقہ نہیں ہو سکتا تھا۔" چنانچہ میں رخصت ہو کر گھر آیا اور تمام نتائج و عواقب پر غور کرتے ہوئے سو گیا۔

صبح جب میری اماں نے ناشتہ پر بلایا تو میز پر میرے اور میری اماں کے علاوہ خود فوزیہ بھی موجود تھی۔ وہ سویرے ہی سویرے آ دھمکی تھی اور اس کے چہرے پر ایک خاص سرخی سی دوڑی ہوئی تھی جو صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کسی کنواری عورت سے اظہار محبت کیا جائے لیکن اس کی نگاہیں جھکی جھکی سی تھیں ایک اصلی حالت کے ظاہر ہو جانے کی شرم تھی۔ دوسری بار حیا نے پلکوں کو جھکا دیا تھا۔

ناشتے کے بعد ہم تیار ہو کر گھومنے کو نکلے۔ ایک جگہ سناٹے میں گاڑی روک کر میں چند باتیں اس سے کرنا چاہتا تھا کہ وہ بولی۔

"غنی تمہاری محبت سے مجھے خوشی ہے۔ مگر میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔"

"کیوں۔"

میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ "شادی۔" اس نے کہا۔ اور دوپٹے کے آنچل کو مروڑتے ہوئے کہا۔ "شادی شاید میری کبھی نہ ہو سکے۔" اور اتنا کہہ کر وہ خود بھی رونے لگی۔

"لیکن آخر کیوں..... جب میں شادی کر رہا ہوں تو تم کو۔"

اس نے بات کاٹ کر کہا۔ "غنی تم مجھ پر ترس کھا کر شادی کر رہے ہو نا..... جیسے کسی بھکارن پر ترس کھا کر تم ایک روپے کی جگہ دس روپے دے ڈالتے ہو۔ مجھے یہ ترس نہیں چاہیے۔ مجھے کسی شخص کی ترس خدائی نہیں چاہیے اور پھر..... سنو غنی..... احسان بھائی جان کو تم نہیں جانتے۔ اگر میں مان بھی جاؤں تو مجھے یقین ہے کہ میری اور اماں کی زندگی سدھر جائے گی۔ لیکن وہ کہیں مانیں گے غنی میں اچھی عورت نہیں

ہوں۔"

اتنا کہہ کر اس نے تقریباً سارا دوپٹہ منہ میں ٹھونس لیا اور زور زور سے رونے لگی۔ "میں تمہارے لائق نہیں ہوں۔"

میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے۔ چہرے کو اپنی طرف موڑا تو آنکھوں سے گنگا جمنا بہہ رہی تھیں۔

میں نے کہا۔ "فوزیہ! تم دل کی بہت اچھی عورت ہو۔ تمہاری روح بہت اچھی ہے اس لیے تم بری عورت نہیں بن سکیں..... یہ تمہاری سچائی..... یہ آنسو تمہاری بلندی اور عظمت ظاہر کر رہے ہیں۔ اب میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا فوزی۔"

"لیکن تمہاری محبت۔" وہ پھر بولی۔ "تم مجھ سے کبھی سچی محبت نہیں کر سکتے۔ تم مجھ پر ہمیشہ ترس کھاؤ گے اور کسی بھکارن کی طرح محبت کے چند ٹکڑے سکوں کی طرح میری جھولی میں ڈال دو گے..... اور بس..... اور بس..... اس سے زیادہ تم مجھے نہیں چاہو گے..... کبھی نہیں چاہو گے..... میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں' میں کسی مرد کی..... اور مرد بھی وہ جو میرا شوہر ہو۔ ترس خدائی پر نہیں جی سکتی مجھے مرد کی صحیح اور سچی محبت نہیں مل سکتی اور میں سچی اور بھرپور محبت کی بھوکی ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ دیر تک روتی رہی۔ میں نے بھی تھک کر اسٹیئرنگ پر سر رکھ دیا۔ کچھ دیر گزری۔ جب میں نے خیال کیا کہ اب شاید نرمی سے اسے سمجھایا جا سکے اور سر اٹھایا تو پہلو خالی تھا۔ دور پر دیکھا کہ وہ چلی جا رہی تھی پیدل۔ تنہا..... میں نے کھلا ہوا دروازہ بند کیا۔ گاڑی اسٹارٹ کی۔ اس کے قریب پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک اور گاڑی جو وسیع اور خوب صورت اور قیمتی تھی وہیں پہ آ کر ٹھہر گئی..... دروازے کھلے بیک وقت احسان اور اللہ والا گاڑی سے نکلے۔ احسان بولا۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں..... مسٹر اللہ والا تم کو کراچی لے جانا چاہتے ہیں۔ وہاں سے ولایت لے جائیں گے۔"

مسکرائیے

شام کے اخبار کے ایڈیٹر نے نہایت پریشانی کے عالم میں رپورٹر سے کہا۔

"اخبار کے پریس میں جانے کا وقت قریب آ گیا ہے اور ابھی تک شہر میں کوئی ایسا سنسنی خیز جرم نہیں ہوا جس کی مزے دار سی ہیڈ لائن لگائی جا سکے۔"

"آپ فکر نہ کریں سر! کچھ نہ کچھ ہو ہی جائیگا۔" رپورٹر نے انہیں تسلی دی۔ "فطرتِ انسانی پر میرا یقین بہت مضبوط ہے۔"

☆ سروے کرنے والے ایک صاحب نے ایک سرکاری دفتر کے انچارج سے پوچھا۔

"آپ کے ہاں کتنے آدمی کام کرتے ہیں۔؟"

انہوں نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر جواب دیا۔ "سو میں سے دو تین۔"

فوزیہ مسکرائی اور ایک لمحے کو میری طرف دیکھا لیکن آنکھیں جو آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں چشمے کے سیاہ شیشوں میں چھپ چکی تھیں۔ احسان اور اللہ والا مجھے نظر انداز کر چکے تھے لیکن فوزیہ کے مخاطب ہونے سے وہ بھی مجبوراً مخاطب ہوئے۔

فوزیہ بولی۔ "شکریہ' مسٹر غنی..... آپ دیکھتے ہیں کہ مسٹر اللہ والا نہ صرف مجھے لفٹ دے رہے ہیں بلکہ زمین سے آسمان تک پہنچائے دے رہے ہیں۔"

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ ہنسا میں بھی لیکن مجھے یاد نہیں کہ شکست خوردہ ہنسی میں میرا کیا عالم ہوا۔ فوزیہ ان کی گاڑی میں جا بیٹھی اور گاڑی دیکھتے ہی دیکھتے ہوا ہو گئی۔

سڑک پر اس گاڑی کی اڑائی ہوئی دھول ہی دھول تھی اور اس دھول میں میری گاڑی جوں کی طرح رینگ رہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہلی قسط

داسی

غزالہ جلیل راؤ

وہ حسین تھی..... معصوم تھی..... اس میں جو حیرت انگیز صلاحیتیں تھیں' ان کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ اس کے والدین بھی نہیں..... جنھوں نے اسے پیدا کیا تھا..... اور جہاں اس نے پرورش پائی تھی۔ وہ دیوتاؤں اور دیویوں جیسے حسن کی مالک تھی..... اس کو ناجانے کون کون سی شکتیاں حاصل تھیں..... بڑے بڑے پنڈت اور مہان شکتی مان اس کے آگے جھک جاتے تھے..... اس کے آگے ان کی کوئی حیثیت نہ تھی..... لیکن ایک خواہش اس کے من میں موجود تھی..... جس کے لیے وہ بہت آگے جانا چاہتی تھی..... عمران ڈائجسٹ کا امتیاز..... ایک ایسا سنسنی خیز سلسلہ..... جس کے بارے میں ہمارا دعویٰ ہے کہ قارئین اس کا بے چینی سے انتظار کریں گے۔

حیرت انگیز صلاحیتوں کی مالک ایک حسین و معصوم کی داستان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"دو تھے شنکر کے بیٹے مدن، جسکرن، بھولی بھالی شکل ان پر بھنڈار ہے۔ جے داس کلونتی کرن، اپر ھارن، کرن کرویو جے، بھنڈاری، جے بھنڈاری....." ہری رام جی آدھے بدن پر دھوتی باندھے گلے میں جنیو پہنے برابر کے گھر میں جھانک رہے تھے۔ وہاں سامنے رسوئی میں پربھا کری کڑاہی میں پوریاں تل رہی تھی اور مسکرا، مسکرا کر پنڈت جی کی طرف دیکھ لیتی تھی۔ دونوں میں باتیں بھی ہوتیں۔ اگر پربھا کری کا پتی رام پرشاد گھر پر موجود نہ ہوتا۔ پنڈت جی کی آواز ابھری۔

سوتلک چند تیواڑی نے پربھا کری سے کہا۔

"بھاگوان۔ دان پن، سنسار کے ہر بھینکر روگ کو ٹال دیتا ہے۔ سومنش کو چاہیے کہ چار پوریاں ترکاری، رکھ کر دونے میں لپیٹ کر اوپر اچھال دے۔ پیٹ کسی کا بھرے چیل، کوے ہوں یا..... رام ہرے..... رام ہرے، رام ہرے۔"

ہری رام رک گئے۔ انہوں نے پربھا کری کے انداز میں اضطراب دیکھا۔ دوبار اس نے ہاتھ سے پیچھے کی سمت اشارہ بھی کیا تھا لیکن وہ سمجھ نہ سکے اور پھر گنگنائے۔ "دو تھے شنکر کے بیٹے مدن جسکرن۔"

کوئی چیز زور سے پیٹھ میں چبھی تو ان کے حلق سے بلغ جیسی آواز ابھری۔ "بھولی، بھالی، بھو۔ بھو۔ قوں۔"

"پیچھے ہٹ جاؤ۔ بھولن بھالن، وہ ماں جادی تو ہے ہی محلے بھر ماں بدنام لوگ تم کا پنڈت جی۔ پنڈت جی کہت ناہیں۔ تھکت کچھ تو سرم کرو۔ اور پھر رام پرساد نے دیکھ لیا تو کانپ کھڈ توڑ کر بغل ماں رکھ دئی ہے۔ ہاں۔" ہری رام کی بیوی کوشلیا کی طنز بھری آواز ابھری۔

"ایں تو کہاں آ گئی اتنی سردی میں اوپر۔"

"سردی۔ ای سردی رہ..... دو..... اور تم کا کرت ہو سردی ماں جوانی کھولے ہوئے۔"

"ساری تپسیا بھنگ کردی تو نے....." ہری رام نے دانت پیس کر کہا۔

"پڑوس میں جھانک جھکت کرت ہو۔ ای تپسیا رہت۔ رہیں تو مار۔" کوشلیا آنکھیں نکال کر بولی۔

"پگلیا، نا رہی ہو۔ سسری۔ اری ستاروں سے آنکھ لڑا رہا ہوں۔"

"آئے ہائے ہائے۔ ستارے رام پرساد کے گھر ماں اتر آئے ہیں کا اور پھر منڈی اوپر کر کے جرا دیکھو۔ آکاس بادلن میں ڈھکت رہن..... اور تم کا ستارے نجر آوت ہیں۔ ارے باوت رہیں رام پر ستار کو ارے اور رام پرساد، تو یار، گھر والی تو کا پرساد ماں بانٹت رہے۔" کوشلیا چیخی لیکن ہری رام نے جلدی سے دھرم پتنی کا منہ دبایا اور اسے کھینچتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

ادھر رام پرساد کی پتنی پربھا کری پوریوں کا تسلا اٹھا کر اندر گھس گئی تھی۔ مہورتی جیوتشی تھے، ہری رام جی، تقدیر کی باتیں بتاتے تھے۔ شادی بیاہ، کاروبار مقدمے کی مہورت نکالتے تھے۔ بھاجی روٹی چل جاتی تھی۔ سولہ سال بیاہ کو ہو گئے تھے اولاد کوئی نہیں ہوئی تھی۔ احساس دونوں کو تھا۔ پر بھگوان کی مرضی..... ہاں ہری رام تاک جھانک کے عادی تھے۔ ستاروں سے آنکھ مٹکا کرتے کرتے تاک جھانک بھی کر لیا کرتے تھے۔ رام پرساد کی استری انہیں دیکھ کر مسکرائی تو پنڈت جی کو دن میں بھی تارے نظر آنے لگے۔ ویسے خطرناک بات تھی کیونکہ رام پرشاد پہلوان تھا لیکن نظر کی آسودگی کے لیے خطرہ تو مول لینا ہی پڑتا ہے۔

اس وقت بھی دھرم پتنی نے رنگے ہاتھوں پکڑا تھا اور پنڈت جی گھبرا گئے تھے۔ منہ پھٹ عورت تھی۔ اگر رام پرشاد کو بھنک بھی پڑ گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ نیچے آئے۔

کوشلیا کا منہ بنا ہوا تھا۔ خوشامدی لہجے میں بولے۔

"سن ری۔ منہ سیدھا کر تو ایک خوشی کی خبر ہے تیرے لیے۔"

"تو یاد ساتھ رہ کر کھوسی کہاں سے مل سکتے ہری

رام۔"

"اوں، ہونہہ۔ سن تو سہی۔ ایک ستارہ ٹھٹھول کر رہا ہے۔ سنتان دیو ہے۔ وہ۔ انکھیں جھپکا رہا ہے۔ بھگوان کی سوگند۔"

"کا مطبل۔" کوشلیا بہک گئی۔

"سنتان ہونے کی خبر دیتا ہے وہ۔"

"ہائے رام۔ تو کا۔" کوشلیا کے چہرے پر مسرت دوڑ گئی۔ اور پنڈت جی چونک پڑے۔

"تو۔ تو آگے بول۔ کیوں شرما رہی ہے۔"

"ہری۔" کوشلیا نے شرما کر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔

"تجھے ہماری سوگند آگے بول۔"

"ہم سمجھے تھے۔ ایسے ہی۔ بس۔ ہری۔" کو شلیا کو جب پیار آتا تھا تو وہ ہری رام کو ہری ہی بولتی تھی۔

"ارے ہری۔ ہری۔ ہری ہی ہری۔ ابھی آیا۔" پنڈت جی دروازے کی طرف دوڑے۔

"کہاں چلے۔" کوشلیا ناز سے بولی

"بانکے حلوائی کی دوکان سے جلیبیاں لینے۔" پنڈت جی یہاں سے باہر نکل گئے۔

☆☆

بیٹی پیدا ہوئی تھی۔

کوشلیا نے کہا۔ "جلیبیاں لینے چلے گئے تھے۔ سنتان کی خبر سن کر..... لڈو لاوت رہے تو بیٹا پیدا ہوتا۔"

"ارے تیرے کی۔ بھگوان نے تجھ جیسی نکمی کو سنتان دے دی، یہ کونسی کم بات ہے اب بیٹا ہو یا بیٹیا۔ شکر بھگوان کا۔"

"اور تم جیسے بڑے بھگت لام ہووت رہو۔ ہاں۔" لڑتے رہنا کوشلیا کی عادت تھی بہر حال سولہ سال کے بعد اولاد ہوئی تھی۔ محلے بھر میں دھوم مچ گئی، ویسے بھی ہری رام جی اور ان کی دھرم پتنی محلے والوں کو پسند تھے۔ سب اپنی اپنی ریکھائیں دکھانے آجاتے تھے اور ہری رام جی سب ہی کے من کی باتیں کرتے تھے۔ کوشلیا صرف اپنے پتی دیو سے لڑتی تھی۔ باقی محلے میں اس کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ چنانچہ جسے جسے پتہ لگا۔ وہ چندر مکھ کو دیکھنے آ گیا۔ اور دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ کوشلیا بھی معمولی شکل و صورت کی عورت تھی اور ہری رام جی بھی لیکن لڑکی..... لڑکی چاند کا ٹکڑا تھی، اتنے حسین اور سبک نقوش، اتنی خوبصورت موٹی آنکھیں چہرہ تھا کہ جاذبیت سے بھرا ہوا تھا۔ جو دیکھتا دنگ رہ جاتا اور ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگتا، بہت سوں نے بڑے خلوص سے بدھائی دی تھی۔

"پنڈت جی! آپ تو لگتا ہے۔ آکاش سے اپسرا اتار لائے ہیں۔ اتنی سندر ہے۔ آپ کی بیٹی۔"

"بھگوان کی دین ہے۔ سولہ سال کے بعد جو دی ہے۔ اس نے تو بھر پور دے دی ہے بس اس کے جیون کی پرارتھنا کریں۔" پنڈت جی نے چندر مکھ کی کنڈلی بنانے کے لیے آخر کار ستاروں سے رابطہ قائم کیا۔ چندر مکھ نام بھی بس اچانک ہی ذہن میں آیا تھا۔ یوں ہی لگا تھا بس جیسے کسی نے کانوں میں پھونک دیا ہو نام رکھنے کی بات ہوئی تو کوشلیا بولی۔

"پنڈت جی! کیا نام رکھیں اپنی بٹیا کا۔"

"میرا خیال ہے۔" پنڈت جی کے منہ سے جملہ نکلا ہی تھا۔ کہ کوشلیا بول پڑی۔

"چندر مکھ۔"

"ارے۔ رے، رے، رے یہ کیا ہو گیا۔" پنڈت جی حیرانی سے بولے اور کوشلیا ان کی صورت تکنے لگی۔

"کا ہوی راہین۔" اس نے سوال کیا۔

"ارے بھگوان کی سوگند۔ ہم بھی یہ ہی بولنے والے تھے۔"

"چندر مکھ۔"

"تو اور کیا۔" پنڈت جی بولے اور کوشلیا مسکرانے لگی پھر کہنے لگی۔

"تو۔ ٹھیک رہن ناں۔ تم کا بھی اوہی پسند ہے۔ سو ہم کا بھی۔" چنانچہ نام چندر مکھ رکھ لیا گیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھٹی ہوگئی اور پنڈت جی نے پہلی بار آسمان پر چندر مکھ کا ستارا تلاش کیا۔ بہت دیر تک آنکھیں پھاڑتے رہے اور پھر ایک دم چونک پڑے۔

"ہے بھگون۔ یہ کیا چکر ہے۔" کوشلیا بھی ان کے پاس ہی کھڑی تھی اور چندر مکھ اس کی گود میں دبی ہوئی تھی۔ اس نے حیرت سے کہا۔

"کیا ہوی ہے۔"

"اریاس کا تو ستارا ہی نیا ہے۔ بھگوان کی سوگندھ آکاش میں بکھرے ہوئے ایک ایک ستارے سے ہماری جانکاری ہے۔ پر یہ ستارہ ہم پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔ ایسا ہوتا نہیں ہے۔ بھگوان ہر آنے والے اور جانے والے کے لیے آکاش میں ایک صورت رکھ دیتا ہے ستارے کی شکل میں۔ اور وہ مورت ہمیشہ سے ہوتی ہے۔ پرائی ستارا نا ہی سمجھ میں آوت۔ جیانا ہی سمجھ میں آوت۔" ہری رام نے ماتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"ایک بات ہم بھی کہیں ہری۔" کوشلیا کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی اور ہری رام جو سخت حیرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ کوشلیا کی صورت دیکھنے لگا۔

"بول ری۔ بول ناں۔"

"ڈر لگت ہے ہم کا ہری۔ بھگوان کی سوگند کچھ عجیب سا ہے۔"

"کیا عجیب سا ہے۔ بتائے گی نہیں۔"

"ارے کا بتی ہے۔ کا بتی ہے۔ تو ہا۔ ہم بولیں گے تو کہو گی کہ سسری پاگل ہوی گئی ہے' ارے بولت رہن تو کا بولت رہن۔ ایک بات کہیں تو کا ہری رام۔ تمہیں بھگوان کی سوگند سچ مان سی ہو۔ ہماری بات۔"

"بولے تب مانوں ناں۔" ہری رام نے کہا۔

"امی ابی سے بولت رہے۔ بات کرت رہے ہم امی کی آواز سنت رہی۔" کوشلیا نے سہمے ہوئے لہجے میں کیا اور ہری رام اس کی کہی ہوئی بات سمجھنے کی کوشش کرنے لگا پھر بولا۔

"تیرا مطلب ہے یہ بولتی ہے۔ ابھی سے۔"

"ہاں۔ ہری رام۔ بھگوان کی سوگند کھا کر کہہ رہے ہیں ہم۔ ہمیں ماتا جی کہہ کر پکارتی ہے دو تین بار ہم نے اس کی آواز سنی ہے۔ ننھی باریک، سندر آواز بھگوان کی سوگند۔"

"وہم ہوگا تیرا۔ کوشلیا۔ چھ سات دن کی بچی کیسے بول سکتی ہے۔"

"اور بھی بہت سی بات رہن۔ ہم تو کے کا بتی ہے۔"

"ارے تو پھر اپنے ماما کو بتائے گی کیا۔" ہری رام نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"تو پھر۔" ہری رام حیرت سے بولا۔

"تین دن ہوی گئے۔ دودھ کا منہ نہیں گھات۔"

"تو پھر کیا ہوا۔"

"ہم رسھو کی ماں کو بولت رہن تو او کہی ہے کہ گو ماتا کا دودھ پلا اس کو۔ تو ہم ایسا ہی کرت رہن۔ اور امی گو ماتا کا دودھ پی لئی ہے۔"

"کیسے۔"

"بوتل کا ڈال کر۔" کوشلیا نے بتایا اور ہری رام حیرت میں ڈوب گیا۔

"ہے تو یہ بڑی عجیب سی۔ تیری بات میں اس لیے مانے لیتا ہوں کہ میں نے اپنے جیون میں ایسا کوئی انوکھا ستارا نہیں دیکھا۔ جس سے میری جانکاری نہ ہو۔ بھگوان جو کرے اچھا ہی کرے۔" اور بھگوان جو کر رہا تھا۔ اچھا ہی کر رہا تھا۔ غالباً سترہ یا اٹھارہ دن کی ہو چکی تھی چندر مکھ کہ ایک رات کوشلیا کی آنکھ کھل گئی۔ ہری رام آدھی رات تک ستاروں سے آنکھیں لڑاتا رہتا تھا۔

لیکن اب کوشلیا نے چھت پر آنا چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے اسے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ رام پرشاد کی دھرم پتنی بھی آدھی رات تک ستارہ بن کر چھت پر جگمگاتی رہتی ہے۔ اس نے بڑے دکھ بھرے انداز میں ہری رام کو بیٹی کی پیدائش کی بدھائی دی تھی۔ اور کہا تھا۔

"کہ ہری رام ہمارے لیے بھی دعا کردے۔"

"جیسا تو کہے۔ دعا بھی کرنے کو تیار ہیں ہم۔ اور دوا بھی۔" ہری رام نے مستی بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"دوا نہ کرو تو اچھا ہی ہے۔ ہری رام' کیونکہ ہری پرساد کو پتہ چل گیا تو پھر تمہاری رتیریاں ہو جائیں گی۔"

"ہرے رام۔ ہرے رام۔ ہرے رام۔" ہری رام نے خوفزدہ لہجے میں کہا سو اس دن ہری رام ستارہ شناسی کے بعد آ کر گہری نیند سو گیا تھا۔ اس کی نیند بھی گھوڑے بیچنے والی ہوتی تھی۔ رات کا نجانے کون سا پہر تھا کہ کوشلیا کی آنکھ کھل گئی اور اس نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ چندر مکھ اس سے تھوڑے فاصلے پر اسے ایک عجیب سی عورت نے اپنی گود میں لے کر بٹھایا ہوا تھا۔ چندر مکھ اس کی گود میں ساکت بیٹھی ہوئی تھی۔ اور یہ عورت..... اس کا چہرہ دھندلاہٹوں میں لپٹا ہوا تھا لیکن پورا بدن نظر آ رہا تھا۔ وہ سفید رنگ کی ایک دھوتی باندھے ہوئی تھی اور گداز ہاتھ پاؤں کی مالک تھی لیکن دوسری حیرانی کی بات یہ تھی کہ اس سے کچھ فاصلے پر ایک چمکدار تھال آرتی کے انداز میں گردش کر رہا تھا۔ اس تھال میں سات دیئے روشن تھے اور کوئی نظر نہیں آ رہا تھا جو اس آرتھی کو چندر مکھ کے گرد گھما رہا ہو۔ کوشلیا نے آنکھیں مل مل کر دیکھا۔ سب گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے سو رہے تھے۔ کوشلیا جانتی تھی کہ اس وقت اگر پنڈت جی کے کانوں کے پاس ڈھول بھی بجا دیجائے تو وہ نہیں اٹھیں گے۔

لیکن وہ جو کچھ دیکھ رہی تھی' ہوش حواس کے عالم میں دیکھ رہی تھی اور وہ ہوش میں تھی۔ وہ دھندلی شکل والی عورت بدستور گھوم رہی تھی۔ کوشلیا نے اپنی جاگتی آنکھوں سے تھالی کے چکروں کو دیکھا اور انہیں گنا۔ پورے اکیس چکر ہوئے تھے اور اس کے بعد تھالی ایک جگہ ٹک گئی' کوشلیا کا دم سینے میں اٹکا ہوا تھا۔ اس کی چیخ تک حلق سے باہر نہیں آ رہی تھی۔

پھر سفید دھوتی والی عورت اپنی جگہ سے اٹھی۔ کوشلیا نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس کا چہرہ کچھ اس طرح دھندلاہٹوں میں لپٹا ہوا تھا کہ اس کے نقوش نظر نہیں آ رہے تھے۔ البتہ کوشلیا نے اسے اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ وہ چندر مکھ کو بڑے پریم سے گود میں لیے ہوئے آگے آ رہی تھی اور پھر اس نے اسی پریم سے چندر مکھ کو کوشلیا کے برابر اس کے بازو پر لٹا دیا اور واپس پلٹ گئی۔

تھالی کے قریب پہنچ کر اس نے ساتوں چراغ پھونک مار کر بجھائے اور اس کے بعد دروازے کی طرف بڑھ گئی لیکن کوشلیا نے یہ بھی دیکھا کہ اس نے آرتی کی تھالی نہیں اٹھائی تھی اور تھالی اسی جگہ موجود تھی۔ بلکہ اس میں رکھے ہوئے چراغوں سے مدھم مدھم دھوئیں کی لکیریں اٹھ رہی تھیں۔

کوشلیا نے ایک بار پھر ہری رام کی طرف دیکھا اور دانت نکوس کر رہ گئی۔ اس کے منہ سے مدھم آواز نکلی۔

"ایسا پتی بھی بھاڑ میں جائے۔ جسے نیند کے آگے کچھ سجھائی ہی نہیں دیتا۔ ارے ہری رام مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ ہری رام جی۔ ہری او۔ ہری۔" وہ آوازیں دیتی رہی اور ہری رام جی عالم خواب میں پڑوسن سے بات کرتے رہے۔

اب نیند بھلا کاہے کو آنی تھی۔ کئی بار اس نے سہمی ہوئی سی نگاہوں سے چندر مکھ کو دیکھا۔ چندر مکھ سوچوں میں مسکرا رہی تھی کوشلیا کے منہ سے آواز نکلی۔

"ہے بھگون۔ ہے بھگون۔ کیا ہے یہ سب کچھ۔" بہر حال وقت گزرتا رہا۔ پھر صبح کا اجالا پھوٹنے لگا اور پنڈت جی کروٹیں بدلنے لگے۔ پھر ان کے منہ سے نکلا۔

"رام ہرے۔ رام ہری۔ رام ہرے۔"

"ہری رام۔ ہری رام۔ ہری رام۔ اب اٹھت ہو کہ پانی اٹھا کے ڈالت تو ہار منہ پا۔" کوشلیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اٹھتے ہیں بھاگوان ایسی کیا جلدی ہے۔"

"ہاں جلدی کا رسیت' نہ پوجا کے نہ پاٹ کے بس' چھت پہ جا کے آنکھیں سیکت رہو۔ اوہی تو ہار پوجا رہے۔"

"شروع ہوگئی۔ شروع ہوگئی صبح ہی صبح۔"

"ارے ہم کہت اٹھو۔ دیکھو کا اندھیر ہوی رہا ہے۔"

"اندھیر۔"

"تم اٹھت ہو کہ نا ہی۔ بھگوان کی سوگندھ اب تو ہار منہ پر کٹورہ بھر کر پانی ڈالت ہی رہن ہم۔"

"لے اٹھ تو گئے۔ کیا ہو گیا صبح ہی صبح۔"

"ادھر دیکھو۔ ادھر۔" کوشلیا نے سامنے کی سمت اشارہ کیا۔ جہاں پوجا کی تھالی رکھی ہوئی تھی۔

"یہ کیا ہے۔" پنڈت جی نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"منہ ہاتھ دھولو۔ پھر بتات رہن۔"

"ای۔ ایسے ہی بتادے۔ بھاگوان یہ کیا ہے۔"

"جرا۔ قریب جا کے دیکھو۔" کوشلیا نے کہا۔

ہری رام کو خود حیرت ہوئی تھی۔ ایک عجیب ہی سی تھالی نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور ننگے پاؤں ہی تھالی کی طرف بڑھ گئے۔ قریب جا کر انہوں نے تھالی کو غور سے دیکھا۔

سنہرے رنگ کی بڑی سی تھالی تھی اور اس میں سات سنہرے چراغ موجود تھے۔ جن میں گھی نظر آ رہا تھا۔ گھی کی خوشبو فضا میں اڑ رہی تھی اور پنڈت جی! کیونکہ خود بھی دیسی گھی کے شوقین تھے۔ اس لیے اس خوشبو کو محسوس کر رہے تھے۔ ان کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ تھالی میں ایک پیالی میں چندن' ایک میں سندور' تیسری پیالی میں تھوڑی سی مٹھائی اور ایک ناریل رکھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ تھوڑا سا کلاوہ بھی موجود تھا۔ یہ ساری چیزیں آرتی اتارنے کے لیے استعمال کی جاتی تھیں لیکن یہ سامان کہاں سے آیا۔

دفعتاً ہی پنڈت جی کو ایک اور احساس ہوا۔ یہ سنہرا رنگ بڑا جاندار تھا۔ عام طور سے پیتل' تانبا' یا کسی بھی چیز کو پالش کر دیا جائے تو یہ رنگ نہیں بنتا تھا۔ انہوں نے لرزتے ہاتھوں سے ایک چراغ ہاتھ میں اٹھالیا اور اسے ہتھیلی پر رکھ کر دیکھے گئے۔ بدری ناتھ سنار سے ان کی گہری یاری تھی۔ بدری ناتھ سونے کا کام تو کرتا ہی تھا لیکن اصل کام چوری کی چیزیں خریدنا تھا۔ بظاہر ایک ٹوٹے پھوٹے سے گھر میں رہتا تھا لیکن اس گھر کے نیچے کلسوں میں اتنی مایہ گڑھی ہوئی تھی کہ بدری ناتھ کروڑ پتی سے کم نہیں تھا۔

یہ الگ بات ہے کہ اس کی دھوتی سے جوئیں ٹپکتی تھیں اور بنڈی ہمیشہ کالی چیکٹ ہوا کرتی تھی۔ بدری ناتھ کے ساتھ رہتے ہوئے پنڈت ہری رام کو سونے کی بڑی پہچان ہوگئی تھی اور اس وقت نجانے کیوں ان کا دل کہہ رہا تھا کہ یہ چراغ جو ان کے ہاتھ میں ہے وہ سونے کا ہے اب باقی باتیں تو وہ بعد میں کوشلیا سے پوچھ لیں گے۔ ذرا یہ تو اندازہ لگائیں کے ان کا خیال ٹھیک ہے یا غلط چنانچہ وہ کمرے سے باہر نکل آئے اور پھر انہوں نے چراغ کو صحن میں بڑی ہوئی سیل کے بٹے پر رگڑ کر دیکھا تو بٹے پر جو لکیر ابھری وہ سو فیصدی سونے ہی کی تھی۔

"ہرے رام۔ ہرے رام۔ ہرے رام۔" ہری رام کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چراغ کو دیکھتے رہے۔ پھر اس میں انگلی ڈال کر گھی کو چھوا اسے ہاتھ پر مل کر اسے سونگھا۔ اتنی دیر میں کوشلیا باہر نکل آئی تھی۔ چندر مکھ گہری نیند سو رہی تھی۔

"ہم تو سمجھت رہن کہ آپ گھر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ارے کیا کرت ہو ادھر۔"

"کوشلیا۔ کوشلیا۔ اندر آ۔ اندر آ۔" پنڈت جی لرزتی ہوئی آواز میں بولے اور غڑاپ سے اندر گھس گئے۔ کوشلیا ان کے پیچھے پیچھے اندر آ گئی تھی' پنڈت جی دوبارہ تھالی کے پاس پہنچ گئے اور آنکھیں پھاڑ

پھاڑ کر اسے دیکھنے لگے۔

"کوشلیا یہ کہاں سے آئی۔"

"تم ہوش میں آوت رہو۔ تو ہم تم کا بتی ہے۔" کوشلیا نے کہا۔

"تو بتا نہ جلدی۔ کہاں سے آئی یہ۔" تب کوشلیا نے رات کا پورا واقعہ پنڈت جی کو بتادیا۔ پنڈت جی کوشلیا کو ہمیشہ کا پاگل سمجھتے تھے اور اس سمے بھی یہ ہی سب کچھ ہوتا۔ پھر تھالی' اس میں رکھے چراغ' اس میں رکھی پیالیاں' چندن سندور' گھی' ناریل ساری چیزیں کوشلیا کو سچا ثابت کر رہی تھیں۔ وہ وہیں تھالی کے پاس بیٹھ گئے اور احمقوں کی طرح کوشلیا کا منہ دیکھنے لگے۔

"بھگوان کی سوگندھ میری تو جان نکل گئی ہے۔ سولہ سال کے بعد بھگوان نے سنتان دی ہے۔ پھر اس سے بھی ڈر لگنے لگا ہے۔"

"ارے تو تجھے کون سا کھائے جا رہی ہے۔ چل ہٹ ادھر سے....." پنڈت جی نے کہا اور تھالی ہاتھوں میں اٹھالی پھر انہوں نے کوشلیا سے ایک اور برتن منگوایا اور جب برتن آ گیا تو انہوں نے سندور' چندن' گھی' وغیرہ اس برتن میں انڈیل دیا اور پھر انگوٹھے سے پیالیوں کی صفائی کرنے لگے۔ ان کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ ہر چیز سونے ہی کی معلوم ہوتی تھی اور اتنا سونا تو جیون ہی بدل سکتا تھا۔ لاکھوں روپے کی مالیت کا سونا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یہ وزنی تھالی بھی سونے ہی کی لگ رہی تھی۔

کوشلیا کو شاید ابھی تک حقیقت معلوم نہیں تھی۔ ورنہ وہ تو خوشی سے بیہوش ہی ہو جاتی لیکن پنڈت جی کا بدن آہستہ آہستہ لرز رہا تھا۔ دل کی بات کوشلیا کے علاوہ بھلا اور کسی سے کیسے کہہ سکتے تھے۔

"وہ سو رہی ہے ناں۔"

"ہاں۔"

"تو پھر جلدی سے آ۔ بھڑئی۔ بھڑئی۔ میں جا کے گھڑھا کھود یہ چیزیں اس میں گاڑھی ہیں۔"

"کیوں۔"

"پاگل سونا ہے کھرا سونا۔ سمجھی یہ پیالیاں' یہ چراغ یہ تھالی سب سونے کی ہے۔ اور سونا بھی کھرا سونا۔"

"دماغ چل گیا ہے۔ تو ہار' کیا پنڈت جی۔" کوشلیا کی آواز میں بھی اب لرزش پیدا ہوگئی تھی۔

"ہاں۔ دماغ چل گیا ہے۔ میرا۔ جو کہہ رہا ہوں وہ کر۔"

"ہائے رام! مگر یہ سب سے کیا۔"

"بتاؤں تجھے میں ابھی۔ ارے جو کہہ رہا ہوں۔ وہ کر' مار کھائی ہے کا ہمارا ہاتھ سے۔"

"کرت' رہو' کرت رہوں بابا۔ کرت رہوں۔" کوشلیا نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد پنڈت جی نے وہ ساری چیزیں بڑی حفاظت کے ساتھ زمین میں دفن کر دیں اور اس پر گھاس پھوس ڈال دیا تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو سکے بس ایک چراغ جو انہوں نے پہلے سے اٹھایا ہوا تھا۔ وہ انہوں نے اپنے پاس رہنے دیا تھا۔ ان کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔

"کا ہوی گوا تم کا۔"

"کوشلیا! یہ ساری چیزیں سونے کی ہیں اور اگر یہ سب ہماری ہیں اور کوئی انہیں واپس لینے نہیں آتا تو سمجھ لو کہ ہمارے دن پھر گئے۔"

"اور ہم تم کا بتادی ہے کہ وہ امی کا آرتھی اتارت رہن۔"

"ہاں اس کا مطلب ہے کہ ہمارے گھر میں لکشمی دیوی آئی ہیں ارے کون سی غلط بات ہوئی ہے کوشلیا۔ وہ جتنی سندر ہے۔ سمجھ لے آکاش سے اپسرا اتری ہے اور یہ اپسرا ہی نہیں بلکہ لکشمی بھی ہے۔" کوشلیا بیوقوفوں کی طرح گردن ہلانے لگی تھی۔

☆☆

بدری ناتھ نے بار بار چراغ کو سونا پرکھنے والی کسوٹی پر پرکھا۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے پنڈت ہری رام کو دیکھنے لگتا۔ پھر اس نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کسی مندر سے مار کر لائے ہو۔ پنڈت جی! شاید۔"

"دیکھ بدری ناتھ یہ ٹھٹھول کا سمے نہیں ہے۔ جو کچھ میں تجھ سے پوچھ رہا ہوں وہ بتا۔"

"سونے کا ہی ہے۔ کھرا اور چوکھا سونا۔"

"کیا دے گا۔ اس کا۔"

"بتاؤ گے نہیں پنڈت جی! آیا کہاں سے۔"

"ادھر لا۔ ادھر لا۔ تجھ سے ہمارا کام نہیں بنے گا۔ سرافہ مارکیٹ لے جاتے ہیں۔ وہاں اس کے کھرے دام ملیں گے۔"

"وہ تو ملیں گے پنڈت جی پر وہاں بھی لوگ تم سے یہ ہی پوچھیں گے کہ یہ سونے کا چراغ آیا کہاں سے۔"

"ارے انہیں آم کھانے سے مطلب پیڑ کیوں گنتے ہیں۔ لا بھائی لا' ہمارا وقت ضائع مت کر۔" پنڈت جی نے کہا۔ اور چراغ بدری ناتھ کے ہاتھ سے جھپٹنے کی کوشش کی لیکن بدری ناتھ نے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا تھا۔

"چھری تلے دم تو لو پنڈت جی! انوکھی چیز ہے۔ اس لیے حیران ہو رہا ہوں۔ کیا لو گے بتاؤ اس کا۔"

"وزن کرو۔ وزن پھر بتاؤ کیا بنا۔"

"ارے وزن تو ہم اپنے ہاتھوں ہی سے کر لیتے ہیں' بیس ہزار دے دیں گے تمہیں اس کے پنڈت جی۔"

ایک بار پھر پنڈت جی! کا بدن لرزا تھا۔ مگر وہ بھی بڑے سیانے تھے۔ سمجھ گئے کے بدری ناتھ گڑبڑ کر رہا ہے۔

"لا بھئی۔ لا چراغ ادھر دے۔ تو پتہ نہیں کیا سمجھ رہا ہے۔ پچاس ہزار سے کم نہیں لوں گا۔ من چاہے لے۔ من چاہے مت لے۔"

"ارے تو چیل کی طرح جھپٹے کیوں مار رہے ہو۔ ہری رام بات تو سنو۔ پچاس ہزار بہت زیادہ ہیں اور ہمیں یہ بھی پتا ہے کہ یہ تمہارے پرکھے ورثے میں نہیں چھوڑ گئے ہوں گے۔ کہیں سے ہاتھ لگا ہے تمہارے...... کل کو پولیس آ گئی ہمارے پاس تو بھگتنا تو ہمیں ہی پڑے گا۔ تم تو مکر جاؤ گے۔"

"بدری ناتھ۔ بہت باتیں بنا رہا ہے تو...... پچاس ہزار دینے ہیں یا نہیں دینے۔"

"یار کچھ کم کرو۔ چالیس کر لو۔"

"پچاس ہزار سے ایک دمڑی کم نہیں ہو گی سمجھ گیا تو۔"

"سمجھ گئے بھائی سمجھ گئے۔ ٹھیک ہے' دیئے دیتے ہیں پچاس ہزار پر یہ ہی اکیلا ہے یا اور بھی کوئی ہے۔ میرا مطلب ہے۔ ایسی کوئی اور چیز۔"

"ہاں۔ جیسے آکاش سے برس رہا ہے یہ سونا۔ لا نکال پیسے یار۔" پچاس ہزار کی رقم پنڈت جی نے زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی۔ واپس پلٹے تو پاؤں لرز رہے تھے' کوشلیا کو بتانے کی ہمت بھی نہ پڑ سکی۔ بس رقم چھپانے کے چکر میں پڑ گئے اور پھر بات آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔

دوسرا چراغ سرافہ مارکیٹ میں ڈیڑھ لاکھ میں بکا تھا اور پنڈت جی کا دل خون ہو کر رہ گیا تھا۔ بدری ناتھ پورے ایک لاکھ مار گیا۔ مگر یہ دو لاکھ روپے اور پھر اس کے بعد لاکھوں روپے یہاں تک کہ تھال تک بک گیا اور اب پنڈت جی کے پاس کلسوں میں دولت بھری ہوئی تھی اور ان کا دماغ' ٹھکانے پر نہیں تھا۔ اب تو چھت پر جانا بھی چھوڑ دیا تھا اور کئی بار پربھاکری آ چکی تھی۔ بظاہر وہ چندر مکھ کی خبر گیری یا اس سے ملنے کے لیے آئی تھی لیکن کوشلیا دیوی جانتی تھیں کہ اس کی آنکھیں کسے تلاش کرتی ہیں۔

دولت آئی تو دماغ بھی اونچے ہونے لگے۔ ہر طرح کی آسائشیں فراہم کر دی گئی تھیں اور صاف نظر آتی تھیں۔ تب پنڈت جی نے کوشلیا سے کہا۔

"دیکھ بھاگوان' بھگوان نے وہ سب کچھ دے دیا ہے جو ہم نے سپنوں میں بھی نہیں دیکھا اور سوچا تھا۔ اب اسے استعمال بھی تو کرنا چاہیے۔" چنانچہ گھر بننا شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہری رام کا اونچا سا گھر بن گیا۔

ادھر چندر مکھی بھی تیزی سے بڑی ہو رہی تھی۔ سال' دو سال' تین سال یہاں تک کہ وہ پانچ سال کی ہو گئی اور اس کے لیے لکھائی پڑھائی کا بندوبست ہونے لگا۔ عجیب' سی تمکنت' عجیب سا بانک پن تھا۔ اس کے اندر بہت کم بولتی تھی حسن جمال میں یکتا تھی دیکھنے والے اسے دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ جاتے' اس کے اندر رانیوں جیسی شان و شوکت تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ معمولی جیوتشی یا نجومی کی بیٹی ہے۔

کچھ ایسے انوکھے واقعات ہوا کرتے تھے جو ناقابل یقین تھے لیکن اب کم از کم ماتا پتا یہ بات جان چکے تھے کہ چندر مکھ کی شکل میں ان کے ہاں کوئی دیوی اتری ہے۔ پانچ سال کی عمر میں اس کے گیان دھیان کا بندوبست کیا گیا اور بستی ہی کے ایک اسکول میں اس کا داخلہ کرا دیا گیا۔ وہ اسکول میں داخل ہوئی تو اس کی شان ہی الگ تھی۔ اسکول کے کرتا دھرتا پنڈت رماشنکر تھے۔ رماشنکر جی۔ بڑے گیانی دھیانی تھے اور اس کے علاوہ وہ ایک مندر میں بھی درس دیا کرتے تھے اور ان کی بات بڑی سمجھی جاتی تھی۔ تو ایک دن پنڈت جی دین دھرم کی باتیں کر رہے تھے۔ بات راجہ بھوج کی ہو رہی تھی۔ جس کے ساتھ گنگو تیلی کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ پنڈت جی بتا رہے تھے۔

"راجہ بھوج کا تعلق فورا قوم سے تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بڑا سخی داتا تھا اور ہر طرح سے وکرم' اجیت کی پوری پوری تقلید کرتا تھا۔ وہ راتوں کو بھیس بدل بدل کر پھرتا تھا۔ اور ضرورت مندوں اور فقیروں وغیرہ کے حالات سے آگاہ ہوتا تھا۔ اور ان کی خبر گیری کرتا تھا راجہ بھوج نے اپنے دور میں رعایا کی خوشنودی' خوشحالی اور آسودگی کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہ تین مقامات' کھرکھوں' بیجہ نگر' اور ہنڈیا۔ اسی راجہ کے عہد میں آباد کیے گئے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی اس کے اندر کچھ خرابیاں بھی تھیں۔ وہ عورت پرست تھا اور ہر سال میں دو مرتبہ ایک بہت بڑا جشن منایا کرتا تھا۔ جس میں ہندوستان کے ہر حصے کے رقص و سرور کے ماہرین شرکت کیا کرتے تھے۔

جشن کا یہ سلسلہ چالیس روز تک جاری رہتا تھا اور اس میں سوائے ناچ گانے کے اور کوئی کام نہ ہوا کرتا تھا۔ دوران جشن میں ہر گروہ کو کھانا' شراب اور پان وغیرہ حکومت کی طرف سے دیا جاتا تھا۔ میرا مطلب ہے۔ راجہ بھوج کے دور حکومت میں۔" اسی وقت' چندر مکھ نے اٹھ کر کہا۔

"اور راجہ بھوج کے زمانے ہی میں ایک شخص جس کا نام باس دیو تھا۔ قنوج کا راجہ بن بیٹھا اور بہار کو جو بنگال کی طرح قنوج سے علیحدہ ہو گیا تھا پھر دوبارہ اپنے قبضے میں لے آیا اور اپنا رعب اچھی طرح قائم کر لیا۔ اسی راجہ کے دور کا ایک واقعہ ہے کہ بہرام' گور' ایک سوداگر کے بھیس میں ہندوستان آیا وہ یہاں کے حالات معلوم کرنا چاہتا تھا۔

بہرام گور کے ہندوستان آنے اور اس کے یہاں پہچان لیے جانے کا واقع یوں ہے کہ جن دنوں وہ یہاں تھا۔ ایک جنگلی ہاتھی قنوج میں اتفاق سے آ گیا اور کوئی دن ایسا نہ گزرتا کہ یہ مدہوش ہاتھی بہت کے جیون بھینٹ میں چڑھا دیتا۔ راجہ باس دیو نے کئی بار اس ہاتھی کا کام تمام کرنے کے کوشش کی لیکن ہر بار ناکام رہا جس روز بہرام قنوج میں داخل ہوا۔ اسی روز یہ بدمست ہاتھی جھومتا ہوا قنوج میں داخل ہوا۔ شہر میں داخل ہوا اور سارے شہر میں شور مچ گیا۔

راجہ نے شہر کے تمام دروازے بند کر دینے کا حکم دے دیا۔ مگر بہرام گور نے جب یہ خبر سنی تو وہ اکیلا اس بدمست ہاتھی کے سامنے آیا اور ایک ہی تیر ایسا مارا کہ خطرناک جانور کا کام تمام ہو گیا۔ شہر کے لوگوں نے جب یہ عالم دیکھا تو بہرام گور کے پیروں پر گر پڑے اور جب راجہ باس دیو کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو اس نے بہرام گور کو بلایا۔ راجہ کے مصاحب نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہرام کو پہچان لیا۔

کیونکہ ایک سال قبل جب وہ نذرانہ لے کر ایران گیا تھا تو اس نے بہرام کو دیکھ لیا تھا۔ باس دیو کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو وہ بہرام کے سامنے خادموں کی طرح حاضر ہوا اور اپنی بیٹی سے اس کی شادی کردی۔ باس دیو جب تک زندہ رہا۔ ہر سال بیش قیمت تحفے بہرام گور کو بھیجتا رہا۔ اس نے ستر سال حکومت کرنے کے بعد وفات پائی اور ایک مشہور شہر کالکی اس بادشاہ کا آباد کیا ہوا ہے۔ اس نے اپنے پیچھے تیس بیٹے چھوڑے جو سلطنت حاصل کرنے کے لیے آپس میں مسلسل دس سال تک لڑتے رہے۔

آخر کار سپہ سالاروں نے ان بھائیوں سے فائدہ اٹھایا۔ اور قنوج پر قبضہ کرکے ایک عظیم الشان راجہ بن بیٹھا۔" ایک معصوم سی باریک آواز میں یہ واقعہ سنایا جارہا تھا۔ اور سننے والے بالکوں کی طرح اس حسین لڑکی کی صورت دیکھ رہے تھے۔ پنڈت روامشنکر جی کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اور وہ دیوانوں کی طرح چندر مکھ کو دیکھ رہے تھے۔

چندر مکھ خاموش ہوئی تو عجیب وغریب آوازیں فضا میں گونجنے لگیں۔

"یہ کون ہے۔ یہ کیا ہے۔ اتنی چھوٹی سی بچی کو اتنی معلومات کہاں سے حاصل ہوئیں۔ پنڈت روامشنکر جی۔ آپ نے تو اسے ایک انتہائی گیانی لڑکی بنادیا۔"

"نہیں بھائیوں سچ بتاؤں' اس میں میری کوئی خوبی نہیں ہے۔ ہے بھگوان' ہے بھگوان' یہ سب کیا ہے....." اور اس شام پنڈت روامشنکری جی! ہری رام کے ہاں پہنچ گئے۔

"ہری رام' تم سے اکیلے میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" پنڈت جی نے سرد لہجے میں کہا۔

"آیئے پنڈت جی' آیئے۔ کیا بات ہے۔" ہری رام جس کا اب لہجہ ہی بدل گیا تھا۔ مسکراتے ہوئے بولا اور پنڈت جی کو اپنی بیٹھک میں لے گیا۔

پنڈت جی تھوڑی دیر تک سوچ میں ڈوبے رہے۔ پھر انہوں نے کہا۔

"ہری رام' میں تم سے تمہاری بیٹی کے بارے میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی مہاراج' کہیئے۔ آپ اس کے گرو ہیں۔ کیا کہنا چاہتے ہیں آپ۔"

"اگر میں تم سے یہ کہوں ہری رام! کہ میں اس کا گرو نہیں بلکہ اب وہ میری گرو ہے تو تمہیں یقیناً ہنسی تو آئے گی۔"

"ہنسوں گا تو نہیں پنڈت جی! پر بات نہ سمجھ میں آنے والی ہے۔"

"ہاں۔ یہ بتاؤ۔ اسے ودیا کس نے دی ہے۔"

"پنڈت جی! دینے والے تو آپ ہی ہیں اور کون اسے ودیا دے گا۔"

"میں نہیں مانتا۔ ہری رام میں نہیں مانتا۔ وہ تو بہت عجیب ہے بہت ہی عجیب ہے۔ بھگوان کی سوگندھ آج تو اس نے درس کے بیچ جو ہمیں بتایا ہے۔ وہ میرے علم میں بھی نہیں تھا۔" ہری رام ایک گہری سانس لے کر خاموش ہوگیا۔ بہت دیر تک چپ رہا۔ پھر بولا۔

"پنڈت جی! بھگوان ہی جانتا ہے کہ وہ کیا ہے..... ہے تو میری اولاد لیکن آپ یقین کرو کہ اس کے جنم کے بعد سے آج تک حیرانی کے پہاڑ ٹوٹتے رہے ہیں۔ ہم پتی' پتنی' پر وہ ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آئی۔"

"تعجب کی بات ہے۔ چلو خیر تم ٹھیک کہتے ہو۔ پر میں ایک بات تم سے کہوں۔ ہری رام' اس کے اندر جو بھی عجیب بات ہو۔ وہ دوسروں کو بتانے کی نہیں ہے۔ اس کی کہانی کسی کو نہ سنانا۔ ورنہ لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔"

"وہ کیسے پنڈت جی۔" ہری رام نے کسی قدر تشویش سے کہا لیکن رامشنکر نے اس سے آگے کوئی اور بات نہیں بتائی تھی۔

اور اسی رات ہری رام نے چندر مکھ سے

پوچھا۔

"چندر مکھ بیٹا ہم تیرے ماتا۔ پتا ہیں تجھ سے جو کچھ پوچھیں گے بتائے گی ہمیں۔"

"ہاں۔ کیوں نہیں۔ پتا جی۔ آپ کی پتری ہوں میں۔"

"بیٹا۔ تیرے اندر بہت سی عجیب باتیں ہیں۔ کچھ بتائے گی اس بارے میں کہ وہ عجیب باتیں تو نے کہاں سے سیکھیں۔" چندر مکھ اس وقت بڑی سنجیدگی سے ہری رام کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے بھاری لہجے میں کہا۔

"میں۔ نہیں جانتی پتا جی! میں بالکل نہیں جانتی۔ بھگوان کی سوگندھ جب میں آپ کے اور ماتا جی کے چرنوں میں ہوتی ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے میں ایک عام سی لڑکی ہوں کچھ بھی نہیں معلوم مجھ سنسار کے بارے میں۔ بس جتنا آپ لوگ بتا دیتے ہیں لیکن پھر کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مجھے یوں لگتا جیسے ادھر ادھر اپسرائیں ناچ رہی ہوں۔ میرا من ڈولنے لگتا ہے اور اس سے میں بڑا عجیب سا محسوس کرتی ہوں اور کچھ نہیں۔" اس سے چندر مکھ بالکل معصوم اور سادہ انداز میں یہ باتیں بتا رہی تھی اور پنڈت ہری رام گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

پھر اسی رات بہت دن کے بعد وہ اپنے بلند و بالا گھر کی چھت پر پہنچے' اب اس گھر کی ہر شے بدل گئی تھی۔ بیچاری پربھاکری بہت نیچے پہنچ گئی تھی۔ ایسی جگہ سے اس کو دیکھ کر مسکرایا بھی نہیں جایا جاسکتا تھا۔ نہ ہی اس کی رسوئی یہاں سے نظر آتی تھی۔ پنڈت جی بہت اوپر چلے گئے تھے۔ مگر آج انہوں نے بہت عرصے بعد ستاروں سے رابطہ قائم کیا۔ بہت دیر تک وہ اپنی ودیا کے مطابق ستاروں میں وہ ستارہ تلاش کرتے رہے جو انہیں بہت عجیب محسوس ہوا تھا اور وہ انہوں نے اس لمحے دیکھا تھا۔ جب چندر مکھ نے جنم لیا تھا۔

نجانے کتنی کوششوں کے بعد وہ ستارہ تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ پھر انہوں نے پوتھی نکال کر سامنے رکھی اور ستاروں سے معلومات حاصل کرنے لگے۔

☆☆

بہت سی عجیب باتیں ہوئی تھیں۔ اس دوران طرح طرح کے کھیل ہوئے تھے جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ پنڈت ہری رام خود بھی اس بارے میں کچھ نہیں سمجھ سکے تھے۔ سترہ سال کی ہوچکی تھی۔ چندر مکھ..... اور چندر مکھ ہی تھی۔

ہری رام اسی مکان میں تھے۔ پرکھوں کی زمین چھوڑنے کا من نہیں چاہا تھا۔ ورنہ دولت کے انبار تھے ان کے پاس کیا نہیں تھا جو ان کے پاس نہ آگیا ہو۔ وہ کیسے کیسے آگیا ہو۔ چودہ سال کی تھی۔ اس لمحے چندر مکھ کہ ایک رات دونوں پتی پتنی کی آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے دیکھا کہ باہر آنگن میں روشنی ہورہی ہے۔ یہ روشنی کیسی ہے اسے دیکھنے کے لیے انہوں نے اپنی کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکا تو انہیں ایک عجیب ہی منظر نظر آیا۔ باہر سے اندر تک سجا جمی ہوئی تھی اور پھر اتنی خوبصورت لڑکیاں وہاں موجود تھیں کہ ان کو دیکھ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتیں۔ خوبصورت روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور ان کے بیچ میں چندر مکھ اپنا گھاگرہ پھیلائے بیٹھی ہوئی تھی۔

وہ دلہن بنی ہوئی تھی اور وہ نو اپسرائیں اس کی سیوا کررہی تھیں۔ پنڈت جی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ چندر مکھ کے اردگرد چھوٹے چھوٹے برتن رکھے ہوئے تھے۔ جن میں سے کوئی چیز چمک رہی تھی۔ پھر ان اپسراؤں نے چندر مکھ کو سجایا بنایا اور اس کے بعد وہ رقص کرنے لگیں۔

ایسا حسین رقص تھا ان کا کہ دیکھنے والے کی نگاہیں نہ ٹھہر سکیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھیں۔ انہوں نے چندر مکھ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور پھر اسے ایک طرف لے گئیں۔

"ہے رام۔ ہے رام۔ ہے رام۔ ای کا ہوت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہے۔" کوشلیا کے منہ سے نکلا اور پنڈت جی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر وہ آہستہ سے بولے۔ "یہ اپسرائیں ہیں۔ بھگوان کی سوگندھ یہ اپسرائیں ہیں۔ یہ راجہ اندر کے استھان سے نیچے اتری ہیں۔"

"ہائے تو کیا وہ میری چندرکھ کو آکاش پر لے گئیں۔"

"بھگ۔ بھگ۔ بھگوان ہی جانے۔ اندر آجا تو۔"

"ارے اسے تو دیکھوں۔ آخر ہماری اولاد ہے وہ۔"

"مت دیکھ اسے کوشلیا۔ میرا من کہتا ہے کہ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ وہ کہیں نہیں جائے گی یہاں سے....." اور وہ سچ تھا کہ چندرکھ صبح کو اپنی بستر ہی پر ملی تھی۔ اس کی خواب گاہ ان کی خوابگاہ سے ملحق تھی اور اسے بہت خوبصورت بنا دیا گیا تھا چندرکھ اپنے چھپر کھٹ پر لیٹی ہوئی تھی لیکن اس کے آس پاس وہ برتن رکھے ہوئے تھے۔ جن میں سے رات کو روشنی چمک رہی تھی اور ان برتنوں میں سونے کی اشرفیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دونوں پتی پتنی نے اپنے سر پکڑ لیے۔ یہ ایک واقعہ نہیں تھا۔ سترہ سال کی عمر تک ایسے کوئی واقعہ ہوئے جو نا قابل یقین تھے چندرکھ کا ایک الگ ہی انداز تھا اور باپ کی تو خیر جو کیفیت تھی سو تھی لیکن کچے ذہن کی مالک کوشلیا بیٹی سے ذہنی طور پر دور ہو گئی تھی۔

وہ اسے ایک دیوی کی طرح ماننے لگی تھی اور وہ محبت وہ انداز نہیں رہا تھا۔ اس کا جو بیٹیوں کے ساتھ ماں کا ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ وقت گزرتا رہا۔ چندرکھ کے معاملات اسی طرح پراسرار تھے۔ بہت سی بار انہوں نے گھر کی چھت پر عجیب قسم کے ہنگامے محسوس کئے تھے۔ پہلی بار پنڈت جی چھت پر دھماکوں کی آوازیں سن کر سیڑھیوں کے ذریعے اوپر پہنچ گئے تھے لیکن اوپر پہنچ کر انہوں نے جو منظر دیکھا۔ اس نے انہیں گنگ کر دیا۔ اوپر کا تو ماحول ہی بدلا ہوا تھا۔ چندرکھ کسی رانی کی طرح ایک زرنگار کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اور بہت سے لوگ اس کے ارد گرد کھڑے ہوئے تھے جو زرق برق لباس میں ملبوس تھے۔ کچھ ایسی صورت حال تھی کہ پنڈت جی کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے۔ نقصان بھی کوئی نہیں ہوا تھا۔ انہیں آج تک اس لیے انہوں نے کسی بھی بات شہرت ضروری نہیں سمجھی۔ البتہ پھر ایک دن ایک عجیب ہی منظر سامنے آیا اور ماتا پتا بہت عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گئے۔ اس دن ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ آسمان ابر آلود تھا اور چاروں طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔

ایسی صورت میں باہر کچھ گھنٹیوں جیسی آوازیں ابھریں تو پنڈت جی چونک پڑے یہ آوازیں کچھ اجنبی اجنبی سی تھیں۔ ان کی آنکھ کھل گئی تب انہوں نے چندرکھ کو دیکھا جو چوروں کی طرح اپنے کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔ بہر طور وہ باپ تھے۔ خود بھی شوقین مزاج تھے۔ بیٹی جوان ہو گئی تھی۔ اس لیے انہیں کچھ عجیب سا احساس ہوا۔

کوشلیا اندر سو رہی تھی لیکن پنڈت جی نے اسے نہیں جگایا بلکہ صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے چندرکھ کے پیچھے پیچھے گھر سے باہر نکل آئے۔ باہر نکل کر انہوں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ بادلوں کی چھاؤں میں ایک گھوڑا گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔

گھوڑا گاڑی میں سفید رنگ کے گھوڑے جتے ہوئے تھے ایک کوچوان نیچے کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے ہی چندرکھ آگے بڑھی۔ کوچوان نے گھوڑا گاڑی میں سے ایک چوکی نما چیز نکالی۔ جو چمک رہی تھی۔ غالباً اس میں جواہرات جڑے ہوئے تھے اس کے ساتھ ہی اس نے بگھی کا پردہ ہٹا دیا۔ اس کے بعد چندرکھ نے بڑے ناز و انداز کے ساتھ بگھی میں قدم رکھا تو اندر سے دو خوبصورت سی عورتیں باہر نکل آئیں۔ انہوں نے چندرکھ کو سہارا دے کر بگھی میں سوار کر دیا اور اس کے بعد خود بھی اندر بیٹھ گئیں۔

ہری رام پر کچھ ایسی کیفیت سوار ہوئی کہ وہ جلدی سے آگے بڑھا۔

اور بگھی کے پچھلے حصے میں لگے ہوئے اسٹینڈ جیسی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اس نے مضبوطی سے بگھی کے دونوں سرے پکڑ لیے تھے۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ چندرکھ کہاں جا رہی ہے۔ کہیں اس کا کردار تو خراب نہیں ہو گیا۔ حسن و جمال میں تو وہ بے مثال تھی ہی' ہو سکتا ہے کہیں سے لاگ ڈاگ ہو گئی ہو۔ دل میں بہت سے بچی بات یہ کہ چندرکھ سے کوئی ذہنی رابطہ نہیں رہا تھا۔ جو والدین اور اولاد کے درمیان ہوتا ہے۔ حالانکہ چندرکھی سے انہیں دنیا کی ہر چیز حاصل ہو گئی تھی لیکن پھر کم از کم تھوڑی سی کشش تو تھی ہی۔

گھوڑا گاڑی سفر کرتی رہی اور اس کے بعد شہری آبادی پیچھے رہ گئی۔ ہری رام کے اوسان خطا ہونے لگے تھے۔ بیٹی کہاں جا رہی ہے۔ چندرکھ پہلی بار اس طرح کسی گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر سفر کے لیے نکلی ہے یا اس سے پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔ ان کے ذہن میں لاکھوں وسوسے تھے اور وہ گہرے انداز میں سوچ رہے تھے۔

گھوڑا گاڑی شہری آبادی سے باہر نکل آئی۔ پھر اچانک ہری رام کو ایک انوکھا احساس ہوا۔ اسے محسوس ہوا جیسے گھوڑے زمین چھوڑتے جا رہے ہوں۔ اس نے نیچے نگاہ ڈالی تو واقعی زمین نیچے ہوتی جا رہی تھی۔

"ارے دیارے دیا۔ یہ کیا ہوا۔" ہری رام کے منہ سے نکلا اور اس نے مضبوطی سے گھوڑا گاڑی کے دونوں سمت کے لوہے کے بنس پکڑ لیے جو اسے گرنے سے بچا سکتے تھے۔

زمین نیچے سے نیچے ہوتی جا رہی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے گھوڑے ہوا میں اڑ رہے ہوں۔ اڑتے ہوئے گھوڑوں کا یہ سفر بہت تیز ہوتا جا رہا تھا۔ پھر ہری رام نے اپنے ارد گرد بادلوں کی نمی محسوس کی وہ لوگ اتنی بلندی پر پہنچ گئے تھے اور گھوڑا گاڑی اتنی اونچی اڑ رہی تھی کہ نم بادلوں نے اسے ڈھک لیا تھا۔

خوف و دہشت کے مارے ہری رام کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے یہ سب کیا ہو رہا ہے اس نے سوچا کہ شاید وہ کوئی سپنا دیکھ رہا مگر یہ سپنا تو نہیں تھا۔ اگر بنس ذرا بھی چھوڑتا تو لاکھوں فٹ گہرائیوں میں جا گرتا' اسے چکر آ رہے تھے لیکن زندگی بچانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ بنس مضبوطی سے پکڑے رہے۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ گھوڑا گاڑی اتر رہی ہو اور پھر اس نے اس زمین کو بھی محسوس کر لیا۔ جس پر گھوڑا گاڑی کے پہیے ٹک گئے تھے۔ مگر فضاء میں اتنا اونچا بلند ہونے کے بعد کسی زمین کا تصور بھی بڑا حیرتناک تھا۔

تاہم حیرتناک تو سب کچھ ہی تھا۔ اس لمحے سے جب سے چندرکھ اس سنسار میں آئی تھی۔

ہری رام نے سوچا کہ کہیں اب اسے دیکھ نہ لیا جائے۔ کیا کروں کیا نہ کروں لیکن عقل نے اسے سمجھایا۔ گھوڑا گاڑی سے دور رہنا خطرناک ہی ہوگا۔ کیونکہ پھر وہ وہاں نہیں جا سکتا۔ جہاں سے یہاں تک کا سفر کیا ہے۔ پھر اس نے کچھ عجیب و غریب مناظر دیکھے۔ شور کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ قرب و جوار میں دونوں سمت بڑے بڑے خوبصورت درخت لگے ہوئے تھے۔ جن میں پھول کھلے ہوئے تھے اور ان پھولوں کی خوشبو فضاء میں بلند ہو رہی تھی۔

گھوڑا گاڑی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آخر کار ایک جگہ رک گئی۔ وہاں بھی بڑے بڑے درختوں کے جھنڈ تھے۔ ہری رام نے سوچا کہ اسے اب کم از کم گھوڑا گاڑی سے تو اتر جانا چاہیے۔ اگر کوئی پیچھے سے آ گیا۔ بلکہ یہاں لوگ موجود تھا۔ ممکن ہے اسے کسی نے پیچھے بیٹھے ہوئے بھی دیکھا ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی مشکل کا شکار ہو جائے۔

درختوں کے یہ جھنڈ بڑے اچھے تھے۔ وہ جلدی سے گھوڑا گاڑی کے تختے سے نیچے اترا اور درختوں کے جھنڈ میں گھس گیا۔ بڑے خوشبو دار اور پھولوں والے درخت تھے اس نے تھوڑا سا سفر آگے کا کیا اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر اک جگہ رک کر گھوڑا گاڑی کا منظر دیکھنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ گھوڑا گاڑی میں بیٹھنے والی بالیاں جو زرق برق لباس میں انہیں کی طرح حسین اور چندر مکھی نیچے اتر آئی تھی۔ پھر وہ ان عورتوں کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔

ہری رام بھی اس کا پیچھا کرنے لگا۔ اس نے درختوں کے جھنڈ میں اپنے آپ کو چھپا لیا تھا۔ ورنہ یقیناً اس کو دیکھ لیا جاتا۔ جدھر سے چندر مکھی گزر رہی تھی۔ وہاں کھڑے ہوئے لوگ گھٹنوں کے بل بیٹھتے جا رہے تھے۔ انہوں نے گردنیں جھکا رکھی تھیں یہ سفر کوئی دو سو گز تک جاری رہا۔ اس کے بعد ایک خوبصورت مہکے ہوئے حسین مناظر سے لدے ہوئے قطعے پر بچھے ہوئے زرنگار تخت پر چندر مکھ جا بیٹھی' ہری رام کو چکر آ رہا تھا۔ کئی بار اس نے اپنے بدن کو نوچ نوچ کر دیکھا تھا کہ کہیں وہ کوئی عجیب و غریب خواب تو نہیں دیکھ رہا لیکن وہ سب خواب نہیں تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ تمام مناظر دیکھتا رہا۔ پھر بڑے بڑے سادھو سنت' جن کے بدن کھلے ہوئے تھے۔ لمبی لمبی داڑھیاں سینوں پر بکھری ہوئی تھیں آئے اور آنے کے بعد چندر مکھ کے ارد گرد کھڑی ہو گئے۔ وہ کچھ اشلوک پڑھ رہے تھے اور چندر مکھ کے ارد گرد ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔ پھر ایک اور گوادری قسم کا سادھو آیا اور سب کے سب اس کے سواگت کے لیے کھڑے ہوئے۔ اس نے ایک خوبصورت ہار جو شاید سچے موتیوں سے بنا ہوا تھا۔ چندر مکھ کے گلے میں ڈالا اور جھک کر اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ اس کے بعد رقص و سرور کی محفل جم گئی۔ اپسرائیں آ کر کمال فن کا مظاہرہ کر رہی تھیں اور چندر مکھ مسکراتی نگاہوں سے ان سب کو دیکھ رہی تھی۔ ہری رام کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہ لڑکی ہے جو اس کے گھر میں پیدا ہوئی ہے۔

وہ انتہائی حیران تھا اور تعجب بھری نگاہوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ کچھ لمحے کے لیے وہ بالکل کھو سا گیا تھا۔ پہلے بھی چندر مکھ اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن اب اور الجھ گئی تھی۔ چنانچہ کافی دیر تک وہ وہیں کھڑا چندر مکھ کو دیکھتا رہا۔ رقص و سرور کی محفلیں جاری رہیں۔ چندر مکھ کے پیروں میں پھولوں کے ڈھیر لگا دیئے گئے تھے۔ اتنا احترام و اہتمام ہو رہا تھا اس کا کہ ہری رام کو چکر آ رہے تھے۔

کافی دیر تک یہ ہنگامہ جاری رہا۔ پھر چندر مکھ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ ہری رام نے محسوس کیا کہ وہ واپس اسی گھوڑا گاڑی کی طرح آ رہی ہے اور تھوڑی دیر کے بعد داسیوں نے اسے گھوڑا گاڑی میں بٹھا دیا۔ ہری رام کو خوف ہوا کہ کہیں ایک انوکھی اور عجیب جگہ نہ رہ جائے۔ چنانچہ ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر وہ جلدی سے دوڑا اور گھوڑا گاڑی کے اسی پچھلے حصے میں جا بیٹھا جس میں بیٹھ کر وہ یہاں تک آیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد گھوڑا گاڑی آگے بڑھ گئی۔ تھوڑا سا زمین پر چلی اور اس کے بعد ہری رام نے وہی منظر دیکھا۔ جیسے وہ بہت بلندیوں سے نیچے جا رہی ہو۔ ہری رام کا کلیجہ الٹا آ رہا تھا لیکن وہ اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جیتے جاگتے اس نے یہ سارا منظر دیکھا ہے گھوڑا گاڑی سفر کرتی رہی اور تھوڑی دیر بعد زمین پر بنے ہوئے مکانات کھلونوں کی مانند نظر آنے لگے۔

گھوڑا گاڑی آہستہ آہستہ نیچے اتر رہی تھی اور ہری رام کا کلیجہ اچھل کر حلق میں آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ تھوڑی دیر بعد گھوڑا گاڑی زمین پر اتر گئی اور چلتی ہوئی ہری رام کے گھر کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ چندر مکھ نیچے اتری اور اس کے بعد گھر کے اندر چلی گئی۔ گھوڑا گاڑی واپس چلی گئی تو ہری رام بھی گھر کے دروازے سے اندر داخل ہو گیا تھا لیکن دوسری صبح اسے تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔ کوشلیا نے اس کا ماتھا چھو کر دیکھا تو چیخ پڑی۔

"ہرے رام۔ ہرے رام۔ ای کا ہوت رہے۔ تم کا تو بہت تیج بکھار چڑھت رہن۔"

"ہاں۔ میں مر رہا ہوں۔ کوشلیا میں مر رہا ہوں۔"

"ہے' بھگون۔ اس عمر میں آ کر مر رہے ہو۔ جب میرا دوسرا' وواہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ارے اب تو جیوت رہو۔ تم کا ہماری قسم ہری۔" ہری وہ بڑے پیار سے کہا کرتی تھی اور جب بھی وہ ہری کہا کرتی تھی۔ ہری رام کے دل میں مسرت کی لہریں دوڑنے لگتی تھیں۔ اس نے کوشلیا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بیٹھ جا کوشل! اگر تجھے ایک کہانی سناؤں تو تو مجھے پاگل تو نہیں سمجھے گی۔"

"سارا جیون ہم کا کہانیاں ہی سناوت رہو۔ ہم تم کا پاگل سمجھے گا۔"

"جو کچھ میں کہہ رہا ہوں۔ کوشلیا۔ غور سے سن۔"

"ارے ہاں۔ سنت تو رہن۔ بولو۔ گا کہت ہو۔"

"کوشلیا میں رات کو اندر کے اکھاڑے گیا تھا۔" ہری رام نے کہا اور کوشلیا نے ایک بار پھر اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا کہ بخار کتنا تیز ہے۔ پھر وہ بولی۔

"تاپ اتنا ہی تیز ہے کہ تم اندر کے اکھاڑے کیا۔ پتہ نہیں کہاں کہاں چلے گئے ہو۔"

"میں نے کہا تھا ناں تجھ سے کہ مجھے پاگل مت سمجھنا۔" ہری رام غصے سے منہ بنا کر بولا۔

"اچھا پھر کا ہوی ہے۔ اندر مہاراج ملے تم کا۔" کوشلیا نے کہا۔

"تجھے پتہ ہے۔ ہوا کیا۔"

"ہاں۔ ہاں۔ بولو۔" اور جواب میں ہری رام اسے رات کی کہانی سنانے لگا۔ کوشلیا اسے تشویش بھر نگاہوں سے دیکھ رہی تھی پھر اس نے کہا۔

"تم تھوڑا رکو۔ ہم کٹورا کا پانی لے آ ہی ہے۔ کپڑے کی پٹیاں پانی کا بھگو کے تو ہا کھوپڑیا پہ رکھت رہن تو اندر مہاراج بہت دور چلے جائیں گے۔"

"ایک لپڑ ماروں گا تو تھوتھڑا ادھر کا ادھر ہو جائے گا۔ ہم جو بتا رہے ہیں تجھے جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"نہ بابا نہ۔ تم تو بالکل سچ بولت رہو۔" اچانک ہی ہری رام کو کچھ یاد آیا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کوشلیا گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

"گاٹ کھاوت ہوگا۔" اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"اٹھ میرے ساتھ چل۔"

"ہائے۔ دیا۔ ہائے دیا۔ کی ہوت رہی ہمارے ہریے کو۔" کوشلیا درد بھرے لہجے میں بولی لیکن ہری رام اس کا بازو پکڑے ہوئے اس کمرے میں آیا۔ جہاں چندر مکھ سو رہی تھی۔ چندر مکھ گھر کے لباس میں ملبوس تھی لیکن حسن تھا کہ انگ انگ سے پھوٹا پڑ رہا تھا۔ وہ مست نیند سو رہی تھی۔ ہری رام اس پر جھکا اور پھر اچانک ہی اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

"یہ دیکھ۔ یہ دیکھ۔ یہ کیا ہے۔" اس نے چندر مکھ کے گلے میں پڑے ہوئے سچے موتیوں کے ہار کی طرف اشارہ کر کے کہا اور کوشلیا اسے دیکھنے لگی۔

"ہاں۔ بول۔ موتیوں کا یہ ہار کیا تیرا چاچا لے کر آیا تھا۔" چندر مکھ کے گلے میں پڑے ہوئے سچے موتیوں کے ہار کی طرف اشارہ کر کے کہا اور کوشلیا اسے دیکھنے لگی۔

"ہاں۔ بول۔ موتیوں کا یہ ہار کیا تیرا چاچا لے کر آیا تھا۔ چندر مکھ کے لیے۔"

"ہار تو نیا لگے تھے۔ پہلے کبھی نا ہی دیکھا۔"

"ہاں۔ اب بول پاگل ہم ہیں کہ تو۔"

"اسی ہار کو دیکھ کر پاگل ہونے یا نہ ہونے کی کا بات رہے۔"

"یہ اندر مہاراج کے اکھاڑے میں ڈالا تھا۔"

"ارے تم کا۔ کا ہوی ہے۔ اے بھگون ہماری پتی کو اچھا کر دی ہے۔"

"اس ہار کو دیکھ کر بھی تو یہ بکواس کر رہی ہے۔"

"ہار کہاں سے آیا۔"

"کہاں ناں۔ سب کچھ میری آنکھوں کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سامنے ہوا۔" ہری رام نے کہا اور پھر غصے سے کوشلیا کی چوٹی پکڑ کر بولا۔ "اور تو مجھے پاگل سمجھے جا رہی ہے اور اچھا یہ بتا۔ آج تک جو کچھ ہوا ہے۔ وہ ایسا نہیں ہوا ہے جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں۔"

"ہاں۔ ہو ہی تو رہے۔" کوشلیا پر خیال انداز میں گردن ہلاتی ہوئی بولی۔

☆☆

ہری رام کو اب نہ تو جیوتش ودیا کی ضرورت تھی۔ نہ وہ ستاروں کا کھیل کھیلتے تھے۔ دولت کے انبار پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بھلا کیا ضرورت تھی لیکن پھر بھی اپنی حیثیت برقرار رکھنے کے لیے کبھی کبھی وہ لوگوں کے کام آجاتے تھے اگر کوئی ان سے شادی بیاہ کی مہورت نکلواتا اور وہ مہورت نکلوانے کے لیے تیار ہو جاتے تو سمجھو اس سے بڑا شبھ کام اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ پنڈت ہری رام کا بہت ہی پرانا جاننے والا کشن داس اپنے بیٹے کا مہورت نکلوانے کے لیے ہری رام کے پاس آیا اور ان کے چرنوں کو چھو کر بولا۔

"ہری رام جی مہاراج! سچی بات تو یہ ہے کہ بڑی مشکل سے آپ کے پاس آنے کی ہمت کر سکا ہوں۔ یہ میرا بیٹا اندر راج ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ اس کی وداہ کی مہورت آپ نکالیں اور جلدی نکال دیں۔ میرا آپ سے جو سنجیدہ ہے اگر آپ کو یاد ہو۔"

"ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں کشن داس بڑے پرانے متر ہو تم ہمارے چلو۔ ٹھیک ہے ہم مہورت نکالتے ہیں۔ کب کی مہورت چاہتے ہو۔"

"جتنی جلدی ممکن ہو۔ مہاراج۔" اندر راج نے بے صبری سے کہا اور ہری رام جی پوتھی لے کر مہورت نکالنے بیٹھ گئے۔ وہ بہت دیر تک حساب کتاب لگاتے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا۔

"اگلے منگل وار کو جو بھی تاریخ ہو۔ وہ لگن کے لیے طے کر لو۔ اچھے دن ہیں۔"

"نہیں پتا جی! نہیں ایسا نہ کریں۔ بیچارہ اندر راج آپ کے متر کا بیٹا ہے اسے دکھ کا شکار نہ کرو۔"

دروازے سے چندر مکھ کی آواز سنائی دی اور وہ مسکراتی ہوئی اندر آ گئی۔ کشن داس اور اندر راج، چندر مکھ کو دیکھ کر سکتے کے سے عالم میں رہ گئے تھے۔ چندر مکھ کو اتنا قریب سے انہوں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اندر راج تو پتھرا سا گیا تھا۔ ہری رام نے کہا۔

"کیوں ری۔ کیا اگلے منگل وار کی تاریخ ٹھیک نہیں ہے۔"

"نہیں۔ پتا جی نہیں۔ ان دونوں کی تو کنڈلیاں ہی نہیں ملتیں، لڑکی کا نام شاید کسم ہے کیوں۔ کشن داس چاچا جی۔"

"اوں۔ ہاں۔ ہاں۔" کشن داس جیسے سوتے سے جاگ پڑا اندر راج نے بھی چھٹی چھٹی نگاہوں سے چندر مکھ کو دیکھا تھا۔

"بڑی تم کی بات ہے۔ مہاراج کشن داس۔ وہ جس کی بھی پتری ہے ان کے لیے بھی اور آپ کے لیے بھی اندر راج تھوڑا سے بتا لے۔ ایک ترکیب بتاتی ہوں تمہیں۔ بس کہہ دینا کہ ابھی راہی اور جوتی ایک دوسرے سے دشمنی کر رہے ہیں۔ تاریخیں نہیں مل رہیں۔ اگلے ماہ کی تاریخ طے کر لی جائے۔"

"پر کیوں۔ میری سندر بیٹا۔" کشن داس نے اب اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔

"اس لیے چاچا جی! مہاراج کے بیچاری کسم کا جیون صرف چار روز کا باقی رہ گیا ہے۔ پانچویں روز وہ مر جائے گی۔" کشن داس اور اندر راج کے علاوہ خود ہری رام بھی اچھل پڑا تھا۔

"کک۔ کک..... کیا کہہ رہی ہو۔ بیٹا۔"

"ہاں۔ مہاراج۔ وہ بچھو کے کاٹے سے مر جائے گی۔ بچھوا اسے کاٹ لے گا۔"

"ب۔ ب۔ ب۔ ب بچھو۔ ب بچھو کہاں سے آئے گا۔"

"اب یہ بھی میں ہی بتاؤں۔ بس دیکھ لو۔ سوچ لو جو تمہارا من چاہے کرو۔" یہ کہہ کر چندر مکھ اندر واپس چلی گئی۔ کشن داس اور اندر راج کے علاوہ ہری رام بھی پتھرا کر رہ گیا تھا۔

بہت دیر تک وہ خاموش بیٹھے ایک دوسرے کی صورت دیکھتے رہے پھر کشن داس چونکا۔ اس نے آنکھیں بھینچ بھینچ کر کئی بار آنکھیں کھولیں اور پھر بولا۔

"ایک بات بتاؤ ہری رام۔"

"جی۔ کشن جی مہاراج۔"

"یہ کیا کہہ گئی ہے۔"

"بھگوان ہی جانے۔ کیا کہا ہے اور کیا نہیں کہا ہے۔"

"تو تم کیا کہتے ہو۔" کشن داس نے سوال کیا اور ہری رام نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلا دی۔ اسے وہ سفر یاد تھا جو ہواؤں کے دوش پر کیا گیا تھا۔ کسی کو بتاتا تو سچ مچ لوگ اسے پاگل ہی سمجھتے۔ اس لیے اس نے اپنی دھرم پتنی کے سوا کسی کو یہ بات نہیں بتائی تھی۔ کوشلیا بھی اس بات پر چونکی تھی کہ سچے موتیوں کا وہ ہار کہاں سے چندر مکھ کے گلے میں آیا اور پھر بات آج ہی کی نہیں تھی۔ جس دن سے چندر مکھ پیدا ہوئی تھی اس دن کے بعد سے آج تک طرح طرح کے انوکھے واقعات ہوتے رہے تھے۔ ظاہر بات ہے کچھ نہ کچھ تو تھا۔ چنانچہ اس وقت چندر مکھ جو کچھ کہہ کر گئی تھی۔ وہ قابل غور تھا۔ ہری رام نے سمجھداری سے کام لیا اور بولا۔

"سنو۔ کشن داس مہاراج۔ وداہ تو تمہیں کرنا ہی ہے اپنے بیٹے کا..... اور ظاہر ہے کہ اس کی کوئی وجہ ضرور ہو گی۔"

"ارے مکھی چند میرا بچپن کا متر ہے اس کی اکیلی ہی بیٹی ہے۔"

"ہوں۔ ایک کام کر لو۔ سچ کہا ہے چندر مکھ نے کوئی دھوکے کی بات وہنی ہی نہیں چاہیے۔ تم مکھی چند کو بتا دو کہ ابھی صحیح مہورت نہیں نکل رہا۔ اگر اس نے بھی کہیں سے مہورت نکلوا لیا ہے تو بیٹے والے تم ہو۔ جو تم چاہو گے وہی ہو گا۔ مہینہ سوا مہینہ نکال لو۔ اگر چندر مکھ کی بات غلط نکلتی ہے تو پھر کوئی بات نہیں مہینے بھر بعد سہی..... اور صحیح نکلتی ہے تو معاف کرنا یہ ٹھیک تو نہیں ہے کہ بیٹا وداہ ہوتے ہی رنڈوا ہو جائے گا۔"

کشن داس نے اپنے نوجوان بیٹے کی طرف دیکھا۔ اسے یہ بات معلوم تھی کہ اندر راج کسم سے پریم کرتا ہے اور اس وداہ کے لیے بے چین ہے لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اندر راج کے چہرے پر کسی طرح غم کے آثار نہیں تھے۔ اور اس کی نگاہیں اس دروازے سے لگی ہوئی تھیں۔ جس سے چندر مکھ واپس اندر گئی تھی۔

کشن داس نے پوچھا۔ "کیوں اندر! کیا کہتے ہو۔"

"ایں..... ہاں۔ ایں..... ٹھیک ہے پتا جی ٹھیک ہے۔" اندر راج نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

"پنڈت جی آپ سے کچھ اور بات کرنا چاہتا ہوں۔" کشن داس بولا۔

"ہاں۔ ہاں۔ بولو۔ کشن۔ میں نے کہا ناں تم میرے بچپن کے دوست ہو۔ بولو۔ بولو۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"پنڈت جی مکھی چند میرا اتنا ہی پرانا دوست ہے جتنے آپ اور کسم اس کی اکلوتی بیٹی ہے۔ آپ آگیا دو تو میں مکھی چند کو بتا دوں۔ ہو سکتا ہے وہ کسی طرح اپنی بیٹی کا بچاؤ کرے۔"

"یہ تو بڑا اچھا کام ہے۔ مگر وہ کہیں تم سے بد دل نہ ہو جائے۔"

"متر ہے میرا۔ سمجھاؤں گا اسے مان جائے تو اچھا ہے۔" کشن داس نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔" تھوڑی دیر کے بعد دونوں باپ بیٹے ہری رام کے گھر سے رخصت ہو گئے۔ کشن داس نے اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بیٹے سے کہا۔

"اندر راج کیا کہتے ہو تم۔ کیا تمہیں اس لڑکی کی باتوں پر یقین ہے۔"

"ایک بات کہوں پتا جی! ہری رام جی آپ کے بچپن کے متر ہیں۔ ناں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں تو پھر۔"

"پتا جی! آپ کو بھگوان کی سوگندھ۔ میرا یہ کام کردیں۔"

"کیا۔" کشن داس حیرت سے بولا۔

"چندر مکھ ہے ناں اس لڑکی کا نام۔ ہری رام کی لڑکی کا۔"

"ہاں۔ تو پھر۔"

"اس سے میرا بیاہ کرادیں۔ پتا جی آپ کے چرن چھو کر کہتا ہوں۔ جیون بھر آپ کا یہ احسان نہیں بھولوں گا۔"

"ارے۔ ارے۔ کل تک تو تو کسم پر مرتا تھا۔ آج تیرا خیال ہی بدل گیا۔"

"دو باتیں ہیں پتا جی۔ اگر چندر مکھ کی بات سچ نکلی تو آپ خود سوچ لیجئے کہ میرا جیون کیا ہوگا اور اگر سچ نہ بھی نکلے تو کوئی چنتا کی بات نہیں ہے۔ میں چندر مکھ کے بغیر نہیں جی سکوں گا۔"

"کل کوئی اور نظر آجائے تو اس کے بغیر نہیں جیئے گا تو..... ہیں۔" کشن داس نے کہا۔

"پتا جی۔ میں..... میں....." اندر راج نے سچ مچ باپ کے پاؤں پکڑ لیے۔

"ابے سیدھا تو ہو کر بیٹھ۔ یہ ساری باتیں بعد میں کروں گا۔ پہلے میں ذرا مکھی چند سے ملاقات کرلوں۔" کشن داس نے اندر راج کو سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ اسے بڑا دکھ تھا۔ کسم کو اگر کچھ ہوگیا تو مکھی چند کی تو دنیا ہی تاریک ہوجائے گی۔ بہر حال ادھر اندر راج کے دل پر چندر مکھ نے قبضہ جمالیا تھا۔ تو ادھر کشن داس اپنے دوست مکھی چند کے لیے پریشان تھا۔ مکھی چند کے پاس جا کر اس نے یہ ہی کہا کہ پنڈت جی نے کہا ہے کہ ابھی سے نہیں آیا ہے کہ ان دونوں کا بیاہ کردیا جائے ابھی مہورت نہیں نکالا جاسکتا۔ کسم سے بھی ملاقات ہوئی تر و تازہ سی حسین سی لڑکی کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیا سے کیا ہوجائے گا۔ یہاں تک چندر مکھ نے کسی بچھو کے کاٹنے کی پیشن گوئی کی تھی۔ اس کے بارے میں فوری طور پر کشن داس کو سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا کرے۔ پھر بھی اس نے کہا۔

"ایک عجیب سا سپنا دیکھا ہے مکھی چند۔ تم میرے دوست ہو اگر تم میری بات مان لو تو میں تمہارا احسان مانوں گا۔"

"ارے۔ ارے کیسی باتیں کرتے ہو کشن داس۔ تم بس حکم کرو۔ مجھے کیا کرنا ہے جو کہو گے کرلوں گا میرے دوست تم سے زیادہ میرے لیے کون ہوسکتا ہے۔" کشن نے کہا۔

"مکھی چند ایک سپنا دیکھا ہے میں نے' بڑا بھینکر' بڑا ہی خطرناک' اگر تم میری مان لو تو تمہیں بتاؤں' ورنہ مجھے خود شرم آتی ہے۔"

"نہیں..... نہیں بولو۔"

"میں نے دیکھا ہے کہ کسم کو ایک خوفناک بچھو نے کاٹ لیا ہے اور بھگوان نہ کرے اسے کچھ ہوگیا ہے۔"

"ارے..... ارے..... ارے..... سنا ہے' موت کا سپنا دیکھنے سے جیون بڑھتا ہے۔"

"پھر بھی میرے دوست' کسم میری امانت ہے' تم اس کی حفاظت کرو۔ تمہاری مہربانی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے' میں خیال رکھوں گا۔" لیکن مکھی چند خیال نہ رکھ سکا۔ ایک رات کسم آرام سے اپنے بستر پر سوئی تھی۔ ان کا گھر بھی ایسا نہیں تھا کہ کیڑے مکوڑوں کی آمد ہو' لیکن رات کے نہ جانے کون سے حصے میں ایک خوفناک کالا بچھو نمودار ہوا اور اس نے کسم کی ران کے پاس کاٹ لیا۔

زہر تھا کہ آگ' کسم کے منہ سے آواز تک نہ نکل سکی' گلا بند ہوگیا اور اس کے بعد اس کا بدن نیلا پڑنا شروع ہوگیا۔ وہ اپنی خواب گاہ میں ماہی بے آب کی طرح لوٹتی رہی اور لوٹتے لوٹتے اس نے دم دے دیا۔ دوسرے دن صبح جب نوکرانی اسے جگانے پہنچی' تب اس نے کسم کا نیلا بدن دیکھا اور دھاڑتی ہوئی باہر بھاگی۔

کسم کی موت کا اعلان ہوگیا' مکھی چند کو خشی

کے دورے پڑے اور اسے اسپتال پہنچا دیا گیا۔ اس کی غیر موجودگی میں ہی کسم کا کریا کرم کیا گیا تھا اور اس کریا کرم میں کشن داس بھی برابر کے شریک تھے۔ پھر دیکھنے دکھانے کے لیے اندر راج بھی آگیا تھا اور اس کے بعد بے شمار المیہ مناظر رونما ہوئے تھے لیکن سب سے زیادہ حیرانی کشن داس کو تھی۔ وہ حیران سا وہاں سے آگے بڑھ گیا اور ہری رام کے پاس پہنچ گیا۔

"ہری رام کسم مرگئی۔"

"ایں....." ہری رام کا منہ خود بھی حیرت سے پھیل گیا تھا۔

"ہاں تمہاری بیٹی کی پیشن گوئی ٹھیک ہوئی' لیکن میں تم سے ایک اور بات کرنا چاہتا ہوں ہری رام۔"

"ہاں..... کشن داس بولو۔"

"ہری رام' میرا بیٹا' اندر راج تمہاری بیٹی کو پسند کرنے لگا ہے' وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے' کیا تم میری یہ خوشی پوری کرسکتے ہو۔" ہری رام سوچ میں ڈوب گیا' اس نے کہا۔

"کشن داس جی! چندر مکھ کو تم نے دیکھ لیا۔ وہ ایک عام انسان نہیں ہے۔ بڑی دھرماتما ہے وہ اور اس کے دھرماتما ہونے کے ہزاروں راز ہیں۔ کیا بتاؤں تمہیں کہاں' کہاں سے بتاؤں۔ کشن داس جی تمہیں ایک خاص بات بتاؤں' یہ اپسرا ہے' اندر کے اکھاڑے کی اپسرا۔"

"سو تو ہے' مجھے بھی اس کا اندازہ ہے' پر تم کیا کہتے ہو' لیکن....." اس سے پہلے کہ ہری رام کچھ کہے۔ دروازے سے چندر مکھ اندر داخل ہوئی تھی۔

"کشن داس جی! میں نے پیشن گوئی کی تھی۔ بتایا تھا آپ کو کہ کسم تھوڑے دن کے بعد مرجائے گی ا ور ایسا ہی ہوا' ایک اور پیشن گوئی میں آپ سے کروں' اگر آپ کے بیٹے نے مجھ سے شادی کرلی تو ایک مہینے سے زیادہ وہ بھی جیتا نہیں رہے گا لیکن اگر اس نے میرا خیال دل سے نکال دیا تو آپ یہ سمجھ لیجیے کہ وہ بچ جائے گا اور آپ کو پتا ہے کشن داس جی! کہ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں وہ ہی سچ ہے۔"

کشن داس جی اتنے خوف زدہ ہوئے کہ ایک لمحے بھی وہاں نہیں رکے اور وہاں سے چلے گئے لیکن دن رات کی سوچوں نے آخر کار انہیں اس فیصلے پر تیار کرلیا۔

"اندر راج بیٹا! تیری خواہش تھی کہ تو انگلینڈ جائے۔ وہاں سے سیر کر کے سوئٹزر لینڈ جائے۔ اتفاق کی بات ہے کہ میرے ایک دوست نے مجھ سے بات کی تھی اور کہا تھا کہ اگر تمہارا بیٹا انگلینڈ آنا چاہتا ہے تو آجا۔ میرے پاس ایسے ذرائع موجود ہیں تو میری مان اندر راج اور تھوڑ دن کے لیے باہر چلا جا۔"

"پتا جی! ایک کام کیوں نہ کریں۔"

"ہاں..... بول۔"

"جیسا کہ میں نے آپ کو کہا کہ آپ میری شادی ہری رام کی بیٹی چندر مکھ سے کردیں' ہم دونوں ہنی مون پر چلے جائیں گے۔"

"ارے تیرے ہنی مون کی ایسی تیسی' ابھی سمے لگے گا بیٹا۔ تھوڑا سا وقت تو وہاں گزار' اس کے بعد جب تو واپس آئے گا نا تو پھر ہری رام سے بات کریں گے۔" اندر راج سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

بہت عرصے سے اس کا ملک سے باہر جانے کا دل چاہتا تھا لیکن حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اب یہ موقع مل رہا تھا وہ ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے حامی بھر لی اور یہ اس کی اور کشن داس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ چندر مکھ کی پیشن گوئی کا شکار نہیں ہوا اور باہر چلا گیا۔

لیکن چندر مکھ پر کوئی اثر نہیں تھا۔ غالباً حسن و عشق کی سرزمین سے بڑی دور وہ کسی ایسی شخصیت کا انتظار کر رہی تھی جو حسن و جمال میں یکتا ہو اور اس کی خواہشوں کے مطابق پورا ہو۔

غرض یہ کہ اس پراسرار وجود کی کہانیاں چلتی رہیں۔ ہری رام تو اب بہت بڑے اوتار نما درویشن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بن چکے تھے۔ وہ دور دور کے علاقوں میں پوجے جاتے تھے۔ کسی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ان کے پاپردہ ان کی بیٹی چندر مکھ ہے۔ بس لوگ ہری رام جی کو ہی دھرماتما سمجھنے لگے تھے اور ہمیشہ اس کی سیوا میں حاضر رہتے تھے۔ ادھر ہری رام کو اس بات کا اندازہ تھا کہ چندر مکھ ایک انوکھی شخصیت ہے۔ اس انوکھے پن کے مختلف واقعات رونما ہو چکے تھے۔ ان میں ایک نئے واقعے کا اضافہ ہو گیا تھا۔

ایک صبح چندر مکھ جاگی تو نجانے اس کے ذہن پر کیا سوار تھا۔ ہری رام سے بولی۔

"پتا جی! ہمیں بندراون چلنا ہے۔"

"ایں۔" ہری رام چونک کر بولا۔ "خیر تو ہے بیٹا۔"

"خیر ہی ہے پتا جی۔ کیوں کیا۔ بندراون ہندوستان سے باہر ہے۔"

"نہیں۔ نہیں میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ کیا کرے گی وہاں جا کر۔"

"پتا جی! ساری باتیں۔ آپ کو بتانے کے لیے تو نہیں ہوتیں۔ آپ جانا چاہیں تو چلیں ورنہ میں خود چلی جاؤں گی۔"

"تو چاہتی ہے بیٹا کہ میں تیرے ساتھ جاؤں۔"

"ہاں۔"

"ہاں تو ٹھیک ہے۔ اچھی بات ہے۔ تیری ماں کو بھی ساتھ لے لیتے ہیں۔"

"اچھا ہے۔ وہ بھی یاترا کر آئے گی۔"

"کیوں ماتا جی! چلیں گی آپ۔" کوشلیا اس طرح چونک پڑی جیسے کوئی بہت ہی اجنبی اور انوکھی بات کہی ہو۔ ماں بیٹی کے درمیان کبھی کوئی ایسا سمبندھ نہیں رہا تھا جو ماں بیٹی کے بیچ موجود ہوتا ہے۔ چندر مکھ نے خود بھی کبھی اس کی طرح توجہ نہیں دی تھی۔

بہر طور تیاریاں ہو گئیں۔ حالانکہ چندر مکھ عجیب و غریب شخصیت کی مالک تھی۔ اگر وہ جانا چاہتی تو بندراون تنہا بھی جا سکتی تھی لیکن سب سے اصول اس نے اپنائے ہوئے تھے۔ غرض یہ کہ ہری رام نے گاڑی کا بندوبست کیا۔ اب ان کے پاس دو تین کاریں تھیں۔ ایک ڈرائیور بھی رکھا ہوا تھا۔

چنانچہ وہ ڈرائیور کو ساتھ لے کر بندراون چل پڑے۔

بندراون بھی ایک یاترا ہے۔ بہت سے مندروں میں پوجا ہوتی ہے اور وہاں بڑے بڑے مکھ وان موجود ہوا کرتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے ایک جگہ قیام کیا۔ چندر مکھ بولی۔

"یہاں سونا گڑھی مندر ہے۔ سونا گڑھی مندر میں ایک بڑے مہان سادھو مہاراج کہیں سے آئے ہوئے ہیں، میں ان کے دوار جانا چاہتی ہوں۔"

"سونا گڑھی مندر۔ معلوم کر لیتے ہیں۔" یہ معلوم کرنا کوئی مشکل کام نہ ہوا۔ درحقیقت یہاں ایک مہان سادھو بھگت سنگرام آئے ہوئے تھے۔ بھگت سنگرام کے بارے میں بڑی دھوم مچی ہوئی تھی کہ جس کی طرف رخ کر لیتے ہیں اس کی تقدیر بدل جاتی ہے۔ دور دور سے لوگ ان کے بارے میں سن کر آ رہے تھے۔ ہری رام کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو وہ حیران ہوا۔ اس نے پوچھ ہی ڈالا۔

"تجھے بھگت سنگرام کے بارے میں کہاں سے معلوم ہوا چندر مکھ۔" جواب میں چندر مکھ اس طرح مسکرائی۔ جیسے باپ کی معصومیت پر اسے پیار آ رہا ہو، اس نے کہا۔

"بس پتا جی چل ہی گیا تھا۔ بڑے مہان پرش ہیں، وہ تیاری کریں ان کے دوار جانے کی۔"

تیاری کیا کرنا تھی۔ یہاں آنے کے بعد ایک بگھی حاصل کر لی گئی تھی اور اس بگھی میں بیٹھ کر، چندر مکھ بھگت سنگرام کے درشن کے لیے چل پڑی۔

سونا گڑھی مندر بڑا عالیشان تھا۔ اس کا کلس سونے کا بنا ہوا تھا۔ یاتری چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ پنڈت بھگت سنگرام کے بارے میں سن رکھا تھا کہ وہ شام کی پوجا سے پہلے درشن دیتے ہیں

اور دو یا تین گھنٹوں تک ضرورت مندوں سے ملاقات کرتے ہیں۔

کوشلیا تو ویسے بھی دبی دبی رہا کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ آگے نہ آئی بے شمار لوگوں کے رش میں وہ لوگ بیٹھ گئے۔ بھگت سنگرام جی نمودار ہوئے۔ ان کے لیے ایک سنگھاسن بچھا دیا گیا تھا۔ وہ اس سنگھاسن پر آ کر بیٹھ گئے تھے۔ انہوں نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور ان کی آواز ابھری جو لاؤڈ اسپیکر کے بغیر بھی بہت تیز تھی۔ انہوں نے کہا۔

"دیویو! اور سجنو! میں سونا گڑھی مندر کے دوار تمہارا سواگت کرتا ہوں۔ سب کو سمے نہیں دے سکوں گا لیکن ابھی یہاں بہت دن تک ہوں۔ تم جس طرح بھی چاہو۔ مجھ سے اپنے سوالات کر سکتے ہو۔ اگر کوئی سوال تمہارے من میں بھی ہوگا۔ تو مجھ تک پہنچ جائے گا۔ میں اس کا نام لے کر اسے پکار دوں گا۔"

بہت بڑی بات تھی۔ لوگوں میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔

سب کے سب بھگت سنگرام سے بہت متاثر تھے اور چندر مکھ ایک طرف بیٹھی ہوئی گہری نگاہوں سے ان کا جائزہ لے رہی تھی۔ بھگت سنگرام کے دو آدمی ان کے خواہش کے مطابق اس کا نام لیتے جس بھگت سنگرام سنگھ جی بلانا چاہتے۔

سب سے پہلے بنواری لعل کا نام لیا گیا تھا۔ جس کا کوئی مسئلہ تھا۔ بنواری لعل جی اپنی جگہ سے اٹھے اور بھگت سنگرام کے دوار پہنچ گئے۔

"ہاں بنواری! تیری من میں جو بات ہے وہ سچی ہے۔ اپنی دھرم پتنی کو سمجھا۔ عمر کا فرق بے شک ہے پر تو اس کا سچا پریمی ہے۔ اس سے کہہ کہ وہ غلط راستے پر جا رہی ہے۔ یہ غلط راستہ اسے موت کی وادیوں تک لے جائے گا۔ یہ بچھوت لے اور اسے بتائے بغیر اس کی ہتھیلی پر رکھ دے۔ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔" بھگت سنگرام نے اپنے کنڈل سے کوئی چیز نکالی اور بنواری لعل کے ہاتھ پر رکھ دی۔

بنواری لعل نے عقیدت سے مٹھی بند کر لی۔

"ٹھیک ہے جا! تیرا کام ہو جائے گا۔" بنواری لعل خوشی خوشی بھگت سنگرام کے پاس سے چلا گیا۔ تین یا چار آدمیوں کو اور عورتوں کو اس طرح بھگت سنگرام نے بلایا اور ان کے بارے میں مختلف باتیں بتائیں۔ لوگوں کے دل عقیدت سے دھڑک رہے تھے لیکن چندر مکھ مسکراتی نگاہوں سے بھگت سنگرام کو دیکھ رہی تھی۔

اچانک ہی یوں لگا جیسے بھگت سنگرام کو بچھو نے ڈس لیا ہو۔ وہ ایک دم سے اپنی جگہ سے اٹھے اور اٹھنے کے بعد اپنے بدن کو جھاڑنے لگے۔ ان کے خادم تیز رفتاری سے ان کے پاس پہنچ گئے تھے۔

بھگت سنگرام آہستہ آہستہ انہیں کچھ کہنے لگے اور خادم گردن جھکا کر دونوں سمت ہٹ گئے۔ تب بھگت سنگرام کی نگاہیں ادھر ادھر اٹھنے لگیں اور کچھ دیر کے بعد وہ چندر مکھ پر مسکرا کر رک گئیں۔

وہ چندر مکھ کو دیکھتے رہے۔ من ہی من میں وہ چندر مکھ کو اپنے پاس بلا رہے تھے لیکن انہیں ایک دم ہی یوں محسوس ہوا جیسے ان کی دھنی قوتیں سلب ہوتی جا رہی ہوں۔ چندر مکھ ان کے پاس نہیں آئی تھی۔ بھگت سنگرام آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے اٹھے اور پھر آگے بڑھتے ہوئے چندر مکھ کی طرف آنے لگے۔ ان کے داس ان کے لیے راستہ بنا رہے تھے اور لوگ ہٹ ہٹ کر انہیں جگہ دے رہے تھے۔

چند لمحوں کے بعد وہ چندر مکھ کے پاس پہنچ گئے۔ تمام نگاہیں اسی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے چندر مکھ کے قریب پہنچ کر اس سے کہا۔

"دیوی! آپ نے ہمیں بلایا ہے۔" چندر مکھ پر اعتماد لہجے میں بولی۔

"آپ مجھے دیوی نہ کہیں۔ بھگت سنگرام مہاراج۔ میں تو داسی ہوں داسی۔"

"دیوی جی! آپ میرے پاس آئیں گی۔"

"ہاں۔ ہاں کیوں نہیں۔" چندر مکھ نے کہا اور پھر اسی راستے سے ہوتی ہوئی وہ آگے بڑھنے لگی۔ بھگت سنگرام جی اس کے بعد وہاں نہیں رکے تھے بلکہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سیدھے مندر کے اندرونی حصے میں پہنچ گئے تھے۔ ان کے خادموں نے لوگوں سے کہا۔

"بھائیو! اس سمے مہاراج مصروف ہوگئے ہیں۔ آپ لوگ اب کل آیئے اب وہ کسی سے نہیں ملیں گے۔" نہ تو چندر مکھ نے اور نہ کسی اور نے ہری رام اور کوشلیا کی طرف رخ کیا تھا۔

وہ دونوں اجنبیوں کی طرح کھڑے کے کھڑے رہ گئے تھے۔ لوگ منتشر ہونے لگے تھے۔ ادھر بھگت سنگرام، چندر مکھ کو لیے ہوئے اپنے اس حجرے میں پہنچ گئے تھے جہاں وہ رہتے تھے۔ چندر مکھ پراعتماد انداز میں مسکرا رہی تھی۔

تب بھگت سنگرام نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔

"بیٹھیے دیوی جی۔"

"میں نے آپ سے کہا ناں مہاراج! آپ مجھے دیوی نہیں، داسی کہیں۔"

"ہاں۔ آپ داسی ہیں لیکن وہ مہانتا ہے آپ کے اندر کہ آپ داسی نہیں دیوی ہی ہیں۔ پر آپ مجھے یہ بتایئے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔"

"آپ کی یہ شکتی ہمیں پسند آئی ہے۔ مہاراج کہ آپ دوسروں کے من کی بات پڑھ لیتے ہیں۔ یہ شکتی آپ ہمیں دے دیں۔ سمجھ رہے ہیں ناں آپ یہ شکتی آپ ہمیں دے دیں۔" یہ کہہ کر چندر مکھ نے بھگت سنگرام کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور بھگت سنگرام ایک دم سے ساکت ہوگیا۔

چندر مکھ اسے دیکھتی رہی۔

بھگت سنگرام جیسے پتھر کا بت بن کر رہ گیا ہو۔ وہ کوئی دس منٹ تک اسی طرح ساکت رہا اور چندر مکھ مسکرا کر اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ کسی نے محسوس تو نہیں کیا لیکن یہ ایک بہت بڑی سچائی تھی کہ چندر مکھ کی آنکھوں سے سبز رنگ کی ہلکی ہلکی شعاعیں نکل رہی تھیں اور یہ شعاعیں براہ راست بھگت سنگرام کی آنکھوں تک پہنچ رہی تھیں۔

پھر تھوڑی دیر کے بعد یوں محسوس ہوا کہ جیسے ان شعاعوں کی واپسی ہوگئی ہو۔ وہ واپس چندر مکھ کی آنکھوں میں آ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا اور اس کے بعد ختم ہوگیا۔ بھگت سنگرام پہلے تو یونہی پتھرایا ہوا کھڑا رہا اس کے بعد اس طرح چونکا جیسے گہری نیند سے جاگا ہو۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر جیسے اس کے قدم بے جان ہوگئے ہوں۔ وہ بیٹھنے کے لیے جگہ تلاش کرنے لگا اور اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ جبکہ چندر مکھ مسکراتی ہوئی واپس چل پڑی تھی۔ گویا اس نے بھگت سنگرام کے ذہن سے وہ صلاحیت چھین لی تھی جس کی بنا پر وہ لوگوں کے من کی بات جان کر ان کے دلوں کی باتیں پوری کرتا تھا اور اب اس کی یہ قوت چندر مکھ کو حاصل ہوگئی تھی۔ بھگت سنگرام کی ذہنی قوتیں اس کے سلب کر لی تھیں اور اسکا اندازہ جب ہوا۔ جب ایک دو دن کے بعد اچانک ہی بھگت سنگرام نے راتوں رات سونا گڑھی مندر چھوڑ دیا اور کہیں گم ہوگیا۔

ادھر چندر مکھ اپنے ماتا پتا کے ساتھ واپس اپنے استھان پہنچ گئی تھی۔

اس نے مسکراتے ہوئے ہری رام سے کہا۔

"جی پتا جی! مہاراج آپ کے من میں آج تک پربھا کری رام پرشاد کی دھرم پتنی موجود ہے۔ ماتا جی ذرا خیال رکھیں پتا جی کا۔" چندر مکھ کے انداز میں شرارت تھی لیکن ہری رام کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

"ارے۔ تجھے..... تجھے کیا معلوم پربھا کری کے بارے میں....." جواب میں چندر مکھ ہنس پڑی تھی۔ اب وہ کیا بتاتی بھگت رام کو کہ لوگوں کے ذہن اس کے سامنے کھل چکے ہیں اور اب وہ ہر ایک کے ذہن کو پڑھ سکتی ہے۔

فورس تھری

صابر علی ہاشمی

دفعتہ اس کی نگاہ یو خوف پر پڑی۔ وہ اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ یو خوف کیفے ہی کی طرف آرہا تھا۔ یوخوف کی نظر الیگزینڈر پر اس وقت پڑی جب وہ اس کی میز کے قریب پہنچ گیا تھا ایک لمحے کے لیے وہ بھی سکتے میں آگیا۔ الیگزینڈر اور اس کا آمنا سامنا مشرق وسطیٰ اور یورپ میں کئی بار ہوچکا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے مخالف تھے مگر دونوں ایک دوسرے کی ذہانت اور پھرتی کے مداح تھے اور ایک دوسرے کو کسی قدر پسند بھی کرتے تھے۔

اس شمارے کے لیے ایک طویل وسنسنی خیز ناول کی تلخیص

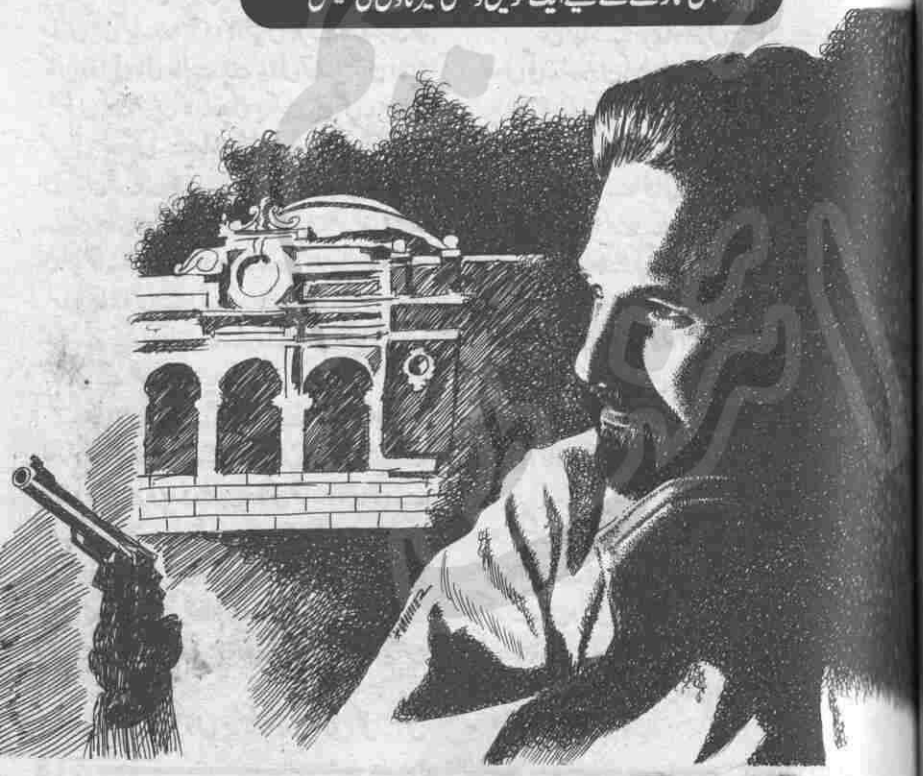

نیا سلسلہ..... نیا ہنگامہ
اس حیرت ناک وسنسنی خیز داستان کی
دوسری قسط آئندہ ماہ ملاحظہ کریں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بین الاقوامی سیکرٹ ایجنسی 'آئی ایس اے' کا ہیڈ کوارٹر نیویارک میں تھا۔ اس ایجنسی کا اہم ترین فریضہ 'عالمی امن کے خلاف ہونے والی ہر سازش کا پتا لگانا اور اس کا خاتمہ کردینا تھا۔

شام کے سائے گہرے ہوئے تو آئی ایس اے کی بیس منزلہ عمارت میں سناٹا طاری ہوگیا۔ تمام شعبوں کے لوگ اپنا کام ختم کرکے اپنے اپنے گھروں کو جاچکے تھے' ہیڈ کوارٹر کی سیکورٹی گارڈ' گشت کے لیے طویل راہداریوں میں نکل آئی یہ مسلح گارڈ پوری عمارت میں رات بھر گھومتی رہتی تھی۔

☆☆

ہیری نے دیوار کے ساتھ چپک کر اپنا سانس روک لیا' دائیں طرف کی راہداری میں گارڈ کے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی جو پچھلی راہداری میں جاکر معدوم ہوگئی' ہیری کے حلق سے طمانیت بھرا سانس نکل گیا۔ وہ ایجنسی کا انتہائی تجربے کار ایجنٹ تھا لیکن وہ اپنی مالی حالت سے بددل تھا۔ ایجنسی اپنے ایجنٹوں کو بہترین کارکردگی پر کیا دیتی تھی۔ صرف تعریفی سند جس سے سامان عشرت خریدا جاسکتا تھا' نہ ہی حسین لڑکیوں کا قرب' مگر آج وہ خوش تھا۔ اس نے بہرحال دولت پیدا کرنے کا ایک طریقہ ڈھونڈ ہی لیا تھا۔ اس نے خود کو منہ مانگے داموں فروخت کردیا تھا۔ اس نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور دیوار میں بنے پہلے دروازے کے سامنے رک گیا جس پر 'سیکشن کے' لکھا ہوا تھا۔

یہی اس کی منزل تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور اندر سرک گیا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا لیکن اس کے باوجود وسیع کمرہ پوری طرح روشن تھا۔ وہ تیزی سے ایک فائل کیبنٹ کی طرف بڑھا اور تیسرے نمبر کی دراز کھول کر اس میں رکھی ایک فائل نکالی۔ اس پر 'روسی میزائل سسٹم' لکھا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے فائل کھولی۔ اس میں دستاویز' نوٹس اور بلیو پرنٹس موجود تھے۔

ہیری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے فائل میز پر رکھ دی اور جیب میں سے ایک چھوٹا سا کیمرا نکال لیا۔ وہ چار میں سے تیسرا فوٹو اتار رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک نوجوان لڑکی اندر داخل ہوئی۔ ہیری چونک کر سیدھا کھڑا ہوگیا۔ اس نے کیمرا چھپانے کی کوشش کی مگر لڑکی اسے دیکھ چکی تھی۔

''تم یہاں کیا کررہے ہو مسٹر ہیری۔'' وہ بے یقینی کے انداز میں بولی۔ وہ سیکشن کے کی کلریکل سپروائزر تھی۔

''اوہ.....'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''میں ایک فائل دیکھنے آیا تھا۔''

''اس سیکشن میں آنے کے کچھ قوانین ہیں۔'' کلریکل سپروائزر ماریا نے سختی سے کہا۔ ''کیا تمہارے پاس اپنے محکمے کے سربراہ کا اجازت نامہ موجود ہے۔'' اس کے چہرے سے برہمی عیاں تھی۔

ہیری نے نفی میں سر ہلادیا۔

''میں تمہارے سربراہ جنرل میتھیوز سے بات کروں گی۔'' وہ فون کی طرف بڑھی۔

ہیری لپک کر اس کی پشت پر پہنچ گیا۔ لڑکی خطرہ محسوس کرکے مڑی۔ اسی وقت ہیری نے میز پر پڑی بھاری سنگی ایش ٹرے اٹھائی اور لڑکی کے سر پر دے ماری۔ لڑکی لڑکھڑا کر میز کے پیچھے جا گری۔ ہیری نے اس کا سر کچل دیا تھا۔ لڑکی گرتے ہی ساکت ہوگئی۔

ہیری نے خون آلود ایش ٹرے میز پر رکھ دی' پھر فائل میں سے چوتھا فوٹو اتارا اور اسے دراز میں رکھنے لگا۔ وہ فوراً ہی یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا مگر جیسے ہی اس نے دراز بند کی۔ اپنے عقب میں دروازہ کھلنے کی آواز سن کر اچھل پڑا۔

☆☆

الیگزینڈر کو 'سیکشن کے' میں ایک فائل دیکھنی تھی' جس کا اجازت نامہ وہ دن میں ہی حاصل کرچکا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو اس کی نظر ہیری پر پڑی' جو فائل کیبنٹ کے سامنے سناٹے میں کھڑا تھا۔ الیگزینڈر نے ماریا کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا پھر ہیری کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''ہیلو ہیری۔'' وہ بولا۔ ''مس ماریا نظر نہیں آرہی۔''

''میں خود بھی اسی کی تلاش میں ہوں۔'' وہ بولا۔ ''میں اسے باہر جاکر دیکھتا ہوں۔'' اس نے ایک اچٹتی سی نظر چاروں طرف ڈالی اور کمرے سے نکل گیا۔ ہیری اندر ہی اندر لرز اٹھا۔ اب اس کا بچاؤ اسی میں تھا کہ وہ الیگزینڈر کو قتل کردے یا پھر ایک صورت یہ تھی کہ وہ..... ماریا کی لاش ہی غائب کردے اس طرح 'سیکشن کے' میں چوری کے بجائے لوگ ماریا کی تلاش میں الجھ جائیں گے اور یہ معاملہ رفع دفع ہوجائے گا۔

اس نے کمرے میں نظر دوڑائی۔ دیوار کے ساتھ ایک بڑا ڈسٹ بن دیکھ کر ہیری اس کی طرف بڑھا۔ ڈسٹ بن کے پیندے میں تیز چھریاں لگی ہوئی تھیں جو بیکار کاغذات کو ہزاروں ٹکڑوں میں تبدیل کرکے انہیں ضائع کردیتی تھیں۔ ہیری نے مشین چلائی اور ماریا کی لاش کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اس نے ماریا کے جسم کو اٹھایا اور ڈسٹ بن میں ڈال کر ڈھکنا بند کردیا۔ مشین میں سے بڑی زوردار گھرگھراہٹ کی آواز نکلی۔ دس منٹ کے بعد اس نے بٹن بند کردیا اور ڈھکنا کھول کر اندر جھانکا۔

ڈسٹ بن میں چاروں طرف خون لگا ہوا تھا۔ نیچے دندانوں میں گوشت کے ریشے' کپڑے کے ٹکڑے اور بالوں کی ایک لٹ پھنسی ہوئی تھی۔ اس کا بدن بری طرح کپکپا اٹھا' اس کا دل متلا اٹھا تھا۔ اس نے مشین بند کی اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ راہداری سنسان پڑی تھی۔ وہ تیزی سے راہداری میں اتر گیا۔ اب اسے کاپٹن کو فون کرنا تھا۔

☆☆

دوسری دوپہر 'سیکشن کے' کے ڈسٹ بن میں ماریا کے باقیات مل گئے اور پوری عمارت میں زلزلہ سا آ گیا' ڈپٹی ڈائریکٹر نے الیگزینڈر اور ہیری کو بلا کر مختلف سوال کیے تھے۔ کاپٹن جوان کا چیف تھا ان کے ساتھ تھا اور ان دو آدمیوں پر ماریا کے قاتل ہونے کا شبہ کررہا تھا جن کے بارے میں ہیری کا بیان تھا کہ وہ اس کے کمرے میں گھستے ہی 'سیکشن کے' سے نکل کر گئے تھے۔

دو دن بعد ہنگامہ کچھ سرد پڑ گیا تو کاپٹن نے ہیری کو اپنے کمرے میں طلب کیا ہیری اندر آیا تو کاپٹن تھکے تھکے انداز میں اپنی کرسی پر بیٹھا تھا۔ وہ بھی ہیری کی طرح ایجنسی میں ڈبل رول ادا کررہا تھا۔

''یہ ڈسٹ بن مشین کو استعمال کرنے کی کیا ضرورت تھی۔'' وہ ہیری کے بیٹھتے ہی تلخی سے بولا۔

''تمہیں جن تصویروں کی ضرورت تھی' وہ میں نے لادیں۔ ہمارے نئے دوست انہیں پاکر یقیناً خوش ہوں گے۔ جہاں تک لڑکی کا تعلق ہے تو اس کے علاوہ میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔''

''مگر اس لاش کا قیمہ بنانے کی کیا تک تھی۔'' کاپٹن بدستور تلخی سے بولا۔ ''تمہیں پتا ہے' لوگ کتنے بپھرے ہوئے ہیں۔''

''مجھے بہرحال اس لاش کو ٹھکانے لگانا ہی تھا۔'' ہیری کسمسا کر بولا۔ ''میں یہی سمجھتا تھا کہ مشین اس کے ذرات تک چاٹ جائے گی۔''

کاپٹن بغور اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ یہ آدمی اسے کبھی پسند نہیں رہا تھا مگر اس کے علاوہ آسانی سے کوئی اور کام کا آدمی نہیں ملا تھا۔ ''خیر' جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔'' بالآخر وہ بولا۔ ''میں بہرحال تمہارے ساتھ ہوں۔''

اسی وقت بزر گونج اٹھا۔ یہ اس کی سیکریٹری تھی جو کہہ رہی تھی کہ الیگزینڈر اس سے ملنا چاہتا تھا۔

''الیگزینڈر آیا ہے۔'' کاپٹن بولا۔ ''بہتر ہوگا کہ کچھ دنوں تک تم ہیڈ کوارٹرز سے دور ہی رہو۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں تم سے رابطہ کرلوں گا۔''

''مجھے بھول نہ جانا کاپٹن۔'' ہیری معنی خیز انداز میں بولا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

الیگزینڈر جب اندر آیا تو ہیری باہر نکل رہا تھا۔ وہ چند لمحوں تک اسے جاتا دیکھتا رہا پھر کاپٹن کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ''ہیری کیا کہہ رہا تھا۔''

''ہیری کا خیال ہے کہ اگر وہ چند منٹ پہلے پہنچ جاتا تو شاید ماریا کے ساتھ یہ خوف ناک حادثہ پیش نہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آتا۔" وہ بولا۔

ان کی آنکھیں یوں ملیں جیسے وہ ایک دوسرے کا جائزہ لے رہے ہوں۔

"چند باتیں ایسی بھی ہیں جو میں نے ڈپٹی ڈائریکٹر کو نہیں بتائیں' ہیری کے متعلق....." الیگزینڈر دھیرے سے بولا۔ وہ کامپٹن کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اسے شک ہو گیا تھا کہ کامپٹن' ہیری کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ "جو کچھ ہوا بہت برا ہوا ہے کامپٹن۔" الیگزینڈر نے اس کے چہرے سے نظر ہٹالی۔ "میں نہیں سمجھتا تھا کہ ہیری نے اندر کا آدمی ہو کر بھی ایسا بھیانک جرم کیا ہوگا۔"

کامپٹن کی بھنویں چڑھ گئیں۔ "اوہ۔" اس کے منہ سے نکلا۔ "میں ہیری کو بہت عرصے سے جانتا ہوں وہ ایک اچھا ایجنٹ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ایجنسی سے غداری کر کے اپنی جیب بھرنے والوں میں سے نہیں ہو سکتا۔"

پھر وہی بات۔ الیگزینڈر نے سوچا۔ آخر کیوں کامپٹن برابر ہیری کی طرف داری کر رہا تھا۔

"شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔" وہ پرخیال لہجے میں بولا۔ "میں بہرحال ہیری پر نظر رکھوں گا اور میرا شبہ درست ہوا تو میں جنرل میتھیوز کو رپورٹ کروں گا پھر وہ خود ہی ڈپٹی ڈائریکٹر سے بات کر لیں گے۔"

"بالکل ٹھیک۔" کامپٹن پرسکون انداز میں بولا۔ مگر اندر ہی اندر وہ لرز کر رہ گیا تھا۔ "ویسے ہم' تم دونوں کو ایک مشن پر باہر بھیجنے والے تھے۔" کامپٹن کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "مگر اب جب تک یہ معاملہ ختم نہیں ہو جاتا تم یہیں رہو گے۔"

الیگزینڈر اس کے ساتھ ہی دروازے کی طرف بڑھ گیا مگر پھر اچانک رک گیا۔ "مجھے ایک پرسنل کال کرنی ہے۔ اگر اجازت ہو تو۔"

"اوہ' کیوں نہیں۔ شوق سے کرو۔ تمہیں پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔" کامپٹن نے کہا اور دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

الیگزینڈر نے اپنے ہی ڈپارٹمنٹ کا نمبر ڈائل کیا اور ریسیور کان سے لگائے میز پر دیکھنے لگا۔ اسے یاد آیا تھا کہ اس کے آنے سے پہلے ہیری کامپٹن سے باتیں کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ماریا کا قتل خود ہیری کے ہاتھوں ہی انجام پایا تھا۔ وہ اپنے اس خیال کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ شاید کوئی سراغ مل ہی جائے اس نے سوچا۔ دوسری طرف اس کے اپارٹمنٹ میں برابر گھنٹی بج رہی تھی۔

ذرا دیر بعد ہی کاغذات کے نیچے کامپٹن کا نوٹ پیڈ اسے مل گیا۔ وہ سادہ پڑا تھا مگر صفحے پر ایسے نشان پڑے تھے جیسے اس کے اوپر والے کاغذات پر زور دے کر کچھ لکھا گیا ہو۔ الیگزینڈر نے وہ صفحہ پھاڑ کر جیب میں رکھ لیا اور فون بند کر کے باہر آ گیا۔ کامپٹن باہر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"جواب نہیں آ رہا ہے۔" اس نے کامپٹن سے کہا۔ "میں بعد میں فون کر لوں گا۔"

☆☆

پورا ہفتہ گزر گیا ان دو آدمیوں کی تلاش جاری تھی جن کا صحیح حلیہ بھی ہیری نہیں بتا سکا تھا مگر یہ تلاش لاحاصل ہی رہی ان کا کوئی وجود ہوتا تو پتا چل جاتا۔ اس عرصے میں کامپٹن نے الیگزینڈر کے ہاتھ میں فلسطین جانے کا آرڈر تھما دیا' الیگزینڈر بھنا کر رہ گیا۔ اسے آئی ایس اے کی امریکہ سے ہمدردی کا علم تھا روس کو ایجنسی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لیے ایک طرح سے یہ ایجنسی سی آئی اے کی ذیلی شاخ بن کر رہ گئی تھی۔

الیگزینڈر بہت دنوں سے خاموش تماشائی بنا یہ حالات دیکھ رہا تھا اور اس سے نکلنے کے لیے وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے منع کرنے کے باوجود کامپٹن نے اسے فلسطینی چھاپہ ماروں کے بارے میں رپورٹ مرتب کرنے کا فریضہ سونپ دیا تھا۔ بالآخر الیگزینڈر نے اپنی زندگی کا اہم ترین فیصلہ کر لیا۔

پلاننگ ڈویژن کے چیف جنرل میتھیوز نے الیگزینڈر کا استعفیٰ دیکھا تو ناخوش گواری سے منہ بنایا اور کہا کہ ماریا کے قاتل کا پتا لگنے سے پہلے الیگزینڈر

ایجنسی چھوڑا کر اپنے لیے مشکلات پیدا کر رہا تھا کیونکہ وہ بھی اس دن 'سیکشن کے' میں دیکھا گیا تھا جس دن میں ماریا کا قتل ہوا تھا۔

الیگزینڈر کو غصہ تو بہت آیا اور اس کا جی چاہا کہ ہیری پر اپنے شکوک کا اظہار کر دے مگر اس نے چپ رہنا ہی مناسب سمجھا کیونکہ اس کے پاس اپنے شکوک کی تائید میں کوئی ثبوت نہیں تھا۔ ویسے بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہیڈ کوارٹر میں وہ کس کا اعتبار کرے اور کس پر نہ کرے۔ کیونکہ کامپٹن کے دفتر سے وہ جو کاغذ پھاڑ لایا تھا۔ بڑا دلچسپ ثابت ہوا تھا۔

دوسرے دن الیگزینڈر نے پلاننگ ڈویژن میں اپنی میز کی درازوں سے ذاتی قسم کی چیزیں نکالیں اور ہیڈ کوارٹر سے باہر آ گیا۔ اب اس کا آئی ایس اے سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ اس کا استعفیٰ منظور کر لیا گیا تھا۔

فوگی باٹم ایریا میں ایک ریستوران کے سامنے وہ کار روک کر اتر اور اندر جا کر ایک خالی میز پر بیٹھ گیا۔ یہ جگہ اس کے اپارٹمنٹ سے قریب تھی۔ کافی پیتے ہوئے اس نے جیب سے وہی پرچا نکالا اور اس پر پنسل رگڑ رگڑ' دبے حروف ابھارنے کی کوشش کی۔ اس پر کامپٹن کی تحریر میں 'الیف تھری فورس' تحریر تھا۔ بڑی دیر تک وہ کاغذ سامنے رکھے اسے گھورتا اور کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے سوچتا رہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ہیری اور کامپٹن ڈبل ایجنٹ تھے اور ایجنسی کے علاوہ کسی فورس تھری کے لیے بھی کام کر رہے تھے اور ہیری اس دن شاید 'سیکشن کے' میں کوئی اہم راز چرانے کے لیے گیا تھا مگر یہ بات کس سے کہہ سکتا تھا۔ اس کا اعتبار کون کرتا۔ اس نے کاغذ جیب میں رکھا اور بل ادا کر کے ریستوران سے باہر آ گیا۔ الیگزینڈر کا رخ اپنے اپارٹمنٹ کی طرف تھا۔

☆☆

اس کے اپارٹمنٹ کا تالہ خراب ہو گیا تھا جسے عمارت کے نگران نے دیکھ لیا۔ اس نے ماسٹر کی سے الیگزینڈر کے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا اور تالہ ٹھیک کرنے کے لیے اندر چلا گیا۔ تاریک کمرے میں وہ تین آدمیوں کو دیکھ کر چونک پڑا۔ ان کے ہاتھوں میں خود کار ریوالور تھے۔ جن پر سائیلنسر چڑھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ اور اٹھا دیے۔ تاریکی میں ایک شعلہ چمکا اور نگران کے پیٹ میں ایک بڑا سا سوراخ پیدا ہو گیا۔

نگران لڑکھڑاتا ہوا دروازے سے آ لگا۔ اسی وقت شعلہ چمکا اور اس کے شانے پر سے گوشت ادھیڑ گیا۔ خون اور گوشت کے ساتھ دروازے کی لکڑی بھی چاروں طرف بکھر گئی۔ تیسرے ریوالور کا ٹرائیگر دبا تو گولی نگران کے سینے کو چھید گئی۔ اس نے فوراً ہی دم توڑ دیا۔

زینے پر چڑھتے ہوئے الیگزینڈر نے اپنے اپارٹمنٹ میں فائرنگ کی آواز سنی تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں نائن ایم ایم آٹومیٹک چمک اٹھا تھا۔

ایک ریوالور بردار' نگران کے جسم پر جھکا۔

"یہ الیگزینڈر تو نہیں ہے۔" اس کے منہ سے غراہٹ سی نکل گئی۔

باہر تاریک راہداری میں الیگزینڈر دیوار کے ساتھ لگا۔ چیتے کی طرح اپنے اپارٹمنٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"لعنت بھیجو' پھر دیکھیں گے۔" دوسرا آدمی غرایا اور تینوں کمرے سے باہر آ گئے' باہر آتے ہی ان میں سے دراز قامت شخص نے سب سے پہلے الیگزینڈر کو دیکھا' اس نے اپنے ریوالور کا رخ الیگزینڈر کی طرف کر دیا مگر اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا الیگزینڈر کے ریوالور سے نکلا ہوا شعلہ اس کے سینے میں دھنس گیا۔ وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑایا پھر زمین پر گر کر ایڑیاں رگڑنے لگا۔ اتنی دیر میں باقی دو میں سے بھی ایک کو الیگزینڈر کے ریوالور سے نکلی ہوئی گولی چھیدتی ہوئی دیوار تک لے گئی' تیسرا آدمی اپنے دو ساتھیوں کو مرتے دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا اور زینے پر سے اترتا ہوا اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

الیگزینڈر تیزی سے اپنے کمرے میں گھس گیا۔ نگران کا چھلنی جسم کبھی کا ساکت ہو چکا تھا۔ وہ جھلایا ہوا باہر آ گیا اور دوسرے آدمی پر جھک گیا۔ اس کے سینے سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا تھا۔ آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔

''تمہیں کس نے بھیجا تھا کتے.....'' الیگزینڈر کے حلق سے بھیڑیے کی سی غراہٹ نکلی۔

زخمی شخص نے آنکھیں کھول دیں۔ الیگزینڈر کا نائن ایم ایم آٹومیٹک اس کی پیشانی سے چند انچ کے فاصلے پر تھا۔ اس کی آنکھیں خوف اور کرب سے پھٹ گئیں۔ ''فورس تھری نے.....'' اس کے منہ سے بمشکل نکلا۔

''کیا ہوا۔ کیا ہوا۔'' الیگزینڈر نے سنا۔ قریب کے دروازے میں سے کوئی جھانک رہا تھا۔ الیگزینڈر اٹھا اور سیڑھیوں کی طرف دوڑ گیا۔ اب اس کے لیے کہیں جائے امان نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ پولیس کے آنے سے پہلے دوسرا آدمی بھی ختم ہو چکا ہوگا۔ وہ زینے کی سیڑھیاں پھلانگتا نیچے پہنچا اور عقبی دروازے سے نکل کر گلی میں آ گیا۔

دفعتاً ایک سیاہ مرسڈیز زناٹے کے ساتھ الیگزینڈر کے قریب سے نکلی اور اس پر گولیوں کی بارش کر گئی لیکن اس سے قبل ہی وہ زمین بوس ہو چکا تھا۔ ساری گولیاں اس کے سر پر سے ہوتی گزر گئی تھیں۔ اگر اسے زمین پر لیٹنے میں ایک ثانیے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو گولیوں نے اس کا بدن چھید دیا ہوتا چند لمحے بعد ہی سیاہ مرسڈیز اس کی نگاہ سے اوجھل ہوئی وہ کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے بدن میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ یہ اس کی خوش قسمتی ہی تھی۔ اسے تعجب ہو رہا تھا کہ وہ مر کیوں نہیں گیا۔ زندہ کیسے رہ گیا۔

☆☆

آئی ایس اے کے ہیڈ کوارٹر میں مس ماریا کے قتل سے ایک ماہ پیشتر نیویارک سے ہزاروں میل دور ویسٹ جرمنی کے بون میں بھی ایک ایسا ہی سنسنی خیز واقعہ اور ہو چکا تھا۔ کے جی بی کا ایک انتہائی شاطر ایجنٹ یوخوف سیاسی پناہ کی تلاش میں اپنا ملک چھوڑ بھاگا تھا۔ یہ بات انتہائی راز میں رکھی گئی تھی۔ جس وقت مس ماریا کا قتل ہوا' یوخوف پیرس میں' برطانوی سفارت خانے میں چھپا بیٹھا تھا۔ محض اس لیے کہ اپنی سابقہ ایجنسی کے جی بی سے پوشیدہ رہ سکے' جس کے ایجنٹ شکاری کتوں کی طرح اس کی تلاش میں سرگرداں تھے۔

یوخوف کا کے جی بی سے فرار' مس ماریا کے قتل سے کہیں زیادہ اہم واقعہ تھا۔ یوخوف ایک ماسٹر اسپائی تھا۔ وہ..... کے جی بی اور روس کے لیے انتہائی اہم شخصیت تھی مگر وہ اپنے آقاؤں کی تخریبی پالیسیوں سے تنگ آ کر برطانوی سفارت خانے میں سیاسی پناہ لے بیٹھا تھا۔ مس ماریا کے قتل کی خبر اخبارات میں آنے کے چند روز بعد وہ سفارت خانے کے ناظم الامور سے ملا اور اس سے کہا کہ وہ وہاں سے جانا چاہتا تھا۔

''مگر۔ مگر تم جاؤ گے کہاں۔'' ناظم الامور حیرانی سے بولا۔ ''وہ لوگ تمہاری تاک میں ہیں' جیسے ہی تم نے سفارت خانے سے باہر قدم رکھا۔ وہ تمہیں چھاپ لیں گے اور تمہیں پکڑ کر ماسکو پہنچا دیں گے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' یوخوف خوش دلی سے ہنسا اور آگے کی طرف جھک کر اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''سر اسمتھ میں نہ صرف یہ عمارت بلکہ پیرس ہی چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''بہرحال آپ کی دوستی اور تعاون کا شکریہ سر اسمتھ۔'' وہ ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

''کب تک جانے کا ارادہ ہے۔'' ناظم الامور نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔

''تین چار دن میں۔'' اس نے کہا اور معنی خیز انداز میں مسکرا دیا۔

یوخوف اسی رات سفارت خانے سے نکل گیا تھا۔ آدھی رات کے بعد وہ دوسری منزل پر واقع اپنے کمرے کی کھڑکی سے لگے پائپ کے ذریعے نیچے اترا اور چند منٹ تک زمین پر ساکت پڑا رہا پھر وہ اٹھا اور گھٹنوں کے بل چلتا ہوا سفارت خانے کی

مشرقی دیوار کی طرف بڑھ گیا۔ اسے احاطے میں کوئی گارڈ نظر نہیں آ رہا تھا۔ دیوار کے پاس پہنچ کر وہ اچھلا اور دوسری طرف اتر گیا۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا سنہری بٹوا تھا جس میں اس کی کچھ کام کی چیزیں تھیں۔ قمیض کے نیچے سینے پر ایک الیکٹرانک آلہ بندھا ہوا تھا اور جیب میں ایک چھوٹا سا خود کار ریوالور تھا۔ یہ سارا سامان اس نے پیرس میں موجود اپنے چند شناساؤں کی مدد سے سفارت خانے میں خفیہ طور پر منگوایا تھا۔ وہ اس ڈبے کو اور لی ایئرپورٹ پر چھوڑ دینا چاہتا تھا جہاں سے وہ جعلی کاغذات کی مدد سے ویسٹ انڈیز جانے والا تھا۔

وہ تیزی سے چلتا ہوا اور ایک کے بعد دوسری گلی میں مڑتا ہوا سفارت خانے سے ایک بلاک دور آ گیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اب تک اسے کوئی برطانوی گارڈ نہیں ٹکرایا تھا اور نہ ہی کے جی بی کا کوئی ایجنٹ۔ وہ ایک گلی میں گھسنا ہی چاہتا تھا کہ دفعتہً اس نے اپنے عقب میں کسی کار کے رکنے کی آواز سنی۔ اس سے قبل کہ وہ پلٹ کر دیکھتا کار کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی بھاری ریوالور ہاتھ میں لیے یوخوف کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''برطانوی سفارت خانے سے کیا چرا لائے روسی۔'' موٹا آدمی حقارت سے بولا اور اس کے ہاتھ سے ڈبا جھپٹ لیا۔ وہ اسے کھول کر دیکھنا چاہتا تھا۔

''مجھے رقم کی ضرورت تھی۔'' یوخوف نے آہستگی سے کہا۔ وہ جان گیا تھا کہ یہ کے جی بی کے کرائے کے آدمی تھے۔

موٹے آدمی نے ڈبا کھولا۔ اس میں کچھ ہیرے رکھے ہوئے تھے مگر وہ شخص ڈبے کی دہری تہ نہ دیکھ سکا تھا جس میں قیامت پوشیدہ تھی۔

''چلو' کار میں بیٹھ جاؤ یوخوف۔ ذرا بھی گڑبڑ کی تو میں گولی مار دوں گا۔ تمہارے سابقہ حاکموں کو اس کی پروا نہیں ہے کہ تمہیں زندہ لانا ہے یا مردہ۔'' وہ درشتی سے بولا۔ اس بار یوخوف سے اس کا لہجہ پہچانا نہ جا سکا۔ وہ جرمن تھا۔

یوخوف نے بے بسی سے کندھے جھٹکے اور کار میں بیٹھ گیا۔ ''صنعتی علاقے کی طرف چلو۔'' موٹے آدمی نے اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے ڈرائیور سے فرانسیسی میں کہا۔ یوخوف نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے بگڑے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اسے جان سے مار دینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

ذرا دیر بعد ہی بھوری سیڈان کار صنعتی علاقے میں ایک زیر تعمیر فیکٹری کے سامنی جا کھڑی ہوئی۔ موٹا آدمی دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ ڈبا اس نے کار میں ہی چھوڑ دیا تھا۔

''باہر آ جاؤ یوخوف۔'' موٹے شخص نے کہا اور ریوالور اس کی طرف لہرایا۔ یوخوف کار سے باہر نکل آیا۔ ''تم یہیں ٹھہرو۔'' وہ ڈرائیور سے بولا۔ یوخوف دل ہی دل میں خوش ہو گیا تھا۔ وہ یہی چاہ رہا تھا کہ ڈبا کار میں چھوڑ دیا جائے اور کم از کم ایک آدمی کار میں ہی رہے۔

موٹا شخص یوخوف کو ریوالور کے بل پر دھکیلتا ہوا شیڈ میں لے آیا۔ اسی وقت یوخوف نے سینے پر بندھے پیکٹ پر ہاتھ پھیر کر ایک بٹن دبا دیا۔ فوراً ہی ان کے عقب میں کان پھاڑ دینے والا دھماکا گونج اٹھا۔ کار بری طرح جل اٹھی تھی۔ ڈرائیور دھماکے کے بعد اٹھنے والے شعلوں کی خوراک بن گیا تھا۔ موٹا شخص سکتے کے عالم میں کار کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ سمجھ ہی نہ پایا کہ یہ دھماکا الیکٹرونک کنٹرول بم کا کرشمہ تھا جو یوخوف کی اپنی ایجاد تھا۔ روسی شاید اسے یہ بتانا بھول گئے تھے کہ یوخوف بہترین الیکٹرانک انجینئر بھی تھا۔ پھر جیسے ہی وہ مڑا یوخوف نے اس کے سر پر کراٹے کا وار کیا تھا۔ وہ لہرا کر فرش پر لمبا ہو گیا۔ یوخوف نے اس سے ریوالور چھینا اور اس کی کنپٹی پر رکھ کر ٹرائیگر دبا دیا۔ دوسرے ہی لمحے اس شخص کا بھیجا زمین پر بکھر کر رہ گیا۔

وہ جلتی کار کے قریب سے گزرا تو اسے شعلوں میں گھرا ڈرائیور نظر آ گیا مگر یہ منظر دیکھ کر وہ رکا نہیں تھا۔ وہ پہلے ہی پیرس میں بہت ٹھہر لیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اب اسے فوراً اوریلی ایئرپورٹ پہنچنا تھا۔

☆☆

الیگزینڈر سانتوڈومینگو کے ایک کیفے کے بیرونی حصے میں بیٹھا سیاہ کافی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کی نگاہ کیتھڈرل اسکوائر سے گزرتے ٹریفک پر جمی ہوئی تھی۔ وہ ایک کیس کے سلسلے میں پہلے بھی یہاں آچکا تھا اور اسے یہ جگہ بے حد پسند آئی تھی حادثے کے فوراً بعد ہی اس نے وہ ملک چھوڑ دیا تھا۔ ایسے گھر میں جا کر اپنا سامان لانا جہاں لاشیں بکھری پڑی ہوں۔ اس کے نزدیک دانش مندانہ فعل نہیں تھا۔

سانتوڈومینگو پہنچتے ہی اس نے امریکی اخبارات چاٹ ڈالے تقریباً تمام ہی اخبارات نے اس کی کہانی کو خوب اچھالا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس نے ہی مس ماریا کو قتل کیا تھا پھر افشائے راز کے خوف سے ان لوگوں نے اسے قتل کر دیا جن کے اشارے پر اس نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ اس نے کافی کا خالی کپ میز پر رکھا اور قریب سے گزارتی دو ملاٹو لڑکیوں کو دیکھنے لگا۔ وہ یہاں صرف کچھ وقت گزارنے اور مستقبل کے بارے میں سوچنے آیا تھا اپنے اپارٹمنٹ میں مرتے ہوئے حملہ آور کے بیان سے اسے فورس تھری نامی تنظیم کے وجود کا یقین آ گیا تھا یہ کوئی ایسی تنظیم تھی جس کا تعلق سی آئی اے، کے جی بی یا چائنیز ایل فائیو سے نہیں تھا۔ اس تنظیم کے وجود میں آنے کا مقصد فی الحال تاریکی میں تھا لیکن وہ تنظیم اتنی بڑی ضرور تھی کہ اس نے ہیری اور کامپٹن جیسے پرانے ایجنٹوں کو بھی خرید لیا تھا۔

دفعتہً اس کی نگاہ یوخوف پر پڑی۔ وہ اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ یوخوف کیفے ہی کی طرف آ رہا تھا۔ یوخوف کی نظر الیگزینڈر پر اس وقت پڑی جب وہ اس کی میز کے قریب پہنچ گیا تھا، ایک لمحے کے لیے وہ بھی سکتے میں آ گیا۔ الیگزینڈر اور اس کا آمنا سامنا مشرق وسطیٰ اور یورپ میں کئی بار ہو چکا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے مخالف تھے مگر دونوں ایک دوسرے کی ذہانت اور پھرتی کے مداح تھے اور ایک دوسرے کو کسی قدر پسند بھی کرتے تھے۔

یوخوف سنبھل کر مڑا اور تیزی سے دوسری سمت چل دیا۔ مگر الیگزینڈر کی آواز سن کر رک گیا۔ الیگزینڈر نے اسے ایک کپ کافی پینے کی دعوت دے ڈالی تھی۔ نہ جانے کیوں یوخوف کھنچا ہوا اس کی میز کے قریب چلا آیا۔ اس کے کرسی پر بیٹھتے ہی ویٹر آ گیا۔ الیگزینڈر نے اسے کافی لانے کا حکم دیا اور پلٹ کر یوخوف کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”میں مردم بیزار نہیں ہوں مگر سانتوڈومینگو میں خود کو پوشیدہ ہی رکھنا چاہتا ہوں۔“ یوخوف نے بتایا۔

”خود میرا بھی یہی حال ہے۔“ الیگزینڈر ہنس دیا۔

”میں نے اخبار میں تمہارے بارے میں کچھ پڑھا تھا۔“ یوخوف بولا۔ ”کیا واقعی تم نے ایجنسی چھوڑ دی۔“

”ہاں۔“ الیگزینڈر نے سر ہلایا۔ ”مگر تم اپنے بارے میں سناؤ تم بھی تو کے جی بی سے بھاگ آئے ہو۔“

اس مرتبہ ہنسنے کی باری یوخوف کی تھی۔ اسی دوران ویٹر کافی لے آیا۔ الیگزینڈر نے دونوں کے لیے کافی بنائی اور وہ خاموشی سے پینے لگے۔ پھر دفعتہً الیگزینڈر بول اٹھا۔ ”ویسے کے جی بی تم جیسے آدمی کو کھو کر بڑے خسارے میں رہے گی۔ تم جیسا الیکٹرانکس اور دھماکا خیزی کا ماہر اب ان کے پاس کوئی نہیں رہا۔“

”تم بھی تو کم نہیں ہو۔“ یوخوف ہنس دیا۔ ”آتشی ہتھیاروں کے بارے میں تمہارے علم اور مہارت نے سب کو دہلا رکھا تھا۔ چائنیز تو تمہیں لومڑیوں کے درمیان چیتا سمجھتے ہیں انہوں نے تمہارے بارے میں ایک خاص قاتل بھی بنا رکھی ہے۔ ویسے ایک بات تو بتاؤ یار، کیا واقعی تم نے ہی اس لڑکی ماریا کو قتل کیا تھا۔“ اس کا انداز انتہائی دوستانہ تھا۔

”نہیں۔ میں ایک طرح سے اس کے قتل کا گواہ تھا مگر ایجنسی نے الٹا ہی چکر چلا دیا۔“ الیگزینڈر نے

اسے بتایا۔ ”بعد میں مجھے قتل کی کوشش بھی کی گئی۔ شاید اس لیے کہ میں مس ماریا کے قتل اور اس سے متعلق کچھ اور باتوں سے بھی واقف تھا۔“

”ٹھیک ہے دوست۔“ یوخوف کچھ دیر بعد بولا۔ ”ہم دونوں ہی اپنے اپنے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں۔“ وہ ہنس پڑا۔ ”اور اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید دنیا کے اس حصے میں ہماری ملاقات نہ ہوتی۔“

”میں نے یہاں شمالی پہاڑیوں میں ایک کاٹج کرائے پر لے لیا ہے اور مدد کے لیے ایک مقامی عورت بھی ملازم رکھ لی ہے۔“ الیگزینڈر نے اسے بتایا۔ ”اگر آج رات تم کھانا میرے ساتھ کھاؤ تو مجھے خوشی ہوگی۔“

ایک لمحے کے لیے یوخوف گھبرا سا گیا مگر پھر فوراً ہی مسکرا دیا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ الیگزینڈر نے تفصیل سے اسے اپنے کاٹج کا نقشہ سمجھا دیا۔

”ٹھیک ہے۔ میں نو بجے تک پہنچ جاؤں گا۔“ یوخوف بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆

الیگزینڈر کا کاٹج سائیوڈومینگو کی پہاڑیوں میں چھپا ہوا تھا مگر یوخوف نے اسے ڈھونڈ ہی لیا تھا۔ کھانے کے بعد پینے کا شغل شروع ہو گیا۔ الیگزینڈر اسپین کی وہائٹ شراب کی بوتل لے آیا تھا۔ دونوں دوست جام خالی کرنے لگے۔ اس دوران الیگزینڈر نے اسے ہیڈ کوارٹر کی ساری بات بتا دی۔ مس ماریا کا قتل، ہیری اور کامپٹن کا طلوث ہونا۔ اپنا استعفیٰ، اپارٹمنٹ میں نگران کا قتل اور مرسیڈیز سے کی جانے والی فائرنگ۔ اس نے سب کچھ ہی بتا دیا۔

”تم نے ان سب باتوں سے کیا نتیجہ نکالا۔“ وہ چپ ہوا تو یوخوف نے پوچھا۔

”میں، اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کسی نامعلوم ہیڈ کوارٹر سے ایک تیسری عالمی طاقت مصروف عمل ہے۔ جس کا نام فورس تھری ہے۔ ہیری اور کامپٹن کو انہوں نے خرید لیا تھا اور وہ اس کے لیے ایجنسی سے راز چرایا کرتے تھے۔“ الیگزینڈر نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”پچھلے چند سالوں میں ایجنسی سے کئی ایسے راز چوری ہوئے ہیں جن کا آج تک سراغ نہیں مل سکا۔“

”ہاں۔ مجھے یاد پڑتا ہے، ہمارے یہاں بھی کچھ ایسی پراسرار باتیں ہوتی رہی ہیں۔“ یوخوف نے کہا۔ ”تو تمہارے خیال میں یہ کوئی تیسری عالمی طاقت ہے جو یکایک ہی میدان میں عمل میں کود پڑی ہے۔“

”ہاں۔ ایک انتہائی مضبوط سپر سیکرٹ تنظیم، جس کے پاس کروڑوں ڈالر کا سرمایہ ہے اور جو کے جی بی، سی آئی اے، ایل فائیو اور آئی ایس اے کے ایجنٹوں اور بڑی طاقتوں کے فوجی حکام خریدنے کی قوت رکھتی ہے۔“

”اور مقصد شاید یہ ہو کہ بڑی طاقتوں کے درمیان ایٹمی جنگ کرا دی جائے۔“ یوخوف بڑبڑایا۔

”اور جنگ کے بعد خلا پیدا ہو، اسے خود فورس تھری پر کر دے۔“ وہ دونوں تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو گئے۔ باورچی خانے سے سارہ کے برتن دھونے کی آواز آ رہی تھی۔ الیگزینڈر نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”میں فورس تھری کا پتا چلانا چاہتا ہوں یوخوف، میرے خیال میں دنیا کی تباہی کے لیے کوئی بھیانک سازش ہو رہی ہے۔ اب مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس کاغذ پر جو میں نے کامپٹن کی دراز میں رکھے پیڈ سے پھاڑا تھا۔ ایک لفظ اور بھی لکھا ہوا تھا۔ پیوینو۔“

”کیا۔“ یوخوف چونک اٹھا۔ ”ایجنسی میں ہمارے پیولینو میزائل سسٹم کا فائل بھی موجود ہے۔“

”یہ بڑی اہم بات ہے یوخوف۔“ الیگزینڈر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”وہ روس کو بھی گھسیٹ رہے ہیں۔ ان کا مقصد صرف یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح دنیا کی دونوں بڑی طاقتیں ایک دوسرے سے بھڑ جائیں۔ ایسے میں یوخوف کیا میں اور تم محض تماشائی بنے بیٹھے رہیں گے۔“

یوخوف نے گہری نظر سے الیگزینڈر کی طرف دیکھا۔ ”تم شاید پارٹنر شپ کی پیش کش کر رہے ہو۔“ پھر وہ مسکرایا۔ ”نہیں میں باقی ماندہ زندگی دور کہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تنہائی میں گزارنا چاہتا ہوں۔ میں ان ہنگاموں سے اکتا گیا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "تمہاری اس دعوت کا شکریہ۔ امید ہے کہ ہم آئندہ بھی ملتے رہیں گے۔"

وہ الیگزینڈر سے ہاتھ ملا کر کار میں جا بیٹھا اور شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆

پھر تیسری رات ہی ان کی دوسری ملاقات ہو گئی۔ الیگزینڈر ڈنر کے لیے سانتو ڈومینگو کے ایک چھوٹے سے ریستوران میں گھسا تو اسے سامنے ہی ایک میز پر یوخوف بیٹھا نظر آ گیا۔ دونوں بڑی گرم جوشی سے ملے۔ ویٹر کھانا لے آیا۔ دونوں نے پلیٹیں اپنے سامنے سرکا لیں۔ الیگزینڈر نے ویٹر کو ایک بوتل کا آرڈر دیا۔ وہ الٹے قدموں لوٹ گیا۔ دونوں خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔

ویٹر بڑی دیر بعد خالی ہاتھ آیا۔

"بوتل کہاں ہے۔" الیگزینڈر نے پوچھا۔

یوخوف بڑے غور سے ویٹر کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی چھٹی حس نے یکا یک ہی خطرے کی گھنٹی بجا دی تھی۔

"ہمارے پاس بہت سی اقسام ہیں۔" ویٹر بولا۔ "آپ چل کر ایک نظر دیکھ لیں، پھر جو کہیں گے، وہی حاضر کر دوں گا۔"

الیگزینڈر نے کندھے اچکائے اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں بھی چلتا ہوں۔" یوخوف بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ ویٹر ہچکچایا اور ٹھٹک کر رہ گیا۔

"یہ دیکھ لیں گے آپ کی کیا ضرورت ہے۔"

"چلو۔" یوخوف غرایا۔ ویٹر کو آگے بڑھایا اور دروازہ کھول کر کچن میں گھس گیا۔

اسی وقت بیک وقت دو گولیاں چلیں۔ ویٹر کے سینے اور ران سے خون ابل پڑا۔ اندر دو آدمی تھے جو الیگزینڈر کے منتظر تھے۔ انہوں نے ویٹر کو سامنے سے ہٹانے کے لیے گولیاں چلائی تھیں۔ انہیں توقع تھی کہ اس کے پیچھے الیگزینڈر ہی ہو گا۔ ویٹر پیچھے کی طرف گرا اور یوخوف کبھی نہ سنبھل سکا ایک اور گولی چلی اور یوخوف کی گردن کی کھال ادھیڑتی ہوئی گزر گئی۔

اسی وقت الیگزینڈر پستول سنبھالے اندر آ گیا۔ اس کی پہلی گولی ایک ریوالور بردار کے سر پر سے گزر گئی اور دوسری نے آدمی کی گردن میں سوراخ کر دیا۔ وہ فرش پر گرا اور ساکت ہو گیا۔

پہلے آدمی نے اٹھتے ہوئے یوخوف کے سر کا نشانہ لیا۔ مگر عین وقت پر الیگزینڈر نے اسے دیکھ لیا۔ اس نے پستول پکڑا اور ٹریگر دبا دیا۔ پہلے آدمی کے سینے میں سوراخ ہو گیا۔ وہ تیورا کر گرا گرتے گرتے بھی اس نے گولی چلا دی جو چھت کا پلاستر ادھیڑ گئی، پھر وہاں سناٹا پھیل گیا۔ الیگزینڈر اچھل کر یوخوف کے پاس پہنچ گیا۔

"تم ٹھیک ہو نا۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ معمولی سا زخم آیا ہے۔" یوخوف اٹھتے ہوئے بولا۔

"ہمیں یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے۔ عقبی دروازے سے۔" وہ بولا اور دونوں عقبی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

یہ ان کی خوش قسمتی ہی تھی کہ ریستوران خالی پڑا تھا۔ دونوں تاریک گلی میں سے گزر کر سڑک پر آئے اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔

"الیگزینڈر اسے لے کر اپنے کاٹج آیا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ شاید فورس تھری کے گن مینوں کو الیگزینڈر کے ٹھکانے کا پتا نہیں لگا سکا تھا۔ یوخوف کے زخم کی پٹی کر کے وہ لان میں آ بیٹھے۔

"کیا یہ آدمی بھی فورس تھری کے تھے۔" یوخوف نے پوچھا۔

"ہاں۔" الیگزینڈر نے سوچتے ہوئے کہا۔

"میں نے یقیناً کبھی ہیری اور کامپٹن سے تذکرہ کیا ہو گا کہ مجھے سانتو ڈومینگو بہت پسند ہے۔ اسی لیے وہ یہاں دوڑے چلے آئے لیکن خوش قسمتی سے انہیں ابھی تک ہمارے ٹھکانے کا علم نہیں ہو سکا ہے۔"

"اس فورس تھری میں تو بڑے خطرناک آدمی ہیں۔" یوخوف نے کہا۔ "اگر ہم مل کر کام کریں تو واقعی

فورس تھری کے بارے میں کچھ معلوم کر ہی لیں گے۔"

"ہاں۔" الیگزینڈر مسکرا دیا۔ یوخوف اس کے ساتھ کام کرنے پر راضی ہو رہا تھا۔

"ٹھیک ہے الیگزینڈر! میں تمہارے ساتھ کام کرنے کو تیار ہوں۔ میں نے صرف کے جی بی چھوڑی ہے۔ اپنے ملک سے بہرحال مجھے پیار ہے اور اس دنیا سے بھی۔"

الیگزینڈر نے اٹھ کر بڑی گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملایا۔ دوسرے ہی دن یوخوف کا سامان بھی الیگزینڈر کے کاٹیج میں منتقل ہو گیا۔ مقامی اخبارات میں ریستوران میں شوٹنگ کی بڑی بڑی خبریں چھپی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ دو زیر زمین گروہوں کے جھگڑے میں ویٹر بے گناہ مارا گیا تھا۔ مرنے والے دو گن مینوں میں سے ایک مقامی بدمعاش تھا۔

الیگزینڈر نے اپنے ذرائع سے جعلی شناختی کاغذات بنوا لیے پھر دونوں دو دن بعد ہی سامان سمیٹ کر نیویارک پہنچ گئے۔

نیویارک کا موسم بڑا سرد تھا۔ ٹیکسی دونوں کو لیے ایک گم نام سے ہوٹل کے سامنے رکی، جہاں الیگزینڈر نے جعلی ناموں سے دو کمرے محفوظ کرا لیے تھے۔ اس شام الیگزینڈر نے ایک کار کرائے پر حاصل کر لی اور رات ہوتے ہی دونوں دوست ہیری کی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ انہیں اس کے اپارٹمنٹ تک پہنچنے میں کسی دشوار کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ہیری اپنے گھر پر نہیں تھا۔

یوخوف نے ماسٹر کی سے تالا کھولا اور دونوں اندر پہنچ گئے۔ ذرا دیر میں ہی انہوں نے پورے مکان کی تلاشی لے ڈالی مگر ایک بھی کام کا کاغذ ان کے ہاتھ نہ لگ سکا تھا۔ دراز، الماریاں، کیبنٹس سب کھلے پڑے تھے انہوں نے باتھ روم اور کچن کی بھی اچھی طرح تلاشی لے ڈالی تھی۔ یوخوف ایک بار پھر باتھ روم میں گھس گیا اور کموڈ کا ڈھکن اٹھا دیا۔ اچانک اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ کموڈ کی دیوار کے ساتھ پانی کے اندر ایک کاغذ چپکا ہوا تھا یوخوف نے اسے نکال لیا۔ یہ ایک لفافہ تھا۔ اس نے لفافہ کھول لیا اندر سے ایک سیاہ چھوٹی سی فلم نکلی۔ یوخوف اسے لے کر لیمپ تک آیا اور پھر اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

الیگزینڈر حیرت بھری نظر سے یوخوف کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ پیولینو میزائل کی تصویر ہے۔" یوخوف بولا۔ "تم ٹھیک کہتے تھے۔ الیگزینڈر آخر یہ لوگ ہیں کس چکر میں۔"

"کاش! مجھے علم ہوتا۔" یوخوف نے فلم لفافے میں رکھی اور لفافہ جیب میں رکھ لیا۔ "اب ہمیں یہاں سے نکل چلنا چاہیے۔"

الیگزینڈر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کمرے سے نکل کر وہ ہال میں آئے۔ اسی وقت اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور ہیری ایک ریوالور ہاتھ میں لیے اندر آ گیا۔

ہیری کے فائر کرنے سے پہلے ہی الیگزینڈر جھک گیا۔ گولی اس کی گردن کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ وہ اپنا پستول نکال رہا تھا۔ ہیری نے دوبارہ اسے نشانہ بنانا چاہا مگر اسی وقت اس کی نظر یوخوف پر پڑی۔ اس نے ریوالور ادھر گھمایا اور ٹریگر دبا دیا۔ گولی دروازے کو ادھیڑتی ہوئی گزر گئی، ہیری مڑا اور دروازے سے باہر کی طرف بھاگ لیا۔

"اسے جانے دو۔" یوخوف چلایا مگر الیگزینڈر اس کے تعاقب میں باہر جا چکا تھا۔ اس کے ذہن میں ماریا تھی جس کا ہیری نے بڑی سنگ دلی سے قیمہ بنا دیا تھا۔

الیگزینڈر جب راہداری میں آیا تو ہیری اسے کھلی کھڑکی میں سے زینے کی ریلنگ پر چڑھتا نظر آیا۔ الیگزینڈر نے گولی چلا دی۔ اس کے کپڑے خون میں تر ہو گئے، پھر وہ توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ہاتھ پیر مارتا ہوا سات منزل نیچے کی طرف جا رہا تھا الیگزینڈر نے اس کی ہلکی سی چیخ سنی تھی۔ پھر ہر طرف سناٹا پھیل گیا۔ یوخوف بھی آ گیا۔ دونوں نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیری گوشت کے کچلی ہوئے ڈھیر کی صورت میں فٹ پاتھ پر پڑا تھا۔ دونوں عمارت سے نکلنے کے لیے دوڑ پڑے۔

☆☆

دوسری صبح کسی اخبار میں ہیری کی موت کی خبر نہیں تھی الیگزینڈر سمجھ گیا۔ یہ کامپٹن کا کارنامہ تھا۔

"میرے خیال میں اب ہمیں کامپٹن سے بھی مل لینا چاہیے۔" یوخوف نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ الیگزینڈر سر ہلا کر رہ گیا۔

اسی رات دونوں دوست بلیو اینجل میں پہنچ گئے جہاں کامپٹن باقاعدگی سے کھانا کھانے آتا تھا۔ کامپٹن وہاں نہیں تھا مگر الیگزینڈر کو یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔ اس نے ایک تاریک سی میز پر بیٹھ کر کھانے کا آرڈر دیا۔

کھانا ختم ہونے سے پہلے ہی کامپٹن آ گیا۔ وہ الیگزینڈر کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس نے آتے ہی ویٹر کو کھانے کا آرڈر دیا۔ ویٹر کے جاتے ہی الیگزینڈر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"تم۔ تم....." کامپٹن گھبراہٹ میں آدھا اٹھ گیا۔ مگر پھر فوراً ہی سنبھل کر دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

"گھبرا گئے۔" الیگزینڈر تلخی سے بولا۔ اسی وقت یوخوف بھی آ کر الیگزینڈر کے پاس کھڑا ہو گیا۔

کامپٹن نے آنکھیں سکیڑ لیں۔ "یہ۔ یہ تو میرے خیال میں کے جی بی کا ایجنٹ تھا۔" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ "کیا چاہتے ہو تم۔" وہ ہکلایا۔ اس نے الیگزینڈر کے ہاتھ میں پستول دیکھ لیا تھا۔ جس کا رخ اسی کی سمت تھا۔

"مسٹر کامپٹن تم آئی ایس اے کے علاوہ کسی فورس تھری کے لیے بھی کام کر رہے ہو۔" الیگزینڈر مدھم لہجے میں غرایا۔ "ہم اسی فورس تھری کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔"

کامپٹن کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

"فورس تھری....." وہ بڑی مشکل سے بولا۔

الیگزینڈر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہاں جلدی بتاؤ فورس تھری کیا ہے۔" الیگزینڈر نے سوال دہرایا۔ "اور وہ روسی میزائیلوں میں کیوں دلچسپی لے رہے ہیں۔"

کامپٹن کی گردن جھک گئی۔ اس سے کچھ بولا نہیں گیا تھا۔

"میرا خیال ہے، ہم اسے کہیں اور لے چلیں، کہیں تنہائی میں۔ یہ یوں نہیں مانے گا۔" یوخوف نے مشورہ دیا۔

کامپٹن نے الیگزینڈر کی طرف دیکھا اور وہ لرز کر رہ گیا، وہ ان دونوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اذیت دینے اور جان لینے میں دونوں ذرا نہ ہچکچاتے تھے۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ زبان سے اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرتا ہوا بولا۔ "ہیری کو میں نے ہی فورس تھری کے لیے کچھ دستاویز چرانے کی ترغیب دی تھی۔ یہ چند سرپھروں کی ٹولی ہے جو روس اور امریکہ کو سیاسی مشکلات میں پھنسا چاہتی ہے انہوں نے مجھے بہت بڑی رقم دی تھی۔"

اسی وقت ویٹر کھانا لے کر آ گیا۔ کامپٹن رک گیا، پھر اس کے جاتے ہی بولا۔ "میں فورس تھری کے بارے میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا مگر مجھے اس کے متعلق کاغذات حاصل کرنے کے لیے کل دوپہر تک کا وقت درکار ہے۔"

"چالاکی مت دکھاؤ۔" الیگزینڈر میز کے نیچے اپنا پستول ہلاتے ہوئے غرایا۔

یوخوف نے اسے خاموش کر دیا۔ "اس کی پیش کش ٹھیک ہے الیگزینڈر۔" وہ بولا۔ "مگر مسٹر کامپٹن اگر تم کل بھی اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے تو....."

کامپٹن نے چند لمحوں کے لیے سوچا۔ "ایسی صورت میں تم دونوں مل کر مجھے قتل کر سکتے ہو۔" وہ بولا۔ "میں کل بارہ بجے تمہیں کانگریس لائبریری کے

مرکزی دروازے پر ملوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔" الیگزینڈر بولا اور کامپٹن سر جھکائے اٹھ کر ریستوران سے نکل گیا۔

الیگزینڈر نے اپنا پستول جیب میں رکھ لیا۔ "ہمیں اس پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔" وہ بولا اور بل ادا کر کے وہ بھی باہر آ گئے۔

کامپٹن کی کار ایک زناٹے سے ان کے قریب سے گزر گئی وہ دونوں بھی اپنی گاڑی میں بیٹھے اور کار اس کے تعاقب میں ڈال دی۔ دو موڑ کے بعد ہی کامپٹن انہیں ڈاج دے گیا۔ اس علاقے میں کئی چھوٹے چھوٹے ہوٹل تھے۔ الیگزینڈر بڑی دیر تک کار کو وہیں گھماتا رہا۔ آخر اسے کامپٹن کی کار نظر آ گئی۔ وہ ایک ہوٹل کی پارکنگ میں کھڑی تھی۔

"میرا وجدان کہتا ہے کہ ہمیں کل کا انتظار کرنے کی بجائے اسے ابھی چھاپ لینا چاہیے۔" الیگزینڈر نے کار سے باہر آتے ہوئے کہا۔

"جیسی تمہاری مرضی۔" یوخوف نے کندھے اچکائے۔ پھر وہ دونوں ہوٹل میں گھس گئے۔ کلرک سے چند نوٹوں کے عوض انہیں کامپٹن کا روم نمبر معلوم ہو گیا۔ چند منٹ بعد ہی وہ اس کے دروازے کے سامنے کھڑے تھے، یوخوف نے ناک سکیڑی اندر سے دھوئیں کی بدبو آ رہی تھی۔

☆☆

کمرے کے اندر کامپٹن نے ردی کی ٹوکری میں جلتی آگ میں سارے کاغذات پھینکے اور چھت سے کے وسط میں لٹکتے پھندے کو دیکھا۔ اس کے نیچے ایک کرسی رکھی ہوئی تھی، کامپٹن نے کرسی پر چڑھ کر پھندا اپنے گلے میں ڈال لیا۔ اب اس کے پاس خودکشی کے سوائے کوئی راستہ نہ تھا۔ نہ اسے انجسی معاف کر سکتی تھی اور نہ ہی فورس تھری سے غداری کر کے وہ زندہ رہ سکتا تھا۔ دفعتہً کمرے سے باہر اس نے کوئی آواز سنی۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ گردن میں پڑا پھندا کچھ اور سخت ہو گیا۔

"کتے کے بچو!" وہ چلایا۔ "تمہیں بہت دیر ہو گئی آنے میں۔" اس نے کرسی کو ٹھوکر مار کر گرا دیا۔ رسہ اس کی گردن میں گھس گیا اور اس کا دم گھٹنے لگا۔ دروازے پر ایک دھماکا ہوا۔ اس کی ٹانگیں ہوا میں لہرائیں اور پھر اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

دونوں دوڑتے ہوئے اندر آئے اور پھر کامپٹن کو بے جان لٹکے ہوئے دیکھ کر ساکت ہو گئے۔ الیگزینڈر نے جلتی ہوئی ٹوکری کو ٹھوکر ماری اور کامپٹن کو گالیاں بکنے لگا۔

"تمہارا وجدان درست تھا یار۔" یوخوف نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ الیگزینڈر جلے ہوئے کاغذات پر جھک گیا تھا۔

"یہاں تو اب کچھ بھی نہیں بچا۔" وہ سیدھا ہو کر بولا اس نے کامپٹن کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا۔ "مر گیا سالا۔" وہ بڑبڑایا۔

انہوں نے کمرے کی ایک ایک چیز کھنگال ڈالی۔ مگر انہیں کوئی کام کی چیز نہ ملی، یوخوف میز کی درازیں ٹٹول رہا تھا۔ اس کی مایوسی بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ کامپٹن ان کا آخری سہارا تھا جو اب چھت سے لٹک رہا تھا، میز کی آخری دراز بھی خالی پا کر اسے غصہ آ گیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے دراز کھینچ لی اور پھر خوشی سے اس کی چیخ نکل گئی۔ دراز کے اندر کی طرف ایک لفافہ چپکا ہوا تھا یوخوف نے اسے جلدی سے نوچ لیا اور لفافہ کھول لیا۔

"کیا بات ہے۔ کچھ ملا ہے۔" الیگزینڈر اس کے قریب آتا ہوا بولا۔

لفافے میں جو کاغذات تھے۔ الیگزینڈر اور یوخوف انہیں خوشی سے پڑھنے لگے۔ ایک کے بعد دوسرا کاغذ دیکھتے ہوئے یوخوف کے منہ سے غراہٹیں نکلنے لگیں، یہ ایک طویل فہرست تھی جو روسی کوڈ ورڈز میں تحریر تھی۔ یوخوف ان علامتوں کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ یہ روسی میزائلوں کے مقامات کی فہرست تھی۔ روس کے جدید ترین میزائل آئی سی بی ایم کی فہرست۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"خدایا۔" الیگزینڈر نے طویل سانس لیا۔ "ایسی فہرست تو سی آئی اے کے پاس بھی نہ ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ کے جی بی اور روسی ملٹری میں بھی فورس تھری کے آدمی موجود ہوں۔"

فہرست میں دو مقامات پر نشان لگے ہوئے تھے۔ انتالیس اور چھیاسی کے ہندسے بھی ایک جگہ موجود تھے۔ ہر صفحے کے اوپر پینسل سے فورس تھری لکھا ہوا تھا اور ایک جگہ حاشیے پر "اسٹریشر کے لیے" تحریر تھا۔

"یہ تو بڑا اہم معاملہ لگتا ہے۔" الیگزینڈر نے متفکرانہ لہجے میں کہا۔ "ہمیں اسٹریشر ارجنٹینا کا مرد آہن' ملٹری کا سربراہ ہے۔"

"ہاں۔" یوخوف بڑبڑایا۔ "مگر شاید ارجنٹینا کی حکومت اس سے واقف نہیں ہے۔" دوسرے دن کامپٹن کی خودکشی کی خبر سے اخبارات بھرے ہوئے تھے۔

الیگزینڈر کو امید تھی کہ وہ ان میزائلوں کی سیلوسائٹ معلوم کرسکتا تھا۔ اسے یاد تھا کہ سی آئی اے کے ہیڈ کوارٹر کے 'سیکشن کے' میں ایک خوبصورت سی کلرک لارا کام کرتی تھی۔ لارا نے کئی بار الیگزینڈر کو رجھانا چاہا تھا مگر وہ اسے ہر بار طرح دے گیا تھا وہی لڑکی اسے یہ معلوم فراہم کرسکتی تھی۔ دوپہر کو اس نے ایک فون بوتھ سے ایجنسی میں فون کیا۔ یہ وہ نمبر تھا جس سے صرف ایجنسی سے متعلق لوگ ہی واقف تھے۔ الیگزینڈر جانتا تھا کہ ایجنسی کا ہر فون ٹیپ کیا جاتا تھا مگر کلرکوں کے فون پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی تھی۔

"خدایا۔ تمہارے بارے میں تو کہا جارہا ہے کہ تمہیں قتل کردیا گیا۔" لارا اس کی آواز پہنچانتے ہی چیخ اٹھی۔

"ابھی تک تو زندہ ہوں لارا۔" الیگزینڈر نے فون کیا۔ "مجھے روسی میزائل سیلو انتالیس نمبر آر تین ہزار ستاسیں اور چھیاسی نمبر ٹی جی نو ہزار تین سو اٹھارہ کی صحیح لوکیشن چاہیے۔ تمہاری فائلوں میں ان کے نشانے کی سمت بھی درج ہوگی۔"

"مگر یہ غیر قانونی کام ہے الیگزینڈر۔" لارا ہڑبڑا کر بولی "میں مصیبت میں بھی پھنس سکتی ہوں۔"

"نہیں ہرگز نہیں۔" الیگزینڈر نے وثوق سے کہا۔ "اس کے علاوہ کام اتنا اہم ہے کہ تم ساری دنیا کی ہیروئن بن جاؤ گی اور پھر میں خود بھی ذاتی طور پر تمہارا احسان مند رہوں گا۔"

"ٹھیک ہے آج رات آٹھ بجے میرے فلیٹ پر آجاؤ۔" لارا طویل سانس لیتے ہوئے بولی۔ "میں تمہیں مطلوبہ معلومات فراہم کردوں گی۔"

الیگزینڈر نے اسے ہوائی بوسہ دیا اور فون بند کردیا۔ ٹھیک آٹھ بجے الیگزینڈر لارا کے فلیٹ کے دروازے پر تھا' لارا نے خود دروازہ کھولا۔ وہ نائٹ گاؤن میں تھی۔ الیگزینڈر کو اندازہ تو تھا کہ وہ اس ملاقات سے پورا فائدہ اٹھائے گی۔ مگر اسے اس قدر بھرپور حملے کی توقع نہیں تھی۔ وہ اندر چلا گیا۔ لارا دروازہ بند کرکے اس کی طرف مڑی۔ نائٹ گاؤن میں اس کا ریشمی بدن ہلکورے لے رہا تھا۔

"کیسی ہو لارا۔" الیگزینڈر نے پوچھا۔ "مجھے امید ہے کہ تم میری مطلوبہ معلومات حاصل کرچکی ہوگی۔"

"اب اتنی جلدی بھی کیا ہے۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بڑھ گئی۔

☆☆

الیگزینڈر' لارا کے فلیٹ سے باہر نکلا تو اس کی جیب میں وہ پرچا موجود تھا جو لارا نے دیا تھا۔ پرچے پر دونوں میزائلوں کے مقام تنصیب اور ان کے نشانے کی سمت تحریر تھی۔ انتالیس آر' تین ہزار ستاسیں پولیسکی کے مقام پر نصب تھا' چھیاسی ٹی وی نو ہزار تین سو اٹھارہ تیانزا کے مقام پر اور دونوں کا رخ نیویارک کی طرف تھا۔ وہ ان دونوں مقامات سے بخوبی واقف تھا۔ پولیسکی' مغربی روس میں تھا تیانزا کیوبا میں ہوانا کے قریب تھا۔

☆☆

سیاہ سیڈان اونچے تاروں سے گھرے احاطے میں سے گزرتی ہوئی بلڈنگ کمپلیکس کے گیٹ پر پہنچ گئی گیٹ پر 'پمپاس الیکٹرانک کارپوریشن' لکھا ہوا تھا۔ ارجنٹینا کے جنگلات میں واقع یہ عمارت قریب ترین شہر ریو کارٹو سے تقریباً ایک سو بیس میل کے فاصلے پر تھی۔

سیڈان' گیٹ سے گزر کر سنتری کا سلام لیتی عمارت کے خصوصی حصے کے سامنے جارکی۔ اس کے پیچھے فوجیوں سے بھری ایک ملٹری گاڑی تھی۔ کار میں ساؤتھ امریکہ کی دو اہم شخصیتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک بیونس آئرس میں ملٹری کا لیڈر ہنیس اسٹریشر تھا اور دوسرا برازیل کا صدر پاؤلا الگریو تھا۔ وہ بظاہر ارجنٹینا میں اسٹریشر سے باہمی تجارت کے فروغ کے موضوع پر گفت وشنید کرنے کے لیے آیا تھا لیکن دراصل اسے اسٹریشر نے فورس تھری کے پانچ بڑے لیڈروں میں سے ایک کی حیثیت سے ملنے کے لیے بلوایا تھا۔ پاؤلا خود بھی ان پانچ لیڈروں میں سے تھا کار کے رکتے ہی دروازے کھلے اور دونوں لیڈر باہر آگئے۔

ان کے دائیں بائیں اسٹریشر کے دو محافظ تھے جو فورس تھری کے انتہائی شاطر ایجنٹ تھے۔ فوجی کار بھی ان سے کچھ فاصلے پر رک گئی۔ انہیں فورس تھری کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ ان کا لیڈر' برازیل کے صدر کو ارجنٹینا کی یہ اہم صنعتی جگہ دکھانے کے لیے لایا ہے۔

'پمپاس الیکٹرانک' دکھاوے کے لیے فوجی نوعیت کا سامان تیار کرتی تھی۔

محافظوں کے ہمراہ دونوں لیڈر اندر چلے گئے اور فوجی باہر رک گئے باہر کے مقابلے میں اندرونی ماحول خاصا فرحت بخش تھا۔ وہ دونوں راہداری کے سرے پر پہنچ کر ایک لفٹ میں سوار ہوگئے وہ فوراً ہی نیچے اترنے لگی۔ الگریو بھاری بدن اور درمیان عمر کا آدمی تھا اس کے بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی جب کہ اسٹریشر دراز قامت تھا اور پینتالیس سال سے زیادہ کا ہونے کے باوجود بھی اس کی حرکات میں پھرتیلا پن تھا۔

لفٹ رک گئی۔ وہ لفٹ سے نکل کر راہداری میں آگئے زیر زمین کمپلیکس اوپر کی عمارت سے دس گنا بڑا تھا۔ دونوں لیڈر تیزی سے چلتے ہوئے وسیع کانفرنس روم میں داخل ہوگئے' دونوں محافظ باہر ہی ٹھہر گئے اور دروازہ بند ہوگیا۔ اندر بیٹھے تین آدمیوں نے اٹھ کر دونوں لیڈروں کو خوش آمدید کہا۔ یہ تینوں بھی فورس تھری کے لیڈر تھے۔ کانفرنس روم میں ان پانچوں لیڈروں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ ان تینوں میں سے ایک کا ستیلو تھا۔ چلی کا وزیر دفاع۔ یہ پستہ قد اور دبلا پتلا آدمی انتہائی مالدار اور کئی کانوں کا مالک تھا۔

دوسرا شخص اسٹیورا اس تھا۔ ارجنٹینا کی سب سے بڑی جہاز راں کمپنی کا مالک اور ساؤتھ امریکہ کا انتہائی امیر و کبیر آدمی یہ واحد شخص تھا جو اس بین الاقوامی خفیہ تنظیم کی لیڈر شپ کے وقت اسٹریشر کے مقابلے میں کھڑا ہوا تھا' تیسرا شخص عامر بن عدن تھا جو ایک چھوٹی سی عرب ریاست کا جلاوطن شیخ تھا' خاصا صحت مند اور دراز قد اسے دنیا کا تیسرا بڑا سرمایہ دار سمجھا جاتا تھا۔

فورس تھری کے ابتدائی مرحلے میں عامر بن عدن اہم ترین حیثیت کا حامل تھا۔ اس نے اس تنظیم کے لیے پانی کی طرح دولت بہائی تھی۔ ایسٹورا اس دنیا بھر سے ماہر ترین انجینئرز اور ٹیکنیشنز لے کر آیا تھا اور فورس تھری کے لیے سپر سیکرٹ زیر زمین کمپلیکس تیار کرایا تھا۔ اس کے علاوہ اسٹیورا اس ہی تھا جس نے ارجنٹینا کے باہر بھی دنیا بھر میں فورس تھری کے انتہائی شاطر ایجنٹوں کا جال بچھا رکھا تھا۔

اسٹریشر کی طرح الگریو نے بھی سب سے ہاتھ ملایا اور پانچوں افراد کانفرنس ٹیبل کے گرد بیٹھ گئے۔ اسٹریشر نے ایک کاغذ اٹھایا اور زیر زمین ہیڈ کوارٹر میں ایک اور کمرے کی تعمیر کی رپورٹ پڑھنے لگا۔ مگر الگریو رپورٹ نہیں سن رہا تھا اس کا ذہن اسٹریشر کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بارے میں سوچ رہا تھا' یہ اسٹریشر ہی تھا جو اس کے پاس فورس تھری بنانے کا خیال لے کر آیا تھا۔ کاسیتلو کو الگریو ہی بہلا پھسلا کر اس تنظیم میں لایا۔ اسٹیوراس اور عامر بن عدن' اسٹریشر کی دریافت تھے۔ اپنی پہلی خفیہ میٹنگ میں ہی اسٹریشر نے تنظیم کا مقصد واضح رکدیا تھا کہ وہ کسی بھی طرح دنیا کی مضبوط ترین طاقت بننا چاہتے تھے ان کے خیال میں دنیا کی بڑی طاقتیں اس قابل نہیں تھیں کہ سیاسی طور پر دنیا کی سربراہی کرسکیں۔ یہ کام صرف فورس تھری ہی کرسکتی تھی۔

باقی چاروں لیڈروں نے بڑے پرجوش انداز میں اس کی تائید کردی تھی مزید غور و فکر کے بعد طے پایا کہ کسی بھی طرح روس اور امریکہ کو ایک ایٹمی جنگ لڑنے پر مجبور کردیا جائے انگلینڈ' فرانس اور چین خود بخود اس جنگ میں شامل ہوجائیں گے اور آدھی سے زیادہ دنیا تباہ ہوجائے گی۔ بھرپور ایٹمی جنگ کے بعد یہ حکومتیں اس قابل نہ رہیں گی کہ خود کو بھی سنبھال سکیں۔ اس طرح عملی طور پر فورس تھری طاقت حاصل کرلے گی اور دنیا میں باقی قوموں کو مجبور کردے گی کہ یا تو وہ اسے پوری دنیا کا آقا تسلیم کرلیں یا پھر نیوکلیئر جنگ کے لیے تیار ہوجائیں۔ اس وقت دنیا میں صرف فورس تھری ہی ہوگی جس کے پاس جوہری ہتھیاروں کا ذخیرہ ہوگا۔ یہ ہتھیار فورس تھری کے ہیڈ کوارٹر میں دن رات بنائے جارہے تھے' اب تک اس زیر زمین کمپلیکس میں دنیا کے ماہر ترین سائنس دانوں نے خاصا کام کرلیا تھا۔

''تو دیکھ لیا آپ لوگوں نے۔'' اسٹریشر' کاغذ کو دوبارہ میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''اب تک ہم نے خاصے خوف ناک ہتھیار بنا لیے ہیں اور اب پلاٹینم بنایا جارہا ہے اگلے ہفتے تک ہم روس' امریکہ اور چین کے بعد دنیا کی سب سے بڑی ایٹمی قوت ہوں گے۔''

چاروں لیڈروں نے بڑے جوش و خروش سے تالیاں بجا کر اس اعلان پر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔

''صرف دو سال میں اتنی حیرت انگیز ترقی۔ یہ بڑی ناممکن سی بات لگتی ہے۔'' کاسیتلو نے کہا۔

''کوئی بات ناممکن نہیں کاسیتلو۔'' اسٹریشر بولا۔ ''تم چلی کی سناؤ' چلی پہلا ملک ہوگا جو سب سے پہلے ہماری اس نئی فیڈریشن میں شریک ہوگا۔''

''سارے جنرل میرے ساتھ ہیں تم بے فکر ہو۔'' کاستیلو نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''نیویارک کی خبر سناؤ۔'' عامر بن عدن ہاتھ لہرا کر بولا۔ روشنی میں اس کی انگوٹھیوں کے ہیرے جگمگا اٹھے۔ ''کاسٹن کی موت کی خبر کہاں تک درست ہے۔''

''کاسٹن نے خودکشی کی ہے۔'' اسٹریشر نے کہا۔ ''اس کا ایک اور نائب ہیری تھا جسے قتل کردیا گیا ہے۔ تمام ہنگامے کے پیچھے آئی ایس اے کے ایک ایجنٹ الیگزینڈر کا ہاتھ ہے' ہمارے آدمیوں نے دو مرتبہ الیگزینڈر کو ختم کرنا چاہا لیکن دونوں بار ہی ناکام رہے۔ اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملی کہ اسے فورس تھری کے بارے میں کچھ علم ہے۔ اس نے آئی ایس اے چھوڑ دی ہے۔ ہمارے آدمی اب بھی اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔'' اسٹریشر نے تفصیل سے بتایا۔

''آپریشن اپوکلیپسی کی تکمیل میں اب کتنا عرصہ باقی ہے۔'' عامر بن عدن نے دوسرا سوال کردیا۔

''ہمارے روسی ایجنٹ نے ضروری کوڈ حاصل کرلیے ہیں اگر کام یوں ہوتا رہا تو ہمیں دو ہفتے سے زیادہ نہیں لگیں گے۔'' اسٹریشر نے چند لمحوں تک اپنے ساتھیوں کے چہرے دیکھے پھر دوبارہ بولا۔ ''ہمارا پہلا میزائل انجن اور گائیڈ سسٹم تیاری کے مرحلے میں ہے۔ آپریشن اپوکلیپسی کے بعد دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کی فوری ضرورت ہوئی تو ہم اپنے بمبار جہاز استعمال کرسکتے ہیں۔''

اس کے ساتھ ہی میٹنگ برخاست ہوگئی۔

☆☆

کاستیلو' بیونس آئرس سے چلی کے لیے پرواز کرگیا۔ برزایل کا صدر ہیڈ کوارٹر کے معائنے میں

مصروف ہوگیا۔ عامر بن عدن ریوڈی جینسٹر چلا گیا جہاں اسے اپنے کچھ کاروباری معاملات دیکھنے تھے۔ اسٹریشر' اسٹیوراس کے ساتھ ہیڈ کوارٹر کی 'عقوبت گاہ' کی طرف بڑھ گیا جہاں الیگزینڈر کا ایک ایجنٹ تھامپسن بند تھا' فورس تھری کے ایجنٹ اسے بیونس آئرس سے پکڑ کر لائے تھے۔

دونوں لیڈر اندر پہنچے تو فورس تھری کے ایجنٹ اسے مار پیٹ کر ہٹے ہی تھے۔ تھامپسن کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ اس کی بہت بری حالت تھی جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے جسم میں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کا ایک کان کچلا ہوا تھا اور بازوؤں پر سگریٹ سے جلنے اور چاقو سے کاٹے جانے کے نشانات تھے۔

''اس سے معلوم کرنے کی کوشش کرو اسٹیوراس۔'' اسٹریشر بولا۔ ''الیگزینڈر ہی کی وجہ سے کاسٹن نے خودکشی کی ہے۔ اسے یقیناً فورس تھری کے بارے میں کوئی خطرناک بات معلوم ہوچکی ہے ہمیں ہر قیمت پر الیگزینڈر کو ختم کرنا ہوگا۔''

اسٹیوراس نے اثبات میں سر ہلایا اور تھامپسن کے قریب جا کھڑا ہوا۔

''بتاؤ۔ تمہارا دوست الیگزینڈر کہاں ہے۔'' اسٹیوراس' اس پر جھک کر چلایا۔

''مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔'' تھامپسن بڑی مشکل سے چلایا اسٹیوراس نے جھپٹ کر اس کے بال پکڑے اور چہرہ اوپر اٹھادیا پھر اس نے ریوالور کا دستہ پوری قوت سے اس کے منہ پر دے مارا تھامپسن کے جبڑے کی ہڈی ٹوٹ گئی اور خون اس کے بدن کو بھگونے لگا۔ اس میں چلانے کی بھی طاقت نہیں رہی تھی۔ وہ ایک سسکی لے کر رہ گیا۔

''تمہیں بولنا پڑے گا۔ بتاؤ۔'' اسٹیوراس بھوکے بھیڑیے کی طرح چلایا۔ ''اگر تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تو میں تمہاری آنکھیں پھوڑ دوں گا۔'' اس نے چاقو نکالا اور اس کے سامنے لہرایا۔ ''بتاؤ الیگزینڈر کہاں ہے۔'' وہ چاقو اس کی آنکھوں کے قریب لاتے ہوئے بولا۔

تھامپسن کی آنکھیں بند تھیں اس نے اسٹیوراس کی دہاڑ سن کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کا چہرہ اذیت اور دہشت سے مسخ ہوکر رہ گیا تھا۔

''مجھے...... کچھ...... پتا نہیں۔'' تھامپسن بہ وقت تمام بولا۔ ''اگر پتا۔ ہوتا...... تو ضرور بتا دیتا۔''

یہ حقیقت بھی تھی۔ الیگزینڈر کے بارے میں تھامپسن صرف اتنا جانتا تھا کہ الیگزینڈر بھی اس کی طرح آئی ایس اے کا ایجنٹ تھا کبھی کبھار دونوں میں علیک سلیک بھی ہوجاتی تھی اس سے زیادہ ان کے درمیان کوئی تعلق نہ تھا۔

اسٹیوراس کو اس کے مسلسل انکار پر غصہ آ گیا۔ اس نے چاقو اس کی آنکھ میں گھسیڑ دیا جو پتلی کو چھوتا ہوا دماغ میں گھس گیا۔ وہ تھامپسن کو جان سے مارنا نہیں چاہتا تھا مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔

تھامپسن کو شدید درد کا احساس ہوا پھر جیسے ہر طرف رنگ برنگے انگارے بکھر گئے۔ اس کے بعد اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

ہوانا میں یوخوف کے کئی واقف کار تھے جو اسے معلومات فراہم کرتے تھے وہ کچھ عرصہ قبل روسی میزائل بیس قائم ہونے کے دوران یہاں ایک سال تک رہ بھی چکا تھا وہ اور الیگزینڈر ایک اندھیری رات میں ایک کشتی کے ذریعے کیوبا پہنچے تھے اور جعلی کاغذات بنوا کر ایک چھوٹے سے ہوٹل میں جا ٹھہرے تھے۔

☆☆

صبح ہوتے ہی یوخوف معلومات حاصل کرنے اپنے شناساؤں سے ملنے نکل گیا۔ جب کہ الیگزینڈر خود متیانزا کا قصبہ دیکھنے کے لیے چلا گیا تھا۔

یوخوف کو دو جگہ مایوسی کا سامنا کرنا پڑا مگر تیسرا آدمی پیڈرو اسے ایک چھوٹے سے ریستوران میں مل گیا۔ وہ وہاں دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا۔ چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد پیڈرو نے کہا۔ ''ہمیں ملے ہوئے خاصا عرصہ گزر گیا ہے۔ میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں کسی ایسے آدمی کی تلاش میں ہوں جو کچھ معلومات حاصل کرتا پھر رہا ہوں۔" یوخوف نے مدھم لہجے میں کہا۔ "مگر جس کا کسی بھی ایجنسی سے کوئی تعلق نہ ہو۔"

"ایک آدمی تھا تو سہی ایسا۔" پیڈرو سوچتا ہوا بولا۔ "وہ متیانزا کے پاس ملٹری کے ٹھکانوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔"

"متیانزا۔" یوخوف بڑبڑایا۔ "اس کا نام اور پتا بتا سکتے ہو۔"

اس نے پرس کھول کر چند نوٹ نکالے اور اس کی طرف بڑھا دیئے۔ پیڈرو نے نوٹ گن کو بڑی احتیاط سے اپنی جیب میں رکھ لیے۔

"میں اس آدمی کا نام تو نہیں جانتا۔" پیڈرو بولا۔ "مگر وہ ایک ماہ سے ہوانا ہوٹ میں ٹھہرا ہوا ہے۔" پھر پیڈرو نے اس کا حلیہ دیرا دیا۔

یوخوف اس کا شکریہ ادا کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے بالکل ہی مایوسی نہیں ہوئی تھی۔ یہ امکان بہر حال تھا کہ وہ آدمی فورس تھری کا ایجنٹ ہو اور متیانزا کے فوجی اڈوں کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہا ہو۔

یوخوف کے جاتے ہی پیڈرو بوتل خالی کرنے لگا۔ اب اس کی جیب گرم تھی۔ اس نے سوچا' اسے کچھ اور رقم بھی کمانا چاہیئے۔ اس نے عقل مندی سے کام لیتے ہوئے یوخوف سے اس آدمی کا نام چھپا لیا تھا۔ اب وہ اسے جا کر یوخوف کے بارے میں خبردار کر دے گا اور اس طرح اس سے بھی کچھ اور رقم ہتھیا لے گا اس کا نام اسمتھ تھا۔ بوتل خالی کر کے وہ اٹھا اور ہوانا ہوٹل کی طرف چل دیا۔

وہاں اس نے اسمتھ کا کمرہ نمبر دریافت کیا اور اس کے دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس کی دستک کے جواب میں ایک خوفناک صورت والے شخص نے دروازہ کھولا۔ یہی اسمتھ تھا۔

"کیا بات ہے۔" اس نے درشتی سے پوچھا۔

"آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔" پیڈرو لجاجت سے بولا۔ "وہی ہوں جس نے آپ کو متیانزا کے فوجی اڈوں کے بارے میں بتایا تھا۔ میں آپ کو ایک کام کی بات بتانا چاہتا ہوں۔ ذرا اندر آنے دیں۔"

اسمتھ ایک لمحے کے لیے ہچکچایا' پھر ایک طرف ہٹ گیا۔ پیڈرو کمرے میں داخل ہو گیا۔

"کہو' کیا بات ہے۔" اس نے دروازہ اندر سے مقفل کرتے ہوئے کہا۔

پیڈرو کا دل دھڑک اٹھا۔ "ایک آدمی جو روسی لگتا ہے' آپ کو پوچھتا پھر رہا تھا۔" پیڈرو ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ "میں نے سوچا' آپ کو بتا دوں۔ شاید آپ کے کام کی بات ہو۔ میں ایک غریب آدمی ہوں اور۔"

"ٹھیک ہے میں سمجھ گیا۔ تمہیں معاوضہ ضرور ملے گا۔ اس کا نام اور حلیہ بتاؤ۔" اسمتھ غرایا۔

"نام تو اس نے مجھے نہیں بتایا۔" پیڈرو نے کہا اور تفصیل سے حلیہ بتاتے ہوئے آخر میں بولا۔ "بس میں اتنا ہی جانتا ہوں۔ اب جو آپ کا جی چاہے' دے دیں۔"

"ہاں' ضرور دوں گا۔" اسمتھ بولا اور تپائی پر رکھا پنسل کا بھاری شمع دان اٹھا کر اس کے منہ پر دے مارا۔

پیڈرو کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ اس کو ایسے سلوک کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے جا لگا۔ اسمتھ نے گریبان پکڑ کر اسے اٹھایا پھر دوبارہ شمعدان اس کی کنپٹی پر دے مارا۔ خون کا ایک فوارہ پھوٹ پڑا۔ پھر اسمتھ اسے اس وقت تک مارتا رہا جب تک کہ اس کا بھیجا نہ نکل گیا۔ اس کے بعد اسمتھ نے بڑی بے پروائی سے پیڈرو کی لاش کو ٹھوکر ماری اور فون کی طرف بڑھ گیا۔ وہ اس روسی سے نمٹنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے ایک پیشہ ور قاتل کے نمبر ڈائل کیے جس سے وہ ہوانا میں آتے ہی ملا تھا۔

وہ ایک دبلا پتلا' بدصورت سا بدمعاش تھا جس کے نزدیک انسان کی جان لینا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ رات ہوتے ہی وہ اسمتھ کے کمرے میں آ گیا

اور پھر دونوں اس روسی کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ اسمتھ کو یقین تھا کہ وہ آج رات وہاں ضرور آئے گا اور پھر وہ اپنے ساتھی کی مدد سے اسے قابو میں کر کے زبان کھولنے پر مجبور کر دے گا۔

☆☆

آدھی رات کے وقت ایگزینڈر اور یوخوف ہوانا ہوٹل میں داخل ہوئے۔ متیانزا سے لوٹتے ہی یوخوف نے اسے اپنی دریافت کے بارے میں بتا دیا تھا۔ ایگزینڈر نے اسے بتایا کہ متیانزا میں روسی فوجی موجود تھے مگر وہ میزالہ کے اڈے کا پتا نہیں لگا سکا تھا اور پھر دونوں میں یہی فیصلہ ہوا کہ آدھی رات کے وقت اس کی خبر لی جائے۔ شاید کوئی اتا پتا مل سکے۔

یوخوف نے ڈیسک کلرک کو مطلوبہ شخص کا حلیہ بتایا۔

انہیں بڑی آسانی سے اس کا نام اور روم نمبر معلوم ہو گیا۔ وہ چوتھی منزل پر کمرہ نمبر چار سو سات میں مقیم تھا۔ وہ چوتھی منزل پر پہنچنے کے لیے لفٹ میں سوار ہو گئے۔ ذرا دیر بعد ہی وہ اس کے کمرے کے سامنے کھڑے تھے۔ راہداری سنسان پڑی تھی۔ اور ہوٹل سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔

"پیڈرو مجھے قابل اعتماد نہیں لگا تھا۔" یوخوف آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ 'اگر اسمتھ اپنے کمرے میں ہے تو وہ یقیناً ہمارا منتظر ہو گا۔'

ایگزینڈر نے اپنا ریوالور نکال کر اس پر سائیلنسر چڑھا لیا وہ دبے قدموں آگے بڑھا اور اسمتھ کے کمرے سے کان لگا دیا۔ بڑی دیر بعد اندر سے ایک کرسی کھسکائے جانے کی آواز آئی۔ اس نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا پھر راہداری کے کنارے پر بنی کھل کھڑکی کی طرف بڑھ گیا اور باہر دیکھنے لگا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ ایک فٹ چوڑی منڈیر دور تک جا رہی تھی مگر اس کی ڈھلان باہر کی طرف تھی۔

"کیا دیکھ رہے ہو۔" یوخوف اس کے قریب آ کر بولا۔

"میں اس منڈیر کے ذریعے اس کھڑکی تک پہنچتا ہوں تم پانچ منٹ بعد اسمتھ کے کمرے پر دستک دینا' پھر فوراً مقفل کو گولی سے اڑا کر دروازہ کھول دینا۔ اس کے بعد میں' میں اندر آ جاؤں گا۔" ایگزینڈر نے اسے بتایا۔

چیتے کی سی پھرتی کے ساتھ ساتھ تمہارے سر میں لومڑی کا مغز بھی ہے۔" یوخوف نے ستائشی لہجے میں کہا۔

ایک منٹ بعد ہی ایگزینڈر' دیوار سے چپکا ہوا منڈیر پر رینگ رہا تھا۔ یہ بڑا مشکل سفر تھا مگر وہ ایسے مرحلے سے پہلے بھی کئی بار گزر چکا تھا۔ وہ رینگتا ہوا کھڑکی کے قریب ہوتا جا رہا تھا پھر وہ کھڑکی کی چوکھٹ تک پہنچ ہی گیا۔ اس نے اندر کی طرف دیکھا۔ دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک حلیے کے مطابق اسمتھ تھا جو اخبار پڑھ رہا تھا اور دوسرا آدمی کاؤچ پر اپنے ریوالور کا چیمبر کھولے بیٹھا تھا۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ اسے ساڑھے چار منٹ ہو چکے تھے۔ اسی وقت دروازے پر ایک دھماکا ہوا اور وہ دونوں اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ اسمتھ نے ہولسٹر سے اپنا ریوالور کھینچا اور دروازے کی طرف دو فائر جھونک دیے۔ دوسرا شخص بھی ریوالور سنبھالے تیار کھڑا تھا۔ یوخوف کی زوردار ٹھوکر سے دروازہ کھلا اور اسی وقت ایگزینڈر اندر کود گیا۔

دوسرے آدمی نے اپنا ریوالور' ایگزینڈر کی طرف اٹھایا ہی تھا کہ ایگزینڈر کے ریوالور نے آگ اگل دی جو اس کے سینے میں جا کر دفن ہو گئی۔ اس آدمی کے ریوالور سے نکلی ہوئی گولی کھڑکی کا شیشہ توڑ گئی اور وہ خود پیچھے الٹ کر فرش پر لمبا ہو گیا۔ اسی وقت یوخوف اندر گھس آیا۔ اسمتھ نے گھوم کر ایگزینڈر پر دو فائر کیے۔ ایگزینڈر زمین پر لڑھک کر صاف بچ گیا۔

یوخوف کے ریوالور سے نکلی ہوئی پہلی گولی اسمتھ کے باو میں لگی اور دوسری گولی اس کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ وہ فرش پر آ رہا۔ ایگزینڈر دوسرے آدمی کی طرف بڑھا۔ وہ دم توڑ چکا تھا۔ پھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ اسمتھ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس نے اپنا ریوالور اسمتھ کی کنپٹی پر رکھ دیا۔

''ریوالور پھینک دو۔'' وہ غرایا۔

اسمتھ ایک لمحے کے لیے جھجکا پھر ریوالور اچھال دیا۔ اس کے منہ سے خون کی ایک لکیر نکل آئی تھی اور آنکھوں سے بے بسی جھلک رہی تھی۔

''اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو فوراً بولنا شروع کردو الیگزینڈر کا لہجہ بڑا خون خوار تھا۔'' کیا تم فورس تھری کے لیے کام کرتے ہو۔

اسمتھ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کی نظر الیگزینڈر کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ اس پر اچانک ہی موت کا خوف سوار ہوگیا۔ جب کہ وہ ابھی زندہ رہنا چاہتا تھا۔

''اب یہ بتاؤ..... کہ فورس تھری آخر ہے کیا چیز۔'' یوخوف نے پوچھا۔

اسمتھ کا سر چکرا رہا تھا۔ اسے اب فورس تھری کی ذرا بھی پروا نہیں رہی تھی۔ اسے صرف اپنی جان کی پروا تھی۔ ''یہ ایک بہت بڑی خفیہ تنظیم ہے جس کا ہیڈ کوارٹر ارجنٹینا میں ہے۔ ان کے منصوبے بے حد خطرناک اور بڑے ہیں۔ وہ نیوکلیئر ہتھیاروں کی ایک فیکٹری بھی بنا رہے ہیں۔ وقت پر استعمال کرنے کے لیے۔ فورس تھری بڑی طاقتوں کو لڑانے کی کوشش کررہی ہے۔ وہ جلد ہی ایک بڑی طاقت کی طرف سے عوسری بڑی طاقت پر فائر کریں گے۔ ظاہر ہے اس کا فوری ردعمل ہوگا اور جواباً فائر کیا جائے گا۔ اس طرح دنیا نیوکلیئر جنگ کی لپیٹ میں آجائے گی۔'' اسمتھ کسی چابی بھرے کھلونے کی طرح بولتا ہی چلا گیا۔

''اور تم لوگ پہلا فائر روس کی طرف سے کرو گے۔'' یوخوف بولا۔ ''روسی میزائلی اڈے' تیانزا یا پولیسکی سے یا دونوں سے۔

اسمتھ کو اب سانس لینے میں دشواری ہورہی تھی ایک ہی فائر کافی ہوگا۔'' وہ خون آلود ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ ''تیانزا کا انتخاب پولسکی سے ناکامی کی صورت میں کیا گیا ہے۔ ان دونوں اڈوں پر پیولیو میزائل ہی خوفناک میگاٹن ہتھیار۔

''اس کا مطلب ہے' پہلا میزائل پولسکی سے فائر کیا جائے گا۔ جو نیویارک کو تباہ کردے گا۔'' الیگزینڈر نے پوچھا۔

اسمتھ نے پھر اثباتی انداز میں سر ہلا دیا۔ الیگزینڈر کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ اس نے اسمتھ کا گریبان پکڑ کر اسے اٹھایا اور اس پر گھونسے برسانے چاہے مگر یوخوف نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اسے روک دیا۔ اس نے اسمتھ کو چھوڑ دیا۔ جو پھر زمین پر آرہا۔

''یہ فورس تھری کس نے بنائی ہے۔'' یوخوف نے سوال کیا۔ ''اسٹریشر..... الگریو کا بتلو۔'' اسمتھ نے اپنے خون آلود ہونٹ چبائے اور بڑی طرح کھانسا۔ ''اسٹیورا اس اور عامر۔''

یہ ایک عظیم اور غیر متوقع کامیابی تھی جس نے دونوں کے جسموں میں سنسنی دوڑا دی۔ اسمتھ شلید فورس تھری کا ٹاپ ایجنٹ تھا کیونکہ معمولی ایجنٹوں کو تو ہوا بھی نہیں لگتی کہ وہ کس کے لیے کام کررہے ہیں وہ ان تمام ناموں سے بخوبی واقف تھا۔ آسٹریشر کے علاوہ ان میں برازیل کا صدر' چلی کا مرد آہن اور دو بڑے سرمایہ دار بھی شامل تھے۔

''پولسکی میں تم نے کسے خریدا ہے۔'' الیگزینڈر نے پوچھا۔ ''یقیناً وہ کوئی روسی ہی ہوگا۔''

اسمتھ کی آنکھیں دھندلاتی جارہی تھیں۔ ''گورگن..... پولسکی میں گورگن ہے۔'' اسمتھ کا منہ کھلا پھر اس نے آئندہ چند دنوں بعد کی وہ تاریخ بتائی۔ جس میں پولسکی سے میزائل کو نیویارک پر فائر کیا جانا تھا۔ الیگزینڈر کے منہ سے بے اختیار سسکی سے نکل گئی۔

''ارجنٹینا میں فورس تھری کا ہیڈ کوارٹر کہاں ہے۔'' یوخوف نے سوال کیا۔

''ان کا ہیڈ کوارٹر.....'' اسمتھ نے بتانا چاہا لیکن وہ اپنا جملہ پورا نہ کرسکا اور اس کی گردن ڈھلک

گئی۔ وہ دم توڑ چکا تھا۔

☆☆

اسی رات انہوں نے اسی کشتی کے مالک سے رابطہ قائم کیا جو انہیں کیوبا لے کر آئی تھی اور جو گلف اسٹریم میں ان کا انتظار کررہی تھی۔ تیانزا بان کے لیے اتنا اہم نہیں رہا تھا دنیا کو اصل خطرہ مغربی روس میں پولسکی کی طرف سے تھا ہوانا کے ایک سنسان کنارے پر ان کی کشتی آگئی اور وہ اس میں سوار ہوکر میامی کی طرف روانہ ہوگئے۔ وہ دونوں اس بات پر متفق تھے کہ سی آئی اے یا کے جی بی کو فورس تھری کے منصوبے سے آگاہ کرنا بے فائدہ تھا۔ کوئی بھی ان کی بات پر یقین نہ کرتا یوخوف کا خیال تھا کہ وہ خود روس جائیں اور جو کچھ کرسکتے ہیں کریں۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

یوخوف کے لیے دس جانا انتہائی خطرناک تھا۔ وہاں کے جی بی کے ایجنٹ اسے چھاپ بھی سکتے تھے۔ الیگزینڈر نے اس کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تو یوخوف بے خوفی سے بولا۔ ''اس خطرے کو ہمارے سوا کوئی ٹال نہیں سکتا۔ الیگزینڈر اور ہمیں ہر قیمت پر وہاں چلنا پڑے گا۔

میامی سے نیویارک پہنچے۔ یہاں الیگزینڈر نے اپنے ذرائع سے شناختی کاغذات بنوائے جو روس میں کارآمد ہوسکتے تھے۔ دوسری رات' میک اپ کا کچھ سامان خرید کر انہوں نے نیویارک چھوڑ دیا۔ استنبول سے انہوں نے ایک یوٹ کے ذریعے بیرہ اسود کو پار کیا اور روس میں داخل ہوگئے۔ اوڈیسا سے انہوں نے ٹرین پکڑی اور خملسک پہنچ گئے جہاں سے پولسکی زیادہ دور نہیں تھا۔

وہ جمعرات کو منسک پہنچے تھے اور سنیچر کو کسی بھی وقت وہ میزائل چھوڑ جانے والا تھا جو دنیا میں تباہی و بربادی پھیلا سکتا تھا۔

پولسکی ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ یوخوف نوجوانی میں ایک مرتبہ یہاں آچکا تھا۔ ان دونوں نے مشرقی جرمنی کے تاجروں کا بھیس بدل رکھا تھا۔ پولسکی کے چھوٹے سے ہوٹل میں کلرک نے ان کا خوش دلی سے استقبال کیا اور قصبے کے کئی اچھے ریستورانوں کا پتا بتا دیا۔

''کیا یہاں قریب واقع میزائل سائٹ دیکھنا بھی ممکن ہے۔'' یوخوف نے سرسری انداز میں بڑی معصومیت سے پوچھا۔

''میزائل سائٹ۔'' کلرک سادگی سے بولا۔ ''ملٹری بیس یہاں سے جنوب کی طرف دس کلومیٹر دور واقع ہے اور میزائل سیلو قصبے کے مشرق کی طرف اس سے دگنے فاصلے پر ہے۔ آپ اس طرف جاسکتے ہیں مگر فوٹو لینے کی کوشش نہ کریں۔

''یقیناً.....'' یوخوف بولا۔ اور دونوں اپنے کمروں میں آگئے۔ سامان رکھ کر وہ باہر آئے اور قصبے سے ایک کار کرائے پر حاصل کرلی' پھر وہ سائٹ کی طرف روانہ ہوگئے۔ وہ ملٹری کی حدود میں چند کلو میٹر آگے تک بڑھ گئے پھر الیگزینڈر نے کار کی ہیڈ لائیٹس بجھا دیں۔ آگے تاریکی باڑ لگی ہوئی تھی جس کے ساتھ ایک کچی سڑک جارہی تھی۔ اس باڑ میں برقی رو دوڑ رہی تھی اور جگہ جگہ علاقہ ممنوعہ کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔

الیگزینڈر نے بریک لگائے اور کار روک لی۔ وہ کار سے اتر آئے اور دوربین آنکھوں سے لگا کر چاروں طرف دیکھا۔ وہ کسی قدر بلندی پر تھے۔ اس لیے دور تک کے مناظر دیکھے جاسکتے تھے۔ باڑ کے اندر فاصلے پر ملٹری نما کنکریٹ کی ایک وسیع چھت تھی جو زمین سے صرف چند منٹ اونچی تھی۔ اس کے قریب تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین پول تھے۔ یہ حساس برقی آنکھیں تھیں جو کسی بھی آنے والے کو دیکھ سکتی تھیں۔

احاطے میں تین سیلو تھے۔ سینتیس' اڑتیس اور انتالیس یہ زیرزمین میزائلی اڈے تھے۔ ان میں سے انتالیس کا رخ تو انہیں معلوم تھا کہ نیویارک کی طرف ہے۔ باقی دو کا رخ بھی بڑے شہروں کی طرف ہی ہوسکتا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

الیگزینڈر..... ان کے نشانے نوے فی صد درست ہوتے ہیں۔" یوخوف نے بتایا۔ "ان تینوں زیرِ زمین اڈوں کے وسط میں ایک عمارت ہے جس کے نیچے کنٹرول کیسپول ہیں جہاں سے یہ میزائل فائر کیے جاسکتے ہیں۔ ان کیسپولوں میں شب و روز دو آدمی حکم کے منتظر بیٹھے رہتے ہیں۔ ہر آدمی ایک الگ شیشے کی کوٹھری میں بیٹھا ہے جہاں سے وہ اپنے ساتھی کو با آسانی دیکھ سکتا ہے۔ اگر کسی میزائل کو فائر کرنا ہو تو دونوں آدمیوں کو الگ الگ کوڈز میں پیغام بھیجا جاتا ہے۔ اور جب دونوں آدمی کنٹرول پر کام کرتے ہیں تب ہی کوئی میزائل فائر ہوسکتا ہے۔"

الیگزینڈر سر ہلا کر رہ گیا۔ بڑا حیرت انگیز انتظام تھا ان لوگوں کا۔ "آخر صرف دو دن میں ہم اس فائر کو کیسے روک سکتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "ہمیں صرف گورگن کا نام معلوم ہے اور ممکن ہے کہ وہ بھی صحیح نہ ہو۔"

"گورگن جو بھی ہے، جسے فورس تھری نے خرید لیا ہے۔" یوخوف نے خیال ظاہر کیا۔ "ممکن ہے کہ وہ یہاں کے ملٹری بیس میں ہی ہو۔ کنٹرول کیسپول تک اس کی پہنچ ہو اور فورس تھری نے کسی طرح اتنا لیس میزائل کو فائر کرنے والے کوڈز حاصل کر کے اس تک پہنچا دیئے ہوں۔" یوخوف نے کہا لیکن سوال یہ تھا کہ وہ ریڈ آرمی کے بیس میں کیسے گھستے اور کیسے گورگن کا پتا چلاتے۔

وہ دوبارہ کار میں بیٹھ گئے۔ اس بار بھی الیگزینڈر ربی وہیل کے پیچھے تھا۔ اس نے کار موڑی اور دوبارہ اس راستے پر ڈال دی جس پر چل کر وہ یہاں تک پہنچے تھے وہ کچی سڑک کے اختتام پر تھے کہ سڑک پر ایک ملٹری جیپ نظر آئی۔ اس میں ریڈ آرمی کے دو جوان تھے۔ وہ رات کے گارڈز تھے جو میزائل سائٹ گیٹ کے گارڈوں کی ڈیوٹی سنبھالنے جارہے تھے۔

ان کی کار دیکھتے ہی جیپ رک گئی اور ایک جوان اس میں سے نکل کر خود کار رائفل لہراتا ہوا ان کی طرف بڑھ آیا۔

"باہر آؤ۔ کون ہو تم لوگ۔ کیا تمہیں علم نہیں کہ یہ ممنوعہ علاقہ ہے۔" اس نے پے در پے کئی سوال کر ڈالے۔

یوخوف باہر آ گیا۔ "ہم جرمن تاجر ہیں۔" وہ بولا "ہمارا قیام پولسکی میں ہے۔ ہم اس طرف گھومنے آئے تھے کہ راستہ بھول گئے۔"

الیگزینڈر بھی باہر آ گیا اور جیپ کا ڈرائیور بھی رائفل لیے ان کے قریب آ کھڑا ہوا۔

"اپنے کاغذات دکھاؤ۔" نئے آنے والے فوجی نے ترشی سے کہا۔

الیگزینڈر اور یوخوف میں نظروں کا تبادلہ ہوا۔ ان کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ فوج یا پولیس کی تفتیش میں الجھ سکتے۔ الیگزینڈر نے کاغذات نکالنے کے بہانے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ریوالور نکال لیا۔ دونوں فوجیوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

الیگزینڈر کی گولی پہلے فوجی کے سینے میں اتر گئی۔ وہ لڑکھڑایا۔ اس کی خود کار رائفل کے تین فائر فضا میں کھو گئے اور وہ گر پڑا۔ دوسرے فوجی نے رائفل سیدھی کر کے الیگزینڈر کے سر کا نشانہ لیا۔ اسی وقت یوخوف نے اس کے ہاتھ پر چھٹا مارا۔ نشانہ خطا گیا اور رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ یوخوف کا دوسرا ہاتھ گھوما اور اس کی ناک پر پڑا۔ وہ ڈکراتا ہوا زمین چاٹنے لگا۔ یوخوف نے اپنا ریوالور نکال لیا اور اس کا رخ فوجی کے سر کی طرف کر دیا۔ اس نے ٹریگر دبا دیا اور فوجی کا بھیجا اڑ گیا۔ اس کا جسم زمین سے اچھلا اور پھر دوبارہ زمین پر گر کر ساکت ہوگیا۔

ان دونوں نے باری باری ان لاشوں کو گھسیٹ کر جھاڑیوں کے عقب میں ڈال دیا پھر یوخوف فوجی جیپ میں سوار ہوا اور اسے درختوں کے پیچھے چھوڑ آیا۔ درختوں نے لاشوں اور جیپ کو چھپا لیا تھا۔

"آؤ۔ چلیں۔" وہ بولا اور الیگزینڈر کے برابر کار کی نشست پر بیٹھ گیا۔ اب ان کا رخ پولسکی کی طرف تھا۔

☆☆

دوسری شام وہ پولسکی کے جنوب میں واقع ملٹری بیس کی طرف جارہے تھے۔ اس طرف خالی گاڑیاں آجارہی تھیں۔ کسی نے بھی ان کی کار پر توجہ نہ دی، پھر مین گیٹ سے نصف میل پہلے انہوں نے کار سڑک سے اتار کر روک لی۔ دائیں جانب بڑی سڑک کو کاٹتی ہوئی ایک کچی سڑک دور تک جارہی تھی۔ یوخوف کو یہ جگہ یاد تھی۔ وہ کئی سال پہلے ایک بار یہاں آچکا تھا۔

"سب کچھ ویسا ہی ہے۔" اس نے الیگزینڈر کو بتایا۔ "اس کچی سڑک پر آگے جا کر دائیں طرف ایک میدان ہے اور پھر درختوں کے جھنڈ۔"

یہاں انہیں ایک کار روکنی تھی، کسی آفیسر کی کار۔ یوخوف کار کے ہڈ سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔

اگلے آدھے گھنٹے میں کئی ملٹری کی گاڑیاں گزر گئیں پھر تقریباً چالیس منٹ بعد انہوں نے ایک کھلی گاڑی آتی دیکھی۔ اس گاڑی میں صرف ایک ہی آدمی تھا جو ریڈ آرمی آفیسر کی وردی میں تھا۔ اس کا قد کاٹھ یوخوف سے ملتا جلتا تھا۔ یوخوف سڑک پر جا کھڑا ہوا اور ہاتھ دے کر گاڑی روک لی۔ پھر اس نے اپنا ریوالور نکالا اور آفیسر کے سر کا نشانہ لے کر، کار کی کھڑکی پر جھک گیا۔

آفیسر نے پہلے تو احتجاج کیا مگر پھر الیگزینڈر کی صورت دیکھ کر ہتھیار ڈال دیے اور اس کی ہدایت پر گاڑی کچے میں موڑ لی۔

چند منٹ بعد ہی یوخوف آفیسر کی وردی میں روسی افسر لگ رہا تھا۔ اس نے اپنا میک اپ اتار دیا تھا اور آفیسر کے شناختی کارڈ پر اپنا فوٹو چپکا لیا تھا۔ اس دوران میں الیگزینڈر آفیسر کو کور کیے کھڑا رہا۔ پھر الیگزینڈر نے اسے اپنی کار کے بمپر کے ساتھ لٹا دیا۔

یوخوف اکیلا ہی اندر جانا چاہتا تھا۔ جب کہ الیگزینڈر کو یہ بات پسند نہ تھی لیکن مجبوری تھی۔ ان کا مطلوبہ آدمی اندر ہی ہوسکتا تھا۔ یوخوف تنہا اندر جا کر اسے آسانی سے ڈھونڈ سکتا تھا پھر وہ اس جنونی مشن کو نا کام بنا سکتے تھے۔

"اگر میں دو گھنٹے تک بھی نہ آؤں تو پھر اس آفیسر کا جو چاہے کرنا۔" یوخوف نے سنجیدگی سے کہا اور الیگزینڈر کا نشانہ تھپتھپا دیا۔

الیگزینڈر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ یوخوف ملٹری کار میں بیٹھا اور بیس کی طرف روانہ ہوگیا۔

عمارت کے اندر داخل ہونے میں اسے کوئی دشواری پیش نہ آئی تھی۔ سیدھی سڑک عمارت کے اندر دور تک چلی گئی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف لکڑی کی عمارتیں تھیں۔ جو بریکیں لگ رہی تھیں۔ یوخوف کی نظریں کسی ایسی عمارت کی تلاش میں تھیں جو دفتر ہوسکتا ہو، پھر اندازے سے اس نے ایک پختہ عمارت کے سامنے کار روک دی اور اتر کر اس طرح عمارت میں داخل ہوا جیسے وہی یہاں کا کمانڈنگ آفیسر ہوا۔ اتفاق سے یہی عمارت ہیڈ کوارٹرز لڈنگ تھی۔

ہیڈ کوارٹرز میں بڑی آسانی سے ڈیوٹی کلرک سے گورگن کے بارے میں علم ہوگیا۔ کلرک نے اسے بتایا کہ سارجنٹ گورگن آج ہیڈ کوارٹرز نہیں آیا۔ وہ کہہ گیا تھا کہ آدھی رات کو اپنی ڈیوٹی پر پہنچ جائے گا۔ اس کی ڈیوٹی میزائل کیسپول میں تھی۔ کلرک گورگن کے شہر کے پتے سے لاعلم تھا۔ مگر اس نے بتایا کہ آدھی رات کو ڈیوٹی پر آنے کے بعد اس سے رابطہ پیدا کیا جاسکتا تھا۔

یوخوف نے معنی خیز انداز میں سر ہلا دیا۔ اب اس میں تو کوئی شک ہی نہیں تھا کہ گورگن غدار تھا اور چونکہ اس کی ڈیوٹی میزائل سائٹ پر تھی اس لیے فورس تھری نے اس کا انتخاب کیا تھا۔ یوخوف نے کلرک کا شکریہ ادا کیا اور واپسی کے لیے پلٹا لیکن پھر ٹھٹک کر رک گیا۔ اسے کلرک کے ساتھ والے کمرے پر 'میزائل آفیسر' لکھا نظر آ گیا تھا۔ وہ فون کرنے کے بہانے سے، کلرک سے اجازت لے کر جلدی سے دفتر میں گھس گیا اور اندر جاتے ہی میز پر رکھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کاغذات اور درازیں کھنگالنا شروع کر دیں۔ کمرے میں اس وقت کوئی بھی نہیں تھا۔ میزائل آفیسر شاید کہیں گیا ہوا تھا۔

میز پر بے شمار کاغذات تھے مگر کوئی اس کے کام کا نہیں تھا۔ اچانک دراز میں اسے میزائل سائٹ میں جانے کے لیے ایک پاس بک نظر آ گئی۔ اس نے جلدی سے دو پاس پھاڑے اور جیب میں رکھ لیے۔ پھر باہر آ گیا۔ میز پر رکھے ہوئے کاغذات پر وہ میزائل آفیسر کے دستخط دیکھ چکا تھا اور انہیں بڑی آسانی سے نقل کر سکتا تھا۔

دس منٹ بعد وہ الیگزینڈر کے پاس تھا۔ گورگن آج بیس میں نہیں آیا۔" اس نے بتایا۔ "وہ آج پولسکی گیا ہوا ہے اور وہ ان چند آدمیوں میں سے ایک ہے جو میزائل سائٹ پر کیسپول کنٹرول میں ڈیوٹی دیتے ہیں۔

"خدایا۔" الیگزینڈر کے منہ سے نکلا۔ "تو گویا ہم صحیح آدمی تک پہنچ گئے ہیں۔"

یوخوف نے اثباتی انداز میں سر جھٹکا۔ "میزائل سائٹ پر چند ہی لوگ ہوتے ہیں۔ ان میں کچھ گارڈز ہیں' جو گیٹ پر اور بلڈنگ میں ہوتے ہیں اور کیسپول کے اندر دو آدمی ہوتے ہیں۔" یوخوف نے بتایا۔ "گورگن چونکہ سارجنٹ ہے' اس لیے گارڈ نہیں ہو سکتا۔ اب یا تو وہ کنٹرول مین ہے کیسپول کا یا پھر باہر کی سیکورٹی کا انچارج ہے اس کی ڈیوٹی آج آدھی رات سے شروع ہے اور تمہیں یاد ہوگا کہ میزائل کو فائر کرنے کی تاریخ آدھی رات کے بعد سے شروع ہو جاتی ہے۔"

اس مرتبہ سر ہلانے کی باری الیگزینڈر کی تھی۔ وہ یوخوف سے متفق تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ گورگن شہر میں تھا اور کسی کو اس کے ٹھکانے کا علم نہیں تھا۔ ان دونوں کے پاس صرف چند گھنٹے تھے جنہیں وہ اس کی تلاش میں ضائع نہیں کر سکتے تھے۔ طے یہی پایا کہ وہ دونوں میزائل سائٹ کے راستے پر پہنچ جائیں اور وہیں اس کا انتظار کریں' پھر جیسے ہی وہ آئے تو اس سے ساری باتیں پوچھ کر اسے قتل کر دیں لیکن اس میں ایک قباحت تھی وہ کسی غلط کار کو روک کر مصیبت میں بھی پھنس سکتے تھے۔

"ویسے میں ایک چیز اور لے آیا ہوں۔" یوخوف نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دو نقلی پاس نکالے اور اس کے سامنے کر دیئے الیگزینڈر روسی زبان سے اتنا واقف تھا کہ ان کا مطلب سمجھ لیتا پاس دیکھتے ہی وہ حیرت آمیز خوشی سے چلا اٹھا۔ اس کا خیال تھا کہ گورگن کو اندر جانے دیں پھر ان پاسوں کی مدد سے وہ اندر جائیں اور اس کی پوری پارٹی کو دبوچ لیں۔

"کیسپول کمپلیکس میں طرف تین آدمی ہوں گے۔" الیگزینڈر کہہ رہا تھا۔ "اور تینوں الگ الگ میرے خیال میں گورگن اوپر ہوگا کیسپول کنٹرول مین کی حیثیت میں۔ اگر ہم باہر کے گرڈوں کو ٹھکانے لگا دیں تو اندر اس سے تنہائی میں نمٹنے کے لیے ہمیں خاصا وقت مل جائے گا۔"

یوخوف پیار سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اسے عزم و ہمت کے اس پیکر پر رشک آ رہا تھا۔ الیگزینڈر کے پلان پر عمل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ پہلے ایک وردی حاصل کی جاتی اس کے لیے انہوں نے آفیسر کو وہیں ایک درخت سے باندھا اور پھر دونوں فوجی گاڑی میں پولسکی کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ کوئی خطرے والی بات نہیں تھی۔ آفیسر اپنے شہری دوستوں کو بعض اوقات پولسکی میں لے آتے تھے۔

جب وہ پولسکی پہنچے تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ انہوں نے ایک چھوٹے سے کیفے میں کھانا کھایا اور ایک گھنٹے بعد اپنے شکاری کی تلاش میں شہر کی گلیوں میں پیدل ہی گھومنے لگے۔ آخر انہیں مطلوب کا آدمی مل گیا۔ یہ ایک سارجنٹ تھا جو تنہا ایک تاریک گلی میں سے گزر رہا تھا۔

یوخوف نے پیچھے سے اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ ذرا دیر بعد ہی اس کی وردی الیگزینڈر کے جسم پر تھی۔ اس کے شناختی

کارڈ پر الیگزینڈر نے اپنا فوٹو چپکا لیا۔ اسے اٹھا کر انہوں نے ایک اندھیرے کونے میں ڈال دیا اور دونوں اپنی کار کی طرف آ گئے۔

یوخوف نے دونوں پاس نکال کر سامنے رکھے اور انہیں پرکرنے لگا پھر ان پر اس نے میزائل آفیسر کے جعلی دستخط کر دیئے جو اس کے لیے مشکل نہیں تھے جب وہ شہر سے باہر پہنچے تو رات کے گیارہ بج رہے تھے گاڑی الیگزینڈر چلا رہا تھا اور بالکل روسی آفیسر کا اردلی لگ رہا تھا۔ ساڑھے گیارہ بجے وہ میزائل سائٹ پر جانے والی سڑک پر آ گئے اس وقت ایک اور کار ان کے قریب سے گزری اور تیزی سے پھاٹک کی طرف بڑھ گئی۔ اس میں صرف ایک آدمی تھا وہ سیدھا عمارت کے اندر چلا گیا تھا۔

پندرہ منٹ بعد ان کی کار جس گیٹ پر کھڑی تھی۔ ان کی کار رکتے ہی تین گارڈز نے انہیں گھیر لیا۔ چوتھا گارڈ۔ اندر ہی چکر لگا رہا تھا۔

"کیا بات ہے کیپٹن۔" ان میں سے ایک گارڈ نے یوخوف سے پوچھا۔ وہ ان دونوں کو بڑی تیز نظر سے گھور رہا تھا۔

"میں کیپٹن اوبلوسکی ہوں۔ فرام ہیڈ کوارٹر۔" یوخوف نے اپنا تعارف کرایا۔ "کیا سارجنٹ گورگن ڈیوٹی پر آ گیا ہے۔"

"ہاں جناب۔" گارڈ نے مرعوب ہوتے ہوئے کہا۔ "اسے آئے ہوئے بیس منٹ گزر گئے ہیں۔"

"میں بیس کمانڈو کے حکم سے ذرا دیر کے لیے گورگن سے ملنا چاہتا ہوں۔ ایک اہم کام ہے۔" یوخوف بولا اور دونوں پاس نکال کر گارڈ کی طرف بڑھا دیے اس کا دل خطرے کے احساس سے اندر ہی اندر دھڑک اٹھا تھا۔

گارڈ نے فلش لائٹ میں پاسوں کا معائنہ کیا۔ "آپ جا سکتے ہیں کیپٹن۔" وہ پاس لوٹاتے ہوئے بولا۔

یوخوف نے پاس لے لیے اور الیگزینڈر نے گیئر بدل کر گاڑی اندر کی طرف بڑھا دی۔

☆☆

ماحول پر سناٹا طاری تھا۔ آگے چل کر سڑک دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی کنارے پر لگی ہوئی ایک تختی دونوں سمت اشارہ کر رہی تھی۔ ایک طرف میزائل سیلو تھا اور دوسری طرف میزائل کنٹرول کمپلیکس۔ الیگزینڈر نے گاڑی کمپلیکس کی سمت موڑ دی۔ کئی میل دور جا کر وہ ایک عمارت کے سامنے رک گئے۔ یہ ایک چھوٹی سی عمارت تھی جس کے نیچے میزائل کمپلیکس واقع تھا۔

گیٹ پر ایک چوکیدار موجود تھا۔ کار رکتے ہی وہ ان کے قریب آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ کیپٹن کو اترتے دیکھ کر اس نے تیزی سے سلیوٹ مارا۔ اور پھر رائفل سیدھی کر لی۔ "کیا کام ہے کیپٹن۔" اس نے پوچھا۔

"مجھے سارجنٹ گورگن سے ملنا ہے۔" یوخوف نے بتایا اور دونوں پاس نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ الیگزینڈر بھی اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ پھر جیسے ہی گارڈ کی نظریں پاس دیکھنے جھکیں۔ الیگزینڈر کا ایک زوردار ہاتھ گردن پر پڑا۔ وہ بغیر آواز نکالے ڈھیر ہو گیا۔ الیگزینڈر نے اس کی بندوق اٹھالی اور دونوں اندر گھس گئے۔

یوخوف نے اپنا ریوالور نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا وہ ایک طویل ہال میں تھے یہاں ایک میز پر گورگن بیٹھا ہوا تھا دبلا پتلا اور پریشان سے چہرے والا شخص۔ دیوار کے ساتھ لگی ایک کرسی پر گارڈ بیٹھا اپنی رائفل دیکھ رہا تھا۔ دونوں کو اس انداز میں آتا دیکھ کر وہ چونک پڑے۔ گورگن سناٹے میں آ گیا لیکن گارڈ نے فوری حرکت کی۔ اس نے رائفل سیدھی کی نشانہ لیا جو اس سے قریب تھا۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ الیگزینڈر پر فائر کھولتا۔ یوخوف کے ریوالور نے یکے بعد دیگرے تین گولیاں اگل دیں جن میں سے ایک دیوار میں جا دھسی۔ دوسری گارڈ کے حلقوم میں گھس گئی اور تیسری نے اس کی ایک آنکھ اڑا دی۔ گارڈ بری طرح دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کی انگلی خودکار رائفل کے ٹریگر پر تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹریگر دبتے ہی خودکار رائفل سے تڑاتڑ گولیاں برسنے لگیں

الیگزینڈر نے فرش پر غوطہ لگایا مگر ایک گولی اس کے شانے کو چھید ہی گئی۔ دوسری گولی یوخوف کی ران میں اتر گئی گورگن میز کے نیچے دبک گیا تھا۔ الیگزینڈر نے رائفل سیدھی کی اور گارڈ کو چھلنی کر دیا۔ اسی وقت میز کے نیچے سے گورگن نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول دبا ہوا تھا۔ جس کی نالی الیگزینڈر کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

یوخوف نے فوراً ہی گولی چلا دی جو گورگن کے بازو میں سوراخ کر گئی۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ الیگزینڈر نے رائفل کا دستہ گورگن کے منہ پر دے مارا۔ اس کے جبڑے کی ہڈی ٹوٹ گئی اور خون بہ کر اس کے لباس کو تر کرنے گا۔ وہ نیچے گر پڑا۔ الیگزینڈر نے دوسرا وار کرنے کو ہاتھ اٹھایا مگر یوخوف نے روک دیا۔ کچھ معلوم کرنے کے لیے یہ ان کا واحد ذریعہ تھا الیگزینڈر نے ہاتھ روک لیا۔

یوخوف نے گورنگ کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور کرسی پر دھکیل دیا۔

"تم آج رات میزائل انتالیس فائر کرنے والے ہو۔" یوخوف اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ جو کرب کی شدت سے بھیگ گئی تھیں۔ "تم یہ فائر کیسے کرو گے۔"

گورگن نے الیگزینڈر کی طرف دیکھا پھر یوخوف کی طرف لیکن وہ بولا کچھ نہیں تھا۔ یوخوف نے الیگزینڈر کی طرف دیکھ کر سر ہلایا اور الیگزینڈر نے رائفل کا بٹ زور سے اس کے منہ پر دے مارا اس کا دوسرا جبڑا بھی بیکار ہو گیا تھا۔

"یہ آخری موقع ہے۔" یوخوف بولا۔ "اب بھی اگر تم نے ہمارے سوالوں کے جواب نہیں دیئے تو ہم تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" اس کی آواز میں غراہٹ تھی۔

"بتاؤ۔ تم میزائل کو کس وقت فائر کرو گے۔"

الیگزینڈر نے پوچھا۔

"ڈیڑھ بجے۔" گورگن نے ہتھیار ڈال دیئے۔ "میں نے ہیڈ کوارٹرز سے دونوں مختلف کوڈز چرا لیے تھے۔

میزائل انتالیس دنیا کا سب سے بڑا جنگی ہتھیار تھا۔ یوخوف کو جھرجھری سی آ گئی۔ کیا تمہیں علم ہے کہ اس کا رخ کس طرف ہے۔

"یہ مجھے نہیں بتایا گیا۔" گورگن نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیا نیچے کیپسول آفیسرز بھی تمہارے ساتھ ہیں۔" الیگزینڈر نے پوچھا۔

"نہیں۔ مجھے اکیلے ہی سب کچھ کرنا ہے۔ وہ الگ دو کیپسولوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔" گورگن نے بتایا۔ "مجھے پہلے وہاں جا کر انہیں قتل کرنا ہے۔ اور پھر کوڈز کے ذریعے کنٹرول کو متحرک کرنا ہے۔

"کھڑے ہو جاؤ۔" الیگزینڈر غرایا۔ شانے کے زخم کی وجہ سے اس کا بازو بری طرح دکھ رہا تھا۔ مگر ابھی اس میں خاصی جان تھی۔ "تم اسے کیسے کھولتے ہو۔"

اس نے دیوار میں بنے لفٹ کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ خود بے جا کر اس کی باتوں کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔

گورگن کے چہرے سے کرب اور فکرمندی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس نے دوسری سمت بنے ایک باکس کی طرف اشارہ کیا۔ الیگزینڈر اور یوخوف نے بیک وقت اس طرف دیکھا۔ اسی وقت گورگن نے میز کے نیچے ایک بٹن دبا دیا۔ لفٹ کا دروازہ کھلا اور وہ بھاگ کر اس میں گھس گیا' پھر اس سے قبل کہ وہ دونوں اس کی طرف بڑھتے' لفٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ اور وہ نیچے اترنے لگی۔

"خدا اسے غارت کرے۔ وہ ابھی تباہی پھیلا سکتا ہے۔" الیگزینڈر غصے میں بڑبڑایا۔ "ہم بازی ہار گئے۔"

وہ زیر زمین میزائل کی طرف جا رہا تھا۔

یوخوف فکرمند لہجے میں بولا۔ "اور شاید اس طرف جانے کا یہی واحد راستہ ہے۔"

دونوں لفٹ کے چمکتے ہوئے ہندسوں کو دیکھ رہے تھے۔ نیچے پانچ منزلیں تھیں۔ اوپری چار منزلوں میں مشینیں تھیں اور آخری منزل میں کنٹرول کیپسول۔ لفٹ تین منزل نیچے اتر چکی تھی۔ الیگزینڈر اس باکس کی طرف بڑھ گیا۔ جس کی طرف گورگن نے اشارہ کیا تھا۔ اس میں چار بٹن لگے ہوئے تھے جن میں سے تین لفٹ کو لے جانے کے لیے تھے اور چوتھے پر واپسی لکھا ہوا تھا۔

الیگزینڈر نے لفٹ انڈیکیٹری کی طرف دیکھا۔ لفٹ آخری منزل تک پہنچ چکی تھی۔ اس نے واپسی کا بٹن دبا دیا۔ لفٹ آہستہ آہستہ اوپر آنے لگی۔ یوخوف لفٹ کے بدلتے ہوئے ہندسوں کی طرف دیکھنے لگا۔

☆☆

لفٹ میں نیچے اترتے ہوئے گورگن نے لفٹ میں چھپا کر رکھا جانے والا ریوالور نکال لیا۔ یہ فورس تری کی ہدایت پر ہنگامی حالات کے لیے رکھا گیا تھا لفٹ رکی تو وہ اس میں سے نکلا اور ایک چھوٹی سی راہداری میں آ گیا۔ جس کے سرے پر دو دھاتی دروازے تھے۔ ان دروازوں میں ایک انچ موٹا بلٹ پروف شیشہ لگا ہوا تھا۔ اس نے باہر لگا ایک بٹن دبایا اور کیپسول کے اندر بیٹھے آدمی کو اپنی طرف متوجہ کیا پھر جیب سے ایک چابی نکال کر دروازے کے قفل میں گھما دی مگر دروازہ اسی وقت کھل سکتا تھا۔ جب اندر والا بھی اپنی طرف سے قفل کھولے۔ اندر والے نے ایک نظر گورگن کی طرف دیکھا اور ایک بٹن دبا دیا کلک کی آواز سنائی دی اور دروازہ کھل گیا۔

گورگن لپک کر کیپسول میں جا گھسا۔ اس سے قبل کہ گورگن کا سوجا ہوا۔ خون آلودہ چہرہ دیکھ کر وہ شخص کچھ سمجھ سکتا۔ گورگن نے ریوالور نکالا اور اس کے سینے میں دو گولیاں اتار دیں۔ اس شخص کی حیرت زدہ آنکھیں اس پر جمی رہ گئیں۔ گولیاں لگتے ہی وہ لڑکھڑایا اور..... پھسلتا ہوا فرش پر جا پڑا دوسرے کیپسول کا آدمی اس طرف متوجہ نہیں تھا۔

گورگن پینل پر جھک گیا اور جلدی جلدی کچھ لیور دبا دیے ڈائل پر روشنیاں چمکیں اور نمبر ابھر آئے۔ پھر اس نے اپنی جیب سے پرچا نکالا اور اس پر لکھے ہوئے کوڈ کے بٹن دبانے لگا ایک اور ڈائل پر نمبروں کی قطار چمکی۔ گورگن نے ہلکا سا تو قفہ کیا پھر طویل پینل کے اوپر لگا بڑا سرخ بٹن دبانے لگا۔ ایک میزائل فائر کے لیے نصف تیار ہو چکا تھا۔

"اے سارجنٹ..... یہ کیا پاگل پن ہے۔" گورگن نے دوسرے کیپسول سے مائک کی آواز سنی پھر وہ آدمی باہر آ گیا۔ "یہ کیا کر رہے ہو تم بیوقوف آدمی۔" وہ ہذیانی انداز میں چلایا۔

گورگن نے لفٹ کی طرف دیکھا اور چونک پڑا اس کا دروازہ بند ہو چکا تھا اور وہ اوپر جا رہی تھی اس نے دل ہی دل میں خود کو اس غفلت پر کوسا پھر سر جھٹک کر دوسرے کیپسول کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کیپسول کے اندر سے نکلنے والا آدمی اس پر جھپٹا مگر گورگن کے ریوالور سے نکلنے والی گولی نے اسے ٹھنڈا کر دیا تھا۔

ایک بار پھر اس نے لیور دبائے اور پرچا دیکھ کر کمپیوٹر کے پیٹ میں کوڈ اتارنے لگا۔ ڈائل پر ہندسے چمک رہے تھے۔ اب اسے میزائل فائر کرنے کے لیے صرف سرخ بٹن دبانا تھا۔ مگر اسی وقت راہداری میں کسی کے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ گورگن کا دل دھڑک اٹھا۔ یہ الیگزینڈر اور یوخوف تھے جو نیچے آ گئے تھے۔

الیگزینڈر نے گورگن کو دیکھتے ہی اس کی طرف چھلانگ لگا دی۔ ایک ہی نظر میں وہ حالات کو بھانپ چکا تھا۔ ڈائل پر چمکتے ہوئے ہندسے اسے خطرے کا پتا دے رہے تھے۔ اس نے رائفل سیدھی کی اور ٹریگر دبا دیا۔ گورگن فضا میں اچھلا اور پھر ڈائل پر سے پھسلتا ہوا فرش پر آ رہا۔ اسے صرف سرخ بٹن دبانا تھا۔ اس کا ہاتھ ایک بار پھر اٹھا۔ رائفل سے دو گولیاں نکلیں اور پھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گورگن ساکت ہوگیا۔ اس کا اٹھا ہوا ہاتھ ڈائل پر پہنچنے سے پہلے ہی نیچے گر گیا تھا۔ یوخوف دوسرے کیپسول میں تھا۔ وہ دوڑتا ہوا الیگزینڈر کے پاس گیا۔

"کیا وہ کامیاب ہوگیا۔" اس نے متوحش انداز میں پوچھا۔ نہیں اسے چند ثانیے کی دیر ہوگئی۔ الیگزینڈر بڑبڑایا

"ورنہ میزائل اپنے ٹارگٹ تک پہنچ چکا تھا اوف نیویارک کھنڈر ہو جاتا۔"

یوخوف بے یقینی کے عالم میں اسے گھور کے رہ گیا۔ "کہیں تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو۔" وہ بے اعتباری سے بولا۔ اسے کھڑا ہونے میں وقت محسوس ہو رہی تھی۔ مارنے والوں نے اسے پوری قوت سے ٹھوکریں ماری تھیں۔ پھر وہ سنبھل گیا۔

"تم خود دیکھ لو۔" الیگزینڈر بولا اور پرچا یوخوف کی طرف بڑھا دیا۔ یہ ایک خط تھا جو اسپینی زبان میں لکھا ہوا تھا۔ اسے اسیٹوراس نے ابتدائی زمانے میں عامر کو لکھا تھا۔ اس میں فورس تھری کا نام نہیں تھا۔ مگر اشارہ اسی کی طرف تھا۔ ان کا ہیڈ کوارٹر ایک کاروباری عمارت کے نیچے پوشیدہ تھا اور اس عمارت کا نام تھا۔ "دی پمپاس الیکٹرانکس کارپوریشن۔"

یوخوف نے پرچا لے کر پڑھا۔ "میرے خیال میں یہ جنگلات میں واقع ہے۔" وہ بولا۔ "قریب ترین شہر سو میل دور سان پیڈرو ہے۔" اس کے چہرے پر کامیابی کی وجہ سے، انتہائی زخمی ہونے کے باوجود اطمینان جھلک رہا تھا پھر وہ الیگزینڈر کے سہارے کچن میں آ گیا۔ اس کے چہرے کی بری حالت تھی مگر اسے ذرا پروا نہ تھی۔

"گویا اب ہم فورس تھری کے ہیڈ کوارٹر کو تباہ کریں گے۔" یوخوف، الیگزینڈر کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

"اس کے سوا انہیں روکنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔" الیگزینڈر بولا۔ وہ اپنے ریوالور کو دوبارہ لوڈ کر رہا تھا۔ "اگر ہم کسی طرح ان کے ہیڈ کوارٹر کو ان کے تمام اسلحے سمیت تباہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر ان میں ذرا بھی جان نہیں رہے گی۔"

الیگزینڈر کا منصوبہ تھا تو درست مگر اس میں ایک قباحت تھی۔ فورس تھری کا ہیڈ کوارٹر ان کے لیے پنک ہاؤس سے بھی زیادہ مضبوط قلعہ ثابت ہو سکتا تھا۔ ارجنٹینا کی پوری فوج اور سیکرٹ پولیس، اسٹریشر کے کنٹرول میں تھی۔ وہ ان کے علم میں لائے بغیر، ان سے جو کام چاہتا، بڑی آسانی سے لے سکتا تھا۔ یوخوف کو اس بات کا اندازہ تھا مگر اس نے بغیر کچھ کہے سر ہلا کے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

خطرے تو بہر حال ہر جگہ موجود تھے ان دونوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس علاقے میں جاتے وقت غیر معمولی احتیاط کی ضرورت تھی۔ کل ان کا بڑا قومی دن تھا۔ ریوکارٹو کے ملٹری کیمپ میں کل کے فوجی مظاہرے کی تیاری جاری تھی یہ جنگی مشقیں خود اسٹریشر اپنی نگرانی میں کرا رہا تھا۔ ان مشقوں میں فضائیہ بھی حصہ لے رہی تھی۔ فضائیہ کچھ دیر چند سرکاری عمارتوں پر بمباری کا مظاہرہ بھی کرنے والی تھی۔

یوخوف نے ایک ہاتھ سے اپنی کمر سہلائی پھر لنگڑاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا لیکن فوراً ہی ٹھٹک کر رک گیا۔

دونوں، کاروں کے رکنے کی آوازیں سن رہے تھے۔ الیگزینڈر دوڑتا ہوا، دروازے کی طرف بڑھا اور دروازے کے برابر میں بنی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ یوخوف بھی لنگڑاتا ہوا اس تک پہنچ گیا۔

"اسٹریشر آیا ہے۔" الیگزینڈر نے بتایا۔ "اس کے ساتھ کار میں تین آدمی اور ہیں۔ ان میں ایک یقیناً اسیٹوراس ہوگا دوسری کار میں دو آدمی ہیں۔ مگر وہ اندر نہیں آ رہے ہیں۔"

"کیا اسٹریشر اندر آ رہا ہے۔" یوخوف نے پوچھا۔

الیگزینڈر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "بھاگ کر اسٹیڈی روم کے دروازے کے پیچھے چھپ

جاؤ۔" الیگزینڈر بولا اور ریوالور نکال کر دروازے کے ساتھ ہی دیوار سے چپک گیا۔ یوخوف اپنا ریوالور نکالتا ہوا اسٹیڈی روم میں گھس گیا۔

پورٹیکو میں سے قدموں کی آواز آ رہی تھی پھر دروازہ کھلا اور اسٹریشر اندر آ گیا۔ اس کے پیچھے اسیٹوراس تھا۔ پھر فورس تھری کا ایک باڈی گارڈ اور آخر میں ایک باوردی ڈرائیور تھا، اسٹریشر راہداری میں چند قدم بڑھا پھر اس کی نظر وہاں بکھری ہوئی لاشوں پر پڑی اور وہ پتھر کی طرح ساکت ہو گیا۔ اسیٹوراس بھی آنکھیں پھاڑے، خون میں بھیگی لاشوں کو دیکھ رہا تھا۔ باڈی گارڈ اور ڈرائیور اپنے پستول نکالنے لگے مگر اسی وقت الیگزینڈر کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ وہ اچھل پڑے۔

الیگزینڈر اپنا ریوالور لیے ان کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ اس کا ریوالور ان کی سمت اٹھا ہوا تھا۔ چاروں بیک وقت اس کی طرف مڑ گئے۔ اسٹریشر کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا۔ یوخوف بھی اپنی جگہ سے نکلا اور ریوالور سنبھالتا ہوا ان کے عقب میں آ کھڑا ہوا۔ اسیٹوراس کے چہرے پر تاریکی پھیل گئی۔ وہ غرایا اور باڈی گارڈ سے ریوالور چھین کر اسے الیگزینڈر کی طرف تان دیا۔

ٹریگر پر اس کی انگلی کا دباؤ پڑنے ہی والا تھا کہ یوخوف نے گولی چلا دی جو اسیٹوراس کے شانے میں اتر گئی۔ وہ پیروں پر گھوم گیا۔ ڈرائیور اس کے ریوالور پر جھپٹا مگر الیگزینڈر کے ریوالور سے نکلی ہوئی گولی اس کے سینے میں جا اتری۔ وہ اسٹریشر کے پیروں کے پاس گر کر پھسل گیا۔

اسیٹوراس فرش پر پڑے، باہر کھڑے ہوئے باڈی گارڈز کو پکارنے لگا جو فائرنگ کی آوازیں سن کر پہلے ہی اس طرف دوڑ پڑے تھے۔ الیگزینڈر نے کھلی کھڑکی میں سے فائر کیا اور آنے والا باڈی گارڈ سینہ تھامے، فرش پر گرا اور تڑپنے لگا۔ دوسرا آدمی مڑا اور کار کی طرف بھاگ لیا مگر اس سے پہلے کہ وہ کار تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا۔ الیگزینڈر کے ریوالور نے شعلہ اگل دیا جو اسے بھی چاٹ گیا تھا۔

"اپنے ہاتھ اٹھا لو۔" یوخوف، اسٹریشر اور اس کے قریب کھڑے باڈی گارڈ کی طرف دیکھ کر غرایا۔

اسٹریشر بڑی حیرت سے الیگزینڈر کی فائرنگ دیکھ رہا تھا جو ذرا سی دیر میں اس کے بہترین آدمیوں کو ٹھنڈا کر چکی تھی۔

یوخوف نے آگے بڑھ کر باڈی گارڈ کے پاس موجود دوسرا پستول نکال لیا، وہ سخت نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اسیٹوراس اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا اس کے شانے سے خون بہہ کر لباس کو تر کر رہا تھا۔ باڈی گارڈ نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا اور وہ دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

"تم یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جا سکو گے۔" وہ چلایا۔ الیگزینڈر اس کی طرف بڑھا اور پوری قوت سے ریوالور کی نال اس کے منہ پر دے ماری۔ ہڈی ٹوٹنے کی آواز آئی۔ اسیٹوراس کے منہ سے بری طرح خون بہہ نکلا۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر گیا۔

"تم بہت زیادہ باتیں کرتے ہو۔" وہ اسے ٹھوکر مارتے ہوئے بولا۔

یوخوف، اسٹریشر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "جنرل۔" وہ بولا۔ "تیانزا میزائل کس دن فائر کرنے کا ارادہ ہے۔"

اسٹریشر کو ایک جھٹکا سا لگا۔ "تیانزا میزائل۔" وہ حیرت سے بولا۔ اسے تعجب تھا کہ یہ لوگ آپریشن اپوکلپسی کے بارے میں کتنے باخبر تھے۔ اسے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہ ہوئی کہ پولسکی میں بھی یہی لوگ تھے، جنہوں نے ان کے عزائم کو خاک میں ملا دیا تھا۔

"انہیں کچھ نہ بتانا اسٹریشر۔" اسیٹوراس دیوار کے سہارے بڑھتا ہوا چلایا۔

الیگزینڈر نے خونخوار نظروں سے اسیٹوراس کی طرف دیکھا اور اسٹریشر کے قریب آ گیا۔ "اگر تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تو میں تمہاری کھوپڑی اڑا دوں گا۔" اس کی غراہٹ بھیڑیے سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مشابہہ تھی۔ ''بتاؤ۔'' اس نے ریوالور اسٹریشر کے سر سے لگا دیا۔

اسٹریشر نے اس کی آنکھوں میں دیکھا جہاں خون ابل رہا تھا' وہ خوف زدہ ہو کر ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا' فورس تھری کو بچانے کے لیے خود زندہ رہنا ضروری تھا۔ اگر اس امریکی پاگل نے گولی چلا دی تو پھر فورس تھری کس کام کی۔ اس نے سوچا۔

''وہاں ہم تیانزا سائٹ سے ایک میزائل فائر کرنا چاہتے ہیں لیکن ابھی تک ہمارا منصوبہ مکمل نہیں ہوا۔'' وہ رکتے ہوئے بولا۔ ''اس میں شاید ایک ہفتہ یا ایک مہینہ لگ جائے گا۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو جنرل۔'' الیگزینڈر غصے سے دہاڑا اور اپنے ریوالور کی نال اسٹریشر کے منہ پر دے ماری۔ ''ہم اس کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں اسٹریشر۔'' وہ چلایا۔ ''اب اگر تم نے جھوٹ بولا تو زمین چاٹتے نظر آؤ گے۔''

''کل۔'' اسٹریشر ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ''میزائل کل دوپہر کو فائر کیا جائے گا۔''

''خاموش رہو بزدل۔'' اسٹیوراس چلایا۔ ''غدار۔''

''چپ ہو جاؤ گدھے کے بچے۔'' اسٹریشر نے اسٹیوراس کی طرف دیکھ کر تلخی سے کہا۔

''اس منصوبے کو ختم کرنے کے لیے تم کسے کال کرو گے۔'' یوخوف نے دریافت کیا۔ ''میں تمہیں صرف پانچ سیکنڈ دیتا ہوں پھر میں ٹریگر دبا دوں گا۔''

اسٹریشر ٹھوک نگل کر رہ گیا۔ اس کی پیشانی پسینے سے بھر گئی تھی۔ وہ بالکل سیدھا اور بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ ''ایل مین۔'' اس کے منہ سے نکلا اور پیشانی پر سے بہنے والا پسینہ اس کے رخساروں پر آڑھلکا۔ اسٹیوراس اچھلتا ہوا دیوار سے ہٹا اور اس پر جھپٹا مگر یوخوف نے اسے راستے میں ہی روک لیا۔ وہ بری طرح بھنا رہا تھا۔

''ہوانا میں۔'' الیگزینڈر نے اسٹریشر سے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ الیگزینڈر نے اس کے سر سے ریوالور ہٹا کر اس کی پسلیوں میں لگا دیا تھا۔ ''ٹھیک ہے۔ چلو۔ اسے کال کرو۔'' اس نے حکم دیا۔

اسٹریشر ہچکچایا مگر الیگزینڈر کے ریوالور کے دباؤ کے آگے بے بس ہو گیا۔ یوخوف اور الیگزینڈر ان دونوں کو لے کر اسٹیڈی روم میں رہ گئے۔ اسٹریشر نے آگے بڑھ کر فون اٹھایا اور آپریٹر سے طویل فاصلے کی کال ملانے کے لیے کہا۔ چند منٹوں بعد وہ ایل مین کے ساتھی سے بات کر رہا تھا۔ ایل مین اس وقت موجود نہیں تھا۔

''میں جنرل اسٹریشر بول رہا ہوں۔'' اس کا لہجہ سخت اور حکمیہ تھا۔ ''ایل مین سے کہہ دینا کہ تیانزا آپریشن غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دیا گیا ہے۔ یہ حکم فوری عمل درآمد کے لیے ہے۔''

اس نے فون رکھ دیا۔ اس کے سینے میں لاوا ابل رہا تھا مگر فورس تھری کے ساتھ ہی اپنی زندگی بچانے کے لیے ایسا کرنا بھی لازمی تھا۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ انہیں کھولتے ہوئے تیل میں ڈلوا دیتا۔ ان دونوں کا بہت برا حشر کرتا مگر یہ اس کے بس میں تھا کہاں۔

''کیا تم مطمئن ہو۔'' وہ الیگزینڈر کی طرف دیکھ کر بولا۔ الیگزینڈر کے ذہن میں مختلف خیال چکرا رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ سان پیڈرو فوجی مشقوں کا علاقہ ہے جہاں ائر فورس' اسٹریشر اور اس کے فوجی افسروں کی ہدایت پر ڈی ٹارگیٹس پر فضائی حملے کرے گی۔ اس نے ریوالور کی نال سے اپنی تھوڑی کھجائی اور دوبارہ اسٹریشر کی طرف گھوم گیا۔ اس کے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال آ گیا تھا۔

''کل کی فوجی مشقوں کا انچارج کون ہے جنرل۔'' اس نے پوچھا۔

اسٹریشر نے بغور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ اس کے سوال کا مقصد نہیں سمجھا تھا۔ ''جنرل شارے۔ کیوں۔؟''

''کیوں کہ۔'' الیگزینڈر ایک ایک لفظ پر زور

دیتا ہوا بولا۔ ''ہم اسے کل کی ہوائی مشقوں کے لیے ایک اور ٹارگیٹ دینا چاہتے ہیں۔''

''ایک اور ٹارگیٹ۔'' اسٹریشر حیرانی سے بولا۔ اس کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا تھا۔

''ہاں۔'' الیگزینڈر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''سان پیڈرو میں' دی پمپاس الیکٹرانکس کارپوریشن۔'' الیگزینڈر نے کہا اور جیسے ایک دھماکا ہو گیا۔ اسٹریشر بری طرح اچھل پڑا تھا۔ اسٹیوراس کا حال بھی اس سے مختلف نہیں ہوا تھا۔

''تم۔ تم۔'' اسٹریشر کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ بری طرح ہکلا رہا تھا۔ ''تم ہمارے ہیڈ کوارٹر سے واقف ہو۔''

''ہاں۔'' اس بار یوخوف بولا۔ وہ الیگزینڈر کا مقصد اچھی طرح سمجھ چکا تھا اور دل ہی دل میں اس کی ذہانت کی داد دے رہا تھا۔ اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔

''تمہیں یہ اطلاع کہاں سے ملی۔'' اسٹریشر نے پوچھا۔

''مسٹر اسٹیوراس کی فائلوں سے۔'' یوخوف پرسکون انداز میں بولا۔ اسٹیوراس کا منہ لٹک گیا۔ اسٹریشر اسے بڑی خونی نظروں سے گھور رہا تھا۔ اسے اسٹیوراس سے اس غفلت کی امید نہ تھی۔

''چلو۔ اب تم جنرل شارے کو فون کرو۔'' الیگزینڈر نے کہا۔ ''اور اسے بتاؤ کہ پمپاس الیکٹرانکس کارپوریشن کا مالک عوام دشمن ہے۔ اس نے تمہارے اقتدار حاصل کرنے میں بڑی رکاوٹیں پیدا کی تھیں اور اب تم اس کے مالک کو ایسا سبق سکھانا چاہتے ہو جسے وہ زندگی بھر نہ بھلا سکے پھر تم اسے ہدایت کرنا کہ وہ اس کارپوریشن کو بھی جنگی مشقوں کے ٹارگیٹ میں شامل کر لے۔''

''اوہ۔'' اسٹیوراس کے منہ سے طویل کراہ نکل گئی۔ اسٹریشر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ''میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔'' وہ چیخا۔ جذبات کی شدت سے اس کی آواز پھٹ گئی تھی۔ ''اور پھر۔ اگر میں نے کہہ بھی دیا تو شارے نہیں مانے گا۔'' وہ ہکلایا۔ ''وہ خود بھی فورس تھری کا لیڈر ہے۔''

یوخوف مسکرایا۔ ''جنرل! تم پھر جھوٹ بول رہے ہو۔'' پھر اس نے الیگزینڈر کی طرف دیکھا اور معنی خیز انداز میں سر ہلا دیا۔

الیگزینڈر نے اپنا ریوالور ہولسٹر میں رکھا اور پوری قوت سے ایک گھونسا اسٹریشر کی پسلیوں میں مار دیا۔ اسٹریشر کی کئی پسلیاں ٹوٹنے کی آواز آئی۔ وہ بری طرح لڑکھڑایا اور میز سے جا ٹکرایا پھر الیگزینڈر کا دوسرا گھونسا اس کی کنپٹی پر پڑا اور اسٹریشر دھپ سے فرش پر گر پڑا۔ اس کے بائیں کان سے خون بہہ رہا تھا۔

''اب کیا کہتے ہو تم' کتے کی اولاد۔'' الیگزینڈر غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔

اسٹریشر گھٹنوں کے بل اٹھنے لگا۔ اچانک اس کا ہاتھ پیپر ویٹ پر پڑا۔ اس نے پیپر ویٹ الیگزینڈر کے پیٹ پر دے مارا۔ الیگزینڈر کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ وہ میز سے جا ٹکرایا۔ اس کے سانس کی رفتار بڑھ گئی اور چہرے کا رنگ بدل گیا۔

اسٹریشر اٹھ رہا تھا۔ الیگزینڈر اچانک ہی اس پر جا پڑا اور گھونسوں کی بارش شروع کر دی۔ دایاں ہاتھ سر پر پڑتا تو بایاں سینے پر۔ وہ مسلسل گھونسے مار رہا تھا۔

اسٹریشر پھر فرش پر گر گیا مگر الیگزینڈر کے ہاتھوں میں بجلی بھری ہوئی تھی۔ اس نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور دیوار کے ساتھ لگے بک شیلف میں گھسیڑ دیا پھر اس کے منہ سر اور سینے پر مکے مارنے لگا۔ وہ غصے سے پاگل ہو گیا تھا۔ اسٹریشر خون میں نہا گیا مگر الیگزینڈر کے ہاتھوں کی رفتار میں کوئی کمی نہ آئی۔

اسٹریشر بک شیلف سے پھسل کر گرنے لگا۔ مگر الیگزینڈر نے اسے دوبارہ گریبان سے پکڑا اور میز پر لا ڈالا اور دوبارہ پوری شدومد سے اس کی دھنائی کرنے لگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''رک جاؤ۔'' اسٹریشر بڑی مشکل سے بولا۔ اس کے ہونٹ پھول گئے تھے جن سے خون نکل رہا تھا۔ اسٹوراس خوف زدہ نظروں سے الیگزینڈر کو دیکھتا ہوا دیوار سے جا لگا۔

''کافی ہے الیگزینڈر۔'' یوخوف اس کے قریب آ کر بولا۔ ''کیا تم اسے جان سے مار دو گے۔''

الیگزینڈر، اسٹریشر کو تھامے کھڑا تھا۔ اس نے اسٹریشر کو چھوڑ دیا۔ وہ اپنے اندر اٹھنے والے غصے کے طوفان کو قابو میں کرنے کوشش کر رہا تھا۔ اسٹریشر نڈھال ہو کر فرش پر پر بیٹھ سا گیا۔ اس کی حالت مردے سے بدتر ہو رہی تھی۔

یہ آدمی تو بالکل وحشی ہے۔'' اسٹوراس بڑبڑایا۔ اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

یوخوف نے الیگزینڈر کا شانہ تھپتھپایا اور جھک کر اسٹریشر کو قدموں پر کھڑے ہونے میں مدد دینے لگا۔ ''اب تو تم جنرل شارے کو کال کرو گے نا۔'' یوخوف نے پوچھا۔

اپنی سوجی ہوئی آنکھوں سے اسٹریشر نے یوخوف کی طرف دیکھا۔ ''ہاں۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''مگر تم اس شخص کو مجھ سے دور ہی رکھنا۔'' وہ خوف زدہ نظروں سے الیگزینڈر کو دیکھ رہا تھا۔ اسٹوراس اس طرح دیوار کے ساتھ سکڑا کھڑا تھا جیسے الیگزینڈر کی بجائے اس کے سامنے کوئی خونی درندہ آ کھڑا ہوا ہو اور اس پر جھپٹنے ہی والا ہو۔

اسٹریشر کی حالت ذرا سنبھل گئی تھی مگر یوں لگ رہا تھا۔ ارجنٹینا آرمی کا کوئی ٹینک اس پر سے گزر گیا ہو۔ یوخوف، اسٹریشر کو لے کر فون کی طرح بڑھا۔ ''اب جنرل شارے کو کال کرو۔'' وہ بولا۔ ''اور یاد رکھنا کہ تمہاری زندگی کا انحصار اسی بات پر ہے۔''

اسٹریشر نے فون اٹھایا۔ شارے وار رعینڈ میں نہیں تھا مگر وہ ریوکارٹو کے فضائی بیس پر مل گیا پھر اس نے الیگزینڈر کا بتایا ہوا حکم دہرا دیا۔ ذرا دیر شارے نے اس سے بحث کی۔ مگر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ پمپاس الیکٹرانکس پلانٹ کو اپنی ٹارگٹ سائٹ میں شامل کرنے پر راضی ہو گیا تھا۔ گفتگو ختم ہوتے ہی وہ کرسی پر ڈھے گیا اور فرش کو گھورنے لگا۔

''تم نے فورس تھری کو تباہ کر دیا۔'' اسٹوراس بڑبڑایا۔ اسٹریشر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اور اسٹوراس دونوں ہی جانتے تھے کہ اگر انہیں ان جنونیوں سے چھٹکارا مل جائے تو شارے کو روکنے کا اب بھی بڑا وقت تھا۔ ان کی آخری امید اب اسی بات میں مضمر تھی۔

''جنگی مشقیں کل کس وقت شروع ہوں گی۔'' الیگزینڈر اس کے قریب آ کر بولا۔

اسٹریشر نے ایک بار پھر جھوٹ بولنا چاہا مگر اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ ''بحری فوج ان کے نکلتے ہی مشقیں شروع کر دے گی۔''

''اور فضائی مشقیں کب شروع ہوں گی۔'' الیگزینڈر نے پوچھا۔

''دوپہر کے وقت۔'' اسٹریشر نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

الیگزینڈر نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ''کافی وقت ہو گیا۔ پھر تو ہمیں جلد ہی نکل جانا چاہیے یہاں سے۔'' الیگزینڈر نے کہا۔ ''ہمیں رات بھر سفر کرنا ہے۔''

جلد ہی وہ اسٹریشر کی کار میں سڑک پر تھے۔ کار یوخوف چلا رہا تھا۔ اسٹریشر اس کے برابر بیٹھا ہوا تھا۔ اسٹوراس عقبی نشست پر الیگزینڈر کے ساتھ بیٹھا تھا۔ جانے سے پہلے انہوں نے لاشیں چھپا دی تھیں اور بندھے ہوئے گارڈ کو بھی تہ خانے میں ڈال دیا تھا۔ جب وہ شہر سے نکلے تو آدھی رات گزر چکی تھی مگر نیند ان چاروں ہی کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

ان کی کیڈلاک دن نکلنے سے پہلے ریوکارٹو پہنچ گئی جب وہ سان پیڈرو کے علاقے میں پہنچے تو مشرق کی سمت، جنگل کے عقب سے سورج نکل رہا تھا۔ سڑکوں پر ملٹری کی گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ انہیں ابھی تک کسی روڈ بلاک کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

انہیں بہر حال کسی ایسی جگہ پہنچنا تھا جہاں سے فورس تھری کے ہیڈ کوارٹر کو دیکھ سکیں اور اس کی تباہی کی تصدیق کر سکیں۔

ہر گزرتا گھنٹہ اسٹریشر کے اندرونی تناؤ کو بڑھا رہا تھا۔ سان پیڈرو کی طرف جاتی ہوئی سڑک پر، وہ ایک چھوٹے سے گاؤں کے قریب پہنچ گئے۔ چند لمحوں بعد ہی وہ سان پیڈرو کے مضافات کی طرف بڑھ رہے تھے۔ الیگزینڈر، اسٹریشر کے چہرے پر بکھرے تناؤ کو بغور دیکھ رہا تھا پھر وہ فورس تھری کے ہیڈ کوارٹر جانے والی چھوٹی سڑک پر آ گئے۔ ان کے بائیں طرف فوجی گاڑیاں گھوم رہی تھیں جن میں جوان بھرے ہوئے تھے۔

''الیگزینڈر۔ فورس تھری کے اسلحے خانے میں جوہری بم ہوں گے۔ اگر وہ پھٹ گئے تو۔'' یوخوف نے اچانک ہی بے چین ہو کر پوچھا۔ ''تو مشرق کی طرف بہت دور تک ان کا اثر جائے گا۔''

''لیکن بیونس آئرس اور دوسرے بڑے شہر اس کے اثرات سے محفوظ رہیں گے۔'' الیگزینڈر نے اسے دلاسا دیا۔ ''ان کی زیادہ قوت اور طاقت تو پمپاس کے وسیع علاقے میں ہی ختم ہو جائے گی۔''

''تہ خانے میں موجود ہمارے آدمیوں کا کیا بنے گا۔'' اسٹوراس نے داؤ پھینکا۔ وہ ان کے انسانی ہمدردی کے جذبے سے کھیلنا چاہتا تھا۔ الیگزینڈر اور یوخوف نے اس کے سوال پر توجہ ہی نہ دی تھی۔

وہ اب خطرناک علاقے سے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ فوجیوں سے بھری ایک گاڑی ان کے قریب سے گزری۔ الیگزینڈر نے اسٹریشر کو خاموش رہنے کی ہدایت کی اور اس نے تعمیل کی اسٹوری اس کے برابر میں ہونٹ سیئے، بیٹھا تھا پھر جب اسٹریشر، یوخوف کو ایک پہاڑی کی طرف جانے کی سمت بتا رہا تھا جہاں سے وہ ہیڈ کوارٹر کو اچھی طرح سے دیکھ سکتے تھے۔ جو اس جگہ سے تین میل کے فاصلے پر تھا تو وہ ایک موڑ مڑتے ہی چونک پڑے۔ سڑک کے کنارے دو فوجی گاڑیاں تھیں اور سڑک پر لکڑیاں ڈال کر اسے بلاک کر دیا گیا تھا۔

یوخوف نے کار آہستہ کر لی۔ ''انہوں نے یہاں مشقوں کے میدان کی حد بندی کر رکھی ہے۔'' الیگزینڈر نے خیال ظاہر کیا پھر وہ اسٹریشر کی طرف مڑ گیا۔ ''اسٹریشر! ان فوجیوں کو اپنی شناخت کراؤ اور ان سے کہو کہ تم علاقے کا معائنہ کرنے جا رہے ہو۔ سمجھے۔''

اسٹریشر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ یوخوف نے کار بہت آہستہ کر دی۔ ایک فوجی سر پر خود پہنے، اسٹریشر کی کھڑکی کی طرف آیا۔ اسٹریشر نے شیشہ نیچے کیا مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا۔ عقبی نشست پر بیٹھا۔ اسٹوراس چلا اٹھا۔ ''اس کار کو روک لو۔ انہوں نے ہمیں یرغمال بنا رکھا ہے۔'' وہ ہیجانی انداز میں چیختا ہی چلا گیا تھا۔ ''کار کو روک لو۔ کار کو روک لو۔''

الیگزینڈر اور یوخوف کے منہ سے بیک وقت مغلظات ابل پڑیں۔ یوخوف نے تیزی سے ایکسیلریٹر دبایا۔ الیگزینڈر، اسٹوراس سے ٹکرا گیا اور اسٹوراس دائیں دروازے سے ٹکرایا۔ نہ جانے کیسے دروازہ کھل گیا اور وہ چلتی ہوئی کار سے باہر کود گیا۔ الیگزینڈر نے ریوالور نکال کر اس پر فائر کیا مگر وہ متحرک کار کے پیچھے جا چکا تھا۔ اسٹوراس پختہ سڑک پر گرا تھا۔ وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا پھر اسٹریشر بھی کھڑکی میں سے منہ نکال کر چلا اٹھا۔ ''میں جنرل اسٹریشر ہوں۔ اس گاڑی کو روکو۔''

بھاری کیڈلاک لکڑیوں کی رکاوٹ سے ٹکرائی اور ایک لکڑی کو دور تک گھسیٹتی ہوئی لے گئی۔ اس کار کا ایک پہیہ سڑک کے نیچے اتر گیا۔ اسٹریشر نے پلٹ کر اسٹیئرنگ وہیل پکڑ لیا اور یوخوف سے لپٹ پڑا۔ کار لہرانے لگی مگر جلدی ہی سڑک پر آ گئی، پیچھے سے الیگزینڈر نے ریوالور کا دستہ، اسٹریشر کے سر پر دے مارا۔

چوٹ زوردار تھی۔ وہ یوخوف کو چھوڑ کر نشست پر پھیل گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رکاوٹ کے پیچھے تین جوان ایک فوجی گاڑی میں سوار ہوئے اور کیڈلاک کا تعاقب شروع ہوگیا۔ باقی دو سپاہیوں نے اسٹیوراس کو اٹھایا۔ اس نے انہیں بتایا کہ وہ اسٹریشر کا دوست ہے اور فوراً ہی سان پیڈرو جانا چاہتا ہے تاکہ جنرل شارے کو اسٹریشر کی طرف سے ایک اہم فون کرسکے۔ اس کا خیال تھا کہ اب بھی وہ ہیڈ کوارٹر پر بمباری رکوا سکتا تھا۔

یوخوف رکاوٹ میں سے ایک کار کو اپنے تعاقب میں آتا دیکھ چکا تھا' پچھلی کار سے چند گولیاں چلیں اور کیڈلاک سے ٹکرا کر پھسل گئیں۔ یوخوف نے رفتار بڑھا دیا۔ ٹوٹی ہوئی سڑک پر کار بری طرح ہچکولے کھا رہی تھی' یوخوف کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ پچھلی کار سے کیسے پیچھا چھڑائے۔ ان کار درمیانی فاصلہ بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا۔ ایک گولی اور آ کر کیڈلاک سے ٹکرائی اور پھر دوسری گولی نے پچھلا دایاں ٹائر پھاڑ دیا۔

کیڈلاک لہراتی ہوئی سڑک سے اتری اور پھر ایک چھوٹے سے کھڈ میں جا کر پھنس گئی۔ اس کا انجن خاموش ہوگیا تھا۔

اسٹیئرنگ وہیل یوخوف کے سینے پر لگا۔ اسے چکر سے آ گئے۔ اسٹریشر کی طرف والا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور وہ آدھا باہر کی جانب لٹک پڑا۔ الیگزینڈر کا سر اگلی نشست سے بری طرح ٹکرایا۔

ملٹری کی گاڑی ان سے کچھ فاصلے پر آ کر رک گئی۔ دو فوجی باہر آئے۔ ڈرائیور' اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھا رہا۔

اسٹریشر پھسل کر کار سے باہر آیا اور پچھلی کار کی طرف رینگنے لگا۔

الیگزینڈر نے یوخوف کو ایک طرف کیا اور اگلی سیٹ پر آ کر اس کی جگہ سنبھال لی۔ فوجی بڑی ہوشیاری سے نیچے جھکے' قریب آتے جا رہے تھے۔ الیگزینڈر نے تیسری کوشش میں کار اسٹارٹ کرلی۔ اس کے پہیے گھومے اور وہ کھڈ سے باہر آ گئی۔

''بھاگ نکلو الیگزینڈر۔'' یوخوف سر جھٹکتا ہوا بڑبڑایا۔ ''ابھی نہیں۔'' الیگزینڈر درندہ بن گیا تھا۔ یوخوف اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔

کیڈلاک کے کھڈے سے نکلتے ہی دونوں فوجیوں نے فائرنگ شروع کردی۔ الیگزینڈر نے جیسے ہی کار گھما کر اس کا رخ ملٹری گاڑی کی طرف کیا' ایک گولی ٹکرائی اور الیگزینڈر کے چاروں طرف شیشے بکھر گئے۔ اسٹریشر اس وقت تک ملٹری کار کے بمپر تک پہنچ چکا تھا۔ دونوں فوجی اس کے اور کیڈلاک کے درمیان کھڑے ہوئے کیڈلاک پر فائر کر رہے تھے۔

یوخوف نے ریوالور نکالا اور دائیں طرف والے فوجی کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ گولی فوجی کے سینے کو چیر گئی۔ وہ لہرا کر گرا اور ساکت ہوگیا۔ دوسرے فوجی کی گولی ونڈ شیلڈ سے ٹکرائی اور وہ ریزہ ریزہ ہوگئی مگر اسی وقت کیڈلاک اس فوجی پر چڑھ گئی اور پھر اس فوجی کی چیخ بھی اس شور میں دب گئی۔ الیگزینڈر' کار کو فوجی گاڑی کی طرف بڑھائے لیے جا رہا تھا۔

اسٹریشر کار کے بمپر کو تھامے کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیڈلاک کی آواز سن کر وہ مڑا اور پھر دہشت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ کیڈلاک' ملٹری گاڑی سے ٹکرائی اور اسٹریشر دونوں گاڑیوں کے بیچ میں پس کر رہ گیا۔ دھات سے دھات ٹکرائی۔ بھاری کیڈلاک نے ملٹری کار کو زبردست ٹکر ماری تھی۔ وہ سڑک سے نیچے اتر گئی۔ اسٹریشر کا خون آلود بھیجا اور ٹوٹا پھوٹا بدن ابھی تک اس سے چمٹا ہوا تھا۔

ٹکر سے ملٹری گاڑی کی ونڈ شیلڈ اندر کی طرف بکھر گئی اور ڈرائیور کی چیخ نکل گئی۔ اس کے بعد وہ بھی ساکت ہوگیا۔

الیگزینڈر' کار روک کر باہر آیا اور اسٹریشر کی طرف دیکھا۔ وہ بڑا خوفناک منظر تھا۔ الیگزینڈر دوبارہ کار کی طرف لوٹ آیا۔ ''وہ مر گیا ہے۔'' الیگزینڈر نے یوخوف کو بتایا۔ ''مگر ابھی ہمارا کام ختم

نہیں ہوا ہے۔ وہ بدمعاش اسٹیوراس' سارا کام خراب کرسکتا ہے۔''

''مگر اب واپس ہونا خطرناک ہے الیگزینڈر۔'' یوخوف بولا۔ ''بہتر ہوگا کہ ہم اسی پہاڑی پر چلیں۔ شاید اسٹیوراس اس وقت انہیں روکنے میں ناکام رہے۔''

الیگزینڈر نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ کار میں سوار ہوا اور اسے موڑ کر آگے بڑھا دیا۔

جب وہ اسٹریشر کی بتائی ہوئی پہاڑی پر پہنچے تو وہاں سے تین میل دور واقع پمپاس کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ دونوں اس بات سے بے خبر نہیں تھے کہ یہ ان کے کام کا اہم ترین حصہ تھا۔ اگر ہیڈ کوارٹر سلامت رہ گیا تو پھر ان کے لیے مشکلات کھڑی ہوسکتی تھیں۔

''کیا وقت ہوگیا۔'' یوخوف نے پوچھا۔

''بارہ بج رہے ہیں۔'' الیگزینڈر بولا۔ ''شاید اسٹیوراس بازی جیت گیا ہے۔''

اسی وقت آسمان پر طیاروں کا شور سنائی دیا۔ جلد ہی کچھ طیارے ان کے سروں پر آ گئے۔ یہ تین تین طیاروں کے دو گروپ تھے۔ وہ دم سادھے انہیں پمپاس کی طرف جاتے دیکھتے رہے مگر وہ عمارت پر سے ہوتے ہوئے گزر گئے تھے کچھ نہیں ہوا۔ ان دونوں کے چہروں پر مردنی پھیل گئی۔ وہ مایوس ہوگئے تھے مگر اسی لمحے انہیں فضا میں سیٹی کی سی آواز سنائی دی۔ یقینی طور پر یہ بم کی آواز تھی۔ انہیں بم نظر نہیں آیا مگر ذرا دیر بعد ہی عمارت پر ایک زوردار جھماکا نظر آیا اور عمارت ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی۔

''کام بن گیا۔'' یوخوف خوشی سے چلایا۔ ''اسٹیوراس' جنرل شارے کو وقت پر خبردار نہ کرسکا۔''

الیگزینڈر نے جلدی سے یوخوف کی گردن پر ہاتھ رکھ کر اسے دبا دیا۔ ''نیچے ہو جاؤ بیوقوف۔'' وہ چلایا۔ ''اپنا سر نیچے کرلو۔''

دونوں نے اپنا سر زمین سے لگا کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور آنکھیں بند کرلیں۔ اسی وقت ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا۔ آنکھیں بند ہوجانے کے باوجود بھی انہیں یوں لگا جیسے ان کے سامنے جہنم کی آگ بھڑک اٹھی ہو پھر ایک اور قیامت خیز دھماکا سنائی دیا۔ چند لمحے بعد ہی تیز ہوا کا جھونکا آیا اور بے شمار ذرات کا بادل ان کے سروں پر سے گزر کر آسمان کی طرف چلا گیا۔ انہوں نے سر اٹھایا اور چندھیائی ہوئی آنکھوں سے عمارت کی طرف دیکھا۔

نیچے میدان میں دھوئیں اور آگ کی بڑی سی چھتری تنی ہوئی تھی۔ دونوں کی زبانیں گنگ ہوگئی تھیں۔ یہ بڑا خوفناک منظر تھا' پھر بتدریج وہ چھتری منتشر ہونے لگی۔ نیچے پمپاس کی جگہ جہاں فورس تھری کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ ایک وسیع غار سا بنا ہوا تھا۔

الیگزینڈر نے سر جھٹکا اور اٹھ کھڑا ہوا پھر اس نے یوخوف کو کھڑا ہونے میں مدد دی۔ ''اب ہمیں جلد ہی یہاں سے نکل جانا چاہیے۔'' الیگزینڈر بولا۔ ''اگر ہم اسی سڑک پر آگے بڑھتے رہے اور خوش قسمتی نے ہمارا ساتھ دیا ہم رات تک چلی کی سرحد میں داخل ہوجائیں گے۔''

''اور پھر وہاں سے یقیناً ہم کسی محفوظ جگہ جاسکیں گے۔'' یوخوف نے کہا۔ ''پھر ہم فورس تھری کی داستان روسیوں اور امریکیوں کو بتائیں گے۔'' اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

''ہوسکتا ہے کہ جب وہ ہماری داستانیں سنیں تو شاید ہمیں گولی مارنے سے باز آجائیں۔'' الیگزینڈر بولا۔

یوخوف مسکرا دیا۔ ''اتنے خوش فہم مت بنو دوست۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زرد کتا

محمد صدیق طاہر

اس نے آگے بڑھ کر لیمپ کو آتشدان میں رکھا اور مجھے لپٹا لیا میری پیشانی کو بوسہ دیا اور میری خیریت دریافت کی۔ میں اس پراسرار ماحول سے اس قدر گھبرایا ہوا تھا کہ ٹھیک طرح ماموں کی باتوں کا جواب بھی نہ دے سکا۔ اس نے آتشدان میں چند لکڑیاں اور پھینک دیں اور ہم دونوں کرسیاں گھسیٹ کر آتشدان کے سامنے بیٹھ گئے۔

اس شمارے کی ایک فکر انگیز و دلچسپ تحریر

میرا ماموں چنگیز آج سے چالیس برس پہلے موت کے بھیانک جبڑوں میں پہنچ گیا۔ میں اس حیرت ناک موت کا چشم دید گواہ ہوں جو کچھ میری نگاہوں کے سامنے ہوا وہ اس قدر خوفناک اور ناقابل یقین ہے کہ آج بھی سوچتا ہوں تو میری ریڑھ کی ہڈی خوف سے سنسنا اٹھتی ہے۔

میں پچاس برس کا ایک ایسا آدمی ہوں جس کے دوستوں کا حلقہ نہ ہونے کے برابر ہے آج ہی نہیں بچپن میں بھی میرا کوئی دوست نہ تھا۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ سب سے بڑی وجہ تو میں خود ہوں۔ میں ایک عجیب اور انوکھی طبیعت کا عجیب الخلقت آدمی ہوں۔ لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس لیے میں شروع ہی سے الگ تھلگ رہنے کا عادی ہوں۔

ماموں چنگیز کی پراسرار موت 1895ء میں واقع ہوئی۔

اس وقت میری عمر بمشکل دس برس تھی۔ ایک شام غالباً عید کا دن تھا کہ چنگیز موت کے ہاتھوں ہم سے بچھڑ گیا۔ اس بھیانک شام کے واقعات شاید ایک یا دو آدمیوں کو ہی معلوم تھے اور غالباً انہی کے ذریعہ میرے ماموں کی موت کا بھیانک افسانہ نئی پود تک پہنچا تھا لیکن میں وہ واحد آدمی ہوں جس کی آنکھوں کے سامنے اس کی پراسرار موت واقع ہوئی۔

لوگوں نے اس قصے کو اس حد تک مسخ کر دیا کہ حقیقت کچھ سے کچھ ہوگئی اور آج چونکہ میں خود مرنے کے قریب ہوں اس لیے یہ خواہش ہے کہ سب کچھ بالکل اسی انداز میں سامنے لے آؤں جس طرح کہ میری آنکھوں نے دیکھا اور جیسا کہ درحقیقت واقع ہوا تھا۔

میرے والدین لنکا میں تھے۔ میری سگی والدہ تو میری پیدائش کے وقت ہی مر گئی تھی۔ اس لیے والد صاحب نے مجھے ایک نرسری اسکول میں داخل کروایا اور خود دوسری شادی کر کے وہاں چلے گئے۔ میں نے اپنی دوسری ماں اور باپ کو پوری زندگی میں صرف دو مرتبہ دیکھا۔ ایک مرتبہ جب وہ میری شدید بیماری کا سن کر بطور خاص مجھ سے ملنے آئے اور دوسری مرتبہ وہ افغانستان جاتے ہوئے ہندوستان سے گزرے تو میں نے ایئرپورٹ پر چند منٹ ان سے ملاقات کی۔ میرے والد لنکا سول سروس میں تھے۔ فرصت کے اوقات میں شاعری ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کا اپنا دیوان تھا۔ جسے بعد ازاں انہوں نے خود ہی شائع کیا۔

آٹھ سال کی عمر میں مجھے نرسری اسکول سے ہٹا کر اکیڈیمی میں بھیج دیا گیا۔ اس لیے جب بھی چھٹیاں ہوتیں مجھے وہ شب و روز بن بلائے مہمان کی مانند اپنے ایسے رشتہ داروں کے ہاں گزارنے پڑتے جنہیں مجھ سے نفرت تھی لیکن میری دادی جو مجھے جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں ان کے رعب و دبدبے نے انہیں کھلم کھلا نفرت کرنے کا موقع نہیں دیا اور وہ مجبوراً مجھے برداشت کرتے رہے۔

میں اگرچہ بچہ تھا لیکن لوگوں کے ناپسندیدہ تیوروں کو خوب جانتا تھا اس کے باوجود میں مجبور تھا۔ مجھے ان رشتہ داروں کے ہاں جانا ہی پڑتا۔ دادی جان ایک دور افتادہ گاؤں میں رہتی تھیں اس لیے وہاں جانا مشکل ہو جاتا اور پھر ان کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے میں کسی نہ کسی عزیز کے ہاں چلا جاتا۔

شہر کے مضافاتی علاقوں میں میرے تین چچا دو خالو اور ایک ماموں رہتا تھا۔ ایک خالو اکیڈیمی سے کچھ ہی فاصلے پر رہتا تھا لیکن میں اس کے بچوں سے پریشان تھا۔ شاید ایک ہی مرتبہ میں اس گھر میں گیا ہوں گا۔ ان دنوں خالو کے بچوں نے میرا اس قدر مزاق اڑایا کہ میں اس کے گھر جانے سے بالکل اس گیدڑ کی مانند گھبرانے لگا جسے شہر کا رخ کرتے موت آتی ہے۔

میں شروع سے ہی عدم توجہی کے باعث دبلا پتلا اور زرد رو تھا۔ جسم اور چہرے کے نقوش اس قدر بے ڈھنگے تھے کہ لوگ میرا مذاق اڑانے سے باز نہ رہتے۔ یہ بات خود مجھے بھی معلوم تھی اس لیے احساس کمتری کے ہاتھوں میں کسی سے ملنا پسند نہیں کرتا تھا۔ محبت کی بھوک مجھے پریشان کرتی لیکن میں اس کے حصول کی کوئی خاطر خواہ تدبیر نہ کر سکا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اپنی بے ڈھنگی شخصیت کے لیے سب سے الگ تھلگ اپنے آپ میں مگن ہو گیا کوئی مجھ سے ملتا تو میں اظہار محبت کرنے سے قاصر رہتا۔ یہ الگ بات تھی کہ میں دوسروں سے محبت کی توقع رکھتا تھا۔ داخلی طور پر میں بے انتہا جذباتی تھا۔ احساس کمتری نے مجھے ہر اس شوق سے دور رکھا جس کی تکمیل میں کسی سے رابطہ قائم کرنا پڑتا یا کسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے تعاون کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ انجام کار مطالعہ ہی میرا واحد اور محبوب مشغلہ بن گیا۔ اگرچہ کمزور بینائی کے باعث اس میں بھی دشواری ہوتی تاہم کتابیں مجھ سے وفا کرتی رہیں اور میں نے بھی ان کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ میں دن رات کا بیشتر حصہ کہانیاں پڑھتے ہوئے گزار دیتا تھا۔

وقت گزر گیا اور میں اپنے رشتہ داروں کے لیے ایک بوجھ بن گیا۔ دادی جان کی وجہ سے میں ان کے ہاں جانے پر مجبور بن گیا اور وہ مجھے برداشت کرنے پر پابند تھے آخر ایک دن دادی جان بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا گویا میں بھری دنیا میں تنہا رہ گیا ہوں۔

اس وقت تک ماموں چنگیز کے ہاں جانے کی نوبت نہیں آئی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ کس قسم کے آدمی ہیں۔ البتہ ایک بات میں نے خاص طور سے محسوس کی کہ دیگر اقارب اس کے تذکرے پر خوف سے زرد ہو جایا کرتے تھے۔ میرے ذہن میں اس کی حالت سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ وہ کوئی بارعب شخص ہوگا لیکن ایسا نہیں تھا۔ یہ مجھے اس وقت معلوم ہوا جب میں پہلی مرتبہ اس کے ہاں گیا تھا۔

موسم گرما کی تعطیلات خاصی طویل تھیں دادی جان کی وفات کے بعد تمام قریبی رشتہ داروں نے مجھ سے یوں منہ موڑ لیا گویا میں ان کے لیے اچھوت رہا ہوں۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ کہاں جاؤں کہ اچانک مجھے ماموں چنگیز کا خط موصول ہوا۔ خط ملنے سے پہلے میرے ذہن میں دادی جان کے گاؤں جانے کا ارادہ پیدا ہوا۔ وہ اپنی تمام جائیداد میرے نام کر گئی تھیں' اس لیے وہاں جانا ضروری تھا لیکن جب چنگیز کا خط ملا تو میں فکر مند ہوگیا۔ میں اس سے ملا تھا اور نہ ہی اس کی صورت دیکھی تھی البتہ رشتہ داروں کے زرد چہروں سے اس کی شخصیت کی ایک خیالی تصویر میرے ذہن میں موجود تھی۔ میں اس تصویر کو حقیقت کے روپ میں دیکھنے کے لیے بے تاب ہوگیا۔

میں نے خط کھولا اور پڑھنے لگا۔

''پیارے ہارون۔

بے شمار دعائیں اور بہت سا پیار۔

تم سوچ رہے ہوگے کہ میں شاید اب تک کچھ بھولا رہا لیکن ایسا نہیں تم میری بہن کی اکلوتی اولاد ہو مجھے معلوم ہوا ہے کہ سب لوگ تم سے نفرت کرتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہے۔ تم نے میرے بارے میں نہ جانے کیا کیا افواہیں سنی ہوں گی بہرطور فوراً میرے پاس چلے آؤ۔ میں تمہیں ملنے اور دیکھنے کے لیے بے تاب ہوں۔

تمہارا ماموں۔ چنگیز۔''

میں نے اس خط کو کئی مرتبہ پڑھا اور آخر میرا دل بیتاب ہوگیا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے کسی نے اپنا سمجھ کر بلایا تھا۔ میں مارے خوشی کے دیوانہ ہوگیا اور دادی جان کے گاؤں جانے کا ارادہ ملتوی کر کے ماموں کے ہاں جانے کا قصد کرلیا۔

بائیس گھنٹے کا سفر تھا اس لیے میں نے کہانیوں کی کئی کتابیں ساتھ رکھ لیں۔ ماموں چنگیز کو اطلاع دے دی کہ میں بدھ کے روز آخری گاڑی سے پہنچ رہا ہوں جوابی خط میں میں نے اپنی ایک تصویر بھی رکھ دی تھی تاکہ اگر وہ اسٹیشن پر مجھے لینے آئے تو پہچاننے میں دشواری نہ ہو۔

اس وقت میری عمر سولہ برس کے لگ بھگ تھی۔ دبلا پتلا جسم اور گندمنا پیشانی تھی۔ میری آنکھوں پر اس قدر دبیز شیشوں کا چشمہ تھا کہ دوربین میں استعمال ہونے والے عدسے معلوم ہوتے تھے۔ میں سفر کے لیے آمادہ تو ہوگیا لیکن نہ جانے کیوں میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ ایک عجیب اور بے نام سا خوف میرے ذہن پر سوار ہوگیا۔ میں نے اپنے اعصاب شل ہوتے محسوس کیے لیکن دل میں ماموں چنگیز سے ملنے کی آرزو شدید تر ہوتی جارہی تھی۔

کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہونے لگتا تھا گویا کوئی مافوق الفطرت ہستی مجھے اس جانب دھکیل

رہی ہو۔ میرے اعصاب یوں بھی کچھ زیادہ مضبوط نہ تھے۔ اس کشاکش کی حالت نے مجھے خاصا پریشان کردیا۔ پہلی ہی شب میں نے ایسے ایسے بھیانک خواب دیکھے کہ بار بار چونک کر اٹھ بیٹھتا۔ دو ایک مرتبہ تو اس بری طرح چیخا کہ ہوسٹل میں کہرام برپا ہوگیا۔

ہوسٹل کے انچارج نے مجھے تسلی دی اور رات کا باقی حصہ میرے پاس بیٹھ کر بتادیا۔ اس کے باوجود میں اس بے نام سے خوف کو ذہن سے نہ جھٹک سکا۔ وہ خوف اپنی تمام تر قوت سمیت میرے اعصاب پر سوار رہا۔ ادھر ماموں چنگیز سے ملنے کی خواہش ہر لحظہ بڑھتی ہی چلی گئی۔ اس وقت مجھے یہ احساس نہ ہوا کہ وہ خوف ماموں ہی کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔

مجھے مستقبل کے لیے ایک دوست کی رفاقت کی ضرورت تھی۔ اس لیے میں ماموں چنگیز کے ہاں جانے کے لیے تیار ہوگیا اور جب میں گاڑی میں سوار ہوا تو خوف کا عنصر مزید شدید ہوگیا لیکن میں نے جلد ہی خود پر قابو پایا اور ساتھ رکھی ہوئی کہانیوں کی ایک کتاب کے مطالعہ میں غرق ہوکر گویا ہر قسم کے خوف و خدشات سے بے نیاز ہوگیا۔

ابتدائی حصہ تو مطالعہ ہی میں صرف ہوگیا۔ باقی سفر گاڑی کے باہر متحرک مناظر دیکھنے میں گزار دیا۔ ہندوستان کے شمالی حصے کی جانب یہ میرا پہلا سفر تھا اس لیے میں یوں بھی مسحور کن مناظر میں کھویا رہا اور بائیس گھنٹے کا طویل سفر چٹکیوں میں گزر گیا۔

گاڑی منزل مقصود پر پہنچ گئی۔ تو میں نے کھڑکی کا شیشہ کھول دیا۔ پلیٹ فارم پر کچھ زیادہ ہجوم نہ تھا گنتی کے لوگ تھے مجھے یقین تھا کہ اس ویران سے اسٹیشن پر اترنے والے مسافروں کی تعداد بہت ہی کم ہوگی۔ میں سامان سمیٹ کر نیچے اتر آیا۔

شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ میں نے ویران پلیٹ فارم پر متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر میرا پورا جسم سردی کی لہر سے تھرتھر گیا۔ دور الیکٹرک پول کے نیچے ایک زرد رنگ کا قوی ہیکل کتا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اس قدر چمکدار تھیں کہ میں جھرجھری لیے بغیر نہ رہ سکا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے باوجود میں نے محسوس کیا کہ میں اس کتے کی مقناطیسی آنکھوں سے مسحور ہوگیا ہوگیا۔ ہوں اور پھر وہ کتا دھیرے دھیرے میری جانب بڑھنے لگا۔

دفعتاً میرے کندھے پر کسی نے نرمی سے ہاتھ رکھ دیا اور کسی کی میٹھی پیار بھری آواز سنائی دی۔

''ہارون۔''

میں نے پلٹ کر دیکھا ایک کریہہ المنظر بوسیدہ حال شخص میرے پیچھے کھڑا تھا' میں نے پہلے تو یہی سمجھا کہ وہی میرا ماموں ہے لیکن جب اس نے مجھے بتایا کہ ماموں نے اسے اسٹیشن بھیج دیا ہے۔ تو میں خاموش ہوگیا۔ چند لمحے تو میں محویت کے عالم میں فیضی کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر میرے ذہن میں ایک دھماکہ سا ہوا۔ پلٹ کر دیکھا لیکن اس زرد کتے کا نام و نشان تک نہ تھا میں خوف سے جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔

ماموں کے ملازم فیضی نے کئی مرتبہ مجھ سے دریافت کیا کہ میں ادھر ادھر دیکھ کر کسے تلاش کر رہا ہوں لیکن میں جواب نہ دے سکا جواب دیتا بھی تو کیا۔ یہ تو نہیں بتا سکتا تھا کہ میں ایک زرد رنگ کے کتے سے خوفزدہ ہوگیا ہوں لیکن وہ کتا تھا۔ بہت ہی غیر معمولی اور خوفناک بالکل جادوئی کہانیوں کا خوفناک کتا۔

فیضی ایک لمبا تڑنگا' مضبوط قویٰ کا سیاہ فام آدمی تھا۔ اس کے چہرے کی رنگت جس قدر سیاہ تھی دانتوں کا رنگ اتنا ہی سپید۔ موتیوں کی طرح جھلکتے ہوئے دانت آنکھیں بے انتہا سرخ' سرخ بالکل خونی رنگ کی۔ بحیثیت مجموعی اس کی شخصیت اس قدر دہشت ناک تھی کہ میں پہلی نگاہ میں ہی اس سے دور رہنے کی خواہش میں مبتلا ہوگیا لیکن جب اس نے مجھ سے گفتگو کی تو آواز کی شیرینی نے میرا دل موہ لیا اور پھر چند ہی لمحوں میں میں دیوانہ وار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کا ہاتھ پکڑنے پر مجبور ہو گیا۔

اور اس بات کا احساس مجھے بعد میں بھی ہوا کہ فیضی ایک ہمدرد قسم کے دل کا مالک ہے۔ اس نے ابتدائی چند لمحات میں مجھے اس طرح اپنے قریب کر لیا گویا وہ مقناطیس کا وزنی اور طاقتور ٹکڑا ہوا اور میری حیثیت محض ایک معمولی سے آہنی ذرے کی۔

میں نے ایک مرتبہ پھر پلیٹ فارم کے اس حصے کی جانب دیکھا ئی دیا تھا لیکن اب وہ غائب ہو چکا تھا۔ تاہم اس کا خوف میرے ذہن پر سوار ہو گیا لیکن فیضی کی محبت بھری باتوں نے اس کا خیال تک میرے ذہن سے محو کر دیا۔

فیضی نے میرا ہلکا پھلکا سامان اٹھا کر گھوڑا گاڑی میں رکھ دیا اور پھر بڑے پیارے سے مجھے بھی اپنے قریب ہی بٹھا لیا۔ سردی شباب پر تھی۔ جیسے ہی ہماری گاڑی دریا کے کنارے کنارے چلنے لگی۔ سرد ہوا کے جھونکے ننھی ننھی سوئیوں کی مانند جسم میں چبھنے لگے۔

چار سو اندھیرا تھا۔ گاڑی کے اطراف میں جو تیل کی بتیاں جل رہی تھیں ان سے ہلکی سی روشنی صرف راستے کو نمایاں کرنے میں مدد دے رہی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔

دفعتاً گھوڑے بدک گئے۔ میں نے محسوس کیا وہ کسی انجانے خوف سے کپکپا گئے تھے۔ دونوں گھوڑے عقبی ٹانگوں پر اٹھ کر کچھ ایسی آوازیں حلق سے نکالنے لگے گویا کوئی مافوق الفطرت چیز رہی ہو۔ میں بھی مارے خوف کے کپکپا گیا۔ فیضی کی طرف دیکھا تو وہ چٹان کی مانند ساکت و جامد بیٹھا ہوا تھا۔

فیضی نے گھوڑے کو پچکارا اور پھر چابک سے انہیں ہانک دیا۔ گھوڑے بری طرح بھاگنے لگے۔ گاڑی الٹتے الٹتے بچی۔ میں فیضی کے مضبوط جسم سے لپٹا بیٹھا رہا۔ یہ سفر کوئی نصف گھنٹہ جاری رہا۔ پھر ایک جگہ گاڑی رک گئی۔ گھوڑوں کی سنسناہٹ قریبی جنگل سے دھاڑنے والے درندوں کی آوازیں۔ دریا کے پرشور لہروں کی شڑاپ شڑاپ اور تاریکی میرا ننھا سا دل مارے خوف کے بری طرح کانپنے لگا۔

گاڑی ایک سنگی عمارت کے سامنے کھڑی تھی جس کا آہنی گیٹ بند تھا' گھوڑوں کی ہنہناہٹ سن کر لوہے کے آہنی پھاٹک میں حرکت پیدا ہوئی اور پھر پرشور آواز کے ساتھ پھاٹک کھل گیا۔

گاڑی اندر داخل ہوئی۔

میں نے دیکھا ایک عجیب الخلقت انسان جس نے زرد رنگ کا چوغہ پہن رکھا تھا۔ ہاتھ میں تیل کا لیمپ سنبھالے گیٹ کے قریب کھڑا تھا۔ جب گاڑی اندر داخل ہو گئی تو اس نے پھاٹک بند کر دیا اور جب میں گاڑی سے اترا تو وہ برآمدے میں پہنچ چکا تھا۔

فیضی مجھے لیکر ایک ایسے کمرے میں پہنچا جس کا فرنیچر صدیوں پرانا دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے ایک بوسیدہ سی کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ لیمپ ہاتھ میں لئے وہ شخص اندر داخل ہوا۔ میں نے اسے دیکھا تو اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہی ماموں چنگیز ہے اور واقعی وہ چنگیز ماموں تھا۔

اس نے آگے بڑھ کر لیمپ کو آتشدان میں رکھا اور مجھے لپٹا لیا۔ میری پیشانی کو بوسہ دیا اور میری خیریت دریافت کی۔ میں اس پراسرار ماحول سے اس قدر گھبرایا ہوا تھا کہ ٹھیک طرح ماموں کی باتوں کا جواب بھی نہ دے سکا۔ اس نے آتشدان میں چند لکڑیاں اور پھینک دیں اور ہم دونوں کرسیاں گھسیٹ کر آتشدان کے سامنے بیٹھ گئے۔

لیمپ کی مدھم روشنی اور آتشدان میں بھڑکتے ہوئے شعلوں کا عکس عجیب سا تاثر پیدا کر رہا تھا۔

فیضی نے رات کا کھانا لگایا اور ہم کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔ اس دوران ماموں نے بہت ہی پیاری پیاری باتیں کیں۔ رفتہ رفتہ میرے دل سے خوف کا اثر زائل ہونے لگا اور جب میں فیضی کے

ہمراہ سونے کے کمرے میں پہنچا تو کسی حد تک خوش اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔

ماموں چنگیز اور فیضی اگرچہ دونوں کریہہ المنظر تھے لیکن ان کے دل پر اثر کرنے والی باتوں نے میرا دل موہ لیا۔ میں خود کو ہر لحاظ سے آسودہ خیال کرنے لگا۔ البتہ الجھن میرے ذہن پر سوار تھی۔ وہ یہ کہ جب بھی فیضی مجھ سے کوئی بات کرنے لگتا تھا گویا اجازت کا طلب گار ہو۔

میں نے اسے فیضی کی اطاعت شعاری پر محمول کیا اور کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کی۔ طویل سفر نے میرے جسم کا جوڑ جوڑ ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس لیے میں غور و فکر کے عالم میں ہی سو گیا۔ ماموں اور فیضی بھی اپنے اپنے کمروں میں آرام کے لیے جا چکے تھے اس لئے عمارت پر گہرا سکوت طاری تھا۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔

میں نے محسوس کیا کہ میرا پورا جسم پسینے میں شرابور ہے دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ سینے پر کچھ ایسا بوجھ سا سوار تھا کہ سانس کی آمد و رفت متاثر محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے پر گہرا سکوت طاری تھا۔ اس لیے میں اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز نمایاں طور پر سن رہا تھا بے انتہا ٹھنڈا کمرہ تھا۔ بالکل سرد جہنم کی مانند لیکن میرا جسم بے پناہ گرم اور پسینے سے شرابور تھا۔ میں نے حیرت سے کمرے میں دیکھا۔ کھڑکیاں اور روشندان نیز دروازے مضبوطی سے بند تھے۔ پھر یکایک یہ سردی لہر کہاں سے آ گئی۔

میں نے کپکپا کر لحاف اوڑھنے کی کوشش کی جسے اب تک میں نے پاؤں کے نیچے ہی رکھ چھوڑا تھا اور عین اسی لمحے میری نگاہ کمرے کے اس جانب اٹھ گئی جہاں کوئی چیز موجود تھی۔ میں نے غور سے دیکھا لیکن کچھ سجھائی نہ دیا۔ کمرے میں کچھ اس طرح کی آوازیں آ رہی تھیں گویا کوئی لڑ بگڑ کر کمرے میں ٹہل رہا ہو۔ ہڈیاں چٹخنے کی آوازیں لیکن کمرے میں کوئی نہیں تھا۔

مارے خوف کے میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں نے تھوک نگلنے کی کوشش کی لیکن حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ میرا جی چاہا کہ چیخ کر فیضی کو آواز دوں' جس کا کمرہ میرے کمرے کے برابر میں واقع تھا اور پھر میں واقعی چیخ اٹھا۔

میرے سامنے آتشدان کے بالکل سامنے ایک زرد رنگ کا غیر معمولی کتا زبان نکالے ہانپ رہا تھا۔ اس کی لٹکی ہوئی سرخ زبان خون آلود محسوس ہو رہی تھی۔ آنکھیں بے پناہ چمکدار تھیں اور دانت اس قدر نوکیلے کہ میں کانپ کر رہ گیا۔

اور پھر وہ زرد رنگ کا کتا میری طرف بڑھنے لگا میری آنکھیں خوف و دہشت سے ابل پڑیں' کتے کی عقبی ٹانگیں' آتشدان کے قریب تھیں لیکن اگلی ٹانگوں سے وہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی کمر ہر ساعت طویل ہوتی جا رہی تھی۔ زرد روئیں بال اس کے جسم پر کھڑے ہوتے چلے گئے اور میں تکیے میں منہ ڈال کر چیخا اور پھر سسکیاں بھرنے لگا۔

میرے کندھے کو کسی نے تھپتھپایا تو جیسے وہ حصہ ہی سن ہو گیا۔ میں نے بمشکل گردن موڑ کر دیکھا تو فیضی تھا اس کی آنکھیں کچھ سرخ دکھائی دے رہی تھیں۔ میں اس سے لپٹ کر بری طرح سسکیاں بھرنے لگا۔ وہ مجھے پچکارتا اور تسلی دیتا رہا۔

''کیا بات ہے ہارون۔ تم چیخ کیوں رہے تھے۔'' فیضی نے دریافت کیا۔

''کتا۔ میرے کمرے میں زرد رنگ کا ایک خوفناک کتا گھس آیا تھا۔''

''زرد رنگ کا کتا۔'' فیضی نے غیر یقینی لہجہ میں کہا۔ ''کمرے میں تو کچھ نہیں ہے بیٹے۔ میرا خیال ہے تم نے کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا۔''

وہ مجھے تھپکنے لگا بالکل اسی انداز میں جیسے ماں اپنے بچوں کو تھپک تھپک کر سلا دیتی ہے۔ آخری مرتبہ میں نے صرف یہی دیکھا کہ آتشدان بجھا ہوا تھا۔ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ کیونکہ اسے بطور خاص

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس لیے روشن کیا گیا تھا کہ کمرہ صبح تک گرم رہتا اور اس وقت نصف سب کا عمل تھا میں فیضی کی گود ہی میں سو گیا۔

صبح ہوئی تو میں بیدار ہو گیا۔ صبح اسقدر سہانی تھی کہ رات کے تمام خوف و خدشات از خود ہوا ہو گئے اور مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ میں نے واقعی کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا فیضی نے ناشتہ تیار کر رکھا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں اس کے ہمراہ گھومنے کے لیے جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔

جنگل کی سیر سے میری طبیعت میں آسودگی کی لہر دوڑ گئی واپس آیا تو ماموں چنگیز اپنا زرد چوغہ پہنے کمرہ نشست میں میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے مجھے ساتھ لیا اور عمارت دکھانے لگا۔

صدیوں پرانی عمارت تھی۔ پہاڑی پتھروں سے تعمیر کی ہوئی اس عمارت کے مغربی حصے میں ایک خوبصورت باغیچہ تھا جس کا ایک حصہ ویران تھا اور وہاں کے تمام پودے خزاں رسیدہ تھے۔ اس حصے میں ایک گنبد تھا۔ اس حصے میں ماموں چنگیز کی رہائش تھی۔ فیضی مجھے بتا چکا تھا کہ ماموں کی رہائش گاہ میں کسی کو جانے کی اجازت نہیں۔ اس کا ایک مخصوص نوکر تھا جو مجہول سا بوڑھا ہونے کے ساتھ ساتھ بالکل گونگا محسوس ہوتا تھا۔ وہ گنبد نما عمارت کی دیکھ بھال کرتا اور اس کی صفائی وغیرہ کے فرائض بھی اس کے ذمہ تھے۔

میں نے دیکھا کہ وہ کسی کو مخاطب کرتا ہے اور نہ ہی کسی کو جرات ہوتی ہے کہ اسے مخاطب کرے مجھے اس پر اسرار بوڑھے نوکر سے خوف آنے لگا عمارت کے جس حصے میں میری رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا اس میں ایک ملازمہ اور فیضی کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

ملازمہ بھی ایک بوڑھی عورت تھی اور جو واقعی گونگی تھی۔ اس کے جھریوں دار چہرے پر بے پناہ عافات کے آثار چھائے رہتے اور آنکھوں سے خوف جھلکتا تھا۔ میں نے دو ایک مرتبہ اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے میری طرف کوئی توجہ نہ دی۔

ایک بات جسے میں نے خاص طور سے محسوس کیا وہ یہ تھی کہ خود فیضی بھی چنگیز ماموں سے خوفزدہ رہتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اشد ضروری گفتگو کے علاوہ وہ اسے مخاطب کرنے کی کوشش تک نہیں کرتا تھا۔ البتہ وہ کبھی کبھی کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھتا ضرور رہتا تھا۔ میں بھی داخلی طور پر چنگیز ماموں سے خوفزدہ تھا۔

لیکن چونکہ وہ مجھ سے بے انتہا محبت اور شفقت سے پیش آتا تھا۔ اس لیے میں نے خوف کے ان تاثرات کو محض وہم پر محمول کرتے ہوئے ذہن سے ہی جھٹک دینے کی کوشش کی۔ یہ الگ بات ہے کہ میں کبھی بھی اس احساس سے پیچھا نہ چھڑا سکا۔

گنبد نما عمارت کا وہ حصہ جس میں چنگیز ماموں کی رہائش تھی میری نگاہوں کا مرکز بن گئی۔ میں اسے دیکھنے کے لیے بے تاب تھا لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس خواہش کی تکمیل کیونکر ہو اس کی طرف ایک ہی صورت تھی کہ خود ماموں مجھے اس حصے کی طرف لے جانے کے لیے آمادہ ہو جاتا۔

یہ غالباً دسویں رات تھی۔ چاند کی ہلکی ہلکی کرنوں میں میں اس ندی کے کنارے پھولوں کو چن رہا تھا جو باغیچے کے کنارے کنارے بہتی ہوئی عمارت سے باہر نکل جاتی تھی۔

دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ میرے پیچھے کوئی موجود ہے میرا سانس رک گیا۔ تنہائی میں کسی غیر مرئی وجود کے احساس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔ وہ جو کوئی بھی تھا بڑے غیر محسوس طریقے سے میرے عقب میں آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ گھوم کر دیکھا۔

سامنے چنگیز ماموں تھا۔ زرد چوغہ پہنے وہ ساکت و جامد کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ مجھے متوجہ دیکھا تو اس کے ہونٹ مسکراہٹ سے پھیل گئے۔ مجھے اس کے نوکیلے دانت دیکھ کر کوئی خوفناک درندہ یاد

آ گیا۔

"آپ نے مجھے خوفزدہ ہی کر دیا ماموں جان۔" میں کھسیا کر ہنسنے لگا۔

"خوفزدہ اور مجھ سے۔" وہ ہنسا اس کا قہقہہ بڑے ہی عجیب سے تاثر سے بھرپور تھا۔ "آؤ آج تمہیں اس گنبد نما عمارت کی سیر کراؤں۔"

میں خوشی سے کھل اٹھا اور خوشی خوشی اچھلتا ہوا اس کے ہمراہ گنبد نما عمارت کی جانب بڑھ گیا۔ راستے بھر کوئی بات نہ ہوئی ماموں چنگیز نے مجھے مخاطب کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی میں نے کچھ کہنے کی جرات کی۔ نہ جانے کیوں میرا دل دھڑکنے لگا تھا۔

ماموں چنگیز نے اپنے خشک استخوانی ہاتھوں میں میرا ہاتھ تھام لیا اور ہم عمارت میں داخل ہو گئے۔ عمارت میں کوئی قابل دید چیز تو موجود نہ تھی لیکن جو کچھ بھی تھا کم تحیر خیز ثابت نہ ہوا۔ سیڑھیوں سے لیکر چنگیز ماموں کی لائبریری تک ہر چیز زرد رنگ کی تھی۔ ہلکی سی زرد روشنی پھیل رہی تھی۔ جس سے عجیب زرد سا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ ماموں میرا ہاتھ تھامے سیدھا لائبریری ہی میں لے گیا۔

لائبریری میں چاروں طرف کتابوں کی الماریاں تھیں۔ بوسیدہ اور برسوں پرانی کتابیں جن کا سلسلہ چھت تک چلا گیا تھا۔ کمرے میں ایک لمبی سی میز تھی۔ جس پر ایک پنجرہ تھا۔ پنجرے میں ایک غیر معمولی جسامت کا چوہا ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔

ہم جیسے ہی اندر داخل ہوئے چوہے نے میری طرف دیکھا اور پھر اس کی خوفناک چمکدار آنکھیں میری آنکھوں میں گڑ گئیں وہ بے قراری کے عالم میں پنجرے کے اندر ادھر ادھر گھومنے لگا اس کے سامنے ایک آئینہ اور ایک خوبصورت عورت کا برہنہ مجسمہ تھا۔ یہ سب کچھ اس بڑی میز پر ہی رکھا ہوا تھا جو کمرے کی مغربی دیوار کی الماریوں کے سامنے موجود تھا۔

آئینے اور ایک سبز بوتل کے علاوہ اس کمرے میں کسی چیز کا رنگ مختلف نہ تھا۔ ہر چیز زرد رنگ کی تھی حتیٰ کہ پنجرہ اور اس میں مقید وہ غیر معمولی چوہا بھی زرد ہی رنگ کا تھا۔

چنگیز ماموں نے مجھے اپنے قریب بٹھا لیا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ میں سحر زدہ سا بیٹھا رہا۔ رفتہ رفتہ میرا خوف زائل ہونے لگا تو میں بھی گفتگو میں حصہ لینے لگا۔ ماموں نے باقاعدہ کہانیاں شروع کر دیں تو میرے لیے دلچسپی کا مزید سامان پیدا ہو گیا۔

میں مبہوت بیٹھا ان کہانیوں میں کھویا رہا جو ماموں چنگیز مجھے سنا رہا تھا۔

"کہانی ختم ہوئی تو میں نے خوف سے جھرجھری سی لی اور اس چوہے کی جانب دیکھنے لگا جو بڑی بے قراری سے زرد رنگ کے پنجرے میں گھوم رہا تھا۔ ماموں نے بتایا کہ یہ خاقان دیوتا ہے جسے ایک پستہ قد جادوگر نے پنجرے میں قید کر دیا ہے۔

چوہے کی طرف دیکھتے وقت ناگاہ میری نظر ایک زرد رنگ کی کھوپڑی پر پڑی۔ میں نے غور سے دیکھا تو یہ ایک فولادی ٹوپی تھی۔ میں حیرت اور غیر یقینی کے عالم میں اس ٹوپی کے گھورنے لگا تو ماموں چنگیز کی آنکھوں میں بے پناہ چمک پیدا ہو گئی۔ وہ مسکرانے لگا۔ اس کی مسکراہٹ اس قدر بھیانک تھی کہ میں سر سے پاؤں تک کانپنے لگا۔

"یہ عجیب و غریب ٹوپی ہے ہارون کیا تم دیکھ رہے ہو۔" میں نے بولنے کی کوشش کی لیکن زبان نے ساتھ نہ دیا تو اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

"اگر تم پسند کرو تو میں اسے پہن کر دکھاؤں۔"

ماموں چنگیز کی یہ بات سن کر میں خوفزدہ ہو گیا اور میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ اس وقت ماموں کا چہرہ کسی بیمار کی طرح زرد ہو رہا تھا لیکن آنکھوں کی چمک میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ میں نے گھبرا کر نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں۔

پنجرے میں بند چوہا بے قراری سے ادھر ادھر گھومنے لگا اور اس کے حلق سے عجیب عجیب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آوازیں نکلنے لگیں۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا گویا لائبریری میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگی ہو۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

کمرے کا ماحول اس قدر دہشت ناک تھا کہ مجھ سا کمسن لڑکا یوں بھی خوفزدہ ہو جاتا چہ جائیکہ اس قدر خوفناک کہانی سن کر میں سب کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا تھا اور پھر میں نے دیکھا کہ ماموں چنگیز کا ہاتھ غیر محسوس انداز میں اس ٹوپی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں یکا یک گھبرا کر اٹھا اور دروازے کی طرف لپکا۔ میرے حلق سے درد ناک چیخیں نکل رہی تھیں۔ چیختا چلاتا میں سیڑھیاں اترتا ہوا اس گنبد نما عمارت سے نکلا اور باغیچے میں پہنچا۔ دفعتاً میرے پاؤں کو ٹھوکر لگی لیکن میں منہ کے بل گرنے کے بجائے کسی کے مضبوط بازوؤں میں پہنچ گیا۔

میں نے کپکپا کر نگاہیں اٹھائیں تو فیضی مجھے سنبھالے ہوئے تھا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس قدر مضبوطی سے کہ مجھے اپنی ہڈیاں کڑکڑاتی ہوئی محسوس ہونے لگیں اور اس نے میرا ہاتھ اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک کہ میں نے وعدہ نہیں کر لیا کہ میں اس عمارت میں دوبارہ نہیں جاؤں گا۔

فیضی نے مجھے سختی سے منع کرنے کے بعد کہا کہ میں بھول کر بھی اس حصے کی طرف نہ جاؤں اور خاص طور سے ماموں چنگیز کے ہمراہ اس حصے میں جانے کی جرات تک نہ کروں۔ میں اس قدر خوفزدہ تھا کہ خود ہی اس حصے کی طرف جانا نہیں چاہتا تھا اس لیے میں نے فوراً ہی وعدہ کر لیا۔

اور فیضی ماموں چنگیز کو گالیاں بکنے لگا۔

میں مبہوت اس کی صورت دیکھتا رہا۔ مالک سے وفاداری اس کے اصولوں میں سے ایک اصول کی حیثیت رکھتی تھی اور اس بات کا اظہار وہ بارہا میرے سامنے کر چکا تھا' مجھے حیرت ہوئی کہ وہ ماموں چنگیز کو گالیاں دے کر اس اصول شکنی پر کیوں مجبور ہو گیا۔

اس حادثے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ فیضی سختی سے میری نگرانی کرنے لگا ہے۔ فیضی نے اس رات مجھ سے جدا ہوتے وقت ایک عجیب سا جذباتی جملہ کہا تھا جو میرے ذہن میں بری طرح گھومنے لگا۔

''میں ایک معصوم بچے کو اس شیطانی چکر میں نہیں پڑنے دوں گا۔ ایک معصوم بچے کی بھینٹ ناممکن..... میں اپنی زندگی میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔'' اس کی بڑبڑاہٹ میرے ذہن میں بازگشت کی مانند چکر لگاتی رہی میں سوچتا رہا لیکن سمجھ نہ سکا۔

وہ میری نگرانی کرتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ بعض اوقات وہ بالکل سائے کی طرح میرے ساتھ ہے۔ اس خیال سے مجھے یک گونہ سکون محسوس ہوا کہ فیضی میری حفاظت کر رہا ہے لیکن اس سکون کے پس منظر میں بھیانک خدشات اور وسوسے میرے دل کو بے چین کرنے پر ہر وقت آمادہ رہتے تھے۔

اگلے ہی دن ماموں چنگیز سے میری ملاقات ہوئی۔

وہ ہمیشہ کی طرح شفقت و محبت سے باتیں کرتا۔ اس کی آواز میں نسوانی لوچ تھا۔ بڑی ہی سریلی اور میٹھی آواز تھی۔ وہ مجھ سے محو کلام ہوتا تو میں گردوپیش سے بیگانہ ہو جاتا لیکن نہ جانے کیوں میں اس کے زیادہ قریب نہیں گیا۔ میرے ذہن پر ایک عجیب سا خوف ہر وقت سوار رہنے لگا۔ میں نے تجزیہ کیا تو معلوم ہوا کہ یہ ماموں چنگیز کا خوف ہے۔ رہی چنگیز جس کی پراسرار شخصیت سے میں خوفزدہ تھا لیکن اس کی میٹھی میٹھی باتوں سے پیاس نہ بجھتی تھی۔

اس شام میں نے فیضی اور چنگیز کو الجھتے دیکھا۔

میں دروازے کے عقب میں کھڑا ان کی

باتیں سنتا رہا۔ فیضی لرزتی ہوئی آواز میں اس سے اپنی مجبوری کا اظہار کر رہا تھا اور چنگیز بڑی بے دردی سے اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ فیضی کے ساتھ اس تضحیک آمیز سلوک پر میرا دل بھر آیا لیکن میں ماموں کی زبان نہیں پکڑ سکتا تھا۔ میں نے یہ بات خاص طور سے محسوس کی کہ چنگیز فیضی کی مجبوریوں کا حال سن کر لطف اندوز ہو رہا ہے۔ کچھ بھی ہی وہ گفتگو میرے بارے میں تھی اس لیے میں خوفزدہ ہونے کے ساتھ ساتھ ماموں چنگیز سے نفرت کرنے پر مجبور ہو گیا۔

رات ہوئی تو میں بستر پر دراز ہو گیا۔ باہر طوفانی ہوائیں جھکڑوں کی مانند شور مچاتی ہوئی چل رہی تھیں۔ بجلی چمکنے اور بادلوں کے گڑگڑانے کی آوازیں میری سماعت سے ٹکرانے لگیں تو مجھے محسوس ہوا کہ میں تنہا ہوں۔

میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ میں کسی شیطانی چکر میں آ پھنسا ہوں جہاں صرف فیضی ہی میرا ہمدرد تھا لیکن وہ ہر وقت تو میری نگرانی نہیں کر سکتا تھا اسے آخر دیگر معاملات بھی نپٹانے پڑتے تھے۔ پراسرار ملازمہ ماموں چنگیز اس کا پراسرار ملازم وہ پراسرار گنبد نما عمارت اور لائبریری میں موجود وہ دہشتناک اشیاء۔ میرا دم گھٹنے لگا۔

رات طوفانی تھی اور طوفان کا زور ہر لحظہ بڑھتا جا رہا تھا میں خوفزدہ ہو گیا۔ اس خوف کے عالم میں اس زرد کتے کا خیالی پیکر میرے ذہن میں ابھر آیا اور میں نے گھبرا کر لحاف میں منہ چھپا لیا۔

مجھے ماموں چنگیز سے نفرت ہو گئی تھی اس کی نرم اور شفقت آمیز آواز میرے دل کے تاروں کو چھوتی بھی تو خوف کا تاثر زائل نہ ہوتا۔ ہر لحہ میں وہاں سے بھاگ نکلنے کا ارادہ کرتا اور پھر میرے منصوبے دھرے کے دھرے رہ جاتے۔

اور پھر ایک دن ایسا آیا کہ میرا خوف جنون کی حد تک بڑھ گیا۔

میں اپنے کمرے کے برابر والی لائبریری میں بیٹھا ایک کہانی کی کتاب پڑھ رہا تھا۔ رات کا وقت تھا ہر طرف سناٹا تھا۔

میرے سامنے اور دائیں ہاتھ دو لیمپ روشن تھے۔ دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ لائبریری میں کوئی اور بھی موجود ہے۔

میرا دل دھڑکنے لگا۔

اور جب میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو لائبریری کے دروازے میں وہی خوفناک زرد رنگ کا کتا کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ اس وقت میری جو حالت ہوئی اس کا اظہار بیان سے باہر ہے' تاہم میں یہ یقین کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اس وقت تک میں نے جتنی مرتبہ بھی کتے کو دیکھا تھا' وہ ایک حقیقت تھی خواب نہ تھا۔

میرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب فرش پر گر گئی اور میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا جیسے ابھی چند لمحوں میں سینہ چیر کر باہر نکل آئے گا۔

زرد کتے کی چمکدار آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اس کی خونی زبان لٹک رہی تھی۔ وہ ہانپ رہا تھا اور اس کے نوکیلے دانت برے ہی بھیانک دکھائی دے رہے تھے وہ اپنے اگلے پنجوں سے فرش کو کھرچنے لگا میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

کچھ دیر بعد میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ رہا۔ زرد کتا میری جانب بڑھ رہا تھا۔

بالکل اسی انداز میں اس کی کمر طویل ہوتی جا رہی تھی جیسا کہ میں نے دیکھا تھا اس نے اپنے زرد رنگ کے پنجے کو اٹھایا' میں نے دیکھا اور خوف سے کپکپا گیا۔ چیخنے کی کوشش کی لیکن آواز ندارد میں چیخنے سے معذور تھا۔ خوف نے میری زبان گنگ کر دی تھی۔ میں بے حس و حرکت بیٹھا کسی کی آمد کا انتظار کرتا رہا۔

وہ میری کرسی کے قریب آ گیا۔

میں سانس روکے بیٹھا رہا۔

اس کی چمکدار آنکھیں مجھے گھورتی رہیں پھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے محسوس کیا کہ کتے نے اپنے دانت باہر نکال دیئے جیسے اس نے مسکرانے کی کوشش کی ہو۔ یہ مسکراہٹ بڑی ہی خوفناک تھی۔ پھر وہ کرسی سے آگے بڑھ گیا۔ اس کی پچھلی ٹانگیں لائبریری کے دروازے میں تھیں اور اگلی ٹانگیں کمرے کی دوسری دیوار تک پہنچ گئیں' کمر طویل ہوتی چلی گئی۔ جیسے جیسے اس کی کمر طویل ہو رہی تھی اس کے جسم پر دکھائی دینے والے زرد بال کھڑے ہوتے جا رہے تھے۔

میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں اور جب کچھ دیر بعد میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو لائبریری میں کوئی نہیں تھا۔ نہ جانے وہ خوفناک کتا کہاں چلا گیا تھا۔ البتہ ایک عجیب سی ناگوار بو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے اس کتے کے بارے میں کسی سے تذکرہ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ فیضی کو بھی نہیں بتایا۔ مجھے یہ محسوس ہو گیا تھا کہ میں کسی ڈرامے کے کلائمکس کا ایک کردار ہوں جس کے انتظار میں جانے کتنا عرصہ بیت گیا ہے جو کچھ ہونیوالا ہے وہ ناگزیر ہے میں نے اس خیال کے بعد خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا اور وہاں سے بھاگ نکلنے کا ارادہ ختم ہو گیا۔

اگلے دن میں باورچی خانے میں بوڑھی ملازمہ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ یکا یک وہ خوف سے کپکپانے لگی۔ اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور بڑبڑانے لگی۔ میں حیرت زدہ سا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے حیرت تھی' وہ گونگی ہونے کے باوجود بول کس طرح رہی ہے۔

وہ مہم سے الفاظ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی رہی۔ جس کا تھوڑا بہت مفہوم میرے ذہن میں پیدا ہوا کہ وہ کسی بھوت سے خوفزدہ ہے ایک ایسا بھوت جو عنقریب کوئی خونی کھیل کھیلنے والا تھا میں نے اس سے وضاحت چاہی لیکن وہ سسکیاں بھرتی ہوئی اٹھی اور دوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔

میرے دل میں خوف کا تاثر بہت گہرا ہو گیا۔ میری حالت کسی جنونی جیسی ہو گئی تھی اور میں بیزار ہو کر یہ سوچ رہا تھا کہ اب جو کچھ بھی ہونا ہے وہ فوراً ہو جائے اس کے بعد عمارت پر موت کا سناٹا طاری ہو گیا پہلے کسی کے ہنسنے یا باتیں کرنے کی آواز سنائی دیتی تھی اب وہ بھی ختم ہو گئی قبرستان کی سی ویرانی اور سناٹا محسوس ہونے لگا۔

میرا دم گھٹنے لگا۔

آخر عید کا دن آ گیا۔

مجھے افسوس ہونے لگا کہ اس آسیبی عمارت میں آنے کے بجائے میں شہر ہی میں کیوں نہ رہا مجھے اپنے ہم عمر بچوں کا خیال ستانے لگا۔ وہ بچے جو ہوسٹل میں میرے ساتھ رہتے تھے وہ میرا مذاق اڑاتے تھے لیکن اس قدر خوفزدہ تو نہیں کرتے تھے۔

عید کا دن اور وہ پراسرار عمارت۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ آخر تنگ آ کر میں لائبریری میں چلا گیا۔

وہاں مصوری کا سامان موجود تھا۔ میں ایزل پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچنے میں مصروف ہو گیا اور اس کے چند ہی لمحوں کے بعد کوئی آہستگی سے میرے عقب میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ گھوم کر دیکھا تو دھڑکنیں بے قابو ہونے لگیں۔ میرے سامنے چنگیز ماموں موجود تھا۔

وہ بیمار سا دکھائی دیتا تھا۔ گزشتہ تین روز سے میں اس سے ملا تک نہ تھا۔ سنا تھا کہ وہ بیمار ہے اور اس کا پراسرار ملازم اس کی تیمارداری میں مصروف ہے۔ اگرچہ میں اسے دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا تھا تاہم مجھے نہ جانے کیوں اس پر رحم سا آیا' وہ اس وقت واقعی قابل رحم حالت میں تھا۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا ماموں۔''

میں نے دریافت کیا میں نے دیکھا کہ اس کی کمر خمیدہ ہے اور وہ چہرہ جھکائے کھڑا ہے۔ اس کی اس قابل رحم حالت پر مجھے اور بھی افسوس ہوا۔

لیکن اس نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے افسردہ انداز میں مسکرانے کی کوشش کی۔

چنگیز کے زرد نوکیلے دانت نمایاں ہو گئے اور پھر دروازہ ایک جھٹکے سے بند ہو گیا۔

وہ جا چکا تھا۔

رات ہوئی تو میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور فیضی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

وہ کھلی کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے میرے بازو پر اپنے ہاتھ کی گرفت سخت کرتے ہوئے سرگوشی کی۔

''سنو کیا تم کوئی آواز سن رہے ہو۔''

میں نے سماعت پر زور دیا لیکن گھڑی کی ٹک ٹک کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دی اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے عمارت کے قریب سے کوئی گاڑی گزری ہو۔ فیضی کے ہاتھ کی گرفت میرے بازو پر اس قدر مضبوط ہو گئی کہ میری ہڈیاں کڑکڑا اٹھیں۔

''سنو ہارون ..... میرے بچے۔'' اس نے جذباتی لہجہ میں کہا۔ ''سنتے رہو' کیا تمہیں کچھ سنائی نہیں دے رہا۔''

میں نے مزید غور کیا تو پتھریلے راستے پر کسی جانور کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ اب یہ آوازیں بہت واضح ہو گئی تھیں میں خوف سے کانپ اٹھا۔ باہر تاریکی تھی اور موسم طوفانی لیکن اس جانور کے چلنے کی آوازیں مسلسل میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔

ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم ایک دوسرے کے دل کی بات سمجھ گئے ہوں۔ ہمارے ذہن میں ایک ہی مفہوم تھا۔

اور پھر دروازے میں وہی زرد رنگ کا کتا کھڑا تھا۔

چند لمحے وہ ہمیں گھورتا رہا۔ اس وقت اس کتے کی آنکھیں جلتے ہوئے انگاروں کی طرف دہک رہی تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے ہماری طرف بڑھنے لگا۔

''رک جاؤ'' رک جاؤ'' فیضی خوف سے کپکپائی ہوئی آواز میں غرایا۔

کمرے میں ناگوار سی بو پھیل گئی۔

کتا رک گیا۔ اس نے تھوتھنی فرش پر رکھ کر سونگھا اور پھر منہ اٹھا کر ہماری طرف دیکھا۔ اس کا دہانہ کھل گیا اور نوکیلے دانت دکھائی دینے لگے۔

''جاؤ۔ واپس چلے جاؤ'' فیضی خوف سے کپکپائی ہوئی آواز میں غرایا۔ اس کے منہ سے جھاگ اڑنے لگا تھا۔

کتا آگے بڑھتا رہا۔

فیضی چلاتا رہا۔

مگر کتا نہیں رکا۔

دفعتاً فیضی نے ریوالور نکال لیا اور نشست کا کمرہ فائر کی آواز سے گونج اٹھا۔ کتا واپس پلٹا۔ اس کی گردن سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگی تھیں وہ غرایا اور پھر جست لگا کر کمرے سے نکل گیا۔ فیضی ریوالور سنبھالے اس کے تعاقب میں بھاگا ایک اور فائر ہوا اور پھر خاموشی چھا گئی۔

میں بھاگ کر باہر نکلا اور فیضی نے مجھے اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ وہ سسکیاں بھر بھر کر رو رہا تھا۔ وہ مجھے لے کر اس گنبد نما عمارت میں داخل ہوا۔ لائبریری کی میز کے قریب کرسی پر ماموں چنگیز کا بے جان جسم پڑا تھا۔ اس کے قریب ہی وہ فولادی ٹوپی زمین پر گری ہوئی تھی۔ جسے پہننے کے بعد ماموں چنگیز زرد کتے کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ میں نے کانپ کر دیکھا' چنگیز کے حلق میں گولی کا نشان تھا۔

اور پھر میری نگاہ اس پنجرے کی طرف اٹھ گئی جس میں ایک خوفناک زرد رنگ کا چوہا مقید تھا پنجرہ کھلا ہوا تھا اور چوہے کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

راز کی بات

وقار بن سعید

پھر ساری موسیقی ٹھہر گئی اور اسے یوں لگا جیسے کہیں فاصلے پر بادل گرج رہے ہوں۔ اس کی نگاہوں کے سامنے عجیب سر زمین ابھر رہی تھی جو ایک طرف تو دھوپ سے جگمگا رہی تھی اور دوسری طرف بارش کی زد میں تھی۔ اس پر دھنک کی رنگین لہر بھی ابھری ہوئی تھی جس کے نیچے ہزاروں شہر سانس لے رہے تھے۔ درمیانی خطے میں ایک بڑا سانپ اپنے سر پر تاج پہنے بیٹھا تھا اور اسے اپنی خوفناک آنکھوں سے گھور رہا تھا۔

اس شمارے کی ایک فکر انگیز و دلچسپ تحریر

یہ ایک مصدقہ بات ہے اور اتنے بہت سے لوگ اس کی تائید کر چکے ہیں کہ بظاہر اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ سانپ کی آنکھ میں ایسی مقناطیسی کشش ہوتی ہے۔ جس کے باعث کوئی مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور جب کوئی اس کی کشش میں گرفتار ہو جاتا ہے تو مداخلت کے باوجود اس کی جانب کھنچتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اس کے زہر کا شکار ہو جاتا ہے۔

ہارکر پیکر برٹین نے جو شب خوابی کے گاؤن اور سلیپر میں ملبوس ایک صوفے پر ٹانگ پسارے بیٹھا تھا' اس جملے کو مرسٹر کی' سائنس کے کرشمے نامی کتاب میں پڑھا اور دل میں کہنے لگا' اس میں اچنبھے کی صرف یہ بات ہے کہ مورسٹر کے زمانے میں عقلمند ترین اور لائق افراد بھی اس خرافات پر یقین رکھتے تھے جسے اب ہمارے دور کے احمق ترین افراد بھی تسلیم نہیں کر سکتے۔ اس کے ذہن میں خیالوں کی ڈور تن گئی کیونکہ برٹین ایک تصور پرست شخص تھا اس نے آنکھوں کا زاویہ بدلے بغیر کتاب نیچے کی جیسے ہی کتاب اس کی نظروں کے سامنے سے ہٹی اس کی نگاہ کمرے کے ایک نیم تاریک گوشے میں پڑی' اس نے دیکھا کہ دیوار پر اس کے بستر کے نیچے روشنی کے دو نقطے چمک رہے تھے جن کے درمیان کوئی ایک انچ کا فاصلہ تھا۔ اس نے ذرا سوچا کہ یہ کیا شے ہو سکتی ہے پھر سر جھٹک کے دوبارہ کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ذرا دیر بعد ایک جذبے کے تحت جس کا تجزیہ کرنے سے وہ قاصر تھا۔ اس نے پھر کتاب نظروں کے سامنے سے ہٹائی اور سامنے دیکھا۔ روشنی کے نقطے ہنوز موجود تھے بلکہ اب وہ پہلے سے زیادہ روشن نظر آتے تھے اور ان میں سبزی مائل چمک تھی جس کی طرف پہلے اس کا دھیان نہ گیا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ ذرا نزدیک آ گئے ہوں لیکن چونکہ اس گوشے میں تاریکی زیادہ تھی لہٰذا ان کی نوعیت کے بارے میں اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا اس نے دوبارہ کتاب پڑھنی شروع کر دی۔ دفعتاً کتاب پڑھتے پڑھتے اسے ایک خیال آیا اور اس نے تیسری بار کتاب صوفے کے پہلو میں رکھی جو اس کے ہاتھ کی گرفت سے نکل کر فرش پر جا گری۔ برٹین تقریباً اٹھ گیا تھا وہ غور سے مسہری کے نیچے اندھیرے میں جھلملاتے ہوئے روشن تاروں کو دیکھتا رہا' اب اس کی ساری توجہ ان روشن نقطوں کی طرف تھی جنہیں وہ پوری دلچسپی اور انہماک سے گھورتا رہا۔ غور کرنے پر اسے مسہری کی پائینتی کے پاس اندھیرے میں ایک بڑا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا نظر آیا۔ اتنی دیر سے اس کی آنکھیں ننھے قمقموں کی طرح جگمگا رہی تھیں۔ اس کا خوفناک سر اس کے سب سے اندر والے کنڈل میں سے ابھرا ہوا بیرونی کنڈل پر رکھا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں سیدھی اس پر جمی ہوئی تھیں اور اس کے ہولناک جبڑے اور مکروہ انداز میں اٹھے ہوئے پھن سے اس کے نفرت انگیز ارادے کا پتہ چلتا تھا۔ اسے اب اس کی آنکھیں محض چمکدار نقطوں کی طرح نظر نہیں آئیں بلکہ لگتا تھا کہ جیسے وہ اس کی آنکھوں میں اتر گئی ہوں اور اس میں ایک خوفناک پیغام چھپا ہوا ہو۔

☆☆

کسی جدید شہر میں واقع ایک مکان کی خوابگاہ میں کسی سانپ کا پایا جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے' اس لیے اس غیر معمولی واقعے کی مناسب توجہ کو ہرگز نہیں ٹالا جا سکتا۔ پینتیس سالہ غیر شادی شدہ ہارکر برٹین ایک صحت مند ایتھلیٹ قسم کا آزاد منش شخص تھا۔ امیر و کبیر اور علم دوست ہونے کے علاوہ وہ سیر و سیاحت کا بہت شوقین تھا اور ابھی حال ہی میں بہت سارے دور افتادہ اجنبی ملکوں کی سیاحت کے بعد سان فرانسسکو واپس لوٹا تھا' چونکہ بڑے سے بڑے ہوٹل میں قیام سے اس کے ذوق نفس کی تسکین نہ ہو سکتی تھی لہٰذا اس نے اپنے ایک دوست ڈاکٹر ڈرو رنگ شہر کے ایک دور افتادہ علاقے میں پرانی وضع کی ایک شاندار عمارت میں مقیم تھا جو اپنی قدیم شان و شوکت کے سبب نمایاں تھی۔ اس کی پراسراریت میں اس طرح اور بھی اضافہ ہو گیا تھا کہ اس کا ایک حصہ ڈاکٹر کے اپنے شوق کی بناء پر سانپ گھر پر مشتمل تھا اس حصے میں اس کی تجربے گاہ اور عجائب گھر واقع تھا' جہاں ڈاکٹر اپنی تنہائی کو سائنسی تجربات پر صرف کرتا تھا اور حیوانی زندگی کے اعلیٰ مظاہر کے مطالعے میں مصروف رہتا تھا۔ ان حشرات الارض میں جو اس کی خاص توجہ کا مرکز تھے' عمدہ قسم کے سانپ اور اژدھے شامل تھے۔ وہ ان رینگنے والے کیڑوں میں خاص دلچسپی کے باعث خود کو ان کا رازداں کہتا تھا چونکہ اس کے بیوی بچے سانپوں سے متعلق اس کے علم تجسس اور تجربے میں ہرگز شریک ہونا پسند نہ کرتے تھے لہٰذا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انہیں اختیار تھا کہ وہ اس کے سانپ گھر سے دور رہیں اور اپنا وقت اپنی جیسی مخلوق کے ساتھ جیسے چاہیں بسر کریں چونکہ دولت کی فراوانی تھی اس لیے وہ اپنے روز و شب کو رنگین سے رنگین تر بنا سکتے تھے اس کی انہیں پوری اجازت تھی۔

سانپ گھر سادگی سے سجا ہوا تھا اور اس میں سانپوں کے آرام دہ قیام کے سارے انتظامات موجود تھے لیکن بہتوں کو اس آزادی سے محروم رکھا گیا تھا جو عیش کی منزل کہلاتی ہے' اس لیے کہ ان پر زندہ ہونے کی خوفناک حقیقت صادق آتی تھی اور انہیں اپنے اپنے میں بھی اتنا بااختیار نہیں بنایا گیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو نگلنے لگیں۔

برٹن کے علم میں یہ بات بھی لائی گئی تھی کہ اس تمام احتیاط کے باوجود بعض اوقات ان میں سے کچھ اپنے فرار کے منصوبے کو عمل جامہ پہنانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں اور اکثر انہیں رہائشی علاقوں میں بعض ایسے مقامات پر اٹھکیلیاں کرتے پایا گیا تھا جہاں ان کا داخلہ کسی طور پر بھی پسند نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سانپ گھر اور اس کے متعلق تمام باتیں جاننے کے باوجود برٹن کو ڈرورنگ منزل میں اپنا قیام بہت آرام دہ محسوس ہوا۔

سانپ کی موجودگی سے برٹن کو اچنبھا تو ہوا لیکن سوائے کراہت کا شکار ہونے کے اور کچھ بھی حائل نہیں ہوا پہلے اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ وہ گھنٹی بجا کے کسی ملازم کو بلا لے لیکن اس کے باوجود کہ گھنٹی کا تار اس کے قریب ہی لٹک رہا تھا' اس نے گھنٹی اس لیے استعمال نہیں کی کیونکہ اس نے سوچا کہ شاید اس کا یہ عمل خوف کے شبہ میں سرزد ہونے والا تھا حالانکہ وہ خوفزدہ ہرگز نہیں تھا۔ اس تعجب خیز اور عجیب صورت حال کو جاننے کا تجسس زیادہ تھا اور اس کے خطرات کا احساس کم۔

برٹن کے لیے یہ نئے قسم کا سانپ تھا اس کی لمبائی کا وہ صرف تصور کر سکتا تھا اور اس کا جو سر انظر آ رہا تھا اس کی موٹائی اس کی اپنی کلائی کی موٹائی کے برابر تھی۔

اس نے سوچا' اگر یہ خطرناک ہے تو کس انداز سے خطرناک ہے۔ کیا یہ زہریلا ہے۔ کیا یہ ایسا سانپ ہے جو بھینچ لیتا ہے۔ قدرتی آفتوں کے بارے میں اس کا علم یہاں بالکل خاموش تھا۔ اس نے سوچا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ خطرناک نہ ہو لیکن خوفناک تو ضرور تھا ویسے بھی وہاں اس کی موجودگی بجائے خود کسی حادثے سے کم نہ تھی اور جنگل کے اس خوفناک نمائندے کی موجودگی میں کمرے کی ساری سجاوٹیں' فرنیچر اور تصویروں سے مزین دیواریں ناموزوں اور عجیب لگ رہی تھیں اور اس کی آتشیں سانس ماحول کے ساتھ مل کے خود اس کی سانسوں کا حصہ بن گئی تھی۔

برٹن کے دماغ میں خیالوں کے مدوجزر سے عمل کی خواہش پیدا ہوئی جسے عرف عام میں سوچ بچار کے بعد کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کہا جاتا ہے۔ یہی وہ صفت ہے جس کی بناء پر انسان کو عاقل کہا جا سکتا ہے اور غیر عاقل بھی۔

آدمی کے عمل کا راز کیا ہے۔ اس کا جواب صاف ہے۔ یعنی یہ وہ قوت ہے جو اس کی رگوں اور پٹھوں میں تحریک پیدا کرتی ہے اور اس وقت کو جو آدمی کو اس عمل پر آمادہ کرتی ہے' ہمت کہتے ہیں۔

برٹن اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے چاہا کہ وہ سانپ کو ہشیار کیے بغیر اس سے دور ہٹ جائے اور کسی طرح دروازے تک پہنچ جائے اسے یقین تھا کہ وہ کسی چیز سے الجھے اور ٹھوکر کھائے بغیر الٹے قدموں چلتا ہوا دروازے تک پہنچ سکتا ہے لیکن اگر اس نے اس کا پیچھا کیا تو۔ اس نے سوچا۔ دیوار پر سجاوٹ کی اشیاء میں جو قدیم اسلحہ شامل ہیں ان میں سے وہ کوئی بھی چیز اپنے دفاع میں استعمال کر سکتا ہے۔

اسی وقت سانپ کی آنکھیں عجیب گھناؤنے انداز میں پہلے سے زیادہ شعلے برسانے لگیں۔ برٹن نے اپنا دایاں پاؤں فرش سے اٹھایا تاکہ ایک قدم پیچھے ہٹ سکے مگر وہ کوشش کے باوجود ایسا کرنے سے باز رہا۔ وہ بڑبڑایا۔ ''میرا شمار بہادروں میں ہوتا ہے۔

یقیناً مگر کیا بہادری محض خوش ہونے کی چیز ہے۔ اچھا اگر میں اب پسپائی اختیار کر لوں تو یہاں میری بزدلی پر ہنسنے کے لیے کوئی موجود ہے ہرگز نہیں۔''

اس کا پاؤں اب بھی اٹھا ہوا تھا اور اسے اپنا توازن برقرار رکھنے کے لیے کرسی کا سہارا لینا پڑا تھا

''کمال ہے۔'' اس نے زور سے کہا۔ ''کیا میں ایسا بزدل ہوں کہ آپ ہی آپ خوفزدہ ہو رہا ہوں۔''

پھر اس نے اپنا پاؤں ذرا اور اوپر اٹھایا۔ گھٹنے کو موڑا اور پھر تیزی کے ساتھ نیچے رکھا لیکن دوسرے پاؤں سے تقریباً ایک انچ آگے کی طرف قدم آگے کی سمت اٹھ رہا تھا۔ ہائیں..... اس نے سوچا یہ کیسے ہوا۔ اس نے پھر بائیں پاؤں کو استعمال کیا مگر وہی نتیجہ سامنے آیا۔ ارے وہ تو آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کا ہاتھ اب بھی کرسی کی پشت پر رکھا ہوا تھا لیکن بازو پھیلا ہوا تھا پیچھے کی طرف اگر کوئی دوسرا شخص کمرے میں موجود ہوتا تو وہ یہ صاف طور پر محسوس کر سکتا تھا کہ برٹن کرسی چھوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہے۔

سانپ کا سر اندرونی کنڈل سے گردن تک ابھرا ہوا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ذرا نہ ہلا لیکن اس کی آنکھوں سے کوندے لپک رہے تھے اور بے شمار دہکتی ہوئی سوئیاں اڑ رہی تھیں۔

برٹن کا چہرہ پیلا پڑ چکا تھا۔ اس نے پھر ایک قدم آگے بڑھایا اس کے بعد ایک اور..... کرسی اس کے ساتھ گھسٹتی ہوئی آگے آئی اور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے ایک دھماکے کے ساتھ فرش پر جا گری۔ برٹن کے منہ سے کراہ نکلی۔ سانپ نے کوئی حرکت کی نہ کوئی آواز نکالی لیکن آنکھیں کیا تھیں..... وہ جلتے ہوئے سورج افق پر موجود تھے جن کی تابناکی میں سانپ کا سارا بدن چھپا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے روشنیوں کے بڑے بڑے چمکدار رنگ برنگے دائرے ابھر رہے تھے جو آگے بڑھ کے صابن کے بلبلوں کی طرف فضا میں تحلیل ہو جاتے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ان دائروں کی زد میں۔ ان کا لمس وہ اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا پھر اس نے دور کہیں پر ڈھول بجنے کی آوازیں سنیں۔ دور سے موسیقی کی نہایت مدھر آوازیں اس کے کانوں میں آ رہی تھیں۔ اس نے خود کو نیل کے کنارے ٹہلتا ہوا محسوس کیا اور اس کے کانوں میں ایسے لافانی نغمے کی گونج سنائی دے رہی تھی جو گمشدہ صدیوں کی پرسکوت چھاتی سے ابل رہا ہو۔

پھر ساری موسیقی ٹھہر گئی اور اسے یوں لگا جیسے کہیں فاصلے پر بادل گرج رہے ہوں۔ اس کی نگاہوں کے سامنے عجیب سرزمین ابھر رہی تھی جو ایک طرف تو دھوپ سے جگمگا رہی تھی اور دوسری طرف بارش کی زد میں تھی۔ اس پر دھنک کی رنگین لہر بھی ابھری ہوئی تھی جس کے نیچے ہزاروں شہر سانس لے رہے تھے۔ درمیانی خطے میں ایک بڑا سا سانپ اپنے سر پر تاج پہنے بیٹھا تھا اور اسے اپنی خوفناک آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ اچانک یہ سرزمین آہستگی کے ساتھ ذرا سی بلند ہوئی اور کسی تھیٹر کے آخری منظر کی طرح تاریکی میں گم ہو گئی۔ اچانک کوئی چیز زور سے اس کے سینے اور منہ سے ٹکرائی۔ وہ فرش پر گر گیا اور اس کی زخمی ناک اور خراش زدہ ہونٹوں سے خون بہہ نکلا۔ چند لمحے وہ سکتے کے عالم میں پڑا رہا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ فرش پر تھا۔ ذرا دیر کے بعد جب اس کے حواس بجا ہوئے تو اس نے محسوس کیا کہ گرنے کی وجہ سے چونکہ اس کی نگاہیں سانپ سے ہٹ گئی تھیں لہٰذا وہ خود بخود اس کی نظروں کے سحر سے آزاد ہو گیا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اب آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ سکتا ہے لیکن اسے خیال آیا کہ سانپ جو اس کے سر سے چند گز کے فاصلے پر موجود تھا' جست لگا کے با آسانی اس پر سوار ہو سکتا ہے اور اس کے گلے کو اپنی گرفت میں لے سکتا ہے اس نے اپنا سر اٹھا کر اسے دیکھنے کی کوشش کی اور دوبارہ اس کی شیطانی آنکھوں کے طلسم میں گرفتار ہو گیا۔ سانپ نے کوئی حرکت نہیں کی تھی اور لگتا تھا کہ جیسے برٹن کے خیالات پر اس کی گرفت بھی جاتی رہی تھی۔ کیونکہ اب برٹن کو وہ مناظر دوبارہ دکھائی نہیں دیے جو کچھ دیر پہلے اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھے تھے لیکن سانپ کے سیاہ پھن کے سرے پر اس کی آنکھیں اب بھی اسی طرح چمک رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے اپنی کامیابی کا یقین ہو چکا ہو جبھی تو اس نے مزید کسی طلسمی حربے کا استعمال ترک کر دیا تھا۔ معاً ایک خوفناک معاملہ پیش آیا۔ برٹین نے فرش پر پڑے پڑے کہنیوں کے بل اپنے آدھے دھڑ کو اوپر اٹھایا۔ اس کی ٹانگیں پیچھے کی طرف پھیلی ہوئی تھیں اور پیٹ زمین سے لگا ہوا تھا اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا اور آنکھیں پوری طرح پھٹی ہوئی تھیں۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا اچانک اس کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا بدن ایسے تڑپنے اور بل کھانے لگا جیسے وہ خود کسی ناگ کا روپ دھار چکا ہو۔ اس نے کمر کے بل ذرا اٹھ کے ٹانگوں کو گھسیٹا لیکن اس کے بدن کی ہر حرکت اسے سانپ کے نزدیک سے نزدیک تر لیے جا رہی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو آگے پھیلا کے خود کو آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش کی مگر بے سود..... وہ کہنیوں کے بل آگے بڑھتا گیا۔

☆☆

ڈاکٹر ڈرورنگ اور ان کی بیگم لائبریری میں بیٹھے ہوئے تھے' ڈاکٹر اس وقت بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ اس نے کہا۔ ''سنو میں نے ابھی حال میں اپنے جیسے سانپوں کے ایک دلدادہ شخص سے ایک نہایت نایاب قسم کا سانپ تبادلے میں حاصل کیا ہے۔''

اس کی بیوی نے بیدلی سے پوچھا۔ ''وہ کیا چیز ہے بھلا۔''

''چیز..... اوہو جان..... وہ سانپ..... بھئی کیا بتاؤں۔ میری صحبت میں رہ کے بھی تمہاری معلومات صفر ہی رہیں۔ افسوس' صد افسوس..... خیر سنو۔ وہ سانپ جو میں نے حاصل کیا ہے ان سانپوں سے تعلق رکھتا ہے جو دوسرے سانپوں کو کھا جاتے ہیں۔''

''اچھا۔'' بیگم نے خوش دلی سے کہا۔ ''خدا کرے وہ تمہارے سب سانپوں کو کھا جائے لیکن.....'' انہوں نے لیمپ دوسری طرف رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آخر وہ دوسرے سانپوں کو اپنا نشانہ کیسے بناتا ہے۔ میرے خیال میں انہیں مسحور کر کے کیوں۔''

ڈاکٹر ہنسا اور شرارت سے بولا۔ ''بالکل تمہاری طرح جان' ویسے سچ بتاؤں میں اس احمقانہ بات پر یقین نہیں رکھتا کہ سانپوں میں مسحور کرنے کی کوئی قوت ہوتی ہے۔''

اسی وقت ان کی گفتگو ایک زوردار چیخ سے منقطع ہو گئی پھر کئی اور زور کی چیخیں ابھریں۔ وہ دونوں اچھل کے کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا۔ اس کی بیوی کا چہرہ خوف سے پیلا ہو گیا۔ ڈاکٹر باہر کی طرف لپکا اور تیزی سے زینے پھلانگتا چلا گیا۔ کوریڈور میں برٹین کے کمرے کے سامنے اسے بالائی منزل سے کئی ملازم آتے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ تیزی سے مہمان خانے کی طرف لپکے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ برٹین فرش پر اوندھا پڑا تھا۔ وہ مر چکا تھا۔ اس کا سر اور دونوں بازو پائینتی کی طرف مسہری کے نیچے چھپے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس کا جسم باہر گھسیٹ کے سیدھا کیا۔

برٹین کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں جن میں کوئی نہ دکھائی دینے والا خوفناک منظر منجمد تھا۔ اس کے چہرے پر خوف تھا اور منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کا دایاں ہاتھ سینے پر رکھا اور کہا۔ ''شاید اس پر کوئی دورہ پڑ گیا تھا جس سے یہ چل بسا۔''

اچانک اس کی نظر مسہری کے نیچے گئی۔ ''ارے!'' اس نے حیران ہو کے کہا۔ ''یہ کم بخت یہاں کیسے۔''

اس نے مسہری کے نیچے ہاتھ ڈال کے سانپ کو پکڑا اور زور سے کمرے کے بیچ میں اچھال دیا۔ سانپ بدستور کنڈلی مارے ہوئے زوردار آواز سے فرش سے ٹکرایا اور پھسلتا ہوا دیوار سے جا لگا جہاں وہ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ وہ مصنوعی سانپ تھا جس کی آنکھوں کی جگہ دو چمکتے ہوئے ہیرے لگے ہوئے تھے۔

یہ غازی

محمد اکبر

دوسری صبح اتوار تھا۔ اس وجہ سے وہ کافی دیر میں سو کر اٹھی۔ اس کی جرمن روم میٹ باہر جا چکی تھی۔ اس نے اٹھ کر حسب معمول دروازے کے نیچے پڑے ہوئے سنڈے ایڈیشن اٹھائے سب سے اوپر والے اخبار کی شہ سرخی میں وہ خوفناک خبر چھپی تھی۔ اس کی تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔

اس شمارے کی ایک فکر انگیز و دلچسپ تحریر

ٹرین مغربی جرمنی کی سرحد میں داخل ہو چکی تھی' حد نظر تک لالہ کے تختے لہلہا رہے تھے' دیہات کی شفاف سڑکوں پر سے کاریں زناٹے سے گزرتی جاتی تھیں' ندیوں میں بطخیں تیر رہی تھیں۔ ٹرین کے ایک ڈبے میں پانچ مسافر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ایک بوڑھا جو کھڑکی سے سر لگائے باہر دیکھ رہا تھا ایک فربہ عورت جو شاید اس کی بیٹی تھی اور اس کی طرف سے بہت فکر مند نظر آتی تھی۔ غالباً وہ بیمار تھا۔ سیٹ کے دوسرے سرے پر ایک خوش شکل طویل القامت شخص

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چالیس سال کے لگ بھگ عمر متبسم' پرسکون چہرہ ایک فرنچ کتاب کے مطالعے میں منہمک تھا۔ مقابل کی کرسی پر ایک نوجوان لڑکی جو وضع قطع سے امریکن معلوم ہوتی تھی' ایک ملٹی تصویر رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی اور کبھی کبھی نظریں اٹھا کر سامنے والے پرکشش شخص کو دیکھ لیتی تھی۔ پانچویں مسافر کا چہرہ اخبار سے چھپا ہوا تھا۔ اخبار کسی ادق اجنبی زبان میں تھا۔ شاید نارویجن یا ہنگیرین یا ہوسکتا ہے آئس لینڈک۔ اس دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو آئس لینڈک میں باتیں کرتے ہیں' پڑھتے لکھتے اور شعر کہتے ہیں۔ دنیا عجائب سے خالی نہیں۔

امریکن نما لڑکی نے جو خالص امریکن تجسس سے یہ جاننا چاہتی تھی کہ یہ کونسی زبان ہے' اس خوب صورت آدمی کو اخبار پڑھنے والے نوجوان سے بات کرتے سنا۔ وہ بھی کسی اجنبی زبان میں بول رہا تھا لیکن وہ زبان ذرا مانوس سی معلوم ہوئی۔ لڑکی نے قیاس کیا کہ یہ شخص ایرانی یا ترک ہے۔ وہ یہ فیصلوں گائے پرشین ہے۔

اچانک بوڑھے نے جو انگریز تھا۔ آہستہ سے کہا۔

''دنیا واقعی خاصی خوب صورت ہے۔''

یہ ایک قطعی برطانوی انڈر اسٹیٹمنٹ تھا۔ لڑکی کو معلوم تھا کہ دنیا حد سے زیادہ خوب صورت جگہ ہے۔

بوڑھے کی بیٹی کینڈین لڑکی کو دیکھ کر خفیف سی اداسی سے مسکرائی۔ باپ کی ٹانگوں پر کمبل پھیلا کر مادرانہ شفقت سے کہا۔

''ڈیڈ اب آرام کرو۔''

اس نے جواب دیا۔ ''ایڈنا میں یہ مناظر دیکھنا چاہتا ہوں۔'' اس کی بیٹی نے دستان سے کہا۔ ''اچھا۔ اس کے بعد ذرا سا سو جاؤ۔''

اس کے بعد وہ آکر کینڈین لڑکی کے پاس بیٹھ گئی گو انگریز تھی مگر شاید اپنا دکھ بانٹنا چاہتی تھی۔

''میرا نام ایڈنا ہنٹ ہے۔ یہ میرے والد ہیں پروفیسر چارلس ہنٹ۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''میں تمہارا فیلڈنگ ہوں۔ ٹورونٹو' کینیڈا۔''

''کیمبرج۔ انگلینڈ' ڈیڈ وہاں پیٹر ہاؤس میں ریاضی پڑھاتے تھے۔''

''کچھ بیمار ہیں۔''

''سرطان اور انہیں بتا دیا گیا ہے۔'' ایڈنا نے سرگوشی میں جواب دیا۔

''اوہ آئی ایم سوسوری۔'' تمہارا فیلڈنگ نے کہا۔ خاموشی چھا گئی۔ کسی اجنبی کے ذاتی الم میں دفعتاً داخل ہوجانے سے بڑی خجالت ہوتی ہے۔

''اگر تم کو یہ معلوم ہوجائے۔'' ایڈنا ہنٹ نے آہستہ آہستہ کہا۔ ''کہ یہ دنیا بہت جلد فلاں مدت کے بعد اور ہمیشہ کے لیے چھوڑنی ہے تو جانے۔ کیسا لگتا ہوگا۔''

''اس معاملے میں انسان کو بہت صابر اور فلسفی ہوجانا چاہیے۔'' تمارا نے کہا اور خفت سے ہنسی۔

''حالانکہ یہ بھی بیکار ہے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔'' ایڈنا ہنٹ نے جواب دیا۔

''جیسے میں اس وقت خود صابر اور فلسفی بننے کی کوشش کر رہی ہوں۔'' ایڈنا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا گو بحیثیت ایک وضعدار انگریز خاتون وہ کسی سے ذاتی سوال کرنا نہ چاہتی تھی۔ اس بے تکلف کینڈین لڑکی نے بات جاری رکھی۔

''میں جرمنی آنا نہ چاہتی تھی۔ اس ملک سے بہت خوفناک یادیں وابستہ ہیں۔ میری والدہ کے دو ماموں ایک خالہ ان کے بچے۔ سب کے سب۔ میری ممی آج بھی کسی فیکٹری سے چمنی سے دھواں نکلتا دیکھتی ہیں تو منہ پھیر لیتی ہیں۔''

''اوہ۔''

''حالانکہ یہ میری پیدائش سے بہت پہلے کے واقعات ہیں۔''

''اوہ۔ میں تمہارے کرسچین نام سے سمجھی تم روسی نژاد ہو۔ حالانکہ تمہارا خاندانی نام خالص اینگلو سیکسن ہے۔''

''میرے نانا روسی تھے۔ میرے والد کا اصل نام ڈیوڈ گرین برگ تھا۔ کینیڈا جا کر تعصب سے بچنے کے لیے بدل کر فیلڈنگ کرلیا لیکن میں۔'' اس نے ذرا جوش سے کہا۔ ''میں اپنے باپ کی طرح بزدل نہیں۔ میں اپنا پورا نام اس طرح لکھتی ہوں تمہارا گرین برگ فیلڈنگ۔''

''واقعی۔'' برطانوی خاتون نے کہا۔ ''کتنی دلچسپ بات ہے۔''

''اولاد آدم کا شجرہ بہت گنجلک ہے۔'' تمہارا نے غیر ارادی طور پر ذرا اونچی آواز میں کہا۔ کیونکہ وہ اس وجہ سے ہمیشہ متحیر رہتی تھی۔

سامنے والے دلکش آدمی نے اس کا فقرہ سنا اور سر اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرایا۔ گویا کہتا ہو۔ ''میں تمہاری بات سمجھتا ہوں۔'' لڑکی دل ہی دل میں اس کی مشکور ہوئی اور اسے دیکھ کر خود بھی مسکرائی اب غالباً میں اس اجنبی پر عاشق ہوتی جا رہی ہوں۔

برطانوی خاتون نے بھی غالباً یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو دلچسپی سے دیکھ رہے ہیں۔ ایک جگہ پر دو انسان ایک دوسرے کی طرف کھنچیں تو سمجھ لیجیے کہ اس انڈر کرنٹ کو حاضرین فوراً محسوس کرلیں گے۔ کیونکہ اولاد آدم کی باہم کشش کا عجیب کھیلا ہے۔

بوڑھا پروفیسر آنکھیں کھول کر پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

''میرے نانا..... جب کریمیا سے بھاگے انقلاب کے وقت تو اپنے ساتھ صرف قرآن لے کر بھاگے تھے۔'' تمارا نے آہستہ سے کہا۔

''کوران.....'' ایڈنا نے تعجب سے دوہرایا۔

''ہاں' وہ موزلم تھے اور میری نانی ممی کو بتاتی تھیں وہ اکثر کہا کرتی تھے کہ قرآن میں لکھا ہے' دنیا بہت خوب صورت ہے۔ اس میں خوشی سے رہو اور دوسروں کو بھی خوش رہنے دو اور شاید موزلیم پروفٹ نے کہا تھا کہ اس سے بہتر دنیا نہیں ہوسکتی تھی۔'' سگریٹ سلگانے کے لیے تمارا نے حسب معمول لائٹر کی تلاش میں بیگ کھنگالنا شروع کیا۔ ایرانی نما شخص نے فوراً آگے جھک کر اپنا لائٹر جلایا۔ پھر اجازت چاہ کر تمارا کے پاس بیٹھ گیا۔

ایڈنا ہنٹ دوسری طرف سرک گئی۔ ایرانی نما شخص کھڑکی کے باہر گزرتے ہوئے سہانے مناظر دیکھنے میں محو ہوگیا۔ تمارا نے اس سے آہستہ سے کہا۔ ''یہ بزرگ سرطان میں مبتلا ہیں۔ جن لوگوں کو یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ چند روز بعد دنیا سے جانے والے ہیں انہیں جانے کیسا لگتا ہوگا۔ یہ خیال کہ ہم بہت جلد معدوم ہوجائیں گے۔ یہ دنیا پھر کبھی نظر نہ آئے گی۔''

ایرانی نما نوجوان درد مندی سے مسکرایا۔ ''جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ وہ عنقریب موت کے منہ میں جانے والا ہے۔ وہ سخت دل ہوجاتا ہے۔''

''واقعی۔''

ہمسفر نے اپنا نام بتایا ڈاکٹر شریفیان۔ تبریز یونیورسٹی شعبہ تاریخ کا کارڈ دیا۔ اس پر نام کے بہت سے نیلے حروف چھپے تھے۔ لڑکی نے فطری تجسس سے دریافت کیا۔ ''این آئی کیو یعنی۔''

''نصرت الدین امام قلی۔''

لڑکی نے اپنا نام بتانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ اس نصرت الدین امام قلی سے اس کی پہلی اور آخری ملاقات ہرگز نہیں ہے۔

ایک قصبے کے اسٹیشن پر ٹرین رکی۔ اخبار پڑھنے والا لڑکا اسی جگہ سرعت سے اتر گیا۔ وکٹور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شریفیان بھی لپک کر باہر گئے۔ باہر بارش شروع ہو چکی تھی۔ درخت اور پھول اور گھاس پانی میں جگمگا رہے تھے۔ اکا دکا مسافر برساتیاں اوڑھے پلیٹ فارم پر چپ چاپ کھڑے تھے۔ چند لمحوں بعد ایرانی پروفیسر لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمپارٹمنٹ میں واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں لالہ کے دو گلدستے تھے جو اس نے بڑے اخلاق سے جھک کر برطانوی اور کینیڈین خواتین کو پیش کیے اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ بوڑھا سو چکا تھا۔ دوسرے کونے میں اس کی فربہ بیٹی اپنی بانہوں پر سر رکھ کر اونگھ رہی تھی۔ دفعتاً ایرانی دکتور نے کینیڈین لڑکی سے کہا۔ ”تمہارا خانم۔ کہاں تک میرے ساتھ رہو گی۔“

وہ اس سوال کا مطلب سمجھی اور اسے آج تک کسی نے تمارا خانم کہہ کر مخاطب نہ کیا تھا۔ دراصل وہ اپنے گھر اور کالج میں ٹم کہلاتی کہاں نا معقول ٹم! اور کہاں تمہارا خانم جیسے سرود بج رہا ہو یا عمر خیام کا مصرع۔ تمہارا خانم کی ایران سے واقفیت محض ایڈورڈ فٹز جیرلڈ تک محدود تھی۔ اس نے اسی کیفیت میں کہا۔ ”جہاں تک ممکن ہو۔“

بہرحال وہ دونوں ایک ہی جگہ جا رہے تھے۔ تمارا نے ایرانی پروفیسر کے سوٹ کیس پر چپکا ہوا لیبل پڑھ لیا تھا۔

”تم وہاں پڑھنے جا رہی ہو یا سیر کرنے۔“

”پڑھنے۔ بایو کیمسٹری۔ مجھے ایک اسکالر شپ ملا ہے۔ تم ظاہر ہے پڑھانے جا رہے ہو گے۔“

”صرف چند روز کے لیے۔ میری دانشگاہ نے ایک ضروری کام سے بھیجا ہے۔“

ٹرین قرون وسطیٰ کے ایک خوابیدہ یونیورسٹی ٹاؤن میں داخل ہوئی۔

دوسرے روز وہ وعدے کے مطابق ایک کیفے ٹیریا میں ملے کاؤنٹر سے کھانا لینے کے بعد ایک دریچے والی میز پر جا بیٹھے دریچے کے عین نیچے خوش منظر ندی بہہ رہی تھی۔ دوسرے کنارے پر ایک کائی آلود گوتھک گرجا کھڑا تھا۔ سیاہ گاؤن پہنے انڈر گریجویٹ ندی کے پل پر سے گزر رہے تھے۔

”بڑا خوب صورت شہر ہے۔“ تمارا نے بے ساختہ کہا۔ حالانکہ وہ جرمنی کی کسی چیز کی تعریف کرنا نہ چاہتی تھی۔

وکتور نصرت الدین بے حد پرمذاق اور خوش دل شخص تھا۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں کر کے اسے ہنساتا رہا۔ تمارا نے اسے یہ بتانے کی ضرورت نہ سمجھی کہ وہ جرمنی سے کیوں متنفر تھی۔

اچانک نصرت الدین نے خالص طہرانی لہجے میں اس سے کہا۔ ”خانم جون۔“

”ہوں۔ جون کا مطلب۔“

”زندگی۔“

”ونڈر فل۔ یعنی میں تمہاری زندگی ہوں۔“

اس نے بے پروائی سے ہاتھ ہلایا۔ ”ہاہا‘ میری زندگی! سنو خانم جون۔ ایک دلچسپ بات بتاؤں۔ تم مجھے بالکل میری دادی جیسی لگتی ہو۔“

”بہت خوب‘ آپ سے زیادہ با اخلاق شخص دنیا میں نہ ہو گا۔ ایک چوبیس سالہ لڑکی کو آپ اپنی دادی بنائے دے رہے ہیں۔“

”واللہ کسی روز تمہیں ان کی تصویر دکھلاؤں گا۔“

دوسری شام وہ اس کے ہوٹل کے کمرے میں آیا۔ تمہارا اب تک اپنے سوٹ کیس بند کر کے سامان ترتیب سے نہیں جما سکی تھی۔ سارے کمرے میں چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔

”بھئی بہت پھوہڑ لڑکی ہو۔ کوئی سمجھدار آدمی تم سے شادی نہ کرے گا۔“ اس نے آتشدان کے سامنے چمڑے کی آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

تمارا نے جلدی جلدی کچھ سامان اٹھا کر ایک طرف رکھا۔

”لوگ باگ مجھ سے ابھی سے جلنے لگے ہیں کہ میں نے آتے ہی کیمپس کی سب سے خوب صورت لڑکی چھانٹ لی۔“

”چھانٹ لی! عرب شیوخ کی طرح آپ بھی حرم رکھتے ہیں!“ تمہارا نے مصنوعی غصے سے کہا۔

وہ زور سے ہنسا اور کرسی کی پشت پر سر ٹکا دیا۔ دریچے کے باہر صنوبر کے پتے سرسرائے۔

”وہ بھی عجیب عیاش بزدل ظالم قوم ہے۔“

تمارا نے مزید اظہار خیال کیا اور ایک الماری کا پٹ زور سے بند کر دیا۔ الماری کے قد آدم آئینے میں اس کا دلنواز پروفائل نظر آیا اور اس پر مزید عاشق ہوئی۔

”تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ خانم جون۔ ہم ایرانیوں کی بھی عربوں سے کبھی نہیں پٹی۔ ہم تو انہیں کاکروچ کھانے والا کہتے ہیں۔“ نصرت نے مسکرا کر پائپ جلایا۔

”کاکروچ کھاتے ہیں۔“ تمارا نے حیرت سے پوچھا اور منہ بنایا۔

”وحشی‘ بدو‘ مشرقی‘ معاف کرنا۔ میرا مطلب ہے۔ تم تو ان سے بہت مختلف ہو۔ ایرانی تو مڈل ایسٹ کے فرنچ مین کہلاتے ہیں۔“

”درست تشکرم‘ تشکرم۔“

”ترجمہ کرو۔“

”جی! تھینکس۔“ اس نے ناک میں بولنے والے امریکن لہجے میں کہا۔

وہ خوب کھلکھلا کر ہنسی۔ ”تم بہت اچھے اداکار ہو۔ کم سے کم ٹی وی اسٹار تو جن سکتے ہو۔“

”واقعی۔ بہت جلد تم مجھے ٹی وی اسکرین پر دیکھ لو گی۔“

”کیا تم نے کبھی ایکٹنگ کی ہے۔“

”بہت۔ کالج میں ہمیشہ رومیو یہ خاکسار ہی بنا کرتا تھا اور فرہاد۔“

”فرہاد کون۔“

”تھے ایک صاحب۔ آغا فرہاد بیگ۔“ اس نے نظامی کے چند اشعار پڑھے۔ ان کا ترجمہ کیا۔ پھر پروفیسر والے انداز میں جیسے کلاس کو پڑھاتا ہوا‘ اس راستے کا نقشہ سمجھایا۔ جدھر سے آرمینیا کی شہزادی شیریں اس کے اپنے وطن آذربائیجان سے گزرتی ہوئی خسرو کی دارالسلطنت پہنچی تھی۔ بعد ازاں کوہ بستیوں کا جغرافیہ اس کینیڈین دانش جو کو ذہن نشین کرایا۔

ہفتے کی شام کو وہ پہلی بار دکتور شریفیان کی قیام گاہ پر اس کے ہمراہ گئی۔ کیمپس سے خاصی دور صنوبروں کے جھرمٹ میں چھپی ایک پرانی عمارت کی دوسری منزل پر اس کا دو کمروں کا اپارٹمنٹ تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر نصرت الدین نے لیمپ جلایا۔ تمارا نے کوٹ اتار کر کرسی پر رکھتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ فارسی کتابیں اور رسالے رسالے میں بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔

تمارا کو معلوم تھا اب وہ ہزاروں بار دہرایا ہوا نقشہ دہرایا جائے گا۔ وہ ریڈیو گرام پر ریکارڈ لگائے گا۔ پھر اس سے پوچھے گا اسے کون سی شراب پسند ہے۔ عین اس وقت سارے مغرب کے ان گنت کمروں میں یہی ڈرامہ کھیلا جا رہا ہو گا اور وہ اس ڈرامے میں اس آدمی کے ساتھ حصہ لیتے ہوئے ناخوش نہ تھی۔

نصرت نے قیمتی فرانسیسی شراب اور دو گلاس سائڈ بورڈ سے نکالے اور صوفے کی طرف آیا۔ پھر اس نے جھک کر کہا۔ ”تمارا خانم۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تم کو اپنی دادی سے ملواؤں۔“

وہ سرخ ہو گئی۔ ”معلوم ہے ہمارے یہاں مغرب میں اس جملے کے کیا معنی ہوتے ہیں۔“

”معلوم ہے۔“ اس نے ذرا بے پروائی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے کہا لیکن اس کے لہجے کی اس خفیف سی بے پروائی کو تمارا نے شدت سے محسوس کیا۔ اب نصرت الدین نے الماری میں سے ایک چھوٹا سا البم نکالا اور ایک ورق الٹ کر اسے پیش کیا۔

ایک بیحد حسین لڑکی پچھلی صدی کے خاور میانہ کی پوشاک میں ملبوس ایک فرنچ وضع کی کرسی پر بیٹھی تھی۔ پس منظر میں سنگترے کے درخت تھے۔

''دادی اماں اور یہ ہمارا سنگتروں کا باغ تھا۔''

تمارا نے دیکھا دادی میں اس کی بہت ہلکی سی مشابہت ضرور موجود تھی۔ اس نے دوسرا صفحہ پلٹنا چاہا۔ نصرت الدین نے فوراً بڑی ملائمت سے البم اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ ''تمارا خانم وقت ضائع نہ کرو۔ وقت بہت کم ہے۔''

تمارا نے سینڈل اتار کر پاؤں صوفے پر رکھ لیے وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے پاؤں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''اتنے نازک چھوٹے چھوٹے پیر تم ضرور کسی شاہی خاندان سے ہو۔''

''ہوں تو سہی شاید۔''

''کون سا۔ ہر مجسٹی اعلیٰ حضرت تمہارے والد یا چچا یا دادا اس وقت سوئٹزر لینڈ کو کون سے قصبے میں پناہ گزیں ہیں۔''

''میرے والد ٹورنٹو میں ایک گارمنٹ فیکٹری کے مالک ہیں۔'' تمارا نے نہیں دیکھا کہ ایک ہلکا سا سایہ وکٹوریہ شریفیان کے چہرے ر سے گزر گیا۔ ''لیکن میرے نانا غالباً خواتین کریمیا کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔''

''اوہو۔ خوانین کریمیا! حاجی سلیم گرائی۔ قرا دولت گرائی۔ جانی بیگ گرائی۔ محمود گرائی۔ کون سے گرائی۔''

''نصرت مجھے معلوم ہے تم تاریخ کے استاد ہو۔ رعب مت جھاڑو۔ مجھے پتا نہیں کون سے گرائی۔ میں نے تو یہ نام بھی اس وقت تم سے سنے ہیں۔''

''اور موصوف تمہارے نانا بالشویک انقلاب سے بھاگ کر پیرس آئے۔''

''ہاں وہی پرانی کہانی۔ پیرس آئے اور ایک ریستوران میں نوکر ہوگئے اور ریستوران کے مالک کی خوب صورت لڑکی روزلین سے شادی کرلی اور روزلین کے ابا بہت خفا ہوئے کیونکہ ان کی دوسری لڑکیوں نے یہاں جرمنی میں اپنے ہم مذہبوں سے بیاہ کیے تھے۔'' وہ دفعتاً چپ ہوگئی۔ اب اس کے چہرے پر سے ایک ہلکا سا سایہ گذرا جسے نصرت الدین امام قلی نے دیکھا۔

چند لمحوں بعد تمارا نے پھر کہنا شروع کیا۔ ''روزلین کے ابا واقعی بہت خفا تھے۔ جب روزلین ان سے فخریہ کہتیں کہ انہوں نے ایک روسی شہزادے سے شادی کی ہے تو وہ گرج کر جواب دیتے آج کل ہر چیڑ قنات کو چوان سائیں خاکروب جو روس سے بھاگ کر یہاں آرہا ہے' اپنے آپ کو ڈیوک اور کاؤنٹ سے کم نہیں بتاتا تمہارا تاتاری خاوند بھی کریمیا کے کسی خان کا چوبدار رہا ہوگا۔ نانا بچارے کا تین سال بعد ہی انتقال ہوگیا۔ دراصل شاید جلاوطنی کا الم انہیں کھا گیا۔'' اب شریفیان کے چہرے پر سے ایک اور سایہ گذرا جسے حسب معمول تمارا نے نہیں دیکھا۔

''میری ممی ان کی اکلوتی اولاد تھیں۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں ممی نے ایک پولش ریفیوجی سے شادی کر لی۔ وہ دونوں آزاد فرانسیسی فوج میں اکٹھے لڑے تھے۔ جنگ کے بعد وہ فرانس سے ہجرت کر کے امریکہ آگئے۔ جب میں پیدا ہوئی تو ممی نے میرا نام اپنی ایک نادیدہ مرحومہ پھوپھی کے نام پر تمارا رکھا۔ وہ پھوپھی روسی خانہ جنگی میں ماری گئی تھیں۔ ہمارے خاندان میں نصرت الدین ایسا لگتا ہے کہ ہر نسل نے دونوں طرف۔ سوائے خوفناک قسم کی اموات کے کچھ نہیں دیکھا۔''

''ہاں بعض خاندان اور بعض نسلیں ایسی بھی ہوتی ہیں۔'' نصرت الدین نے آہستہ سے کہا۔ پھر پوچھا۔ ''فی الحال تمہاری قومیت کیا ہے۔''

''کنیڈین۔''

ایرانی پرفیسر نے شراب گلاسوں میں انڈیلی اور مسکرا کر کہا۔

''تمہارے نانا اور میری دادی کے نام۔''

انہوں نے گلاس ٹکرائے۔

دوسرے ہفتے کا ذکر ہے۔ سورج غروب ہورہا تھا۔ وہ دونوں ایک ریستوران کی سمت جاتے ہوئے بازار میں سے گزرے اچانک وہ کھلونوں کی ایک دوکان کے سامنے ٹھٹک گیا اور کھڑکیوں میں سجی گڑیوں کو بڑے پیار سے دیکھنے لگا۔

''تمہارے بہت سارے بھانجے بھتیجے ہیں نصرت الدین۔'' تمہارا نے دریافت کیا۔

وہ اس کی طرف مڑا اور سادگی سے کہا۔ ''میرے پانچ عدد بچے اور ایک عدد ان کی ماں میری بیوی ہے۔ میری سب سے بڑی لڑکی اٹھارہ سال کی ہے۔ اس کی شادی ہونے والی ہے اور اس کا منگیتر۔ میرے بڑے بھائی کا لڑکا۔ وہ۔ دراصل ہماری ایئرفورس میں فسٹ پائلٹ ہے۔ اس لیے کچھ پتا نہیں۔ بہت خطرناک زندگی ہے اس بے چارے کی۔'' وہ ایک دم خاموش ہوگیا۔

اس وقت تمارا کو معلوم ہوا جب کسی پر فالج گرتا ہو تو کیسا لگتا ہوگا۔ اس نے آہستہ سے خود دار آواز میں جس سے ظاہر نہ ہو کہ شاکی ہے' کہا۔ ''تم نے کبھی بتایا نہیں۔''

''تم نے کبھی پوچھا نہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اچانک تمارا نے اسے پہلی بار دیکھا۔ وہ ایک سنگی انسان تھا کوہ بستون کے پتھروں سے ترشا ہوا مجسمہ۔

ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ تمارا اس سے اسی طرح ملا کی۔ وہ اسے مغرب کی سوسائٹی کی ایک آوارہ گرد عام لڑکی سمجھتا ہے تو سمجھا کرے۔ وہ تو اس پر سچے دل سے عاشق تھی۔ اس پر جان دیتی تھی۔

ایک رات ندی کے کنارے بنچ پر بیٹھے ہوئے نصرت الدین نے تمارا سے کہا۔ ''ہلو خواند خاتون۔''

''کون۔''

''علاؤالدین کیقباد دوم کی ملکہ۔''

کبھی وہ اسے ترکان خاتون کہہ کر پکارتا۔ ملک شاہ سلجوقی کی بیگم۔ کبھی اسے شہزادی ساقی بیگ کہتا۔ ''کیونکہ تمہارے اندر کم از کم پندرہ فیصد تاتاری خون تو ہے ہی...... اور سنو فرض کرو۔'' ندی کے کنارے اس رات اس نے کہا۔ ''اگر تمہارے نانا کریمیا ہی میں رہ گئے ہوتے۔ وہیں کسی خانزادی سے شادی کر لی ہوتی اور تمہاری اماں فرض کرو ہمارے کسی اوغلو پاشا سے بیاہ کر تبریز آجاتیں تو تم میری گل چہرہ خانم ہوسکتی تھیں۔''

دفعتہً وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نسل' خون' کس کا کیا قصور ہے۔ وہ بہت بیرحم تھا۔

نصرت الدین اس کے رونے سے مطلق نہ گھبرایا۔ نرمی سے کہا۔

''چلو' بی بی جون گھر چلیں۔''

''گھر۔'' اس نے سر اٹھا کر کہا۔ ''میرا گھر کہاں ہے۔''

''تمہارا گھر ٹورنٹو میں ہے۔ تم نے کبھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ میرا گھر کہاں ہے۔'' نصرت نے ذرا تلخی سے کہا۔ وہ روتی رہی لیکن اچانک دل میں امید کی مدھم سی شمع روشن ہوئی۔ یہ ضرور اپنی بیوی سے ناخوش ہے۔ اس کی ازدواجی زندگی پرسکون نہیں ہے۔ اسی وجہ سے کہہ رہا ہے۔ ''میرا گھر کہاں ہے۔''

ان تمام مغربی لڑکیوں کی طرح جو مشرقی نوجوانوں سے معاشقے کے دوران ان کی زبان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سیکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ تمارا بڑے اشتیاق سے فارشی کے چند فقرے یاد کرنے میں مصروف تھی۔ ایک روز کہنے ٹیریا میں اس نے کہا۔ ''آغا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ جب ہم بوڑھے ہو جائیں تب ملیں۔''

''ہاں۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔''

''آج سے بیس سال بعد جب تم مورخوں کی کسی کانفرنس کی صدارت کے لیے مونٹریال آؤ یا یو۔ این میں ایرانی سفیر ہو کر نیویارک پہنچو۔''

''اور تم کسی امریکن کروڑ پتی کی فربہ بیوہ ہو۔''

''ہاں اور ٹفنی میں ہماری اچانک مڈبھیڑ ہو جائے۔ جہاں تم اپنی نواسی کی منگنی کی انگوٹھی خریدنے آئے ہو۔ اور تم سوچو میں نے اس بوڑھی موٹی عورت کو پہلے کہیں دیکھا ہے۔ فارسی میں بوڑھی عورت کو کیا کہتے ہیں۔''

''پیرزن۔''

''اور عربی میں۔''

''مجھے عربی نہیں آتی اور فرنچ میں البتہ بتا سکتا ہوں۔''

''سنو نصرت الدین۔ ایک بات سنو۔ آج صبح میں نے ایک عجیب خوفناک وعدہ اپنے آپ سے کیا ہے۔''

''کیا۔''

''جب میں اس امریکن کروڑ پتی سے شادی کروں گی۔''

''جو بوجہ السر تمہیں جلد بیوہ کر جائیگا۔''

''ہاں لیکن اس سے قبل ایک بار' صرف ایک بار۔ تم جہاں کہیں بھی ہو گے۔ تبریز۔ اصفہان' شیراز۔ میں وہاں پہنچ کر اس اپنے نا معقول شوہر کے ساتھ ضرور بے وفائی کروں گی۔ ضرور بالضرور۔''

نصرت نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''بعض مرتبہ تم مجھے اپنی دادی کی تصویر معلوم ہوتی ہو۔ بعض دفعہ میری لڑکی کی۔ وہ بھی تمہاری طرح۔ تمہاری طرح اپنے ابن عم کو اسی شدت سے چاہتی ہے۔'' وہ پھر ملول نظر آیا۔

''آغا تم مجھے بھی اپنی بنت عم سمجھو۔''

''تم میری بنت عم ہو تو سہی۔''

''کیونکہ ہم سب اولاد آدم ہیں۔ ہے نا۔''

''اولاد آدم۔ اولاد ابراہیم۔ آل یافث آل اسحٰق۔ آل اسمٰعیل۔ میں انسان کے شجر نسب کے اس گھپلے پر مزید روشنی ڈال سکتا تھا تمار خانم لیکن اب کھانا شروع کرو۔''

وہ ریستوران کی دیوار پر لگے ہوئے آئے میں اس کا پروفائل دیکھنے لگی اور بولی۔

''میں نے آج تک ایسی خوب صورت ناک نہیں دیکھی۔''

''آغا تم میں نرگسیت بھی ہے۔''

''ہے۔'' وہ شرارت سے مسکرایا۔

اس وقت اچانک تمارا کو ایک قدیم فرانسیسی دعا یاد آئی جو بریٹنی کے ماہی گیر سمندر میں اپنی کشتی لے جانے سے پہلے پڑھتے تھے۔ اے رب عظیم میری حفاظت کرنا۔

میری ناؤ اتنی چھوٹی سی ہے۔

اور تیرا سمندر اتنا بڑا ہے۔

اس نے دل میں دہرایا۔

اے رب عظیم۔ اس کی حفاظت کرنا۔

اس کی ناؤ اتنی چھوٹی سی ہے۔

اور تیرا سمندر۔

''آغا ایک بات بتاؤ۔''

''ہوں' ہوں۔''

''تم نے آج کا اخبار پڑھا۔ تمہارے ملک کے بہت سے دانش جو اور دانشور شہنشاہ کے خلاف ہیں۔ انہوں نے برلن میں کل بڑا جلوس نکالا۔''

''پڑھا۔''

''تم تو جلاوطن ایرانی نہیں ہو۔''

''نہیں۔ میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تمہارا خانم لڑکے پڑھاتا ہوں۔''

''اچھا شکر ہے۔ دیکھو۔ کسی خطرے میں نہ پڑنا۔ ہر طرف آج کل دنیا میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ اپنا خیال رکھو۔''

''اچھا۔''

اس رات وہ حسب معمول ندی کے کنارے بیٹھے تھے۔ تمارا نے کہا۔ ''جب ہم اپنے اپنے دیس واپس جائیں گے مجھے کتنی باتیں یاد آئیں گی۔ کتنی ہزاروں باتیں تم کو خیر کبھی میرا خیال بھی نہ آئے گا۔ تم مشرقی لوگوں کی عادت ہے یورپ امریکہ آ کر لڑکیوں کے ساتھ تفریح کی اور واپس چلے گئے بتاؤ کبھی میرا خیال آئیگا۔''

وہ مسکرا کر چپ چاپ پائپ پیتا رہا۔

''تم نصرت الدین امام قلی میرا دل رکھنے کے لیے اتنا بھی نہیں کہہ سکتے کہ کم از کم سال کے سال ایک عدد نیو ایئر زکارڈ ہی بھیج دیا کرو گے۔ اب تک میرا اپنا بھی نوٹ بک میں نہیں لکھا۔'' اس نے نصرت کے کوٹ کی جیب سے نوٹ بک ڈھونڈ کر نکالی' ٹی' کا صفحہ پلٹ کر اپنا نام اور پتا لکھا اور بولی۔ ''وعدہ کرو۔ یہاں سے جا کر مجھے خط لکھو گے۔''

''میں غلط وعدے بھی نہیں کرتا۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ذرا خفگی سے آگے آگے چلنے لگی۔ نصرت نے چپکے سے جیب میں سے نوٹ بک نکالی۔ وہ صفحہ علیحدہ کیا جس پر تمارا نے اپنا پتا لکھا تھا۔ باریک باریک پرندے کر کے ان کی گولی بنائی اور ندی میں پھینک دی۔

صبح سویرے چھ بجے تمارا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے تکیے سے سر ذرا سا اٹھا کر دریچے کے باہر دیکھا۔ صبح کی روشنی نقرئی پانی کی مانند باغ کے صنوبروں پر پھیل رہی تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے آنکھیں بند کیں اور پھر سو گئی۔

سوا آٹھ کے قریب جب وہ بستر سے اٹھی نصرت میز پر ناشتہ چننے میں مصروف ہو چکا تھا۔

فون کی گھنٹی بجی۔ تمارا نے کروٹ بدل کر کاہلی سے ہاتھ بڑھایا۔ ٹیلی فون پلنگ کے سرہانے کتابوں کے انبار پر رکھا تھا اس نے ذرا سا سرک کر ریسیور اٹھایا اور الو کہے بغیر نصرت کو اشارے سے بلایا۔

وہ لپک کر آیا اور ریسیور ہاتھ میں لے کر کسی سے فرنچ میں باتیں کرنے لگا۔

گفتگو ختم کرنے کے بعد نصرت نے جھک کر اس سے کہا۔

''خانم جون۔ اب اٹھو۔''

اس نے سستی سے کلاک پر نظر ڈالی اور منٹ کی سوئی کو آہستہ آہستہ پھسلتے دیکھتی رہی۔ نصرت باورچی خانے میں گیا قہوے کی کشتی لا کر گول میز پر رکھی۔ تمارا کو پھر آواز نہ دی اور دریچے کے قریب کھڑے ہو کر قہوہ پینے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں توس تھا اور دوسرے میں پیالی اور وہ ذرا جلدی جلدی توس کھاتا جا رہا تھا اور باغ کو دیکھ رہا تھا۔ سفید جالی کے پردے کے مقابل اس کے پروفائل نے بیحد غضب ڈھایا تمارا چھلانگ لگا کر پلنگ سے اتری اور اس کے قریب جا کر بڑے لاڈ سے کہا۔ ''آج اتنی جلدی کیا ہے۔ تم تو ہمیشہ دیر سے کام پر جاتے ہو۔''

''ساڑھے نو بجے وائس چانسلر سے اپائنٹمنٹ ہے۔'' اس نے کلاک پر نظر ڈال کر جواب دیا۔ ''جھٹ پٹ تیار ہو کر ناشتہ کر لو۔ تمہیں راستے میں اتارتا جاؤں گا۔''

ٹھیک پونے نو پر وہ دونوں عمارت سے باہر نکلے۔ صنوبروں کے جھنڈ میں سے گزرتے سڑک کی طرف روانہ ہو گئے۔ رات بارش ہوئی تھی اور بڑی سہانی ہوا چل رہی تھی۔ گھاس میں کھلے زرد پھولوں کی وسعت میں لہریں سی اٹھ رہی تھیں۔

وہ دس منٹ تک سڑک کے کنارے ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے رہے اتنے میں ایک بس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آتی نظر آئی۔ نصرت نے آنکھیں چندھیا کر اس کا نمبر پڑھا اور تمارا سے بولا۔ ”یہ تمہارے ہوسٹل کی طرف سے نہیں جاتی۔ تم دوسری میں چلی جانا میں اسے پکڑتا ہوں۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر بس روکی۔ تمارا کی طرف پلٹ کر کہا۔ ”خدا حافظ۔“ اور لپک کر بس میں سوار ہو گیا۔

شام کو کلاس سے واپس آ کر تمارا نے حسب معمول اسے فون کیا۔ گھنٹی بجی وہ شاید اب تک واپس نہ آیا تھا۔

دوسری صبح اتوار تھا۔ اس وجہ سے وہ کافی دیر میں سو کر اٹھی۔ اس کی جرمن روم میٹ باہر جا چکی تھی۔ اس نے اٹھ کر حسب معمول دروازے کے نیچے پڑے ہوئے سنڈے ایڈیشن اٹھائے سب سے اوپر والے اخبار کی شہ سرخی میں وہ خوفناک خبر چھپی تھی۔ اس کی تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔ وہ وکتور نصرت الدین امام قلی شریفیان پروفیسر تاریخ دانشگاہ تبریز نہیں تھا۔ وہ ایرانی بھی نہیں تھا لیکن اخبار میں اس کا جو نام چھپا تھا وہ بھی غالباً اس کا اصل نام نہ تھا۔ اس کے ساتھ دوسری تصویر اس دبلے پتلے نوجوان کی تھی جو ٹرین میں سارا وقت اخبار پڑھتا رہا تھا اور خاموشی سے ایک قصبے کے اسٹیشن پر اتر گیا تھا۔

نزدیک کے ایک شہر کے ایئرپورٹ میں طیارے پر دستی بموں اور مشین گنوں سے حملہ کرتے ہوئے وہ تین مارے گئے تھے۔ نصرت الدین نے حملہ کرنے کے بعد سب سے پہلے دستی بم سے خود کو ہلاک کیا تھا۔ ہنسی خوشی اپنی مرضی سے ہمیشہ کے لیے معدوم ہو گیا تھا۔

وہ دن بھر نیم غشی کے عالم میں پلنگ پر پڑی رہی۔ متواتر اور مسلسل اس کے دماغ میں طرح طرح کی تصویریں گھومتی رہیں جیسے انسان کو سرسام یا ہائی بلڈ پریشر کے حملے کے دوران انوکھے نظارے دکھلائی پڑتے ہیں۔ رنگ برنگے موتیوں کی جھالریں۔ سمندر‘ بے تکے شکلیں۔ آگ اور آوازیں۔ کیونکہ اس کے کان میں صاف آوازیں اس طرح آ رہی تھیں جیسے کوئی برابر بیٹھا باتیں کر رہا ہو اور ٹرین کی گڑگڑاہٹ میں نے تمہاری بات سنی تھی۔ جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ عنقریب موت کے منہ میں جانے والا ہے وہ سخت دل ہو جاتا ہے۔ یہ ہمارا سنگتروں کا باغ تھا۔ تم نے کبھی مجھ سے نہ پوچھا میرا گھر کہاں ہے۔ ونڈر فل۔

میں تمہاری زندگی ہوں! ہاہا‘ میری زندگی! جان من‘ چلو وقت نہیں ہے۔ وقت بہت کم ہے۔ قربون چلو وقت ضائع نہ کرو۔ میری لڑکی کا منگیتر۔ بہت خطرناک زندگی ہے اس بے چارے کی۔ مجھے عربی نہیں آتی۔ ہلو ترکان خاتون۔ میں غلط وعدے کبھی نہیں کرتا۔ ایسے وعدے کبھی نہیں کرتا جو نبھا نہ سکوں تم میری نبت عم ہو تو سہی۔ آل الحق‘ آل اسمٰعیل۔ میں نبی آدم کے شجرے کے اس گھپلے پر مزید روشنی ڈال سکتا ہوں لیکن تمارا خانم کھانا شروع کرو۔ دیکھو نصرت خطرے میں نہ پڑنا ہر طرف دنیا میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ اپنا خیال رکھو۔ اچھا رکھوں گا۔ شہزادی ساقی بیگ۔

اندھیرا پڑے پالا اس کی روم میٹ کمرے میں آئی۔ روشنی جلا کر تمارا کی طرف دیکھے بغیر بے دھیانی سے میکانکی انداز میں ہاتھ بڑھا کر ٹیلی ویژن کا سوئچ آن کیا اور گنگناتی ہوئی بالکنی میں چلی گئی۔

تمارا نے کروٹ بدلی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے برفیلی نیلی اسکرین دیکھنے لگی۔

کچھ دیر بعد نیوز ریل شروع ہوئی۔ اچانک اس کا کلوزاپ سامنے آیا۔ آدھا چہرہ۔ آدھا دستی بم سے اڑ چکا تھا۔ صرف پروفائل باقی تھا۔ دماغ بھی اڑ چکا تھا۔ ایئرپورٹ کے چمکیلے شفاف فرش پر اس کا بھیجہ بکھرا پڑا تھا اور انتڑیاں سیاہ جما ہوا خون۔ کٹا ہوا ہاتھ۔ کارتوس کی پیٹی گوشت اور ہڈیوں کا مختصر سا ملغوبہ۔ تم بہت اچھے اداکار ہو۔ کم از کم ٹی وی اسٹار تو بن سکتے ہو۔ واقعی۔ جلد تم مجھے ٹی وی اسکرین پر دیکھ لو گی۔

کیمرہ پیچھے ہٹا۔ لالہ کا ایک گلدستہ جو بھگدڑ میں کسی مسافر کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا تھا۔ برابر میں ’نصرت الدین > کا کٹا ہوا ہاتھ لالہ کے پھول اس کے خون میں لت پت۔ پھر اس کا آدھا چہرہ پھر گوشت کا ملغوبہ۔ اس ملغوبے کو اتنے قریب دیکھ کر تمارا کو ابکائی سی آئی۔ وہ چکرا کر اٹھی اور غسلخانے کی طرف بھاگنا چاہا۔ اس کی ہیبت زدہ چیخ سن کر پالا اس کی روم میٹ بالکنی سے لپکی ہوئی آئی۔

تمارا نے دیکھا پالا کا چہرہ نیلا اور سفید تھا۔ پالا نے فوراً ٹیلی ویژن بند کیا اور اسے فرش پر سے اٹھانے کے لیے جھکی۔

پالا کے سر پر سفید اسکارف بندھا تھا۔ جیسے نرس آپریشنل ٹیبل پر سرطان کے مریض کو لٹاتی ہو یا اسے اس ٹرالی پر بٹھا کر گیس چیمبر کے اندر لیجایا جا رہا تھا اور برابر کی بھٹی میں انسان زندہ جلائے جا رہے تھے ان کا سیاہ دھواں چمنیوں میں سے نکل کر آسمان کی نیلاہٹ میں گھلتا جا رہا تھا۔

اب وہ ایک نیلے ہال میں تھی۔ دیواریں فرش چھت برف کی طرح نیلی اور سرد کمرے کے اندر کمرے گیلریاں سب نیلے ایک کمرے میں سفید آتشدان کے پاس ایک نیلے چہرے والی عورت کھڑی تھی شکل سے سنٹرل یوروپین معلوم ہوتی تھی۔ پورا سراپا ایسا نیلا جیسے رنگین تصویر کا نیلا پروف جو ابھی پریس سے تیار ہو کر نہ نکلا ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ عجیب۔

ایک اور ہال۔ اس کے وسط میں قالین بافی کا کرگھا۔ کرگھے پر آدھا بنا ہوا قالین۔ اس پر ’شجر حیات‘ کا ادھورا نمونہ۔

”یہ شجر حیات کیا چیز ہے نصرت الدین۔“

”مڈل ایسٹ کے قالینوں کا موتیف خانم جون۔“

کرگھے کی دوسری طرف سر پر رومال باندھے دو مڈل ایسٹرن عورتیں پھر بہت سے پردے۔ جیسے محلات میں ہوتے ہیں۔ اطلسی آبشار پردوں سے نکل کر اس نے بگٹٹ بھاگنا شروع کیا۔ مگر گیلری طویل ہوتی چلی گئی۔ وہ نیچے اتری۔ جیسے بنک کے تہہ خانے ہوتے ہیں چمکیلی سنگلاخ دیواریں چمکیلا فرش یا جیل خانے کے کوریڈور سناٹا۔ اب وہ ایک بہت وسیع سرنگ میں چل رہی تھی۔ اچانک اسے چند کیچڑ کے آدمی نظر آئے۔ وہ اس سرنگ یا انڈر گراؤنڈ ریلوے کے سنسان کوریڈر میں ایک مین ہول کے اندر اور اس کے گرد پھاوڑے لیے کھڑے تھے۔ کیچڑ کے چہرے کیچڑ کی وردیاں اسے دیکھ کر استہزا سے ہنسے‘ وہ باہر نکلی عین سامنے چوڑا دروازہ تھا۔ دروازے کے باہر شہر کا بازار بارش ہو رہی تھی۔ ٹرامیں ٹن ٹن کرتی گزر رہی تھیں۔ دروازے کے برابر ایک پھول والی برساتی اوڑھے بیٹھی پھول بیچ رہی تھی۔ اس نے قریب جا کر اس عورت کو چھوا۔ وہ عورت مردہ تھی۔

اسے کوئی تعجب نہ ہوا۔ آگے بڑھی۔ سڑک پر مردوں کا ہجوم تھا۔ بسیں اور ٹرامیں مردے چلا رہے تھے۔ دونوں میں خرید و فروخت مردے کر رہے تھے۔ ایک تھیٹر ہال میں جھانکا اسٹیج پر ’سوان لیک > میں مردے رقصاں تھے اور تماشائی ہیجان تھے۔

”یہ زومبی ہیں نا۔“ اس نے ایک آدمی سے پوچھا جو تیز تیز قدم رکھتا اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔

”قیں قیں۔“ اس آدمی نے مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر جواب دیا۔ ”زومبی نہیں ادموزیل‘ خالص‘ اصلی مردے۔“

وہ آدمی بہت لمبا تھا۔ تاڑ کا تاڑ۔ گریٹ کوٹ میں ملبوس مفلر سے سر چھپائے مستقل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مونچھوں پر ہاتھ رکھ کر بولتا تھا۔ اس کی آنکھیں ٹریفک کی بتیوں کی مانند کبھی سرخ ہو جاتیں کبھی سبز اچانک اس نے تمارا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کا پنجہ لوہے کا تھا۔

''تمارا۔'' اس نے نرمی سے کہا۔ ''ایکسکیوزمی'' اور ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہوئی ایک بس میں سوار ہو گئی۔

چاروں طرف دیکھا۔ شاید اس بس میں نصرت موجود ہو یہ اس کے ہوسٹل کی طرف جاتی ہے۔ نمبر پڑھ لیا تھا۔ ایک دفعہ نصرت مل جائے پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

دفعتاً بس خالی ہو گئی۔ بغیر ڈرائیور بغیر مسافروں کے فراٹے بھرتی ایک پل سے گزر کر قبرستان کے پھاٹک پر رک گئی۔

یہ زندوں کا قبرستان ہے۔ تمارا نے اپنے آپ کو بتایا۔ اب اسے ساری باتیں آپ سے آپ معلوم ہوتی جا رہی تھیں میں چیزوں کو ان کے اصل بنیادی روپ میں دیکھ رہی ہوں۔

اندر جا کر اس نے ایک ایئر کنڈیشنڈ قبر میں جھانکا۔ یہ ایک قبر تھی۔ اندر رنگین ٹیلی ویژن کے سامنے زندہ لوگ بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ ٹیلی ویژن پر سنٹرل یوروپین نیلے چہرے والی عورت 'لل مارلین' گا رہی تھی۔ اس نے 1916ء کے فیشن کا لباس پہن رکھا تھا۔

گڑگڑاہٹ کے ساتھ خبریں شروع ہو گئیں۔ وہ خبریں سننا نہ چاہتی تھی اس لیے بھاگی۔

راستے میں دیکھا کہ جنازے قبرستانوں سے الٹے گھروں کی طرف جا رہے ہیں۔

قبریں زندوں سے بھر گئی ہیں جگہ نہیں ملی۔

اس نے اپنے آپ کو بتایا اور شہر واپس آئی۔

یہاں حسب معمول ہر جگہ مرد ہی مرد تھے۔ دفتروں میں کارخانوں میں ہر جگہ بعض مردوں نے پچھلی صدیوں کے لباس پہن رکھے تھے۔ اس کے سامنے ایک سولہویں صدی کا برطانوی بادشاہ اپنا تاج سیدھا کرتا ذرا جھینپا' جھینپا کیونکہ اس کا شاہی لباس بے حد شکن آلود اور بوسیدہ تھا۔

تابوت سے نکلا (تابوت گاڑی کو باوردی مردے کھینچ رہے تھے) سلامی لیتا ایک بنک کی سیڑھیاں چڑھا اور جا کر منیجر کی کرسی پر گم صم بیٹھ گیا اور مٹی کے رنگ کی بھربھری داڑھی پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

باہر پارک میں اٹھارویں صدی کی مردہ عورتیں سائیکل چلانے کی مشق کر رہی تھیں۔ ان کے منجمد چہرے مٹی کے تھے۔

''یہ ان لوگوں کو کیوں بلایا گیا ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''جنرل لام بندی۔'' ایک گیارہویں صدی کے نارمن کسان نے جواب دیا اور سر جھکائے پارک کی کیاری میں کدال چلاتا رہا۔ اس کے ہاتھ بالکل خشک اور سیاہ تھے۔

تب اس نے سوچا۔ وقت دعا ہے۔ توبہ استغفار' توبہ استغفار ایک عظیم الشان صومعہ فوراً اس کے سامنے آ گیا۔ وہ سر پر رومال باندھ کر اس کے صدر دروازے کی طرف بڑھی۔ اندر عربی نماز عشاء پڑھ رہا تھا۔ باہر دروازے کی محراب کے نیچے ایک آدمی گھٹنوں میں منہ چھپائے بیٹھا سر پہ خاک ڈال رہا تھا۔

''معاف کیجیے گا آپ حضرت ایوب ہیں۔'' اس نے ادب سے جھک کر دریافت کیا۔

''نہیں۔ میں بلبلا بلبلا کر خدا کو پکارتا ہوں مگر منہ سے صرف گالیاں نکلتی ہیں۔'' آدمی نے سر اٹھا کر جواب دیا۔

''آپ ابلیس ہیں۔''

''یا ابلیس یا مجذوب یا محض نروس بریک ڈاؤن کا شکار۔'' اس نے جواب دیا اور مزید راکھ سر پر ڈالی۔

''آپ نے ایل ایس ڈی بہت نوش جان کی ہو گی۔ آپ کی روح کو کیا تکلیف ہے۔''

''روح' روح گئی چولہے بھاڑ میں کیسی روح۔'' اس نے جواب دیا اور بال نوچے۔

میں چیزوں کو ان کے بنیادی روپ میں دیکھ رہی ہوں اس نے دل میں دہرایا اور خود کو بہت عاقل اور ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ وہ ایک انڈر گراؤنڈ ٹرین میں موجود تھی۔ ٹرین کبھی کھچا کھچ بھر جاتی۔ کبھی ایک دم خالی۔ اس میں دنیا بھر کی قوموں کے لوگ سوار تھے اور زمین کے نیچے نیچے آواز سے زیادہ تیز رفتاری سے ساری دنیا میں گھوم رہی تھی۔ سرحدوں کے بعد سرحدیں۔

اور الجزائر۔

اور سنائی۔

اور سوریہ۔

اور۔

ٹرین سمندر کے نیچے سے نکل کر ایک تپتے ہوئے صحرا میں آ گئی اور بغیر پٹریوں کے ریت پر چلنے لگی اور گڑگڑاتی ہوئی سامنے پڑا کے سرخ رومن کھنڈروں میں گھس گئی۔

اور صدون۔

اور نینوا۔

افق پر سنسان خیموں کے پردے باد سموم میں پھٹپھٹا رہے تھے سارے میں جلی ہوئی رسیاں اور جلے ہوئے پردے اور بچوں کی ننھی منی جوتیاں بکھری پڑی تھیں۔ بہت دور دریا بہہ رہا تھا۔ اس کے کنارے ایک گھوڑا زور سے ہنہنایا اور کسی نے بڑی کربناک آواز میں پکارا۔ العطش' العطش۔

اس کے کیا معنی ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ کیونکہ اسے کوئی زبان نہ آتی تھی۔ سو اپنی زبان کے۔ میں اب واپس جانا چاہتی ہوں میں وہاں ہو آئی ہوں وہاں کچھ نہیں ہے پرچھائیوں کی پرچھائیاں بھی نہیں ہیں۔

لیکن آواز برابر گونجا کی۔ ''العطش۔''

پھر ایک لرزہ خیز چیخ بلند ہوئی۔ ''العطش۔''

اچانک سورج کی روشنی بہت تیز ہو گئی۔ تباہ شدہ خیمہ گاہ اب صاف بہت قریب نظر آ رہی تھی۔

''آج خیمہ گاہوں پر پھر بمباری کی گئی ہے۔''

جرمن نیوز کاسٹر نے کہا۔

تیسرے روز جب اس کی طبیعت سنبھلی اور وہ کلاس کے بعد لنچ کے لیے اسی کیفے ٹیریا میں گئی دریچے کے سامنے والی میز پر اس وقت دو ہندوستانی طالب علم بیٹھے کافی پی رہے تھے ان کے سامنے تازہ اخبار رکھا تھا جس میں 'نصرت الدین' اور اس کے ساتھیوں کی مزید تصویریں اور تفصیلات چھپی تھیں تمارا جلدی سے کاؤنٹر کے پاس جا کر قطار میں لگ گئی۔

بیاباں میں ہے۔

بیاباں میں ہے۔

دونوں طالب علم کسی اجنبی زبان میں بات کر رہے تھے اور ان کے جوش و خروش سی اندازہ ہوتا تھا کہ شعر پڑھ رہے ہیں (جیسے وہ فارسی اشعار اسے سنایا کرتا تھا۔)

آئس لینڈ کی طرح دنیا میں کتنی زبانیں ہیں جو تمارا کو نہیں آتیں' کتنے جذبات' تصورات نظریے۔ خواب۔ کرب اندوہ جن سے وہ واقف ہونا نہیں چاہتی۔ کافی کچھ جان جانے کے باوجود منتظر لالہ کب سے۔ کانٹا چمچے اور پلیٹ اٹھا کر وہ قطار میں آگے سرکی۔

قبا چاہیے۔ قبا چاہیے۔

اس کو خون عرب سے۔

سامنے سے تمارا گرین برگ کو اپنی ٹرے اٹھائے آتا دیکھ کر وہ لڑکے معاً خاموش ہو گئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فولاد

ایم اے راحت

پانچویں قسط

دین دشمن قوتوں سے برسرپیکار ایک کچے فولاد کی ولولہ انگیز داستان' جو را اور موساد کے گٹھ جوڑ اور ان کی ناپاک سازشوں کے خلاف دھشت کا نشان بن گیا۔ سرزمین پنجاب کی حسین وادی جھلم کا ایک سادہ لوح جوان' جو دشمن کی ناپاک کارروائیوں سے برگشتہ ہوکر ناقابل تسخیر 'فولاد' بن گیا۔

ایک ایسے نوجوان کی داستان' جو دیارغیر میں تعلیم حاصل کرنے گیا تھا مگر اچانک اس کے سامنے اس کے پیارے وطن کے دشمنوں کی سازشیں آگئیں اور وہ ان سب کے خلاف برسرپیکار ہوگیا۔ اس کے پاس ہتھیار کے طور پر اس کے ملک کی محبت ہی کافی تھی۔

عمران ڈائجسٹ کا سنسنی خیز، پرتجسس اور نیا سلسلہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان لوگوں نے ہمیں یہ کچھ دن خوشگوار گزارنے کا موقع دیا تھا۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ سنالی کی اس قدر قریب سے دل میں ایک گداز سا پیدا ہونے لگا تھا۔ اب کسی کا احساس' احسان' بھی محسوس ہوتا تھا۔ پہلے جیسی جانوروں کی سی زندگی نہیں رہی تھی۔ کسی بات کے بارے میں سوچنے کو دل نہیں چاہتا تھا لیکن اب صورتحال بالکل مختلف تھی۔ البتہ اس دن جب ہم واپس آئے تو اچانک یوں محسوس ہوا جیسے گھر کے کچھ سامان میں کوئی تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ اس تبدیلی کا احساس ہمیں ایک لمحے کے اندر اندر ہو گیا تھا۔

یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے گھر کی صفائی کر ڈالی ہے لیکن اس احساس کے ہونے کے بعد جب نے اپنے مختصر سے سامان کی تلاش لی تو کوئی چیز غائب نہیں ملی لیکن یہ صرف سنالی کا خیال تھا۔ میں نے البتہ جب گہری نگاہوں سے جائزہ لیا تو مجھے پتہ چل گیا کہ ہمارے پاسپورٹ اور کاغذات وغیرہ غائب ہیں۔ اس کے باوجود میں نے سنالی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کے چہرے کی شگفتگی میں کوئی شکن پیدا ہو جائے۔ ایسی شکن جس میں تشویش ہو۔

بہر حال میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ اس دوران ان لوگوں نے مجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھا تھا۔ پھر ایک دن میں جب سنالی کے ساتھ سیرو سیاحت کر کے واپس پہنچا تو براؤن رنگ کی ایک بھدی سی کار مجھے اپنے ہی بنگلے کے دروازے پر کھڑی نظر آئی۔ ایک لمحے کے لیے ذہن پر ایک اثر سا ہوا تھا لیکن جب اندر داخل ہوئے تو کندن سنگھ' جوگندر سنگھ اور ایک تیسری شخصیت وہاں موجود تھی۔ مکان چونکہ انہی کا فراہم کیا ہوا تھا۔ اس لیے اس بات پر تعجب نہیں ہوا کہ وہ اس مکان میں کیسے داخل ہو گئے میرے ذہن میں پہلے بھی یہ خیال آیا تھا کہ ممکن ہے ہمارے پاسپورٹ وغیرہ کی ضرورت کسی شکل میں خود کندن سنگھ کو ہوئی ہو اور اس نے اس انداز میں اسے حاصل کر لیا ہو۔

بہر حال مجھے یہ اندازہ ہوا کہ یہ لوگ کافی دیر سے یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ کیونکہ کمرے کی فضاء میں تمباکو کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اجنبی شخص خاصا پستہ قامت لیکن چوڑے اور پھیکے ہوئے بدن کا مالک تھا۔ اس کی آنکھوں سے بے رحمی عیاں تھی اور ایک نگاہ دیکھنے سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ خاصا سخت مزاج آدمی ہے جو گندر سنگھ نے کسی قدر ترش لہجے میں کہا۔

''گھر سے باہر رہنا بہر حال انسان کے لیے بہت ضروری ہے لیکن تم اس طرح عیش و آرام سے باہر کی سیاحت کر رہے ہو جیسے یہاں کے معزز شہری ہو۔ اگر کہیں کوئی گڑبڑ ہو گئی تو ہمارے لیے عذاب بنا دو گے۔ کیا تمہیں یہ احساس نہیں ہے کہ تم.....''

''خیر چھوڑو۔ کوئی بات نہیں ہے۔'' کندن سنگھ نے جلدی سے کہا اور پھر پستہ قامت کی طرف رخ کر کے بولا۔

''ان سے ملو۔ مسٹر ایمرے۔''

''ہیلو'' چوڑے پستہ قامت آدمی نے میری جانب مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس کا لہجہ مضبوط تھا اور ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ ایک انتہائی طاقتور آدمی ہے۔

''اب ہمیں کام کی بات کرنی چاہئے' مس سنالی اگر ہم یہ کہیں کہ ایک اچھے میزبان کی حیثیت سے آپ ہمارے لیے کافی کا بندوبست کریں تو یقینی طور پر آپ اپنے مہمانوں کی اس فرمائش کا برا نہیں مانیں گی۔''

''بالکل نہیں۔ میں ابھی کافی تیار کر کے لاتی ہوں۔'' سنالی نے کہا اور باہر نکل گئی۔

تب ان لوگوں نے مجھے دیکھا اور جوگندر سنگھ نے تیکھے انداز میں کہا۔

''یہاں تم ضرورت سے زیادہ بہک گئے ہو۔ بھیڑیا! کیا تمہاری سمجھ میں اب تک یہ بات نہیں

آئی کہ تمہیں ہمارے حکم کی تعمیل کرنی ہے۔ کسی بھی لمحے تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے ہمیں اور تم ہو کہ ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے یہاں ایک معزز انسان کی طرح سیاحت کے لیے آئے ہوئے ہو۔''

''تم دوسری بار یہ بکواس کر رہے ہو جو گندر سنگھ اور اس سے پہلے بھی تمہارا رویہ میرے لیے ناخوشگوار رہ چکا ہے۔ بہتر ہے کہ اپنے آپ کو ہوش میں لے آؤ میں کسی بھی حیثیت کے انسان سے فضول باتیں سننے کا عادی نہیں ہوں۔''

''اوہو۔ کیا بے تکی باتوں کا آغاز ہو گیا۔ تم کچھ لمحوں کے لیے خاموشی اختیار کرو۔ جو گندر سنگھ۔'' ایمرے نے کہا۔

''یہ شخص آخر مجھ سے کہنا کیا چاہتا ہے۔''

''تمہیں چھوڑو کوئی ایسی بات نہیں ہے۔''

''اسے سمجھا دیا جائے کہ یہ میرے سامنے ہوش و حواس میں رہ کر گفتگو کرے چاہے۔ یہ کسی بھی حیثیت کا مالک کیوں نہ ہو۔''

''میں کہتا ہوں۔ آپ لوگ اس کی ناز برداریاں کیوں کر رہے ہیں۔ اگر مجھے اجازت دیں تو میں اسے سیدھا کر دوں۔'' جوگندر سنگھ بولا اور اتنا میں نے زندگی میں کبھی نہیں سنا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور جوگندر سنگھ کی جانب ہاتھ بڑھا کر میں نے اس کے نرخرے کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن فوراً ہی ایمرے اور کندن سنگھ میرے اور جوگندر سنگھ کے درمیان آ گئے۔ ایمرے نے مجھے کمر سے پکڑ لیا اور کندن سنگھ نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''تم اندر جاؤ۔ اور دوسرے کمرے میں انتظار کرو۔''

''لیکن میں۔'' جوگندر سنگھ نے احتجاجی انداز میں کہا اور ایمرے نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ پھر وہ اسے لیے ہوئے کمرے کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ کچھ لمحات کے لیے خاموشی طاری رہی جو گندر سنگھ کا باہر چلے جانا ہی اس کے اور میرے دونوں کے حق میں بہتر رہا۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد کندن سنگھ نے کہا۔

''یہ آدمی بے وقوف ہے۔ ویسے میں تمہیں بتاؤں اپنے کاموں میں انتہائی ماہر اور شاطر ہے لیکن اصل میں کبھی کبھی آؤٹ ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ کو سنبھال نہیں پاتا۔ خیر چھوڑو۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس نے جو بکواس کی اسے ذہن سے نکال دو۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ ہم لوگ کچھ وقت کے لیے باہر جا رہے ہیں یہ سمجھ لو ایک دوسرے ملک اور تمہیں میرے ساتھ جانا ہے۔''

''کون سے ملک۔؟''

''یہ بعد میں بتاؤں گا تمہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ ایک پرائیویٹ طیارہ ہمیں یہاں سے لے کر جائے گا۔''

''واپسی میں کتنے دن لگیں گے۔'' میں نے سوال کیا۔

''ہفتہ دس دن یا شاید اس سے بھی کم یہ حالات پر منحصر ہے۔''

''تم یقین کرو کہ پوری بات ہمیں بھی نہیں بتائی جاتی بس ہمیں کہیں اور سے ہدایات ملتی ہیں اور جو کچھ ہدایات ہمیں ملتی جاتی ہیں۔ ہم ان پر عمل کرتے رہتے ہیں۔ وقت آنے پر تمہیں بھی یقینی طور پر طور پوری بات بتا دی جائے گی لیکن یہ بات تمہیں بتانے والا کم از کم ہم میں سے کوئی نہیں ہوگا۔''

''میرے کاغذات اور میرا پاسپورٹ کہاں ہے۔ کیا تمہیں اس بات کا علم ہے کہ انہیں یہاں سے غائب کر دیا گیا ہے۔''

''شاید تم اس بات پر یقین نہ کرو۔ یہ بات میرے علم میں نہیں لائی گئی لیکن یہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ وہ کوئی اجنبی نہیں ہو سکتے۔ جنہوں نے یہ کام کیا ہے۔ بس تم یوں کر لو کہ ہم لوگ کافی پیتے ہیں اور تم اپنا سفری بیگ تیار کر لو۔''

''کیا مطلب' کیا اسی وقت۔'' میں نے تعجب بھرے لہجے میں کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں۔ ابھی اور اسی وقت۔"

"اور کیا سنالی میرے ساتھ جائے گی۔"

"نہیں میرے دوست اور تم سمجھتے ہو کہ یہ اس کے حق میں بہتر بھی ہے اور یہی مناسب ہوگا۔"

"نہیں۔ میرے دوست' اگر تم چند دن کے خوبصورت خواب دکھا کر اب سنالی سے دور کر دینا چاہتے ہو تو یہ سمجھ لو کہ یہ میری زندگی کے قیمت پر بھی ممکن نہیں ہے۔"

"میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ ہمیں ہدایات کہیں اور سے ملتی ہیں۔ ہم مجبور ہیں۔"

"سنو۔ یہاں اپنی مجبوریوں سے سمجھوتہ نہ کرو۔ کیونکہ میں سنالی کے بغیر یہ سفر نہیں کروں گا۔"

"دیکھو! اس سے پہلے میں تمہارے ساتھ ہر طرح کا تعاون کر رہا ہوں لیکن مسئلہ ذرا مختلف ہے۔"

"کچھ بھی سمجھو۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور وہ کچھ لمحے سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ تم رکو۔ میں ذرا ان دونوں سے مشورہ کر لوں ہم لوگ اپنی کافی وہیں پی لیں گے۔" کچھ دیر کے بعد سنالی کافی کی ایک پیالی لیے ہوئے میرے پاس آ گئی اور اس نے متفکر لہجے میں کہا۔

"وہ لوگ شاید تمہارے ساتھ کہیں جانے کی بات کر رہے تھے۔ میں نے ان کی گفتگو کے چند الفاظ سنے ہیں اور وہ لوگ الگ کمرے میں کیوں چلے گئے ہیں۔"

"وہ مجھے کچھ عرصے کے لیے باہر جانا چاہتے ہیں تمہارے بغیر۔"

"آہ نہیں یہ تو۔ یہ تو۔ یہ تو ممکن نہیں ہوگا۔ اب جبکہ میں....."

لیکن ابھی سنالی کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ تینوں ہی واپس آ گئے اور کندن سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

پھر طیارے میں وہ تینوں اگلی والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جیٹ طیارہ تھا اور میں اور سنالی پچھلی سیٹ پر بیٹھے اس سفر سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور میری نگاہیں بادلوں کو دیکھ رہی تھیں۔ میرے ذہن میں اس وقت ایک مشکل خیال رقصاں تھا۔ مجھے یاد آ رہا تھا کہ ایک بار انہوں نے میری ضد سے مجبور ہو کر میری ساتھ جگ نرائن کو بھی فرار کا موقع دیا تھا اور اس کے بعد جگ نرائن کو ختم کر دیا گیا تھا اور مجھ سے معذرت کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ وہ میری ضد سے مجبور ہو گئے تھے۔

کیا اس وقت سنالی کے لیے بھی کوئی ایسی ہی بات سوچی گئی ہے میرے بدن میں انگارے سے بھر گئے اور میں نے دل میں سوچا کہ اگر ان لوگوں نے سنالی کے ناخن کو بھی نقصان پہنچایا تو میں زندگی ان کے لیے اتنی مشکل کر دوں گا کہ شاید انہوں نے کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا ہوگا اور یہ بات میں ان لوگوں کو بتا بھی دینا چاہتا تھا لیکن جیٹ کا سفر بہت زیادہ طویل نہیں نکلا۔ وہ ایک ائرپورٹ پر جب نیچے اترا تو ہر طرف تاریکی پھیل چکی تھی۔ ٹرمینل سے باہر آ کر کندن سنگھ نے کہا۔

"تم لوگوں کے لیے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں کمرہ مخصوص ہے لیکن براہ کرم وہاں پہنچنے کے بعد کمرے میں ہی قیام کرنا۔ یہ ایک مجبوری ہے۔ میں موقع ملتے ہی تم سے رابطہ قائم کروں گا۔" پھر اس نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"اس میں کچھ رقم وغیرہ ہے۔ اخراجات کے لیے رکھ لو۔"

یہ ہوٹل جو ہمارے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ بلا شبہ انتہائی خوبصورت تھا' سمندر کے کنارے ناریل کے درختوں میں گھرا ہوا۔ لابی کے بالکل سامنے سوئمنگ پول تھا اور یہاں زندگی رواں دواں تھی حسین لڑکیاں اور کشادہ سینے والے مرد ہر غم سے آزاد زندگی کا لطف لے رہے تھے۔ ہمارا یہ کمرہ

بارہویں منزل پر تھا۔ اور سمندر کا ساحل انتہائی گہرائیوں میں پھیلا ہوا تھا۔ مزید سمندر دور دور تک عجیب نظر آ رہا تھا اور یہاں پہنچنے کے بعد جب وہ لوگ چلے گئے تو سنالی نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہم اس وقت کہاں ہیں۔"

"کیا مطلب۔"

"بس یوں سمجھ لو کہ میری ایک اور خواہش پوری ہو گئی۔ یہاں میری ایک گہری دوست رہتی ہے۔ کافی عرصے سے میرا اس سے رابطہ ختم ہو چکا ہے۔ مجھے اس کا فون نمبر یاد ہے کیا میں اس سے بات کر لوں۔"

"مائی ڈیئر سنالی تم نے شاید اس دوران میرے اور ان کے درمیان ہونے والی گفتگو نہیں سنی۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں ایک مخصوص ملزم ہوں اور ہم یہاں جعلی ناموں اور جعلی پاسپورٹ سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"لیکن میرے سہیلی کبھی یہ بات ظاہر نہیں کرے گی کہ....."

"ضد نہ کرو۔ کندن سنگھ ابھی ہر بات کو چھپانا چاہتا ہے۔ ذرا سا صبر کر لو۔ تم بعد میں اس سے بات کر لینا۔ یہ کام اتنا ضروری نہیں ہے۔"

"ضروری ہے۔ میں اس سے....."

"سنو۔ میرا خیال ہے تم ایک بے مقصد ضد کر رہی ہو۔ جاؤ۔ جب میں نے تمہیں منع کر دیا تو ضد نہ کرو۔"

بہر حال وہ چند لمحات میری صورت دیکھتی رہی اس کے بعد واش روم میں چلی گئی لیکن جب واش روم سے واپس آئی تو میں نے محسوس کیا کہ اس نے اپنے چہرے کو اچھی طرح دھویا ہے اور اس کی آنکھوں پر ہلکا سا ورم ہے۔ غالباً وہ واش روم میں جا کر روئی ہے البتہ میں نے اس وقت اپنی فطری ہمت سے کام کیا تھا لیکن شاید لڑکی کا رونا عام لوگوں کو تو متاثر کر سکتا ہے لیکن میں اتنا کچا اور کمزور نہیں تھا۔ البتہ محبوبہ کو منانے کا فن مجھے آتا تھا۔

دوسرے دن صبح آٹھ بجے فون کی گھنٹی بجی اور میں جاگ گیا۔ سنالی بدستور گہری نیند سو رہی تھی۔ ہم رات کو بہت دیر سے سوئے تھے۔ میں نے سنالی سے بہت سخت لہجہ اختیار کیا تھا۔ اس کا ازالہ کرتا رہا تھا۔ البتہ پھر میں آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے اٹھا اور فون کی جانب بڑھ گیا لیکن دوسری طرف سے سنائی دینے والی آواز کچھ اجنبی سی محسوس ہوئی تھی اور اسے کچھ لمحے میں پہچان نہیں سکا۔ اس نے کہا۔

"ہوٹل کے سامنے کی دروازے سے باہر نکلو۔ سڑک پار کرو۔ دور سے تمہیں ایک پارک نظر آئے گا۔ اس پارک کے دائیں جانب کنارے کنارے کوئی تقریباً دو سو گز آگے بڑھو۔ اب سے ٹھیک ایک گھنٹے کے بعد تمہارا انتظار کیا جا رہا ہے اور سنو ہر بات کی ضد نہیں کرتے۔ تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو کچھ کہا گیا ہے۔ وہی کافی ہے خیال رکھنا۔" اور اس کے بعد فون بند کر دیا گیا تھا لیکن میرے ذہن میں عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

"کیا یہ حکم ہے۔ یہ عورت کی آواز۔ اس نے مجھے میرے نام تک سے مخاطب نہیں کیا کہا کرنا چاہیئے۔ مجھے اس حکم کی تعمیل کروں یا....." لیکن پھر دماغ تھوڑا سا ٹھنڈا ہوا وہ لوگ میری مدد کر رہے تھے اور بہر حال انہوں نے اب تک جو کچھ بھی کیا ہے۔ بظاہر مجھے اس میں اپنی بہتری ہی نظر آئی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حسین سنالی میرے بالکل قریب ہے اور ہم زندگی کے شب و روز سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

چنانچہ دانش مندی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے اور ان کی ہدایت پر عمل کیا جائے۔ ایک گھنٹے کا وقت دیا گیا تھا اور اس ایک گھنٹے میں میں با آسانی تیار ہو سکتا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سنالی کا سوتے رہنا مناسب تھا۔ کیونکہ عورت سوالات کرنے سے کبھی باز نہیں آتی۔ میں نے واش روم میں داخل ہوکر دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ تیار ہونے میں تو زیادہ وقت نہیں لگا تھا لیکن بس سنالی کی طرف سے دل میں ایک الجھن سی تھی۔ وہ بدستور سو رہی تھی۔ اگر اسے جگا کر سمجھانے کی کوشش کروں تو دیر بھی ہوسکتی تھی اور بہرحال ابھی میں ان لوگوں کے چنگل میں تھا۔ ان سے منحرف ہونے کا مطلب اب اچھی طرح سمجھ میں آ گیا تھا۔ سنالی کو پیار سے سمجھا لینا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ چنانچہ میں خاموشی سی کمرے سے باہر نکل گیا۔

باہر کے موسم میں دھند پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود میں نے دور ہی سے کندن سنگھ کو پہچان لیا۔

"یقیناً تم نے ابھی ناشتہ نہیں کیا ہوگا۔"

"ہاں۔ میں تمہارے فون کی آواز پر جاگا تھا۔" جس نے جواب دیا۔

"خیر مجھ سے یہ ہدایات لے کر تم واپس جاؤ گے۔ اس کے بعد سنالی سے کوئی مناسب بہانہ کرکے باہر نکلو گے' اس جگہ ایک کلومیٹر پیدل سفر کرکے تم نیومون نام کے ایک اسٹور پر پہنچو گے۔ جہاں تمہیں سفید اور نیلی رنگ کی اک کار کھڑی نظر آئے گی۔ اس کی سیٹ پر تمہیں ایک شناسا شکل بیٹھی ملے گی۔ تم سمجھ رہے ہو۔ بس تمہیں اس کے ساتھ سفر کرنا ہے۔"

"سفر۔" میں نے چونک کر کہا۔

"ہاں۔"

"کوئی طویل سفر۔"

"شاید نہیں۔ کام زیادہ طویل نہیں ہوگا۔"

"اور وہ شناسا شکل۔" میں نے سوال کیا۔

"خدا حافظ۔" اس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ میرے وجود میں ایک لمحے کے لیے گرم لہریں دوڑ گئی تھیں۔

میں نے ایسی بے اعتنائی کبھی برداشت نہیں کی تھی لیکن مصلحت کا تقاضہ یہ ہی تھا کہ کچھ عرصے کے لیے خود کو بھول جاؤں اب اس حد تک آنے کے بعد ضروری ہے۔ ہوٹل واپس پہنچا سنالی بدستور سو رہی تھی۔ میں نے اسے جگایا لیکن یہ اظہار نہیں کیا کہ میں باہر کا سفر کرکے آیا ہوں۔ البتہ مقررہ وقت کر میں اسے سمجھا سمجھا کر ہوٹل سے نکل آیا تھا۔

پھر میں نے پیدل کا سفر کیا۔ اس کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ اس سفر میں وہ یہ اندازہ لگانا چاہتے ہیں کہ کوئی مجھ پر نگاہ تو نہیں رکھے ہوئے ہے۔ شاید وہ مطمئن ہی ہوں گے۔ کیونکہ مجھے مطلوبہ کار نظر آ گئی اور جس شکل نے میرا استقبال کیا۔ وہ شناسا ہی تھا' یعنی ایمرے۔

میں نے اس کے ساتھ کار کا سفر شروع کردیا۔ ایمرے بالکل خاموش تھا لیکن کچھ لمحوں کے بعد اچانک بولنا شروع کردیا۔

"ہمیں واپسی میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ جو طریقہ کار ہم نے سوچا ہے اس کے دو حصے رکھے گئے ہیں۔ اگر ہمارا پہلا مرحلہ کامیاب نہیں ہوا تو پھر ہم دوسرے مرحلے پر کام کریں گے۔"

یہ آواز گویا کسی مشین سے نکلی تھی۔ نکلی اور خاموش ہوگئی۔

کار کا سفر ایک وسیع میدان پر ختم ہوا۔ جس کے بیچوں بیچ ایک ہیلی کاپٹر کھڑا ہوا تھا۔ ایمرے نے میدان کے سرے پر کار روکی اور پھر مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کرکے ہیلی کاپٹر کی طرف چل پڑا۔

پائلٹ اپنی سیٹ پر موجود تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی ہیلی کاپٹر کے خودکار دروازے بند ہوگئے۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ اوپر اٹھ رہا تھا اور مجھے نجانے کیوں یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اب تک جس مقصد کے لیے اتنی ہنگامہ آرائی ہوئی ہے وہ اپنے آخری مراحل میں ہے۔

زندگی میں لاتعداد ایسے کام کیے تھے اور کبھی بھی ان کی کوئی حیثیت نہیں سمجھی تھی بس یہ بات معلوم ہوتی تھی کہ فلاں شخص کو قتل کرنا ہے یا فلاں

علاقے کو بم سے اڑانا ہے۔ کسی جلسے کو منتشر کرنا ہے یا کچھ بھی کیا جانا ہے لیکن کبھی بریفنگ کے بعد اس کے بارے میں یہ سوچا بھی نہیں کہ یہ کام کیسے کیا جاسکتا ہے لیکن ہر انسان اپنے اندر ایک کمزوری رکھتا ہے۔ سنالی کی اس قدر قربت حاصل کرنے کے بعد یہ سوچیں میری زندگی میں شامل ہوگئی تھیں اور اسوقت ہیلی کاپٹر میں سفر کرتے ہوئے میں ان سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

ہیلی کاپٹر سمندر پر پرواز کر رہا تھا اور مجھے گہرائیوں میں نیلا شفاف سمندر اور بلندیوں پر بادل سے محفوظ آسمان نظر آ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر کے بعد نیچے پانی کی ہموار اور پرسکون سطح پر رنگ برنگی کشتیاں تیرتی نظر آئیں اور مجھے یہ احساس ہوا کہ تھوڑا سا خالی سمندر طے کرنے کے بعد ہیلی کاپٹر اب شاید کسی جزیرے پر پرواز کر رہا ہے۔

اس دوران ایمرے مکمل طور سے خاموش رہا تھا لیکن اس شخص کے اندر اچانک بول پڑنے کی عادت تھی۔ پرسکون ماحول میں اگر انسان کس سوچ میں ڈوبا ہوا ہو اور ایمرے جیسے آدمی کے ساتھ بیٹھا ہو تو اسے اپنے طور پر شاید خاموش رہنے کا کوئی حق نہیں حاصل ہوتا وہ کہنے لگا۔

"بس کچھ لمحوں کے بعد ہم ایک ایسی جگہ اتر جائیں گے جسے تم خطرناک جگہ کہہ سکتے ہو اور اس سمت کشتیاں نہیں آتیں۔ ہمیں کچھ دیر وہیں رک کر کام کرنا ہے۔"

میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا' کوئی سوال نہیں کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اپنے آپ کو اندھا' گونگا' بہرہ بنائے رکھنا اس وقت ایک بہتر مستقبل کی ضمانت تھا۔ ایمرے پھر کہنے لگا۔

"اور یہ ہتھیار تمہارے لیے غیر مانوس نہیں ہے۔" نجانے کہاں سے اس نے ایک رائفل نکالی تھی۔ جسے ہم دنیا کی بہترین رائفل کہہ سکتے ہیں۔ وزن اور لمبائی کے اعتبار سے وہ رائفل کے برابر ہی تھی لیکن اس کا بہرل انتہائی شاندار تھا۔

ایمرے نے کہا۔

"یہ قطعی بے آواز ہے۔ ذرا اسے دیکھو۔"

میں نے رائفل اس کے ہاتھ سے لے لی اور اسے شانے سے ٹکا کر نال باہر نکالی اور بیرل کی سطح سے ملا دی گویا میں نشانہ درست کر رہا تھا۔ پھر نجانے کون سی زبان میں ایمرے نے پائلٹ سے گفتگو کی۔ میری سمجھ میں ایک لفظ بھی نہیں آیا۔ ہیلی کاپٹر اچانک نیچے کی طرف جھکنے لگا اور پھر اچانک کچھ دیر کے بعد وہ ایک خاص بلندی پر ٹھہر گیا۔

"ہم یہیں ٹھہریں گے یہ ہے وہ جگہ۔"

ہیلی کاپٹر پانی کی سطح سے کوئی سو فٹ اوپر تھا۔ پائلٹ نے غالباً ایمرے کے اشارے پر کوئی بٹن دبایا اور میرے پاس والی سیٹ کا دروازہ کھل گیا۔ ایمرے کی آواز ابھری۔

"تمہاری سیٹ کھومنے والی ہے۔ اسے جس طرح مناسب سمجھو گھما لو۔ پھر ہم لاک کردیں گے۔"

میں نے جھک کر سیٹ کا بولٹ ہٹایا اور کھینچ کر دروازے کے قریب کرلیا یہاں سے پانی کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ ایمرے نے کہا۔

"یہ تمہارے ٹارگٹ ہیں۔" اس نے ایک بڑے سے کارٹن کو کھول لیا تھا۔ جس میں مختلف رنگوں کے ڈبے بھرے ہوئے تھے۔ اس نے ایک ایک کرکے یہ ڈبے پانی میں پھینک دیئے جو پانی کی سطح پر تیرنے لگے تھے۔ چنانچہ ایمرے نے کہا۔

"اب تم شروع ہو جاؤ۔ یہ دس ڈبے ہیں اگر تم نے ان سب کو بیس شاٹس میں نشانہ بنالیا تو اس کا مطلب ہے کہ تمہارے نمبر سو کے سو ہیں۔"

میرے لیے یہ الفاظ گویا گالی کے مترادف تھے لیکن میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ یہ گالیاں مسلسل سنتا رہوں گا۔ میں نے صرف دس شاٹ میں ان ڈبوں کو اڑا دیا اور ایمرے کی خوشی سے تھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"خدا کی قسم شاندار اتنا شاندار کہ تصور نہیں کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جاسکتا۔ پائلٹ واپس چلو۔"

میں نے وہ رائفل ایمرے کو واپس تھمادی اور اس نے احتیاط سے اسے محفوظ کرلیا۔ پھر ہیلی کاپٹر کا رخ تبدیل ہوگیا اور اس کے بعد خاموشی سے آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ زمین نظر آنے لگی۔ سمندر دور رہ گیا تھا۔ زمین پر سبزہ پھیلا ہوا تھا اور اس سبزے کے درمیان دور دور تک سفید دیواروں والے وسیع و عریض مکانات جن کی چھتیں سرخ ٹائلوں کی تھیں اور یہ سارے کے سارے مکانات ناریل کے درختوں میں گھرے ہوئے تھے۔ مکانوں کے وسیع و عریض احاطوں میں سوئمنگ پول بنے ہوئے تھے اور یہ اندازہ ہوتا تھا کہ جن لوگوں نے بھی یہ مکانات بنائے ہیں وہ انتہائی صاحب حیثیت ہیں۔

ہیلی کاپٹر آہستہ آہستہ ان کے اوپر سے گزر رہا تھا اور نیچے بے ترتیب پہاڑیوں پر اونچے اونچے درخت جھول رہے تھے۔ چند لمحوں کے بعد ایک بار پھر ہیلی کاپٹر بلند ہونے لگا اور اس کے لیے بھی ایمرے نے کسی غیر مانوس زبان میں پائلٹ کو حکم دیا تھا۔ پائلٹ نے اس کے مطابق عمل کیا اور پھر دروازے کھل گئے۔ ایمرے کی آواز ابھری۔

"اپنی سیٹ فکس کرلو۔"

میں نے اس کے مطابق اندازہ کیا اور پھر اپنی سیٹ فکس کرلی۔ ایمرے نے کہا۔

"ہم یہاں دو سو فٹ کی بلندی پر ٹھہریں گے۔ ہیلی کاپٹر بس سیکنڈ تک فضاء میں رکے گا اور اتنے وقت میں ہی تمہیں اپنا کام کرلینا ہوگا۔"

میں نے نیچے نگاہیں دوڑائیں۔ نیچے پہاڑی پر اونچی اونچی دیواروں سے گھرا ہوا ایک قلعے کا احاطہ تھا۔ غالباً پرانی طرز کی کوئی عمارت تھی لیکن کون سی جگہ تھی۔ کہاں تھی۔ اس کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ اطراف میں سرسبز گھاس سے گھرے ہوئے میدان پھیلے ہوئے تھے اور میدانوں کے درمیان سے ایک پتھریلی سڑک گزر رہی تھی۔ درمیان میں ایک سوئمنگ پول تھا اور قریب ہی غالباً پولو گراؤنڈ بھی یا پھر آپ سے گولف گراؤنڈ کہہ سکتے ہیں اس کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکا۔

کچھ لمحوں کے بعد ایمرے نے پھر پائلٹ کو مخاطب کیا اور ذرا سی دیر کے بعد ہیلی کاپٹر معلق ہوگیا۔

"یہ ہوگی تمہاری پوزیشن۔ تمہارا شکار مکان سے سوئمنگ پول کے درمیان اس سڑک پر کہیں ہوگا۔ ہمیں اس کے معمولات کا بخوبی علم ہے اور میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ تمہارے پاس صرف بیس سیکنڈ ہوں گے۔ جس انداز میں تم رائفل استعمال کرسکتے ہو اس اعتبار سے یہ وقت بہت کافی ہے۔"

میں خاموش تماشائی کی طرح اپنی سیٹ پر بیٹھا نیچے دیکھتا رہا تھا۔ میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ تب ایمرے نے کہا۔

"چلو واپس چلو۔" یہ الفاظ اس نے پائلٹ ہی کو مخاطب کرکے کہے تھے لیکن میں نہیں سمجھ پایا تھا کہ اس نے یہ الفاظ اپنی زبان سے کیوں نہیں ادا کئے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا سلسلہ ہے۔

لیکن اس کے بعد جب ہم واپس پلٹے اور ایک جگہ اترے تو وہاں میری ملاقات مسز مہرا سے ہوگئی۔ یہ ایک خوبصورت سا مکان تھا اور اس مکان میں شاید اس وقت مسز مہرا کے علاوہ اور کوئی موجود نہیں تھا۔ یہ عورت بھی کچھ اس طرح کی فطرت کی مالک تھی کہ حسین ترین ہونے کے باوجود میرے لیے اس کی شخصیت ناپسندیدہ ہی رہ تھی لیکن بہرحال اس نے بڑے خوشگوار انداز میں میرا استقبال کیا۔

میرے ذہن میں اگر تھوڑی بہت حس لطافت تھی تو صرف سنالی کی حد تک اور اس وقت تو خاص طور سے میرے ذہن میں ایک جھلاہٹ سی سوار تھی۔ کتنے عرصے سے ان لوگوں نے یہ چکر چلایا ہوا

کیسے کیسے کھیل کھیلے تھے۔ جیل میں زندگی گزار رہا تھا۔ سنالی کو یہ سوچ کر ہمیشہ کے لیے فراموش کردیا تھا کہ میری منزل وہ نہیں ہے لیکن ان بدبختوں نے ایک بار پھر سے مجھے ایک عجیب و غریب مشکل میں لاڈالا تھا۔ ہر بار ایسے انداز میں باہر نکلتے تھے۔ جیسے اب وہ کام آخری مرحلے میں ہو۔ جس کے لیے انہوں نے اتنا طویل چکر چلایا ہوا ہے اور اس کے بعد پھر وہی ٹائیں ٹائیں فش۔ کوئی عمل ہی نہیں تھا۔ بہرحال مسز مہرا نے مجھ سے پوچھا۔

"اگر کسی شے کی حاجت ہو تو مجھے بتاؤ۔ میں تمہارے لیے تیار کردوں۔ یہ ایک مکمل گھر ہے اور یہاں ہر شے موجود ہے۔"

"مجھے جس شے کی ضرورت ہے وہ تم مجھے مہیا نہیں کرسکو گی۔"

"ہوسکتا ہے۔ ایسا ہو کیا تم اپنی دوست سنالی کو طلب کرو گے۔" مسز مہرا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں! تمہارے نرخرے سے بہنے والے خون کی دھار گلاس میں بھر کر پینا چاہتا ہوں۔ پیش کرسکو گی مجھے۔" مسز مہرا کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ کچھ لمحے خاموشی رہی پھر آہستہ سے بولی۔

"ایسا ایک خنجر باورچی خانے میں موجود ہے۔ بخدا اگر تم ایسا کرنا چاہو گے تو شاید میں تمہیں حیرت میں ڈال دوں۔"

"کیا مطلب۔"

"میں خوشی میں تمہیں یہ پیشکش کروں کہ تم ایسا کرڈالو۔" میں نے اسے گھور کر دیکھا اور اس کے بعد وہاں سے نکل کر اور کمرے میں پہنچ گیا۔ جہاں بستر پڑا ہوا تھا۔ میں جوتوں سمیت بستر پر دراز ہوگیا اور اس کے بعد میرے ذہن میں گزرے ہوئے واقعات ایک فلم کی مانند دوڑنے لگے۔ وہ شخص جو اپنے آپ کو ایمرے کہلواتا تھا۔ مجھے اس انداز میں لے گیا تھا جیسے آج ہی مجھے اپنا کام کرلینا ہے۔ وہ لوگ میرے نشانہ بازی کی مشق دیکھنا چاہتے تھے۔ میری مہارت کا اندازہ لگانا چاہتے تھے اور پھر وہ جگہ جس کے بارے میں ایمرے نے مجھے بتایا تھا آخر یہ سب کیا ہے۔ یہ لوگ ایسا کیوں چاہتے ہیں۔ وہ کون شخصیت ہوگی جسے اس انداز میں مجھے ہلاک کرنا ہوگا۔ کون لوگ ہوں گے وہ جو اس جگہ مل سکیں گے۔

اصل میں بات وہی تھی کہ تجسس میرے ذہن میں بے پناہ تھا۔ لیکن ان کم بختوں کا دائرہ کار اس قدر وسیع تھا کہ میں نے جہاں بھی اپنے طور پر کچھ کرنے کی کوشش کی وہاں ناکام رہا۔ مجھے جگ نرائن اور ڈاکٹر ہری داس کی موت یاد تھی وہ تو شکر ہے کہ انہوں نے سنالی کے سلسلے میں وہ عمل نہیں آیا۔ ورنہ میرے ذہن میں تو یہ بھی خدشہ موجود تھا۔ سنالی کے تصور کے ساتھ ایک بار پھر ذہن پر جھلاہٹ سوار ہوگئی تھی لیکن پھر میں نے اپنے آپ پر خود ہی غور کیا۔ یہ دیوانگی جو بچپن سے میرے ذہن پر سوار ہوگئی ہے۔ یعنی یہ کہ کچھ کرڈالنا۔

بے شک تنظیم نے مجھے اس کی تربیت دی تھی لیکن صحیح بات یہ تھی کہ تنظیم کے خاتمے کے بعد نجانے کیوں صرف میری زندگی بچ گئی تھی یا نجانے میرے ساتھ ساتھ کون ایسا ہوگا۔ اگر میں بھی مصلحت سے کام لیتا تو شاید میری شخصیت کا کوئی دوسرا ہی روپ ہوتا' ایسا کر کے دیکھنا چاہئے تھوڑا بہت تو اپنے آپ کو تبدیل کرنا ضروری ہے اور اس وقت اس عمارت میں مسز مہرا کے علاوہ بھلا کون تھا۔ جس پر اپنی ذات کا یہ پہلا تجربہ کرتا۔

میں نہیں جانتا کہ عورت کس طرح رام ہوجاتی ہے لیکن جب میں نے مسز مہرا کے پاس جاکر اس خود مخاطب کیا تو وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

ڈرائینگ روم میں صوفے پر سر جھکائے بیٹھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔

عمارت کے بارے میں مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہاں اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ وہ لوگ بھی شاید اس بات سے مطمئن تھے کہ اب میں مسز میرا کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ کیونکہ سنالی مکمل طور پر ان کے قبضے میں ہے۔ مسز مہرا نے ایک بار پھر استفہامیہ نظروں سے مجھے دیکھا اور بولی۔

"یقینی طور پر تم تنہائی سے اکتا گئے ہو گے۔ تنہائی سے بری چیز اس دنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔"

"اتفاق سے میں ایسی بہت سی چیزوں کا عادی ہوں۔ جس لوگ بری طرح اکتا جاتے ہیں لیکن میں نہیں اکتاتا۔ کیونکہ میری شخصیت میں انسانیت کم اور حیوانیت زیادہ ہے۔ میں اپنے آپ کو آدھا حیوان سمجھتا ہوں۔" اس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی پھر بولی۔

"کسی شے کی ضرورت۔"

"ہاں۔ اب میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"آؤ۔ براہ کرم بیٹھو۔" اس نے کہا اور میں اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ مسز مہرا کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ مجھے نمایاں محسوس ہو رہے تھے پھر وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

"بھیڑیا کے علاوہ تمہارا کوئی اور نام ہے۔"

میں نے ایک بار پھر تفصیلی نظروں سے اسے دیکھا لیکن اس وقت مجھے اس سے کوئی کام لینا تھا۔ چنانچہ میں نے خود کو سنبھال لیا اور کہا۔

"اگر بھیڑیا کے علاوہ میرا اور کوئی نام ہے تو یوں سمجھ لو کہ میں نے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذہن سی کھرچ کر پھینک دیا ہے اور یقین کر لو کہ اب وہ نام مجھے یاد نہیں ہے۔"

"خیر ناموں سے کیا ہوتا ہے بھیڑیا۔ تمہاری زندگی کے بارے میں جتنی معلومات مجھے حاصل ہو چکی ہیں۔ اس کے تحت بہت سے سوالات کئی بار میرے ذہن کے پردوں پر ابھرے لیکن میں جانتی تھی کہ ان سوالات کا جواب مجھے زندگی میں کبھی نہیں مل سکتا۔ اب اس وقت تم آئے ہو۔ بیٹھے ہو۔ تو مجھے تم سے کچھ کہنے کی جرات ہوئی ہے کہ تم نے تنظیم میں شامل رہ کر جو کچھ کیا۔ اس کی تفصیلات میرے پاس موجود ہیں۔ مگر مجھے ایک بات پر حیرت ہوتی ہے کہ تم سنالی کے لیے اپنے دل میں اتنا گداز کیسے رکھتے ہو۔ کیا یہ جانتا ہے کہ سنگدل کی آنکھ سے آنسو نہیں بہتے لیکن سنگدل کا لفظ جو ہے۔ صرف انسانی زبان کی تراش ہے۔ دل کبھی پتھر کا نہیں ہوتا اور اس کا ثبوت تم سے ملتا ہے تمہارے دل میں سنالی کے لیے گداز موجود ہے۔ اس کا مقصد ہے کہ تمہارے سینے میں دل کے وجود کا پتہ لگتا ہے۔"

"دیکھو۔ مسز مہرا بہت بڑا لگتا ہے مجھے الفاظ میں طوالت اختیار کرنے کا اور بہت اچھا لگتا ہے۔ یہ کہ ایک لفظ میں مطلب کی بات کہہ دی جائے۔"

"تم ان لوگوں کو کیا سمجھے ہو جو تمہیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔"

"انہیں سمجھنے کے لیے ہی میں تمہارے پاس آیا ہوں۔"

"اور اگر میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کروں تو مجھ پر یقین کر لو گے۔"

"اگر تم چاہو۔"

"تو ٹھیک ہے۔ میں تمہیں اس وقت یہ بتائے دیتی ہوں کہ میں بے حد خطرے میں ہوں۔ میں نہیں جانتی کہ ڈرائینگ روم کی کون سی شے ایسی ہے جو اصل میں ریوالور کی نال ہو اور کوئی اسے ریموٹ سے آپریٹ کر رہا ہو۔ جیسے ہی میرے منہ سے کوئی غلط الفاظ نکلے فوراً ہی میری پیشانی کو گولی کا نشانہ بنا دیا جائے گا۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ یہاں اس ڈرائینگ روم میں کون کون سی جگہ ایسے آلات نصب ہیں جن پر ہماری گفتگو کسی جگہ سنی اور ریکارڈ کی جا رہی ہو لیکن ایک بات فوراً سن لو۔ وہ لوگ تم سے مخلص نہیں ہیں اگر میرا سینہ اور دماغ

گولیوں سے چھلنی ہو جائے تو تم یہ ضرور سوچ لینا کہ تم بھی اس سے محفوظ نہیں ہو۔"

میں نے شاید زندگی میں پہلی بار ایک ٹھنڈی لہر اپنے وجود میں دوڑتی ہوئی محسوس کی تھی۔ بہت سے احساسات کمبخت اب جاگ کر جاگ رہے تھے۔ جن سے میں مکمل طور پر ناواقفیت رکھتا تھا۔ وہ بھی عجیب سے انداز میں میری صورت دیکھ رہی تھی اور اس کا انداز ایسا تھا جیسے جو کچھ کہہ رہی ہے۔ اس کے ردعمل کی منتظر ہو لیکن کہیں سے کوئی گولی نہیں چلی اور کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تو اس نے پھر کہا۔

"ہاں۔ تو میں تمہیں بتا رہی تھی کہ یہ سب جو ہو رہا ہے تمہارے خلاف نہیں بلکہ ایک بہت بڑی شخصیت کے خلاف ایک خطرناک سازش ہے۔ اس شخصیت کو جسے یہ لوگ قتل کرانا چاہتے ہیں۔ اس کو ملک میں بہت بڑی حیثیت حاصل ہے اور وہ شخصیت ایک دہشت گرد گروپ کے خلاف ایسے شواہد جمع کر رہی جو ملک میں بدامنی پھیلانا چاہتا ہے اور اس بدامنی کو پھیلانے کے لیے اعلیٰ پیمانے پر کام کیا جا رہا ہے۔ وہ لوگ ایک بیرونی ملک کے اشارے پر بے پناہ دولت صرف کر کے اپنا دائرہ کار بے حد وسیع بنا چکے ہیں اور اب میرے بارے میں تم یہ سن لو بھیڑیا کہ میں اصل میں سیکیورٹی کی رکن ہوں۔ میرا تعلق اسٹیٹ سیکیورٹی سے ہے اور میری ڈیوٹی اسے لوگوں پر لگائی تھی۔ جن کے بارے میں حکومت کو شبہ تھا کہ وہ اینٹی اسٹیٹ ہیں اور ملک وملت کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔

میں اپنی ڈیوٹی کو نہایت کامیابی سے سرانجام دیتی ہوئی ان میں شامل ہو گئی وہ دہشت گرد گروپ جس کے تم رکن تھے۔ ختم ہو گیا تھا لیکن ان لوگوں کے پاس ابھی تمہارے جیسے تربیت یافتہ لوگ موجود نہیں ہیں ان کے پاس تمہارے بارے میں کسی طرح رپورٹ پہنچ گئی اور انہوں نے اپنے طور پر اپنے اختیارات وسیع کرنا شروع کر دیئے۔ دولت کے بل پر انہوں نے یوں سمجھ لو کہ ہر جگہ اپنے آدمی داخل کر دیئے یا جو لوگ پہلے سے وہاں موجود تھے۔ انہیں خرید لیا اور اس کے بعد انہوں نے تم پر ہاتھ ڈالا۔ تمہیں جس شخصیت کو قتل کرنے کی مشق کرائی جا رہی ہے۔ اس کے قتل سے اس ملک میں ایک شدید اور خوفناک بحران پیدا ہو گیا۔ وہ شخصیت بے شک براہ راست سیاسی شخصیت نہیں ہے لیکن لیکن۔" مسز میرا جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گئی۔

میں خاموشی سے اس کی صورت دیکھ رہا تھا مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ مسز میرا اس وقت کسی ایسے جذبے کے تحت بول رہی ہے۔ جس میں بے بسی اور بے کسی ہے اور ایک غم آلود کیفیت بھی ہے۔ البتہ اس کیفیت کو میں مکمل طور پر سمجھ نہیں پایا تھا۔ وہ کچھ لمحات کے لیے رک پھر بولی۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اب تک ان لوگوں نے تمہاری تمام باتیں مان لی ہیں اور ہر طرح سے تمہارا تحفظ کر رہے ہیں تو براہ کرم یہ خیال ذہن سے نکال دو۔ وہ جسے قدر خطرناک ہیں اور انہوں نے اپنے نیچے جتنی دور دور تک گاڑ رکھے ہیں۔ مجھے اور تمہیں دونوں کو اس بارے میں معلوم ہے۔ چنانچہ وہ کسی ایسے شخص کو زندہ نہیں چھوڑیں جو ان کے خلاف ہونے والی سازش میں شریک ہو جائے۔ کیونکہ بہر حال انہیں اپنی بقاء کا بھی خیال ہو گا۔ اس کے لیے میں تمہیں بتاؤں ڈیئر بھیڑیا! کہ وہ لوگ صرف تم سے چوہے بلی کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ اصل میں وہ جس ٹارگٹ کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں ابھی کچھ قباحتیں ہیں جس کی بناء پر وہ یہ وقت صرف کر رہے ہیں۔ تم سے کام لینے کے بعد سب سے پہلے وہ تمہارا ہی خاتمہ کریں گے۔ یا پھر اگر تم سے کوئی کام نہیں بن سکا تو وہ سنالی کے ذریعے تمہیں مجبور کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ کارڈ ان کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔" میں خاموشی سے مسز میرا کی صورت دیکھتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مسز مہرا۔ تم اس وقت جو گفتگو کر رہی ہو۔ تمہیں خود بھی اندازہ ہوگا کہ مجھے اس پر حیرت ہونی چاہیئے۔ بیشک تم نے خود کو سیکیورٹی کا فرد بتایا ہے لیکن تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا میں اس بات پر یقین کرلوں۔"

"میرے پاس کوئی اہم ثبوت نہیں ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا ثبوت میں تمہیں دے رہی ہوں۔ اگر اس پر یقین آجائے تو ٹھیک ہے ورنہ جیسے تم پسند کرو۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور پھر تھوڑے فاصلے پر رکھے ہوئے ایک پینڈ بیگ سے ایک چوکور سی شے نکالی اتنا چھوٹا ٹیپ ریکارڈر میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ٹیپ ریکارڈ میرے سامنے رکھا۔ کیسٹ ریوائنڈ کیا ہوا تھا۔ اس پر آوازیں ابھرنے لگیں' ننھے سے ٹیپ ریکارڈر کی یہ آوازیں خاصی نمایاں تھیں۔ میں نے پہلی آواز کو پہنچانا۔ وہ کندن سنگھ تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"جوگندر سنگھ کیا تمہیں مسز مہرا کے بارے میں علم ہوگیا ہے۔"

"آہ! میں تمہیں یہ ہی بتانے والا تھا کہ وہ سیکیورٹی کی فرد ہے اور میں اس کا شجرہ معلوم کر چکا ہوں۔ وہ بے حد خطرناک اور نہایت کامیابی سے ہمارے ہر پہلو سے آگاہ ہو چکی ہے۔"

"اسے ختم کردو۔"

"یقیناً ہمیں ایسا ہی کرنا ہے لیکن ابھی کچھ وقت ایسا نہیں کیا جاسکتا۔"

"کیوں۔"

"وہ اب سے چند لمحوں کے بعد واپس آرہا ہے۔ مسز مہرا کو ہدایت کردی گئی ہے کہ اس کو سنبھالے اور مقررہ وقت تک ان پر کنٹرول اس وقت ہمارے پاس مسز مہرا کے علاوہ اور کوئی موجود نہیں۔ ہاں اتنا کیا جاسکتا ہے کہ مسز مہرا کو پوائنٹ سے ہلنے نہ دیا جائے اور پوری طرح یہ بات ذہن میں رکھی جائے کہ اب وہ ہمارے بارے میں مزید کوئی رپورٹ کسی کو نہ دے سکے۔"

"اس کا تمام سامان اپنے قبضے میں کرلو۔ اول تو اسے اس بات کا احساس نہیں ہونا چاہئے اور اگر ہو جائے تو پھر اسے سختی سے آگاہ کردو کہ اس کی ایک غلط حرکت اس کے پورے خاندان کو ختم کردے گی۔ اس کا پورا خاندان یرغمال بنالیا جائے گا اور اس کام میں ایک لمحہ ضائع نہ کیا جائے۔"

کیسٹ ختم ہوگیا۔ میں خاموشی سے یہ الفاظ سن رہا تھا۔ یہ ایک گہری چال بھی ہوسکتی تھی اور حقیقت بھی۔

میں نے مسز مہرا سے اس کے بارے میں چند سوالات کئے اور وہ مجھے بتانے لگی کہ ٹیپ ریکارڈر اس نے اصل میں کہاں چھپا رکھا تھا اور کس طرح یہ گفتگو ریکارڈ ہوگئی۔ اس کے بتائے ہوئے الفاظ تسلی بخش تھے۔ چنانچہ میں نے کہا۔

"اور اب تم کیا چاہتی ہو۔"

"نہیں۔ میرا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ میرے خاندان کے لوگ ان کے پاس یرغمال ہیں۔ میں اپنے بچاؤ کے لیے اگر کوئی کوشش کرتی ہوں تو وہ انہیں قتل کر ڈالیں گے میں جانتی ہوں کہ میری زندگی ختم ہونے کے بعد انہیں ان لوگوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہے گی چنانچہ بہتر ہے کہ مجھے اپنے منصوبے کے مطابق قتل کردیں ہاں اگر تم میری مدد کرسکتے ہو تو ضرور کرلو۔ وہ لوگ قابل اعتبار نہیں ہیں۔"

مسز مہرا کی بات پر مجھے یقین آگیا تھا۔ چنانچہ جب مجھے فائنل میٹنگ کے لیے طلب کیا گیا اور انہوں نے اپنے منصوبے کو آخری شکل دیتے ہوئے مجھے کہا کہ بس اب کچھ وقت گزر رہا ہے۔ اب مجھے یہ کام کر ڈالنا ہے تو میں نے ان سے صاف انکار کردیا۔

"نہیں مجھے تم لوگوں سے یہ تعاون منظور نہیں ہے۔" وہاں جتنے افراد موجود تھے ان کے منہ حیرت سے کھل گئے۔ جوگندر معمول کے مطابق سرخ

ہوگیا۔ اس نے شدت سے جوش میں کہا۔

"تمہارے تو فرشتے بھی کریں گے۔ پتہ ہے ہم سب رائفل کی نال کے نشانے پر ہیں اور اب ہم اس منصوبے سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹ سکتے اور منصوبہ تمہارے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔"

"تم سب جہنم میں جاؤ۔ میں نے جو فیصلہ کرلیا ہے۔ وہ میرا آخری فیصلہ ہے اور یہ سمجھ لو۔ اگر کوئی کوشش اس میں ترمیم نہیں کرسکتی۔" وہ لوگ ایک دوسرے کی صورت دیکھتے رہے۔

"کیا سمجھے۔" پھر جوگندر سنگھ نے کہا۔

"کوئی بھی ایسا کام جو ایک مشت کہ حیثیت رکھتا ہو۔ کسی کے انکار کردینے سے مکمل نہیں ہوتا۔ ہم تمہیں سوچنے کا ایک انتہائی معقول موقع دے رہے ہیں کیا سمجھے۔ کیا تم ہمیں آئندہ کے لیے فیصلہ کرنے کا تھوڑا سا وقت دو گے۔"

میں بھلا کسی کو کیا وقت دے سکتا تھا چنانچہ وہ سب اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ پھر جوگندر سنگھ ہی واپس آیا تھا اور اس نے کہا۔

"اصل میں ہم تمہیں خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کررہے ہیں۔ ہمیں یہ بھی اندازہ ہے۔ کہ تم سنالی کے بغیر کسی قدر مضطرب ہوجاتے ہو۔ جاؤ مزید آرام کرلو۔ ابھی ہمارے پاس وقت ہے اور یہ پیشکش بھی کہ تم ہمارے لیے یہ کام ضرور کرو۔" میرے ذہن میں تو خناس تھا۔ میں نے ان کی باتیں سنیں لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔

آخرکار مجھے واپس اس عمارت میں چھوڑ دیا جہاں مسز مہرا موجود تھی لیکن اس بار جس شخصیت نے میرا استقبال کیا۔ اسے دیکھ کر میں نے اپنے دل میں سوچا کہ یہ لوگ واقعی شیطان کے چیلے ہیں۔ اور جس گروہ میں میں نے پہلے کام کیا تھا۔ اس کے خطرناک لوگوں سے کہیں زیادہ زیادہ خطرناک وہ سنالی تھی جو دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی تھی۔

باقی تفصیلات اس نے یہ ہی بتائی تھیں کہ اسے یہاں بڑے احترام کے ساتھ پہنچایا گیا ہے اور اس سے پہلی بھی اس کے احترام میں کوئی کمی نہیں کی گئی تھی بلکہ نہایت ہی اچھے انداز میں سے ان لوگوں نے اپنی ساتھ رکھا ہے۔ میں ان شیطانوں کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ پھر میں نے سنالی سے مسز مہرا کے بارے میں پوچھا تو وہ چونک کر بولی۔

"کون' مسز مہرا۔ کیا یہاں کوئی عورت بھی رہتی ہے۔" میں نے ایک لمحے کے لیے دل میں دکھ محسوس کیا۔ بس ایک لمحہ اور اس کے بعد پرسکون ہوگیا۔ اچھی طرح جانتا تھا کہ مسز مہرا کہاں گئی۔ سنالی کو میں نے کہہ سن کر بہلا دیا لیکن پھر میرے ذہن میں بہت سی سوچیں رقصاں ہوگئیں اور میں نے سوچنا شروع کردیا کہ اب مجھے اپنے تحفظ کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

وہ شیطان تو بھلاوے تھے اور ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا ناممکن تھا۔ کب کیا کر بیٹھیں کوئی نہیں جانتا تھا۔ بہرحال سنالی اتنے وقت کے بعد ملی تھی ایک بار پھر میری ساری توجہ اس کی جانب ہوگئی۔ پرانے لوگوں کی کیا وتیں غلط نہیں ہوتیں۔ عورت کی وجہ سے زندگی میں نجانے کتنے کھیل ہوتے ہیں۔

اس رات کھانے کے بعد جب ہم اپنی اپنے بیڈ پر جا کر سوئے تو شاید صبح ہی کو میری آنکھ کھلی اور وہ بھی اس وقت جب سورج کی تیز روشنی راستے تلاش کرتی ہوئی اندر آگئی تھی اور اس نے کمرے پر قبضہ جمالیا تھا۔ میں جاگا تو گزرے ہوئے واقعات یاد آگئے۔

اور میں نے گردن گھما کر سنالی کو تلاش کیا جو بستر پر موجود نہیں تھی۔ یہ دیکھ چکا تھا کہ یہ گھر ہر طرح سے ایک مکمل گھر ہے۔ ہوسکتا ہے سنالی کچن میں ہو۔ میں نے پر اطمینان انداز میں غسل کیا' لباس بدلا۔ سنالی ابھی واپس نہیں آئی تھی۔

پھر نجانے کیوں میرا دل دھک سے ہوگیا اور میں نے دوسرے انداز میں سوچا اور سنالی کو پوری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عمارت میں تلاش کر ڈالا لیکن وہ موجود نہیں تھی۔

میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ آہستہ آہستہ ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ وہ لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ مجھے مجبور کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور انہوں نے بڑا صحیح حربہ آزمایا تھا۔ میں دیوانگی کے انداز میں سر پٹخنے لگا۔

کسی نے مجھ سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ میں گھر سے باہر نکل جاتا تھا۔ ادھر ادھر گھومتا پھرتا تھا۔ ہر وہ جگہ میں نے تلاش کر لی تھی جہاں ان لوگوں میں سے کوئی پھر سنالی نظر آ جائے۔

چار پانچ دن اسی طرح گزر گئے اور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں' میں آدھی آدھی رات تک سڑکوں پر گھومتا پھرتا رہا تھا۔ اور مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اب میری فطرت میں دیوانگی کے بجائے خوف اور مایوسی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ کئی بار میرا دل چاہا کہ پولیس اسٹیشن چلا جاؤں اپنے بارے میں تفصیل بتاؤں اور سنالی کی تلاش کے لیے پولیس سے مدد طلب کروں دو تین بار میں پولیس اسٹیشن کے سامنے جا کر رکا اگر میں ان کی سازش پولیس کو بتا دوں تو یقینی طور پر میری مدد کی جائے گی۔

اس دن میں پورے ارادے کے ساتھ پولیس اسٹیشن کی طرف چل پڑا تھا کہ اچانک ہی ایک کار میرے پاس آ کر رکی اور میری نگاہیں اس کی جانب اٹھ گئیں۔ کار کی عقبی سیٹ پر سنالی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے برابر میں جوگندر سنگھ اور سامنے صرف ایک ڈرائیور میرا منہ کھلا ہی تھا کہ کار آگے بڑھ گئی اور میں اس بے اختیار اس کے پیچھے دوڑا پڑا۔

تھوڑی دور جا کر کار پھر رک گئی۔ میں ہاتھ اٹھائے اس کے قریب پہنچا اور جیسے ہی میں اس کے قریب پہنچا ڈرائیور نے کار پھر آگے بڑھا دی۔ اس بار کار کی رفتار قدرے تیز تھی۔

میرے ذہن کی جو حالت تھی وہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ نجانے نجانے کتنا فاصلہ میں نے کار کے پیچھے دوڑتے ہوئے طے کیا' یہی کیا جا رہا تھا کہ کار رکتی اور جیسے ہی میں اس کے قریب پہنچتا وہ آگے بڑھ جاتی اور پھر کافی فاصلہ طے کر لیا گیا شاید کسی ایک وقت میں کوئی ایک انسان اتنی تیز رفتاری سے اتنی دور تک دوڑا ہو۔ میں تھک گیا تھا اور اب میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔

وہ کار اب میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ غالباً جو کھیل وہ کھیل رہے تھے۔ ان کی دانست میں اب وہ ختم ہو گیا تھا۔ میری اتنی ہمت بھی نہیں رہی تھی کہ اب میں اپنے قدموں پر کھڑا بھی رہ سکوں اور پھر اس وقت میں زمین ہی پر بیٹھ گیا تھا۔ جب اچانک ایک کار پیچھے سے آئی۔ میرے قریب آ کر رکی اور پھر اس کے چاروں دروازے کھل گئے۔ اس میں سے چند افراد نیچے اترے۔ اور انہوں نے مجھے اپنے قبضے میں لے لیا۔ کسی نے میری گردن کی پشت پر ضرب لگائی تھی اور اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔

پھر نجانے کب ہوش آیا۔ آنکھ کھلی تو چاروں طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ میں حیران سا تاریکی میں آنکھیں ٹٹپٹانے لگا اور میں نے حلق پھاڑ کر چیختے ہوئے کہا۔

"کوئی ہے۔ یہاں روشنی کرو۔ کیا میں اندھا ہو گیا ہوں۔ روشنی کرو۔ ورنہ میں یہاں موجود ہر چیز کو تباہ کر دوں گا۔"

میرے ان الفاظ کے ساتھ ہی اچانک روشنی ہو گئی اور اس نے اپنے اردگرد کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ جوگندر سنگھ' کندن سنگھ' پستہ قامت ایمرے اور اس کے علاوہ دو تین افراد بھی موجود تھے۔ کندن سنگھ نے کچھ کہنا چاہا تو ایمرے نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا اور آہستہ سے بولا۔

"بھیڑیا! اب بھی اگر تمہیں اس بات کا یقین نہیں ہوا تو میں یہی کہوں گا کہ تم دیوانے ہو اور پھر تم یقین کر لو کہ ہمارے پاس تمہیں ختم کر دینے کے

علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں رہے گا۔"

"تم مجھے ختم کرنے کا ارادہ تو پہلے ہی رکھتے ہو۔"

"ہاں۔ ہمیں معلوم ہے۔ مسز مہرا نے تمہیں یہی بتایا ہے لیکن بہر حال تم جو کچھ بھی سوچو ہم ایسا کریں گے نہیں۔ بشرطیکہ ہمارا کام خوش اسلوبی سے ہو جائے اور تم اس انداز میں وہ سب کچھ کر ڈالو جو ہم تم سے چاہتے ہو۔ ورنہ دوسری صورت میں تمہیں خود اندازہ ہو چکا ہو گا کہ تمہارے ہاتھ خالی ہیں مسز مہرا ختم ہو چکی ہے۔ کیونکہ یہ ضروری تھا۔ اس نے تمہیں جو کچھ بتایا ہے۔ تم یہ سمجھ لو کہ یہ مناسب نہیں ہے اور تمہیں وہ کام کرنا ہی ہو گا۔ جو ہم چاہتے ہیں۔"

"لیکن ایک بات تمہیں بتا دینا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اب یہ تمہارے آخری لمحات ہیں اور ہمارے لیے بھی کیونکہ وہ کام اب جلد از جلد ہو جانا چاہئے۔ جس کے لیے ہم نے یہ لمبا چکر چلایا اور اگر ہمیں اس میں شک و شبہ باقی رہتا ہے تو ضروری ہے کہ ہم کچھ اور بندوبست کریں لیکن پہلے مرحلے کے طور پر ہم سنالی کی لاش کو تمہارے سامنے پیش کر دیں گے۔ سنالی اس وقت جن لوگوں کے قبضے میں ہے۔ انہیں ہدایات دی گئی ہیں یہ ضروری ہے کہ اب تم پوری بات ذہن نشین کر کے اپنا آخری فیصلہ ہمیں سنا دو۔"

میں نے خونی نگاہوں سے انہیں دیکھا پھر آہستہ سے کہا۔

"میں تیار ہوں۔"

اس وقت اگر نفرتیں ریکارڈ کرنے کا کوئی آلہ ہوتا تو اس کی سوئی آخری حدوں کو چھو رہی ہوتی۔ ان سب کے لیے میرے دل میں اتنی ہی شدید نفرت تھی۔ یہ لوگ بڑے صاحب اختیار تھے۔ ہر کام کر سکتے تھے۔ مسز مہرا نے مجھے ان کی تفصیل بتا دی تھی۔ وہ ایک عجیب کھیل کھیل رہے تھے۔ اب تک انہوں نے دوبارہ مجھے زچ کیا تھا۔ جگ نرائن کو جیل سے نکالتے ہوئے انہوں نے اپنی وعدے کی جس طرح تکمیل کی تھی۔ وہ مجھے معلوم تھا۔ اسی طرح انہوں نے سنالی کے سلسلے میں کہا تھا لیکن اس بار صورتحال شاید ان کے حق میں نہ ہو۔

پھر اس کے بعد باقی کے معاملات چلتے رہے۔ میں نے اپنا چولا بدل لیا تھا' کندن سنگھ مجھے بریف کرتا تھا۔ ساری صورتحال بتاتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ وقت آ گیا جب مجھے ان کے ساتھ کام کرنا تھا۔ اس رات مجھے کچھ بھی نہیں بتایا گیا تھا لیکن اس وقت میں گہری نیند سو رہا تھا۔ جب انہوں نے مجھے جگایا اور مجھ سے کہا کہ میں تیار ہو جاؤں۔ کام کا آغاز ہونے والا ہے۔ میں نے ان کے ہر حکم کی تعمیل کی۔ باہر ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک اجنبی چہرہ تھا۔

باقی جوگندر سنگھ' کندن سنگھ' اور ایمرے تینوں موجود تھے۔ کار چل پڑی' کندن سنگھ نے ہیڈ فون کانوں پر چڑھا لئے اور اپنے قریب رکھے ہوئے ٹرانسمیٹر کا ڈائل گھمانے لگا سڑکیں بالکل سنسان تھیں۔ ابھی مکمل طور پر صبح کی روشنی نہیں ہوئی تھی۔

کار کی رفتار بے حد تیز تھی اور سب مکمل طور پر خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سب کی نگاہیں باہر کا جائزہ رہی تھیں۔ جبکہ کندن سنگھ مدھم لہجے میں اسی نامانوس زبان میں گفتگو کر رہا تھا۔ جو نجانے کون سی زبان تھی۔ میرا ذہن بے شک نیند سے جاگ چکا تھا لیکن پھر بھی مجھ پر ایک خمار سا طاری تھا اور اس وقت میں نے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا تھا۔ کار جن راستوں پر سفر کر رہی تھی۔ وہ میرے لیے اجنبی تھے۔ سڑکوں کے دونوں طرف سڑک کے دونوں طرف اونچے اونچے درخت کھڑے ہوئے تھے۔ اور قریب و جوار میں مکانات بکھرے ہوئے تھے۔ خاصا فاصلہ طے کرنے کے بعد کندن سنگھ کی آواز نکلی۔

"ہائے وے بند کر دی گئی ہے اور ہم نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نا کہ بندی کر لی ہے ایئر پورٹ کے علاقے میں بس ذرا صورتحال مشکل ثابت ہوگی۔ کیونکہ ہم وہاں اپنے آدمیوں کو نہیں پھیلا سکتے۔"

کسی نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا کار بائیں جانب مڑی اور پھر ایک میل کے بعد جنگل میں گھس گئی گھنے درختوں کے درمیان گھری ہوئی بل کھاتی سڑک پر فاصلہ طے کیا جا رہا تھا۔ اور اس کے بعد جنگل کے اسی علاقے میں ایک میدان سا نظر آیا۔ جس کے پاس درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ تھے صبح کا اجالا پھوٹ رہا تھا۔ میں نے میدان میں ایک ہیلی کاپٹر کھڑا دیکھا۔ انجن اسٹارٹ تھا اور پائلٹ اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ کندن سنگھ کے علاوہ باقی لوگ کار سے اتر آئے۔ کندن سنگھ نے مسلسل ٹرانسمیٹر آن کر رکھا تھا اور کسی کو رپورٹ دیتا جا رہا تھا۔

پھر ایمرے نے آگے جھک کر کندن سنگھ سے کچھ کہا اور اس کے بعد میری جانب رخ کر کے بولا۔

"آجاؤ۔" میں نے خاموشی سے ہیلی کاپٹر کی جانب قدم آگے بڑھا دیئے تو ایمرے کہنے لگا۔

"یہ ہیلی کاپٹر نہایت جدید ہے اور اس کے دروازوں کا نظام ویسا ہی ہے۔ جیسا تم پہلے ہیلی کاپٹر میں تجربہ کر کے دیکھ چکے ہو۔ اس لیے جیسے ہی تم اوپر پہنچو اپنی سیٹ پر بیٹھ کر اسے صحیح پوزیشن میں فکس کر لینا۔ ہم ٹھیک کچھ بجے ٹارگٹ پر پہنچ جائیں گے، وہاں اس کا وقت نہیں ملے گا۔"

ہیلی کاپٹر میں بیٹھنے کے بعد ایمرے نے بھی کانوں پر ہیڈ فون چڑھا لیے، جو گندر سنگھ پائلٹ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ہیلی کاپٹر نے زمین چھوڑ دی اور ایمرے نے مجھے وہ رائفل تھما دی۔

"رائفل مکمل طور پر چیک کی جا چکی ہے۔ تمہیں صرف نشانہ لینا ہے۔ جیسے ہی ہم لوگ وہاں پہنچیں گے، دروازہ کھلے گا اور تم اپنا کام کر ڈالو گے پھر ہم فوراً ہی وہاں سے نکل جائیں گے جس شخص کو تمہیں نشانہ بنانا ہے۔ وہ ایک خصوصی عمارت میں صبح کی ورزش کر رہا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی معمولات میں اتفاقیہ طور پر تبدیل پیدا ہو جائے جبکہ یہ اندازہ لگایا جا تا رہا ہے کہ وہ معمول کا پابند ہے اور کوئی تبدیلی ممکن نہیں ہے لیکن بہر حال ہمیں ہر بات کو مدنگاہ رکھنا ہے۔ اصل میں اتفاقیہ واقعات ہی ناکامیوں کا سبب بنتے ہیں۔ تمہیں ہر قیمت پر اسے قتل کرنا ہے۔ تمہارا نشانہ خطا نہیں ہونا چاہیئے۔" وہ خاموش ہو گیا تھا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ جو فیصلہ میں نے کیا تھا۔ وہ بے حد سنگین تھا لیکن پھر بھی مجھے ایک عجیب سا احساس تھا۔ پہلی بار، پہلی بار میں وہ کرنے والا تھا۔ جو شاید میری زندگی کا سب سے خطرناک کام تھا۔ میں آنکھیں بند کر کے آنے والے وقت کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔

ہیلی کاپٹر کی رفتار بہت تیز تھی۔ درفت اب صرف تنکے نظر آ رہے تھے اور مشرق سے سورج ابھر رہا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد صبح کی چمکیلی روشنی میں نیچے وسیع احاطہ اور وہ مکان نظر آنے لگا جسے میں پہلے دیکھ بھی چکا تھا۔

سورج کی کرنیں سوئمنگ پول کے پانی کو چوم کر چاندی کی جھیل بنا رہی تھیں۔ جیسے ہی یہ منظر ہماری نگاہوں کے سامنے آیا ہیلی کاپٹر نے غوطہ لگایا میرے ہاتھ میں رائفل تھی۔ میں نے ایک لمحے کے اندر اندر گھوڑا سا بدن پیچھے کر کے یہ رائفل ایمرے کی گردن پر رکھ دی۔

اور ایمرے کے دونوں ہاتھ پھیل گئے۔

"یہ کیا۔ یہ کیا۔ یہ کیا کر رہا ہے۔ کک۔ کتے! کیا کر رہا ہے کیا تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

"پائلٹ سیدھے چلو اور یہاں سے ہٹ کر کسی ایسی جگہ ہیلی کاپٹر اتار لو جہاں اسے اتار سکتے ہو۔ سمجھ رہے ہو۔ ورنہ۔"

"بھیڑیا۔ بھیڑیا۔ تم ہوش و حواس کھو بیٹھے ہو۔ تو

جانتا ہے کہ سنالی ہمارے قبضے میں ہے۔"

"صرف ایک لمحے کے اندر اندر اگر تم نے میرے حکم کی تعمیل نہیں کی تو۔" میں نے کہا۔ اور اس کے بعد ہلکا سا ٹریگر دبا دیا لیکن جو گندر سنگھ کو اس بات کا شبہ بھی نہیں تھا کہ ایمرے کے بجائے میں اسے نشانہ بناؤں گا۔ اس کی کھوپڑی اس طرح اڑی کہ بھیجا نکل کر ہیلی کاپٹر کی اسکرین پر بکھر گیا اور خون کی پھواریں اس طرح چاروں طرف پھیل گئیں کہ ہمیں اپنے چہرے صاف کرنے پڑے ہیلی کاپٹر لرز گیا تھا۔ میں نے پائلٹ سے کہا۔

"اگر تم ہیلی کاپٹر نہ سنبھال سکو تو بڑی خوشی کے ساتھ اسے کسی بھی پہاڑی، کسی بھی درخت، کسی بھی جگہ زمین سے ٹکرا دو۔ زندگی اور موت کا یہ کھیل بہت آسان ہے۔ کوئی دقت نہیں ہوگی۔"

پائلٹ اپنے حواس کھوتا جا رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر کی رفتار بہت تیز ہو گئی اور وہ تیزی سے نیچے آنے لگا ایمرے چیخ کر بولا۔

"سنبھالو اسے۔ سنبھالو۔ میں کہتا ہوں۔ اسے سنبھالو۔" ہیلی کاپٹر ایک دم اتنا نیچے آ گیا تھا کہ درختوں کی چوٹیاں تھوڑی سی بلندی پر رہ گئیں لیکن پھر پائلٹ نے ہیلی کاپٹر سنبھال لیا اور اس کی نگاہیں چاروں طرف کا جائزہ لینے لگیں۔ ایمرے بھی اپنے اعصاب نہیں سنبھال پا رہا تھا۔ اس کی زبان بند تھی۔ جو گندر سنگھ کا بے سر کا بدن، اس طرح ساکت تھا کہ حیرت ہوتی تھی یہ وہ جتنی خاموشی سے مر گیا تھا یہ بات ناقابل یقین تھی۔ ورنہ مرنے کے بعد بدن تھوڑی دیر تک تڑپتا ہی ہے۔ آخر کار ہیلی کاپٹر ایک گنجان آبادی میں غالباً کسی کرکٹ گراؤنڈ میں اتر گیا تھا۔ ایسے گراؤنڈ میں جو عموماً علاقے کے رہنے والے کھیلنے کے لیے بنا لیتے ہیں۔ ہیلی کاپٹر نیچے اتر آیا تو میں نے رائفل سیدھی کی اور کہا۔

"چلو نیچے اتر جاؤ۔ مسٹر ایمرے! آپ کے پاس ٹرانسمیٹر سیٹ موجود ہے اگر چاہتے ہیں تو ایک لمحے کے اندر اندر کندن سنگھ کو ہدایت کریں کے سنالی کو لے کر یہاں آ جائے۔ جگہ کی نشاندہی آپ خود کر دیں۔ کیونکہ میں ساری دنیا کو بھول چکا ہوں۔"

"لل لیکن۔ تم۔ تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔"

"گویا ابھی تم ہوش میں نہیں آئے۔" میں نے کہا۔ اور پائلٹ کے سر کا نشانہ لیتے ہوئے بولا۔

"اس کے بعد میں اسے ختم کر دوں گا اور پھر تمہاری باری ہے۔ بعد میں جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔"

پائلٹ نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "جو یہ کہہ رہا ہے۔ وہ کرو۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔"

"لیکن..... لیکن یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہوگا۔"

"ایمرے۔ تم یہ کام کرو گے کیا سمجھے۔" میں نے کہا اور دوسرے ہی لمحے میں نے پائلٹ کے سر کا نشانہ لے لیا۔

"نہیں دیکھو میرا اس میں۔" پائلٹ نے یہ الفاظ ادا کیے لیکن اس کے بعد اس کے بدن پر گولیوں کے جو نشانات بنے ان میں کہیں کوئی ٹیڑھا پن نہیں تھا۔ وہ اوندھے منہ زمین پر آ رہا اور اس کے بعد ایمرے کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ وہ میرے حکم کی تعمیل کرے میں نے اس سے کہا۔ "اور جو کہو اس زبان میں کہو جو میری سمجھ میں آئے۔"

ایمرے نے ٹرانسمیٹر میں کہا۔

"کندن سنگھ۔" میں نے باقاعدہ دوسری طرف کی آواز سنی۔

"ہاں۔ کیا تم مجھے مسرت کا پیغام دینا چاہتے ہو۔ وہ وقت تو ہو گیا ہے۔ جب ہم کامیابی کی خبر سننے والے تھے۔"

"تم ایسا کرو۔ سنالی کو لے کر فوراً اس پتے پر پہنچو۔ جو میں تمہیں بتا رہا ہوں۔"

"کیا بات ہے۔ ایمرے تمہاری آواز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں۔"

"جو کچھ میں کہہ رہا ہوں۔ وہ کرو۔ اور جتنی جلدی کرسکو۔ وہ بہتر ہے۔"

"اور یہ بھی کہہ دو اس سے کہ کوئی بھی غلط حرکت کی تو خیر جو کچھ ہوگا۔ وہ ہوگا ہی لیکن آخری آدمی یعنی تم بھی موت کا شکار ہو جاؤ گے۔"

"کندن سنگھ۔ براہ کرم اس وقت اور کوئی عمل نہ کرنا۔ صرف وہ کرو جو کہا جا رہا ہے۔"

"بس ٹرانسمیٹر بند کردو۔ مگر پہلے اسے اس جگہ کی تفصیل بتاؤ۔" اور ایمرے کندن سنگھ کو تفصیل بتانے لگا۔ میں اطمینان سے ہیلی کاپٹر سے ٹک کر کھڑا ہو گیا تھا اور ایمرے پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ وقت ایسا تھا کہ میرے لیے نہایت پرسکون' ان لوگوں نے جسے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ وہ اپنے معمولات میں مصروف ہوگا لیکن جوگندر سنگھ' اور پائلٹ اس کی جگہ اپنی زندگیاں ہار چکے تھے۔ چھوڑنا کسی کو بھی نہیں تھا۔ میرے اندر کا وحشی بھیڑیا اب پورے ہوش و حواس میں تھا۔ بالکل اسی عالم میں جب وہ گروہ سے ملنے والے احکامات کی تعمیل کرتا تھا۔

پھر آدھے گھنٹے کے بعد ایک بڑی لیموزین آتی نظر آئی جس کی چھت کھلی ہوئی تھی اور اس میں مجھے کندن سنگھ' سنالی کے ساتھ بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ باقی گاڑی خالی تھی۔ میں نے مسکراتی نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھا۔ کندن سنگھ کے کانوں پر بھی ہیڈ فون چڑھا ہوا تھا۔ ایمرے نے کہا۔

"اس وقت کچھ نہ پوچھنا۔ بلکہ جو ہدایات دے رہا ہوں ان پر عمل کرنا۔"

"بولو کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"اس سے کہو کہ ہیلی کاپٹر سے دو سو گز کے فاصلے پر رک جائے اور سنالی کو ادھر بھیج دے۔" میں نے کہا۔

"بس اب تم جس جگہ ہو۔ وہاں رک جاؤ۔ کندن سنگھ اور سنالی کو ادھر بھیج دو۔"

کندن سنگھ نے شاید دوربین کے ذریعے یہ منظر دیکھ لیا تھا۔ اور سمجھ گیا تھا کہ صورتحال کیا ہے۔ ان کا کھیل بگڑ گیا ہے۔ لیموزین رک گئی اور سنالی دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی۔

کندن سنگھ نے خود بھی اپنی جگہ چھوڑ دی تھی اور نیچے اتر کر کھڑا ہو گیا تھا سنالی چند قدم آگے چلی اور اس کے بعد اس نے دوڑنا شروع کر دیا اور وہ ہاتھ ہلا کر کچھ کہہ رہی تھی لیکن دو سو گز کے فاصلے سے مجھے اس کی آواز صاف سنائی نہیں دی رہی تھی۔ البتہ کچھ مدھم مدھم سے الفاظ کانوں میں ابھرے تھے۔

"خود کو بچاؤ۔ خود بچاؤ۔ یہ شخص تنہا ہے۔"

ایک لمحے کے اندر تو میں صورتحال کو سمجھ نہیں سکا تھا لیکن دوسرے لیموزین سے کچھ گنیں برآمد ہوئیں' کندن سنگھ کے عقب میں شاید کچھ لوگ اور چھپ کر بیٹھے ہوئے تھے اور سنالی مجھے خطرے سے آگاہ کر رہی تھی لیکن ابھرنے والی گنوں نے سنالی کو نشانہ بنایا اور اس کے پورے بدن میں سوراخ ہو گئے' وہ زمین پر گری اور تڑپنے لگی۔ میرا پہلا نشانہ ایمرے کے علاوہ کون ہو سکتا تھا۔ ایمرے نے مرتے ہوئے بھی ایک موٹی سی گالی بکی تھی جو غالباً کندن سنگھ کے لیے تھی۔ کندن سنگھ نے الٹی چھلانگ لگائی۔

لیکن میں ایک پیشہ ور قاتل تھا۔ سنالی کو مرتے ہوئے دیکھ چکا تھا اور جانتا تھا کہ اس کے بعد کائنات ختم ہو گئی ہے۔ چنانچہ میں نے لیموزین پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ کندن سنگھ اتنی زور سے اچھلا تھا کہ اچھل کر سر کے بل لیموزین میں جا گرا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں اوپر بلند تھیں کہ لیموزین کی ٹنکی پھٹی اور اس کے اندر سے دو انسانی جسم اچھل کر باہر آ گرے جو کندن سنگھ کے علاوہ تھے۔

"کون جیا کون مرا یہ الگ بات تھی۔ مگر سنالی مر گئی تھی۔ سنالی جس نے پتا نہیں میرے اندر کیا

ٹوٹ پھوٹ کر دی تھی۔ میری آنکھوں میں تاریکیاں پھیل گئیں اور اس کے بعد میں نے دنیا ہی چھوڑ دی۔ کسی چیز میں دل نہ لگا۔ وہ درندہ مر گیا۔ ہاں گوپال اس دنیا میں نہ رہا۔ نجانے کب تک دیوانوں کی طرح مارا مارا پھرا' دل نہیں لگتا میرا دنیا میں پنڈت جی! سنالی بہت یاد آتی ہے۔ بہت یاد آتی ہے وہ گوپال مر گیا۔ پنڈت جی گوپال مر گیا۔ اب میری آنکھوں میں تاریکیوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا اور میں اسے دیکھتا رہا عجیب کہانیاں بکھری ہوئی ہیں اس کائنات میں۔ طرح طرح کے غم ہیں انسان کو صرف اپنے غموں کو دیکھتا ہے وہ۔ دوسروں پر غور نہیں کرتا پھر میں نے ساوتری کو دیکھا اس لڑکی کا ذکر درمیان میں نہیں آیا تھا لیکن اس کے بارے میں میرے دل میں ایک تجسس تھا۔ میں نے پوچھا۔

"مگر یہ ساوتری کون ہے۔" بمشکل تمام گوپال نے اپنے آپ پر قابو پایا۔ پھر مدھم لہجے میں بولا۔

"زمانے کی ستائی ہوئی۔ ایک معصوم سی بچی دنیا کی اپنی مشکلات کا شکار جنہوں نے دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ دولت مندیات کی بیٹی تھی۔ باپ مر گیا۔ ماں بہت پہلے مر چکی تھی۔ چچا اور اس کے تین بیٹوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا لیکن سر پر نہیں بلکہ اس کی دولت پر ہاتھ رکھا اور جب دنیا کی نگاہیں چوکیں انہوں نے اس ٹھکانے لگانے کی کوشش کی لیکن زندہ بچ گئی بیچاری۔

میرے ہاتھ لگ گئی کچھ اس طرح اس نے مجھے پیار سے بھائی کہا کہ میرا کلیجہ پانی ہو گیا۔ سنالی کی موت نے میرے دل سے گوپال نکال دیا تھا۔ میں اسے ساتھ لے آیا۔ بہرحال سنالی کے لیے آج بھی روتا ہوں۔ مندروں میں جا کر بھگوان سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ بھگوان میری من کو سکون دے دے۔ کچھ سکون دے دے میرے من کو۔ اور پنڈت جی اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے پاپوں کا قرض اتارنے کی کوشش کروں گا۔ کچھ دنوں کے لیے میں پھر سے گوپال بننا چاہتا ہوں تاکہ ساوتری کو اس کا صحیح مقام دے دوں۔ بس اس کے بعد گوپال کے لیے اس دنیا میں کچھ بھی نہیں رہے گا۔ میرے لیے دعا کریں پنڈت جی! بھگوان کے لیے میرے لیے دعا کریں۔ بھگوان میرے من کو شانتی دے۔ پنڈت جی! میں بہت اشانت ہوں۔" وہ پھر رونے لگا۔

بہرحال اسے دلاسہ دینا ضروری تھا۔ بڑا وحشی انسان تھا۔ کئی دن گزر گئے میرے ساتھ اس کا سلوک بہت اچھا تھا۔ پھر ایک دن اس نے کہا۔

"پنڈت جی! میں ساوتری کو لے کر جا رہا ہوں آپ کو بھگوان کی سوگند آپ یہاں سے نہ جائیں۔ یہیں رہیں۔"

"کہاں جا رہے ہو گوپال۔" میں نے سوال کیا۔

"پنڈت جی! میں سے اس کی جگہ دلانے جا رہا ہوں۔ میں آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔" گوپال ساوتری کو لے کر چلا گیا۔ مجھے بہر طور فیصلہ کرنا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے گھر بہت یاد آتا تھا۔ بہت کچھ یاد آتا تھا۔ جہلم کنارے بیٹھ کر جو کچھ مجھے ملا تھا وہ مجھ سے چھن گیا تھا اور چھیننے والے وہ تھے جو انتہائی مکروہ فطرت کے مالک تھے۔ میں پرسکون ہو کر نہیں بیٹھ گیا تھا۔ اپنا گھر چھیننے والوں کے لیے میں موت کا ہرکارہ بننا چاہتا تھا۔ وقت گزرتا رہا کچھ دن کے بعد گوپال واپس آ گیا۔ ساوتری اس کے ساتھ نہیں تھی۔

وہ آیا۔ اس کا چہرہ ہشاش بشاش تھا۔ مجھ سے بڑے پیار سے ملا پھر بولا۔

"پنڈت جی! میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔"

"کیا کیا تم نے۔" میں نے سوال کیا۔

"ان چاروں ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ساوتری کا چاچا اور اس کے تینوں بیٹے۔ اب ان کا اس سنسار میں کوئی وجود نہیں ہے۔ میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے ساوتری کے وکیلوں کو بھی جمع کرلیا ہے اور ان سے کہا ہے کہ ایک مہینے کے اندر اندر ساوتری کے اثاثے اسے واپس نہ مل گئے تو میں ان سب کو اسی طرح ختم کردوں گا۔ جس طرح میں نے ان چاروں کو کیا ہے۔ طاقت کی زبان سب ہی سمجھتے ہیں پنڈت جی! مگر یہ میں نے آخری کام نہیں کیا ہے ابھی مجھے ایک کام اور بھی کرنا ہے۔ اپنی دانست میں میں نے نیکیاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ بھگوان مجھے جیتے جی نہیں تو موت کے بعد شانتی دے۔ سمجھ رہے ہیں ناں۔ پنڈت جی! میں نے ساوتری کے لیے کچھ محافظ مقرر کردیئے ہیں اور ان سے کہہ دیا ہے کہ اگر ساوتری کا بال بھی بیکا ہوا تو میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ بس یہ کرکے واپس آگیا ہوں۔ سنسار میں کچھ نیکیاں کرنا چاہتا ہوں۔ پنڈت جی۔ اپنی دانست میں کوشش تو یہ ہی کررہا ہوں۔"

"اچھی بات ہے گوپال۔ اچھی بات ہے لیکن جب خود کو بدل رہے ہو تو مزید بدلنے کی کوشش کرو۔"

"جی پنڈت جی! میں نے نیکیاں کرنے کا بیڑا اٹھالیا ہے اور پنڈت جی آج ایک اور نیکی کررہا ہوں۔" اس نے کہا اور اپنے لباس سے ایک پستول نکال لیا۔ میں نے حیرت سے اس کا یہ عمل دیکھا تھا۔ پستول میں کارٹرج لگا کر اس نے اسے چیک کیا اور مسکرا کر بولا۔

"میں ہمیں دیش بروہی رہا ہوں اپنے دیش سے غداری کی ہے میں نے لیکن آپ پہلی بار دیش بھگتی کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے دیش کے لیے میں پہلی بار کچھ کررہا ہوں پنڈت جی! پہلی بار۔ اور جو کچھ میں کررہا ہوں وہ یہ ہے۔" یہ کہہ کر اس نے پستول سیدھا کرلیا اور میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر وہ سانپ جیسی پھنکار کے ساتھ بولا۔

"تم پاکستانی جاسوس ہو۔ سمجھے پنڈت جی! پنڈت بنے ہوئے ہو۔ میرے دھرم کا مذاق اڑایا ہے۔ تم نے۔ میرے دیش کو نقصان پہنچایا ہے تم نے میں دیش بھگتی کرنا چاہتا ہوں۔ سمجھے تمہیں ختم کروں گا اور تمہاری لاش سرکار! کو پیش کروں گا۔ انہیں بتاؤں گا کہ تم کیسا روپ دھارن کرکے مجھے اور مجھ جیسوں کو بیوقوف بنا رہے ہو۔" بدن میں سنسنی دوڑ گئی تھی میرے لیکن میں کبھی تو دیش بھگت تھا۔ میں پاکستانی جاسوس نہیں تھا۔ مجھے ان لوگوں نے نجانے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ مجھے ایک دم زور سے ہنسی آگئی۔ میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ میرا اور اس کا فاصلہ کتنا ہے۔ اب جو کچھ کرنا تھا۔ وہ مجھے کرنا ہی تھا۔

چنانچہ میری ہنسی نے اسے ایک لمحے کے لیے حیران کردیا اور حیرانی کا یہ ہی لمحہ میرے لیے کار آمد تھا۔

میری زوردار لات اس کے ہاتھ پر پڑی اور پستول فضاء میں بلند ہوگیا لیکن اس سے پہلے میں نے پستول کو لپک لیا تھا اور کئی قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ہکا بکا رہ گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"گوپال مجھے تم سے بہت ہمدردی ہے جو کچھ ہوا بہت برا ہوا سنالی کی موت کا بھی مجھے دکھ ہے لیکن میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ میں تمہارے وطن کا دشمن نہیں ہوں۔ میں تو ایک عام سا انسان ہوں۔ جسے تم سب نے مل کر وطن دشمن بنا دیا ہے۔ ابھی مجھے بہت کچھ کرنا ہے گوپال' بہت کچھ کرنا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا گوپال۔ گیا وقت پھر واپس نہیں آتا اور بس ایک بار ملتی ہے اور مجھے اپنی زندگی سے زیادہ اپنے وطن کی آبرو کا پاس ہے اور اس کے لیے تمہارا اس دنیا سے چلے جانا ضروری ہے۔ کیونکہ ابھی میری ذمہ داریاں ختم نہیں ہوئیں۔" جیسے ہی میں نے پستول کے ٹریگر پر ہاتھ رکھا۔ اس کا منہ کھلا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن تین گولیاں ایک لائن سے اس کے سینے میں داخل ہوگئیں اور اس کے دونوں ہاتھ فضاء میں پھیل گئے۔ پھر وہ آہستہ

آہستہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ اور چند لمحات کے بعد اس نے کچھ کہے سنے بغیر دم توڑ دیا۔ یہ ضروری تھا۔ بہت ضروری تھا۔ وہ دیش بھگت تھا تو میں بھی تو کچھ تھا۔ مجھے یہ سب منظور نہیں تھا۔ اس کی لاش پڑی ہوئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا ضروری تھا اور کافی دیر تک میں اس کی اس رہائش گاہ کی تلاشی لیتا رہا۔

میرے کام کی بہت سی چیزیں مجھے یہاں مل گئی تھیں۔ چنانچہ میں نے اس وقت سادھو کا روپ ختم کیا۔ گوپال کا ایک لباس نکال کر پہنا یہاں سے حاصل ہونے والی ہندوستانی کرنسی اپنے لباس میں محفوظ کی اسی کے پاس سے ایک چھوٹی سی اٹیچی اٹھائی اور اس میں اس کے چند جوڑے کپڑے رکھے جو میرے بدن پر بالکل فٹ تھے اور پھر میں وہاں سے باہر نکل آیا گوپال نے سادھو کے روپ میں مجھے پہچان لیا تھا۔ تو یہ تو میرا اصل روپ تھا۔ اسے بدلنے کے لیے کوئی کام کرنا ضروری تھا۔

فی الحال تو یہ ممکن نہیں تھا۔ سب سے پہلے تو مجھے کوئی رہائش گاہ درکار تھی۔ اس کے لیے میں نے ایک معمولی سے ہوٹل کا انتخاب کیا۔ جو یہاں سے تھوڑے فاصلے پر ہی مجھے نظر آگیا تھا۔ اس ہوٹل کا نام دھرم نواس تھا۔ میں دھرم نواس میں داخل ہوگیا لباس وغیرہ سے میرا حلیہ بھی بدل ہی گیا تھا۔ دھرم نواس میں مجھے ایک کمرہ حاصل ہوگیا جو سو روپے روز پر تھا۔ کمرہ خوب صاف ستھرا سا تھا لیکن ہوٹل کی رہائش کے بارے میں مجھے یہ اندازہ تھا کہ میرے لیے غیر مناسب ہوگی۔ یہاں بلاوجہ لوگوں کی نگاہوں میں آنا پڑا گا۔ اور اگر خور کے لیے دیئے رکھتا ہوں تب بھی مشکل ہوگی۔ ہوٹل کے رجسٹر میں میرا نام ہیرالعل لکھوایا تھا اور اس پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا اور ہوٹل میں داخل ہونے کے بعد میں نے کمرہ بند کیا اور اس کے بعد بستر پر لیٹ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ میں نے گوپال کو قتل کردیا تھا۔ قتل کرنا اب میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں کچھ اور لوگوں کو قتل کرنا چاہتا تھا اور صحیح معنوں میں میری زندگی کا اصل مقصد ہی یہ تھا لیکن کسی قسم کی کوئی حماقت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تھوڑی ذہانت بہت ضروری ہوتی ہے۔ ان لوگوں نے مجھے بے مقصد انتہائی مشکلوں میں پھنسا دیا تھا۔

میں ان سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ کنور وریندر سنگھ اور اس کا باپ دھرمندر سنگھ۔ میرا نشانہ تھے۔ بڑودہ کے بارے میں مجھے کوئی خاص معلومات حاصل نہیں تھیں لیکن میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ معلومات حاصل کرنے کے بعد ان لوگوں کا خانہ خراب کرکے رہوں گا اس کے بغیر تو زندگی ہی بے مقصد ہے بہرطور میں یہ تمام باتیں سوچتا رہا اور پھر میں نے بہت ہی مناسب فیصلے کیے لازمی بات ہے کہ ہندوستان بھر میں میری تلاش ہورہی تھی۔

لازمی بات ہے کہ اور کوئی شخص میرے بارے میں کچھ جانتا ہو یا نہ جانا ہو لیکن کنور وریندر سنگھ کے ساتھ ساتھ اس کے باپ دھرمندر سنگھ کو بھی میرے بارے میں معلوم ہوگیا ہوگا اور چونکہ یہ فوجی آدمی تھا۔ اس لیے اس کے پاس وسائل بھی بے پناہ ہوں گے۔ وہ یہ سوچتے ہوں گے کہ اگر مجھے فرار نہ ہونے کا موقع مل گیا ہے۔ اور میں ہندوستان میں دندناتا پھر رہا ہوں۔ تو ہوسکتا ہے کہ بڑودہ میں ان کے بارے میں معلومات حاصل کرکے میں ادھر کا رخ کروں۔

یہ بات بڑی قرین قیاس تھی کہ وہ میرے منتظر ہوں اور انہوں نے میرے لیے معقول بندوبست کرلیا ہو۔ نہیں۔ بہادر علی بہادری کے ساتھ ساتھ عقل کا استعمال بھی ضروری ہے۔ اگر ہم اپنے مزاج کے مطابق ان پر دوڑ پڑیں تو وہ آسانی سے ہمارا شکار کرسکتے ہیں۔ بس یہ ایک جملہ میرے ذہن میں گونج رہا تھا اور میں نے فیصلہ کیا تھا کہ ابھی مجھے طویل خاموشی اختیار کرنا ہوگی۔

پہلے اپنے آپ کو ہندوستان کے ماحول کی چادر میں چھپالوں اپنے لیے کچھ ایسے ہمدرد تلاش

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرلوں جو میرے مددگار ثابت ہوں۔ اس سے پہلے اپنے دشمنوں سے رونمائی کرنا مناسب نہیں ہوگا۔

یہ خیال میرے ذہن میں جم گیا اور اس کے بعد میں نے یہ بھی سوچا کہ ہوٹل کی رہائش میرے لیے قطعی غیر موزوں ہے۔ یہاں لینا پڑے گا تو کمرے میں بند ہوکر رہنا پڑے گا۔ کوئی ایسی ترکیب ہو سب سے پہلے میرے لیے ایک مناسب رہائش گاہ کا بندوبست ہو سکے اس کے لیے اخبار مناسب ہوتا ہے اور ایک اخبار میں مجھے میرے مطلب کی چیز مل گئی۔ یہ گیسٹ ہاؤس کا اشتہار تھا۔ جس میں پے ان گیٹ کے بارے میں لکھا گیا تھا۔ ایک ہندو خاتون دیواسری اس کی مالک تھیں اور اشتہار انہی کی جانب سے تھا لیکن صاف لکھا ہوا تھا کہ یہ جگہ صرف ہندو نوجوانوں کے لیے ہے بہرطور میں تیار ہوگیا۔ گوپال کے لباس تقریباً ہندوانہ لباس ہی تھے۔

لیکن وہاں سے جو کرنسی مجھے حاصل ہوئی تھی۔ وہ میرے لیے بڑی معاون تھی۔ میں نے بہت سے فیصلے کرلیے تھے۔ اپنا روپ اور اپنا انداز بدلنے کے لیے مجھے ایک ہندو نوجوان کا روپ ہی دھارنا پڑے گا۔ چاہے اس کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے۔ میں نے اپنے اللہ سے معافی مانگی کہ معبود دو جہاں! جو کچھ کرنا پڑے گا۔ اپنی جان بچانے کے لیے تو ہے ہی لیکن ان دشمنوں کو نقصان پہنچانے کے لیے بھی ہے۔ جنہوں نے مجھے گناہوں کے اس عذاب میں پھنسا دیا ہے۔

دیواسری کے گیسٹ ہاؤس کا جو پتہ مجھے معلوم ہوا تھا۔ میں اس پر چل پڑا اور دوپہر کے وقت دیواسری کے گیسٹ ہاؤس پہنچ گیا۔ مجھے ایک بڑے اچھے کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ یہاں فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف دو صوفہ سیٹ پڑے ہوئے تھے۔ چند آرام کرسیاں ایک طرف بڑا سا ٹیپ ریکارڈر رکھا ہوا تھا اور اس کے قریب میز پر پھولوں کا ایک خوبصورت گلدستہ دیواسری جی ایک عمر رسیدہ بھاری بدن کی خاتون تھیں۔ جب وہ ڈرائینگ روم میں داخل ہوئیں تو میں احتراماً کھڑا ہوگیا۔ شاید میرے احترام کا ان پر اثر ہوا تھا۔ ویسے بھی میرے چہرے مہرے سے بہت متاثر ہوئی تھیں۔ میں اس وقت ململ کی ایک کیپ لگا رکھی تھی۔ بس ماتھے پر کوئی نشان نہیں بنایا تھا۔ دیواسری جی نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا نام ہے بیٹے آپ کا۔''

''ہیرالعل۔''

''بڑا اچھا نام رکھا ہے آپ کے ماتا پتا نے آپ کا ہیرے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ یقیناً آپ میرے گیسٹ ہاؤس میں قیام کے لیے آئے ہوں گے۔''

''جی ماتا جی۔'' میں نے دونوں ہاتھ جوڑ ہندوانہ انداز میں کہا اور دیواسری مسکرا دیں۔ اس کے اندر ایک محبت کرنے والی عورت چھپی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

''یہ دو منزلہ عمارت ہے۔ اس میں بارہ کمرہ ہیں۔ ہمارے پاس خاصے مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں۔ تمہیں نیچے والے منزل پر کمرہ مل سکتا ہے ہر بیڈ روم کے ساتھ اٹیچ باتھ ہے۔ ڈرائینگ' اور ڈائینگ نچلی منزل پر ہیں اور یہ سب کے استعمال میں ہوتے ہیں۔ ہم مہینے کا کرایہ دو ہزار روپے لیتے ہیں۔ ناشتا' لنچ' ڈنر اور شام کی چائے کے اخراجات الگ ہوں گے آپ کو پوری آزادی ہوگی کہ آپ آرام سے اپنی مرضی کے مطابق یہاں رہیں آپ سے بس ایک درخواست ہوگی کہ دوسرے مہمانوں کو کوئی شکایت کا موقع نہ دیں۔ یہاں لڑکیاں بھی ہیں اور آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔ ہاں یہاں پر آپ شراب یا نشے کی کوئی چیز استعمال نہیں کرسکتے۔''

''چلیئے۔ مجھے یہ تمام شرائط منظور ہیں۔''

''اور کوئی بات اگر آپ کرنا چاہتے ہوں

تو۔''

''نہیں۔ آپ فرمایئے۔''

''آپ ایک ماہ کا کرایہ دو ہزار روپے ایڈوانس ادا کرتے رہیں اور باقی اخراجات کے بارے میں آپ کو بتا چکی ہوں۔''

''کیا میں وہ کمرہ دیکھ سکتا ہوں جو مجھے رہائش گاہ کے طور پر ملے گا.....'' میں نے سوال کیا۔

''ہاں۔ ہاں کیوں نہیں۔ ظاہر ہے۔'' مکان کی نچلی منزل پر وہ کمرہ موجود تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ دیواسری جس طرح ایک مہربان اور مکمل خاتون تھیں اسی طرح انہوں نے اپنے گھر کو بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نے پرمسرت لہجے میں کہا۔

''مجھے کمرہ پسند ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ آجاؤ۔ بقیہ شرائط طے ہوجائیں۔'' بحالت مجبوری میں نے اس کے رجسٹر میں اپنا نام ہیرالعل اور اپنے باپ کا نام کندن لعل لکھا۔ دو ہزار روپے نقد ادا کئے اور مزید دو ہزار روپے اسے اپنے کھانے پینے کے لیے ادا کردیئے۔ وہ مطمئن نظر آرہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

''یہاں جن لڑکیوں کا میں نے ذکر کیا ہے۔ وہ میری ملازمہ ضرور ہیں لیکن میں انہیں بیٹیوں کی طرح سمجھتی ہوں۔ آپ سے درخواست کروں گی مسٹر ہیرالعل کہ آپ اپنی ضروریات بے شک انہیں ضرور بتائیں لیکن ان کی عزت آبرو کا خیال رکھیں۔''

''آپ مطمئن رہیئے۔'' میں نے کہا اور اس کے بعد میں اپنے مختصر سے سامان کے ساتھ اس گیسٹ ہاؤس میں منتقل ہوگیا۔ کم از کم مجھے سر چھپانے کے لیے ایک ایسی جگہ مل گئی تھی۔ جہاں میں تھوڑا سا وقت دنیا سے ہٹ کر گزار سکتا تھا۔ البتہ میں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اپنے حلیے میں وہ قدرتی تبدیلیاں پیدا کروں گا جو ممکن ہوسکتی ہیں۔ دیواسری کے گیسٹ ہاؤس میں مجھے کوئی دقت نہیں ہورہی تھی۔ میں ابھی کمرے میں ہی مقیم تھا کھانے پینے کی چیزیں مل جاتی تھیں۔

وہ دو خادمائیں نوجوان تھیں اور اچھی خاصی زندگی سے بھرپور نظر آتی تھیں۔ باقی آس پاس کے مہمانوں سے میں ابھی کوئی ملاقات نہیں کی تھی لیکن میں یہ چاہتا تھا کہ ان سے بھی گھل مل جاؤں۔ اس طرح گھلنا ملنا ضروری تھا اور میرے کام کے لیے بھی نہایت بہتر' غرض یہ کہ یہاں کئی دن پر سکون گزر گئے۔ پھر اس دن شام کا وقت تھا کہ میرے دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ اور میں چونک پڑا۔

دروازہ میں عام طور سے اندر سے بند ہی رکھتا تھا۔ خادمائیں جب بھی آتی تھیں یا صفائی کرنے والا ملازم جب بھی آتا تھا۔ وہ دوسرے انداز میں دروازے پر دستک دیتا تھا۔ اس وقت یہ دستک بالکل مختلف تھی میں نے احتیاط کے ساتھ دروازہ کھولا تو میرے سامنے ایک شخص کھڑا ہوا تھا۔ لمبا چوڑا قد، مجبوری داڑھی پتہ نہیں اس گیسٹ ہاؤس کا مہمان تھا یا اور کوئی باہر کا شخص وہ عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''اندر آنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اسے اندر آنے کے لیے جگہ دے دی۔ اندر آکر اس نے دروازہ اندر سے بند کرایا تھا۔ پھر وہ مجھے عجیب سی نگاہوں سے گھورنے لگا اور اس کے بعد اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کوئی چیز نکالی میں سچ مچ حیران تھا اس وقت اس نے جو چیز نکالی تھی۔ وہ ایک تصویر تھی اور اس نے وہ تصویر میرے سامنے کردی۔ میں یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا کہ وہ میری ہی تصویر تھی۔

مزید واقعات کے لیے
آئندہ ماہ کا شمارہ
ملاحظہ کریں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

☆☆☆☆
ادب سے انتخاب
☆☆☆☆

الفا

محمد الیاس

جن معاشروں کے پاس کوئی حقیقی وجہ افتخار نہ رہے' ان کے افراد اپنی بے مقصد زندگیوں کو معنویت سے سرفراز کرنے کے لیے کارہائے نمایاں سرانجام دینے کی بجائے عصبیتوں کے بلندوبالا اور تاریک قلعے تعمیر کرتے ہیں اور ازخود ان میں محصور ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان قلعوں میں لسانی' نسلی اور مذہبی نفرتوں کے عفریت پروان چڑھنے لگتے ہیں۔

قلعہ بند بستیوں میں روحانی موت مرنے والوں کی کہانی

بعض لوگ اتنے غریب ہوتے ہیں کہ اس ''ناکردہ گناہ'' پر نادم سے ہوئے رہتے ہیں۔ ایلزبتھ کا گھرانا بھی ''جرم غربتی'' پر شرمندہ شرمندہ رہا کرتا۔ گویا' کسی پہلے جنم وہ چھوٹی سی ریاست کے حاکم ہوا کرتے تھے لیکن موجودہ زندگی میں لوگوں کی نجاستیں دھو کر دو وقت کی روٹی کمانے پر مجبور ہو گئے ہوں۔ ایلزبتھ کی ماں قصبے کے کئی گھروں میں یہ کام کرتی تھی۔ قصبہ بھی ایسا جسے سکندر اعظم نے پہلی جھونک میں تباہ تو کر دیا لیکن دم واپسی اسے ازسرنو تعمیر کرنے کے بارے میں نہ سوچا اور یہ دوبارہ آباد ہوا تو بڑا بے ترتیب اور ٹیڑھا میڑھا۔ شاید اسی فاتح کی فوج کا کوئی آفسر یہاں بس گیا تھا' جس کی آخری اولاد ایلزبتھ تھی۔

دنیا میں ہر آنے والا بچہ اپنے والدین کے حضور نئی طرح کے سپنوں کا گلدستہ پیش کرتا ہے۔ شاید اسی لیے بیٹی نے جنم لیا تو خداوند کا نام لے کر اسے ایک بہت بڑے ملک کی ملکہ سے موسوم کر دیا۔ بچی ذرا بڑی ہوئی تو دل کے نہاں خانوں میں کروٹیں لیتے سہانے خواب کی تعبیر پانے کی نیت سے اسے اسکول میں داخلہ دلا دیا تاکہ پڑھ لکھ کر کسی بہت بڑے ملک کی نہ سہی' چھوٹی سی ریاست کی ملکہ ہی بن جائے۔!

اللہ بادشاہ بھی بڑا سخی اور بے پروا ہے۔ جب نوازنے پر آتا ہے تو دریا بہا دیتا ہے۔ ایلزبتھ کو ایسا حُسن عطا کر دیا کہ قصبے میں فتنہ بپا ہو گیا۔ ایک نظر دیکھنے سے یوں گمان گزرتا کہ کوئی یونانی شہزادی قتل ہو جانے کے خوف سے بیابانوں میں بھٹکتی رہی اور روپوشی کے عرصے میں ذرا سنولا گئی ہو! لیکن جان بچانے کے لیے اب مفلسی کا بھیس بدل کر قصبے کے مضافات میں چوہدریوں کی زمینوں پر ایک کچے کوٹھے میں مقیم ہو گئی ہو۔ ہر قصبے کے مضافات میں زمینیں' چوہدریوں' ملکوں اور خانوں کی ملکیت ہوتی ہیں۔ ایسے ہی چوہدریوں کے ایک گھرانے کا بیٹا سمیع اللہ آٹھویں جماعت تک ایلزبتھ کے ساتھ پڑھتا رہا۔

سمیع اللہ ذات کا سماں تھا اور عرف عام میں 'سمی' کہلاتا۔ اس کے ڈیرے پر محفلیں جما کرتیں۔ بانسری کی مدھر تانیں سنائی دیا کرتیں۔ تفسیر یوسفؑ' سیف الملوک اور ہیر وارث شاہ بڑے اہتمام سے گائی جایا کرتی۔ سمی چوہدری کے من کی دنیا میں افق تا افق رومان پرور ہوا اٹکھیلیاں کیا کرتی۔ شاید یہ صوفی شعراء کے کلام کا فیض تھا کہ سمی کے مزاج کو عاشقانہ رنگ میں پوری طرح رنگ دیا لیکن کسی آلائش سے داغدار نہیں ہونے دیا۔

جن معاشروں کے پاس کوئی حقیقی وجہ افتخار نہ رہے' ان کے افراد اپنی بے مقصد زندگیوں کو معنویت سے سرفراز کرنے کے لیے کارہائے نمایاں سرانجام دینے کی بجائے عصبیتوں کے بلندوبالا اور تاریک قلعے تعمیر کرتے ہیں اور ازخود ان میں محصور ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان قلعوں میں لسانی' نسلی اور مذہبی نفرتوں کے عفریت پروان چڑھنے لگتے ہیں۔ ہر قلعہ بند گروہ غضب ناک تفہیم کی طرح مخالف پر عصبیت کے زہر میں بجھے تیروں کی بارش کرتا ہے۔ ایسی بستیوں کے مکین روحانی طور پر مر جاتے ہیں اور ان قبرستانوں کا منظر پیش کرتے ہیں' جن کی مسمار قبروں کے تابوتوں میں سے خون آشام ڈریکولے بیدار ہوتے ہیں اور محبتوں کی رگ رگ سے لہو نچوڑ کر پی لیتے ہیں۔ انجام کار' ان مردہ بستیوں میں انسانی عظمت کے بچے کھچے نشان بھی منہدم ہو جاتے ہیں اور کوئی پورس بھی زندہ نہیں بچتا کہ جسے باہر کی کسی مقدونیہ سے آیا ہوا فاتح صرف ایک جملے پر خوش ہو کر جیتی ہوئی متاع بھیک میں لوٹا دے۔

تعصب کی آگ میں خوش نما جذبوں کے سبزہ زار اور گل وگلزار جھلس جایا کرتے ہیں اور نفرتوں کے موسم میں حسد اور بغض کی بدنما فصل ہی اُگتی ہے۔ سمی کے گھر والوں کے پاس سوائے چوہدراہٹ کے کچھ باقی نہ بچا تھا اور چوہدراہٹ بھی ڈیرے تک سمٹ کر رہ گئی تھی۔ سب کچھ دشمنیوں کی نذر ہو چکا' تو ان کے لیے سر اٹھا کر چلنا محال ہو گیا اور ایک وہ لمحہ بھی آیا کہ کسی ساہوکار نے اعلیٰ حسب نسب کو گروی رکھنے کی ہامی نہ بھری۔ سمی نے کالج کی تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور رزق کی تلاش میں اپنے ہی وطن میں پردیسی ہو گیا۔

ایلزبتھ کے پاس عہد و پیمان کے علاوہ کچھ نشانیاں بھی بچی رہ گئی تھیں' جن میں سے محبوب کے پھونکے ہوئے سگریٹوں کے ٹکڑے' سر کے بال اور تراشے ہوئے ناخن زیادہ اہم تھے' وہ آس لگائے بیٹھی تھی کہ ہمدم' زمین کے کسی ٹکڑے پر قدم جما لے تو اسے اپنے پاس بلا لے گا۔ وہ میٹرک پاس کر چکی تھی لیکن کوئی شہزادہ اس کے والدین کے حضور عرضداشت پیش کرنے حاضر نہ ہوا تو کٹیا میں جلتا آرزوؤں کا چراغ بجھنے لگا۔ تاہم ایلزبتھ کے دل کی مقدونیہ ابھی آباد تھی اور اسے یقین تھا کہ اس سونے شہر کی گلیوں کو سکندر اپنے دم قدم سے آباد کرے گا تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہر سو جشن کا سا سماں ہوگا اور آسمانوں میں بھی چراغاں ہو جائے گا۔

رزق کی تلاش سمی کو ایسے مقام پر لے آئی' جہاں ایک غیر ملکی کمپنی زیرِ زمین تیل کے خزانے کھوجنے کے لیے ڈرلنگ کر رہی تھی۔ سائٹ پر موجود سب سے اہم اور منفرد شخصیت مسٹر فروشا کی تھی' جو رگ انجینئر تھا۔ سبز آنکھوں والا اَن تھک اور انتہائی مضبوط جسم والا تیس بتیس سالہ خوش باش امریکن تھا۔ وہ اکثر مسکراتا ہوا دکھائی دیتا۔ پہلی ہی ملاقات میں بے تکلف ہو جاتا۔ سمی حیرت زدہ تھا کہ مسٹر فروشا صرف چھ گھنٹے میں جتنا معاوضہ لیتا ہے' اتنا تو یہاں کا ڈپٹی کمشنر ضلع بھر کی حکمرانی کر کے مہینے بعد بھی سرکاری خزانے سے وصول نہیں کر سکتا۔ اسلام آباد میں کمپنی نے ہیڈ آفس کے قریب مسٹر فروشا کو محل نما کوٹھی لے کر دے رکھی تھی اور سفر کے لیے ہیلی کاپٹر ملا ہوا تھا۔ سائٹ پر بھی دیگر تعمیرات کے علاوہ اس کے لیے رہائش گاہ تکمیل کے آخری مراحل میں تھی۔ میٹنگ کے سلسلے میں ہیڈ آفس ہیلی کاپٹر سے جاتا' تو جلد ہی واپس لوٹ آتا۔ وہ جینز پہنے' ہاتھوں سے سر کو سہارا دیے کھلے آسمان تلے ریت پر لیٹ جایا کرتا۔

مسٹر فروشا کو اردو اور مقامی زبان کے الفاظ بولنے اور سمجھنے کا بہت شوق تھا۔ سمی کا انٹرویو کرتے ہوئے اس نے اس کے نام کے لاحقہ ''چوہدری'' میں زیادہ دلچسپی لی۔ سمی نے وضاحت کی کہ وہ ایک باعزت لینڈ لارڈ فیملی کا چشم و چراغ ہے اور ''چوہدری'' اس کا خاندانی ٹائیٹل ہے۔ گو زمینیں باقی نہیں رہیں لیکن ٹائیٹل بدستور قائم و دائم ہے۔ مسٹر فروشا نے ایک بھرپور قہقہہ لگاتے ہوئے کہا کہ اس کے والد بھی امریکہ میں بہت بڑے فارم کے مالک ہیں لہٰذا وہ بھی اس حوالے سے چوہدری ہوا۔ ''فروشا چودری۔!'' ''وی بوتھ آر چودریز!!''

ڈرلنگ سائٹ پر زندگی ابھی خیموں میں بسر ہو رہی تھی۔ مسٹر فروشا صبح اٹھ کر نیکر پہنے' بیلچہ کندھے پر رکھے سیٹیاں بجاتا ہوا دُور نکل جاتا۔ وہ عجب شخص تھا۔ سمی سوچتا کہ اس سرزمین پر آباد کروڑوں لوگوں میں سے کسی نے ایسا تکلف کرنے کا کبھی سوچا بھی نہ ہوگا' جس قدر مسٹر فروشا تردّد کیا کرتا۔ وہ خیمہ بستی سے دُور نکل جاتا۔ بیلچے سے زمین میں چھوٹا سا گڑھا کھودتا اور بطور سنڈاس استعمال کرنے کے بعد مٹی سے پاٹ دیا کرتا۔ سمی کو بھی اس نے ہدایت دے رکھی تھیں کہ جرمن شیفرڈ جوڑا تقریباً نصف کلومیٹر کی دوڑ مکمل کر لے تو فوراً ایک ڈیڑھ فٹ گہرے دو الگ الگ گڑھے کھودے۔ سمی جوں ہی بیلچہ چلا کر پیچھے ہٹتا تو جرمن شیفرڈ جوڑا اپنے مالک کی تقلید کرتے ہوئے فراغت پا لیتا۔ بعد میں سمی یہ گڑھے مٹی سے پاٹ دیتا۔

سمی کی برادری میں کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ چوہدریوں کا بیٹا کسی گورے کی نجی خدمات پر مامور ہے' جس میں اس کا اوّلین فرض جرمن شیفرڈ جوڑے کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ اس کی مجبوری یہ بھی کہ دُور دراز شہروں کی خاک چھان کر کہیں کلرکی بھی نصیب نہیں ہوئی تھی' جبکہ یہاں اسے کمپنی کی طرف سے جتنی تنخواہ مل رہی تھی' وہ چار سرکاری کلرکوں کی مجموعی ماہانہ آمدنی سے بھی کچھ زیادہ تھی۔ اسی لیے اس نے سب باتیں تو گھر میں نہیں بتا رکھی تھیں لیکن ماں کو اس قدر آگاہی ضرور تھی کہ بیٹا کوئی ایسا کام نہیں کر رہا' جو چوہدریوں کے شایانِ شان ہے۔ تاہم یہ امر اطمینان بخش تھا کہ بیٹے کے کام کی نوعیت جیسی بھی ہے' وہ برادری اور قصبے والوں کے علم میں نہیں اور اگر چوہدراہٹ کے تقاضوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے لگی روزی کو لات ماردی جائے تو نوبت کشکول پکڑنے تک پہنچ سکتی ہے۔

ادھر ایلزبتھ تصور کیے بیٹھی تھی کہ ان موسموں کی مہک ہر سُو رچ بس گئی ہے' جس میں وعدے ایفا ہوا کرتے ہیں۔ عشق اور مشک چھپا نہیں کرتی۔ ماں نے بیٹے کو نصیحت کی کہ پگڈنڈی کی راہ ترک کرنے سے دامن جھاڑ جھنکاڑ میں الجھ کر تار تار ہو سکتا ہے اور حسرت الارض سے گزند نہ بھی پہنچے تو پاؤں کیچڑ میں

پڑنے کا احتمال رہتا ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو پاؤں دھو کر لباس بدل لینا اور تب بستی کی گلیوں کا رخ کرنا۔ سمی نے موقع غنیمت جان کر دل کا مقدمہ ممتا کی عدالت میں پیش کر دیا لیکن ابتدائی سماعت پر خارج کر دیا گیا۔ اعلیٰ نسب اور مذہب کی دفعات لاگو ہوئیں اور آئندہ محتاط رہنے کے لیے سخت تنبیہ کر دی گئی۔ حالانکہ مسلمان ہونے میں اس گھرانے کو کوئی خاص تردّد نہیں کرنا پڑتا تھا۔ جب یہ پیدا ہوئے تو کان میں اذان دے دی گئی اور مرنے والوں کی نمازِ جنازہ ادا کر دی جاتی۔ اس کے علاوہ کچھ رسومات بصورت عید' شبِ برات منالی جاتی تھیں۔ تاہم جب مفاد پر زد پڑتی تو اسلام کو ڈھال کے طور پر ضرور استعمال میں لایا جاتا۔ بیٹا تعلیم یافتہ تھا۔ اس نے نظرِ ثانی کے لیے اپیل داخل کر دی اور اسلامی اصولوں کے تحت اپنے مقدمے کی پیروی کی۔ جب یہ ثابت کر دیا کہ مسلم گھرانے میں اہلِ کتاب کی آمد پر کوئی قدغن نہیں تو مقدمہ اس دلیل پر خارج ہو گیا کہ اسلام اگر مانع نہیں تو خاندانی وقار اس امر کی اجازت نہیں دے سکتا کہ ''چُو..... چوہدرانی کی بہو بنے۔''

دراصل فاضل عدالت نے نسلی عصبیت پر مبنی جو فیصلہ صادر فرمایا تھا' اس کے پسِ پردہ کچھ اور عزائم تھے۔ جوان بیٹے کی صورت میں بہت سے خواب شرمندۂ تعبیر ہونے کی تدبیر بن رہی تھی۔ عہدِ رفتہ کی عظمت لوٹنے کے امکانات تھے۔ ڈیرے کی حدود سے کچھ آگے تک چوہدراہٹ وسعت پذیر ہو سکتی تھی۔ گویا شاہی قلعے میں مقیدِ قلم رو آزاد ہونے کے آثار نمایاں تھے۔

ایلزبتھ کے دل میں ایک ہی سودا سمایا ہوا تھا کہ کسی نہ کسی صورت محبت کا بھرم رہ جائے۔ اس نے تو سمی سے ایسے دور میں بھی کبھی ترکِ محبت کا نہ سوچا' جب وہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح بے رحم ہواؤں کے تھپیڑوں کی زد پہ تھا۔ جذبے توانا ہوں تو فاصلے سمٹ جاتے ہیں۔ شام گہری ہونے کو تھی کہ ایلزبتھ تقریباً دو سو میل کی مسافت طے کر کے ڈرلنگ سائٹ سے قریبی بستی ''ڈھوک سیال'' کے اسٹاپ پر لاری سے اتری تو اردگرد نگاہ دوڑا کر کچھ سوچتی رہی۔ تب ایک فیصلے پر پہنچ گئی اور مسجد کے پہلو میں مولوی رب نواز سیالوی کے گھر میں داخل ہو گئی۔ اہلِ خانہ گھر آئی' مہمان کی آؤ بھگت سے فارغ ہو چکے تو ایلزبتھ نے بلا جھجک کہا کہ وہ تعلیم یافتہ ہے اور بالغ بھی' اپنی مرضی سے اسلام قبول کرنے کا عزم رکھتی ہے۔

اگلے روز نمازِ جمعہ کے بعد مولوی صاحب نے بستی کی بہت سی خواتین اور بزرگوں کی موجودگی میں ایلزبتھ کو چادر اوڑھائی' کلمے پڑھائے اور سر پر دستِ شفقت رکھتے ہوئے اپنی بیٹی قرار دیا اور اتفاقِ رائے سے کنیز فاطمہ نام رکھا۔ اردگرد کی بستیوں سے خواتین کئی روز تک طرح طرح کے تحائف کے ساتھ کنیز فاطمہ سے ملنے آتی رہیں۔ سائیٹ پر بھی یہ خبر پہلے ہی روز ہر ملکی اور غیر ملکی فرد تک پہنچ چکی تھی۔ سمی کی ہستی اندر سے تہ و بالا ہو گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ماضی کی ایلزبتھ' جو کم سنی سے ہی اس کی چاہت رہی تھی اور نوجوانی میں محبت بن کر دل میں سماتی رہی' اپنے عشق میں اس قدر ثابت قدم رہے گی۔ اپنا سب کچھ تج دے گی اور ماضی پر خطِ تنسیخ کھینچ کر عشق کا نیا عہد نامہ تحریر کرے گی۔

سمی اور کنیز فاطمہ کا نکاح ہوا تو کمپنی کے بیشتر ملازمین نے نو بیاہتا جوڑے کو خوب تحائف دیے۔ مسٹر فروشا نے حسبِ عادت زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک لفافہ سمی کو تھمایا اور کہا: ''فرام چودری فروشا ٹو چودری سامی اللہ' دی ہز بینڈ آف این ایلی گینٹ لیڈی۔!''

دو ماہ بعد سمی کو ماں کا خط ملا' جس کا مضمون کچھ اس طرح کا تھا۔ ''اس خط کو تار سمجھو' بیٹھے ہوئے ہو تو اٹھ کھڑے ہو اور کھڑے ہو تو چل پڑو۔ اُڑ کر گھر پہنچو۔ اگر دیر کرو تو میرا مرا ہوا منہ دیکھو۔'' کنیز فاطمہ نے سمی کو رخصت کرتے ہوئے اتنا کہا کہ جب سے ہوش سنبھالا ہے' یہی سنتے آئے ہیں کہ جٹ چوہدری سے بڑا راٹھ کوئی نہیں ہوتا۔ قول دے کر نبھانا جانتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ اصل اور نقل کیا ہے۔ کون کتنا سچا ہے۔ پیٹھ کون دکھاتا ہے۔

سمی گھر پہنچا تو کہرام مچ گیا۔ ماں اور بہنوں نے باقاعدہ سینہ کوبی کرتے ہوئے بین کیے کہ وہ لٹ گئے۔ پہلے تقدیر نے ٹھوکریں ماریں اور اب بیٹا ذلت کے گڑھے میں دھکیل رہا ہے۔ سارے خواب چکنا چور کر ڈالے۔ چوہدری خانوادے کی ناک کاٹ ڈالی۔ کمی کمینوں سے بھی بدتر گھرانے کی لڑکی کو بہو بنادیا۔ سمی نے دہائی دی کہ اس نے عورت ہوتے ہوئے بھی لاج نبھائی اور میں مرد ہو کر پیچھے ہٹوں' کیا یہی مردانگی ہے؟ اور پھر جس پیشے کی بناء پر اتنی نفرت..... وہی کام اب قدرت ان کے راٹھ بیٹے سے کروا رہی ہے..... فرق صرف اتنا ہے کہ میں انسانوں کی بجائے اپنے امریکی آقا کے کتوں کا فضلہ ٹھکانے لگاتا ہوں اور کنیز فاطمہ کی ماں بھی روزی کمانے کے لیے کچھ ایسا ہی کرتی رہی۔

چوہدرانی تضحیک برداشت نہ کرسکی' گو وہ بیٹے کے کام کی نوعیت کو کچھ نہ کچھ سمجھتی تھی لیکن اس ذات اور دکھ کو سربستہ راز کی طرح سینے میں چھپائے رکھنا چاہتی تھی۔ واشگاف الفاظ میں تلخ حقیقت سنی تو وحشت اچھلنے لگی۔ آناً فاناً مٹی کا تیل اپنے اوپر انڈیل لیا اور دونوں جوان بیٹیوں کو بھی تر کر ڈالا۔ ماچس کی تیلی جلانے لگی تو بیٹے نے آگے بڑھ کر بانہوں میں جکڑ لیا۔

نہ جانے اس مٹی میں کیا تاثیر ہے کہ اس کے بیٹے کسی اور سے ایفائے عہد کریں یا نہ کریں' ماؤں سے بے وفائی نہیں کرتے۔ تریاہٹ پر بھی قربان ہو جاتے ہیں۔ چوہدری سمیع اللہ تو ڈھوک سیال کبھی نہ گیا لیکن مولوی صاحب کو باقاعدہ رجسٹریاں وصول ہوتی گئیں اور کنیز فاطمہ کو قانونی طریقے سے طلاق ہوگئی۔ سمی ٹوٹ کر بکھر چکا تھا۔ بجھے ہوئے چراغ کی مانند اس میں کوئی رمق باقی نہیں رہی تھی۔ مفلوج ذہن اور بدن کے ساتھ گھر میں پڑا رہتا۔ پانچ چھ ماہ کا عرصہ اسی طرح بیت گیا۔ گھر میں کچھ نہیں بچا تھا' جسے بیچ کر گزر بسر کی جاسکتی۔ صدقہ خیرات کے لیے ہاتھ نہیں اٹھتا تھا۔ تاہم فاقہ کشی کا مرحلہ آجاتا' تب در پردہ کہیں سے کوئی مدد پہنچتی۔

بعض روحیں اپنی ذات میں بڑی سچی اور کھری ہوتی ہیں۔ عشق کے اپنے ہزار رنگ ہیں۔ یہ تہ در تہ کھلتا چلا جاتا ہے تو نئے نئے در وا ہونے لگتے ہیں۔ کنیز فاطمہ پر کمی کی جانب کھلنے والا ایک روزن کیا بند ہوا' بہت سی چاہتوں کے چراغ روشن ہوگئے' وہ عشق کی اگلی منزلوں کی جانب گامزن رہی۔ اس کی ہستی کی ہر پرت میں چنگی سما گئی۔ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ذرا نہیں لڑکھڑائی۔ ہر آنے والے لمحے میں اپنے روحانی والدین اور بہن بھائیوں سے محبت سوا ہوتی گئی۔ تصوف کے بڑے گہرے راز منکشف ہوئے تو دل کو قرار آگیا اور نہاں خانے میں ہر سُو ہوائے بسیط چلنے لگی۔ مولوی صاحب نے اس کے اصل والدین سے رابطہ رکھا اور بیٹی سے اس انداز میں ملاقات کروائی کہ سارے گلے شکوے آنسوؤں کے پہلے ہی ریلے میں بہہ گئے اور دل آئینے کی طرف شفاف ہوگئے۔

مسٹر فروشا کو جس طرح سے ذہن نشین کرایا گیا' وہ ان ہدایات کی روشنی میں دو مقامی ساتھیوں کے ہمراہ عین روایت کے مطابق مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور فطری خوش طبعی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اُسے فرزندی میں قبول کیا جائے۔

اسے یہ علم ہو چکا تھا کہ ماضی کی ایلزبتھ عشق کے جس سفر پر گامزن ہے' کسی اگلی منزل پر پڑاؤ تو کرسکتی ہے' واپس لوٹ آنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی' لیکن کیا خبر؟ امریکہ میں بھی کہیں کوئی تخت ہزارہ ہو' جہاں کا رانجھا محض بانسری پر سُر الاپنے کی بجائے رگ انجینئر کا روپ اپنا کر ڈھوک سیال آن پہنچا ہو اور گروبال ناتھ کا چیلا بننے پر مولوی رب نواز کے روبرو اسلام قبول کرنے کو ترجیح دی ہو۔!

☆☆☆☆
ادب سے انتخاب
☆☆☆☆

قربانی کا بکرا

سیر نصرت آرکیٹیکٹ

ہمارے ہاں ایک روایت سی بن گئی ہے کہ عید قرباں کے موقع پر رشتہ داروں اور احباب کی نظروں میں اپنی حیثیت' اپنے مرتبے کی تشہیر کی جائے۔ ایک ایسے ہی صاحب کا قصہ' انھوں نے بھی عید پر قربانی کے لیے ایک بکرا منگوایا تھا۔ اس کے لیے انھوں نے اپنے سالے صاحب کی خدمات حاصل کی تھیں۔

ہنسنے ہنسانے کے لیے ایک شگوفہ' عید قرباں کی سوغات

اس سال عید آئی تو بیگم ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئیں کہ جیسے بھی ہو' اس عید پر قربانی ضرور دی جائے گی اور یہ کہ پچھلے کئی سالوں کی طرح اس مرتبہ کوئی حیلہ بہانہ ہرگز نہیں چلے گا۔ چاہتے تو ہم بھی یہی تھے کہ عید قرباں پر ایک عدد موٹے تازے بکرے کی قربانی دی جائے تاکہ اس عمل صالح سے ایک طرف پاس پڑوس میں ہمارے متمول ہونے کی دھاک بیٹھ سکے۔ دوسرے قربانی کے گوشت سے کچھ کام و دہن کے مزے بھی لوٹے جاسکیں' لیکن اس کو کیا کیجیے کہ بازار جا کر کسی مناسب بکرے کا بھاؤ تاؤ کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے' تیسرے یہ کہ بکرے کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گلے پر چھری پھیرنے کا لرزہ خیز منظر ہم سے دیکھا نہیں جاتا۔ چنانچہ قربانی کا معاملہ برسوں سے یونہی ٹلتا چلا آ رہا تھا لیکن اب کی بار جب بیگم کا اصرار حد سے زیادہ بڑھنے لگا تو ہم نے بھی سنجیدگی سے قربانی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ سوئے اتفاق کہ عید سے آٹھ دس دن قبل ہمارے اکلوتے سالے قدیر الزماں اپنے شہر سے ہمارے ہاں تشریف لائے اور آتے ہی انہوں نے حسبِ روایتِ قدیم اس بات کا باقاعدہ اعلان کر دیا کہ وہ ہمیشہ کی طرح ہمیں دو چار ماہ شرفِ میزبانی بخشیں گے۔

قدیر الزماں کی شخصیت ہمارے بیشتر دوست، احباب اور محلے والوں کے لیے نئی نہیں ہے بلکہ سال کے نو دس ماہ ہمارے گھر قیام پذیر ہونے کی وجہ سے تمام اہلِ محلہ (جن میں حیوان ناطق کے علاوہ کتے، بلیاں، کیڑے مکوڑے اور تمام حشرات الارض بھی شامل ہیں) ان کو نہ صرف اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں بلکہ بہتوں سے ان کا یارانہ بھی ہے۔ چنانچہ ہم نے ایک دن اپنے اکلوتے سالے صاحب سے پوچھا کہ ''بھئی آج کل آپ کی نظر میں کوئی بکرا وکرا ہے؟'' تو بولے: ''کیوں نہیں بھائی جان، ایک نہیں سینکڑوں بکرے میرے ہاتھ پر ہیں، اور پھر کسی کو بھی منٹوں میں بکرا بنانا تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔''

ہم نے کہا: ''میاں ہم اس بکرے کی بات نہیں کر رہے ہیں، بلکہ ہمیں تو وہ بکرا درکار ہے جس کی قربانی دی جا سکے۔ کیونکہ یہ نہ صرف تمہاری آپا کا اصرار ہے بلکہ برسوں سے ہمارے پڑوسی بھی بصد شوق و حسرت اس ''واقعہ'' کے منتظر ہیں کہ ہم اگر قربانی دیں تو انہیں بھی ہمارے گوشت سے حصہ مل سکے۔''

بولے: ''فکر نہ کریں بکرے کا انتظام ہو جائے گا۔ مگر میری ایک شرط آپ کو ماننی پڑے گی وہ یہ کہ معین الدین صاحب کے گھر ایک بھی بوٹی نہ جانے پائے۔''

ہم نے کہا: ''میاں! معین الدین صاحب تو ہمارے بہت اچھے پڑوسی ہیں اور وقتاً فوقتاً ہم سے اُدھار لے کر ہمارے احسان مند بھی رہتے ہیں۔'' سالے صاحب نے فرمایا: ''اجی کیا خاک! اچھے پڑوسی ہیں، محلے میں آئے ہوئے انہیں پورے پانچ برس ہو رہے ہیں۔ آج تک ان کے یہاں سے نہ کوئی دعوت آئی اور نہ ہی کسی عید پر انہوں نے گرام دو گرام گوشت بھیجا۔''

دروغ بر گردنِ راوی سنا جاتا ہے کہ کسی وقت ہمارے سالے صاحب نے معین الدین صاحب کی لڑکی سے شادی کے لیے پیام روانہ کیا تھا جس کے جواب میں معین الدین صاحب نے انہیں یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ ان کی لڑکی کوئی بکری نہیں ہے جس کا بیاہ وہ قدیر الزماں جیسی شہرۂ آفاق شخصیت سے کریں گے، بس اس دن سے ہمارے سالے کو معین صاحب سے خدا واسطے کا بیر سا ہو گیا ہے۔

ہم کو چونکہ عید پر ایک عدد بکرے کی ضرورت تھی اور ہماری یہ ضرورت قدیر الزماں بخوبی پوری کر سکتے تھے، چنانچہ ہم نے ہامی بھر لی کہ معین صاحب کے گھر بوٹی تو کیا چھیچھڑا بھی نہ جائے گا۔ بس پھر کیا تھا قدیر الزماں کہیں سے مناسب داموں پر ایک تنومند اور متناسب الاعضاء بکرا خرید لائے اور گھر میں پورے زور و شور سے قربانی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

بقرعید میں ابھی چار دن باقی تھے اور ان چار دنوں تک بکرے کی پرورش اور نگہداشت کرنا اپنی جگہ ایک مسئلہ تھا۔ پہلے دن بیگم مصر ہو گئیں کہ وہ بکرے کو نہلا دھلا کر کسی شریف آدمی کی طرح صاف ستھرا بنائیں گی۔ ہم نے انہیں لاکھ سمجھایا کہ بکرے اپنے پورے عرصۂ حیات میں کبھی بھول کر بھی نہیں نہاتے اور وہ محض بکرے ہی رہا

کرتے ہیں اور اگر انہیں نہلانے کی کوشش بھی کی جائے تو وہ اپنی تمام تر شرافت بالائے طاق رکھ کر سینگ مارنے پر تل جاتے ہیں، لیکن بیگم جس کام کو بھی پورا کرنے کا بیڑا اُٹھاتی ہیں، اسے پایۂ تکمیل کو پہنچا کر ہی دم لیتی ہیں چنانچہ وہ اپنے بھائی قدیر میاں کی مدد سے بکرے کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئیں اور پانی کی بالٹی لے کر اس کے سر پر پہنچ گئیں لیکن اچانک ہی منہ پر ساری کا پلو اٹھا کر انہوں نے منہ پھیر لیا۔

ہم نے پوچھا: ''کیا ہوا؟'' بولیں: ''عجیب سی بدبو آ رہی ہے۔!''

ہم نے حیران ہو کر سالے صاحب کی طرف دیکھا۔ تو بولیں: ''اُدھر سے نہیں اِدھر سے!''

اب بکرا اس پوزیشن میں کھڑا تھا کہ اس کے دونوں سینگ ہمارے سالے صاحب کے بائیں ہاتھ کی گرفت میں تھے اور دائیں ہاتھ سے انہوں نے اس کی گردن کے گرد کچھ اس طرح کا ہالہ بنا کر اسے دبوچ رکھا تھا، جیسے عظیم مصور چغتائی کی کسی تصویر میں عمر خیام، صراحی سے شراب انڈیلتی ہوئی حسینہ کو تھامے اس پوزیشن میں نظر آتا ہے کہ مذکورہ حسینہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کی سی کیفیت میں مبتلا نظر آتی ہے! اب جیسے ہی بیگم نے بکرے کے جسم پر پانی ڈالا، بکرا ایک زوردار قسم کی ''میں'' کرتا ہوا بجلی کی طرح تڑپا اور سالے صاحب کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ اس نے موصوف کے مقابلے میں ایک خطرناک قسم کی پوزیشن لے لی۔

بیگم پانی کی بالٹی پھینک کر ایک طرف ہو گئیں۔ ہم نے اس سچوئیشن سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ریفری کی جگہ سنبھال لی اور گنتی شروع کر دی ''ایک..... دو..... تین'' بکرا آگے بڑھا اور انتہائی جارحانہ انداز میں قدیر الزماں پر حملہ آور ہوا، رضیہ کونے سے چلائی۔ ''بکرا جیت گیا..... بکرا جیت گیا۔'' ننھے عرفان بولے: ''نہیں..... ماموں جان جیتے۔'' پتا نہیں ہمارے یہ دونوں بچے کب سے کونے میں کھڑے اپنے ماموں جان اور قربانی کے بکرے کا یہ مقابلہ دیکھ رہے تھے۔ اب پوزیشن خاصی مضحکہ خیز ہو گئی تھی۔ قدیر الزماں ایک ہاتھ سے بکرے کی رسی تھامے اور دوسرے ہاتھ سے اس کی سینگ پکڑے زمین پر چاروں شانے چت پڑے تھے اور بکرا خالص بکروں کے انداز میں 'میں..... میں' کیے جا رہا تھا اور ساتھ ہی اپنی ڈاڑھی ہلا ہلا کر گویا اس بات کا اعلان بھی کر رہا تھا کہ جیت اسی کی ہوئی ہے۔ قدیر الزماں اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے بڑی مشکل سے اُٹھے اور بکرے کو ایک نہایت ہی فصیح اور شستہ سی پارلیمانی گالی دی۔ ننھے ارمان بولے: ''بکرے نے ایک عرصہ بعد حمام کا رخ کیا ہے، بہتر موقع ہے، نہلا دھلا کر اسے ایک صاف ستھرا انسان بنا دیں۔''

دراصل ہمارے سالے صاحب نے شکل و صورت ہی کچھ ایسی پائی ہے کہ جسے دیکھ کر ذہن میں یکایک ہی کسی بوجھ بجھکو یا کسی ''شیخ چلی'' کی شبیہ ابھر آتی ہے جو اپنی مٹھی بھر داڑھی کی بناء پر دور ہی سے پہچانی جا سکتی ہے، شام کو کچھ یہی صورتِ حال پیش آئی جب وہ آئینے کے سامنے کھڑے اپنی چھدری چھدری داڑھی کی تراش خراش میں مصروف تھے تو رضیہ نے اُنہیں بکرے کی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے خوشی سے چلانا شروع کر دیا۔ ''ماموں جان بکرا..... ماموں جان بکرا۔''

جس پر قدیر الزماں جھنجھلا گئے اور آئینہ پر سے نظریں ہٹائے بغیر بولے: ''ہاں ہاں دیکھ تو رہا ہوں، اس میں چلانے کی کیا بات ہے۔!''

اب نہا دھو کر بکرے صاحب (میرا مطلب ہے سالے صاحب) حمام سے برآمد ہوئے تو تھوڑے بہت آدمی دکھائی دینے لگے ان کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہانے کے دوران بکرا برابر ''میں' میں'' کیے جارہا تھا اور جب نکھرے نکھرے دُھلے دُھلے سالے صاحب پر اس کی نظر پڑی تو یکدم چپ سا ہوگیا اور دائیں بائیں اپنے سر کو جھٹک کر زمین پر بیٹھ گیا۔

دن بھر بکرے نے چلا چلا کر سارے گھر کو سر پر اُٹھا رکھا تھا۔ جب رات آئی تو اس کا چلانا کچھ کم ہوا لیکن پاس کے کمرے سے سالے صاحب کے خراٹے اپنی پوری گھن گرج کے ساتھ ہائی پچ میوزک کی طرح شروع ہوگئے' جس کی وجہ سے نہ صرف ہماری نیند خراب ہوئی بلکہ پاس پڑوس کے افراد بھی رات گئے دروازہ کھٹکھٹا کر پوچھتے رہے کہ اس سال عید پر ہم کتنے بکروں کی قربانی دے رہے ہیں۔

دوسری صبح جب بچے اسکول جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے تو بیگم سارے گھریلو کام کاج نبٹا کر بکرے کی طرف متوجہ ہوئیں اور بڑے دُلار سے اس کا منہ دھلانے لگیں۔ قدیر الزماں بستر سے برآمد ہوکر برآمدے میں کھڑے طویل جمائیاں لے رہے تھے انہوں نے جب یہ منظر دیکھا تو بے اختیار ہنس پڑے اور بولے۔

''آپا آپ بھی کمال کرتی ہیں' بکرے کا منہ دھلا رہی ہیں۔'' بیگم قدرے مسکرا کر بولیں: ''بھول گئے؟ جب تم چھوٹے سے تھے تو میں اسی طرح تمہارا بھی منہ دھلایا کرتی تھی۔''

فیضان جو جوتا پہننے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے' تعجب سے بولے۔ ''بالکل اسی طرح؟''

ہم نے کہا۔ ''بیگم وہ تو بچپن کی بات ہے اگر آپ اب بھی ان کا منہ اسی طرح دھلائیں تو کچھ بات بھی بنے گی۔''

بولیں: ''کیوں نہیں..... کیوں نہیں' میرا ایک ہی تو بھائی ہے اور میں نے اس کو ماں کی طرح ہی تو پالا ہے' اب میں نہیں تو اور کون اس کا منہ دھلائے گی۔'' بکرے نے کہا۔ ''میں..... میں'' سالے صاحب موقع پاکر کمرے میں گھس گئے اور دیر تک ان کی شکل دکھائی نہ دی۔

شام تک اُدھر ہم آفس میں رہے اور اِدھر بیگم گھر میں بکرے کی ناز برداریاں کرتی رہیں۔ دن ڈھلے جب ہم گھر لوٹے تو دیکھا بیگم سالے صاحب کے کمرے سے بڑبڑاتی ہوئی نکل رہی ہیں۔

''سارا کمرہ جیسے اصطبل بنا رکھا ہے' صفائی اور سلیقہ تو چھو تک نہیں گیا' بالکل بکروں کی طرح رہتا ہے۔'' ہم نے یہ سن کر کہا: ''بکرے کو ان کے ساتھ ایک ہی کمرے میں کیوں نہیں رکھ دیتیں؟ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔'' جواب ملا: ''ایسی صورت میں تو بکرا کمرہ چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوگا۔''

رات آئی تو بکرے کی ''میں..... میں'' اور قدیر الزماں کی ''غوں' غٹر' غٹراپ .....'' پھر شروع ہوگئی' سالے صاحب کے خراٹے جیسے جیسے تیز ہوتے گئے' ویسے ویسے بکرا بھی اپنی ''میں..... میں'' کی صدائیں بلند کرنے لگا اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی بڑے پنڈال میں کلاسیکی موسیقی کے دو اساتذہ کے بیچ' پکے راگوں کا مقابلہ ہورہا ہے۔ یہ مقابلہ سالے صاحب نے جیت لیا۔ کیونکہ بکرے نے بہت جلد اپنی ہار مان لی اور رات کے پچھلے پہر اپنے انجام سے بے خبر ہوکر چپ سادھ لی۔

تیسرے دن تک سارے محلے میں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ اس عید پر ہمارے یہاں قربانی دی جارہی ہے۔ چنانچہ کئی حضرات بشمول دوست احباب وقتاً فوقتاً گھر آکر ہم سے قربانی کے بارے میں استفسار کرتے رہے' شاید ان کا مقصد یہ اطمینان کرنا تھا کہ قربانی واقعی دی جارہی ہے۔ ان ملاقاتوں کا دوسرا اہم مقصد اپنی

موجودگی کا احساس دلانا تھا۔ تاکہ گوشت کی تقسیم کے موقع پر انہیں یاد رکھا جائے۔ کچھ حضرات نے تو بکرے کا سارا حسب نسب بھی ہم سے پوچھنا شروع کردیا۔ انور نے پوچھا۔ ''اس کی عمر کیا ہے۔؟''

ہم نے جواب دیا ''سالے صاحب کو معلوم ہے۔''

اسمٰعیل صاحب فورمین نے جرح کی کہ بکرا واقعی بکرا ہے یا مینڈھے کی نسل سے اس کا تعلق ہے۔ اس سلسلے میں ہمارا جواب وہی تھا کہ ''سالے صاحب بہتر جانتے ہیں۔''

پھر اسمٰعیل صاحب نے اپنے تئیں بکرے کے حسب ونسب کے متعلق جاسوسی شروع کردی اور یہ ان کی عادت میں شامل ہے کہ وہ کسی بھی چیز کے بارے میں پوری تفصیلات حاصل کیے بغیر نچلے نہیں بیٹھ سکتے۔ چنانچہ انہوں نے بکرے کو چاروں طرف ٹھونک بجا کر دیکھا اور اس کے پیٹ پر ایک بڑا نشان دیکھ کر فاتحانہ انداز میں نعرہ لگایا۔ ''میں اسے جانتا ہوں۔''

ہم کو شک گزرا کہ کہیں ہمارے سالے صاحب بکرے کو کسی اور گھر سے اُٹھا نہ لائے ہوں' گھبرا کر پوچھا۔ ''کس طرح جانتے ہو؟''

فرمایا۔ ''پیٹ پر نشان کا یہی مطلب ہے کہ اب سے چند دن قبل اس کا آپریشن ہوا ہوگا اور میں نے اسے شاید بڑے دواخانے میں دیکھا ہے۔''

ہم اسمٰعیل صاحب کی اس بیش بہا معلومات پر ابھی عش عش بھی نہ کرنے پائے تھے کہ قدیر الزماں باہر سے ایک بڑی ترازو اُٹھائے گھر میں داخل ہوئے اور بکرے کو پکڑ دھکڑ کر اس کا وزن کرنا شروع کردیا۔ وہ جب بھی بکرے کو ایک پلڑے میں بٹھا کر دوسرے پلڑے میں باٹ رکھنے کی کوشش کرتے' بکرا کود کر بھاگ کھڑا ہوتا اور ترازو جھولنے لگتی' کافی جدوجہد کے بعد وہ بکرے کو پلڑے میں بٹھانے میں کامیاب ہو ہی گئے اور جب باٹ رکھنے کی باری آئی تو باٹ رکھتے رکھتے وہ خود کچھ اس طرح بے قابو ہوئے کہ بنفس نفیس پلڑے میں جا پڑے۔ اب بکرے کا پلڑا ایک نیچے کی طرف چلا گیا۔ قدیر الزماں نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ ''وہ مارا! بکرا کافی وزن دار ہے اور گوشت بھی بہت ہاتھ لگے گا۔'' ہم نے کہا: ''لیکن آپ بکرے کے مقابلے میں بہت ہلکے ثابت ہوئے۔''

عید کے دن علی الصبح قدیر الزماں قصائی کے تعاقب میں دوڑائے گئے بلکہ وہ خود ہی دوڑے گئے۔ کیونکہ اس دن سب سے پہلے قصائی سے شرف حاصل کرنا کسی نعمت سے کم نہیں ہوتا یا پھر ہوسکتا ہے کہ قدیر الزماں کو اس بات کی بے حد جلدی رہی ہوگی کہ بکرے کی گردن پر جس قدر جلد ہوسکے چھری پھر جائے اور انہیں اس عذاب سے نجات مل جائے جو بکرے کی صورت میں ان پر گزشتہ تین چار دن سے نازل تھا۔ بکرے کے ہونے سے ان کی اپنی پوزیشن بھی بار بار کے مواز نے سے خاصی نازک اور مشکوک صورت اختیار کرگئی تھی۔

ہم عید الاضحیٰ کی نماز پڑھ کر عیدگاہ سے گھر لوٹے ہی تھے کہ قدیر الزماں ایک خوفناک قسم کے قصائی کے ساتھ آدھمکے۔ ہم قصائی صاحب کے ساتھ بھاؤ تاؤ کرنے لگے اور سالے صاحب بکرے کو غالباً دلاسا دینے کے لیے اس کے پاس پہنچ گئے۔

قصائی بولا: ''بکرے کہاں ہیں؟'' ہم نے اشارے سے بتایا: ''وہ رہے۔''

''لیکن وہاں تو صرف ایک ہی بکرا دکھائی دے رہا ہے۔''

ہم نے کہا۔ ''ہاں صرف اسے ہی قربان کرنا ہے جسے تم دیکھ رہے ہو' دوسرا تو ابھی نابالغ ہے!''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قصائی منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا۔

''بوہنی کا وقت اور صرف ایک ہی بکرا' کیسے کنجوسوں سے پالا پڑا ہے!''

قربانی سے قبل ہماری بیگم نے قدیر الزماں کے مشورے سے پروگرام یہ بنایا تھا کہ قربانی کے گوشت کے تین حصے کیے جائیں گے اور ان تین حصوں میں سے ایک حصہ غرباء میں تقسیم کردیا جائے گا۔ دوسرا حصہ رشتہ داروں (یعنی صرف سالے صاحب) کو دیا جائے گا اور باقی گوشت سے زوردار قسم کی بریانی بنائی جائے گی۔ قربانی کے گوشت کی اس ''منصفانہ'' بندر بانٹ یا بیگم بانٹ کی بدولت دو تہائی گوشت گھر ہی میں استعمال ہورہا تھا لیکن جب گوشت کی تقسیم کا وقت آیا تو پاس پڑوس والوں اور دوست احباب کی فہرست اتنی طویل ہوگئی کہ ہر ایک کو چھٹانک چھٹانک بھر گوشت تقسیم کرنے کے بعد اپنے استعمال کے لیے صرف کلو آدھا کلو گوشت ہی بچتا دکھائی دیا۔ دراصل پچھلے تین چار دنوں میں ہمارے یہاں قربانی کی اطلاع کچھ اس قدر عام ہوگئی تھی کہ اب سب کے ہاں گوشت بھیجنے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا چنانچہ طے یہ پایا کہ قربانی کا سارا گوشت دوست احباب اور پڑوسیوں میں تقسیم کردیا جائے اور بریانی بنانے کے لیے اس وقت تک انتظار کیا جائے جب تک کہ ہمارے سارے دوست احباب اور پڑوسیوں کے یہاں قربانی نہیں ہوجاتی' کیونکہ اس طرح بہت سارے لوگوں کے پاس سے گوشت کے حصے ملنے کی ہمیں قوی اُمید تھی۔

چنانچہ قربانی کا سارا گوشت تقسیم کردیا گیا اور اس کے بعد حصوں کا انتظار شروع ہوا' احتیاطاً سالے صاحب کو باہر کے دروازے پر اس خیال سے کھڑا کردیا گیا کہ کسی بھی دوست کو ہمارا گھر ڈھونڈنے میں مشکل پیش نہ آئے۔ کچھ دیر بعد محمد بھائی نے باہر سے آواز لگائی اور ہم لپک کر باہر کی طرف بھاگے کیونکہ محمد بھائی ہمارے جگری دوستوں میں ایک ہیں اور ان کے پاس سے بکرے کی ایک ثابت ران ملنے کی پوری اُمید تھی۔ محمد بھائی نے پہلے تو ہمیں خوب بھینچ بھینچ کر عید کی مبارکباد دی پھر بولے: ''اماں یار! تمہارے ہاں ابھی تک قربانی نہیں ہوئی؟'' ہم نے جواب دیا'' کب کی ہوچکی۔ اور آپ کے حصہ کا گوشت بھی روانہ کیا جاچکا ہے۔'' کچھ تذبذب کے انداز میں بولے۔ ''لو تمہارے سالے صاحب باہر کیوں کھڑے ہیں؟''

ہم نے سنی ان سنی کرتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کے ہاں قربانی ہوگئی؟''

بولے۔ ''کل اطمینان سے کرنے کا ارادہ ہے۔'' اس جواب سے ہمارے ہاتھوں سے ایک ثابت ران نکل گئی۔

شام تک گوشت کا انتظار کیا گیا' اس دوران دس بارہ گھروں سے حصے آئے' اس کے بعد کسی قدر اطمینان ہوا کہ شام کو بریانی ضرور ملے گی لیکن بیگم نے سارے حصوں کا تجزیہ کرنے کے بعد اعلان کیا کہ صرف کلو ڈیڑھ کلو گوشت ہی اب تک ہاتھ لگا ہے' جس کا آدھا حصہ ہڈیوں پر اور ایک چوتھائی حصہ چھیچھڑوں پر مشتمل ہے اور وہ محض ہڈیوں کا شوربہ تیار کرکے ہمارے ضیافت کرسکتی ہیں۔

عید کے دن لوگ باگ پلاؤ' زردہ اور مرغ و ماہی کے مزے لوٹتے ہیں لیکن ہمارے لیے شوربہ پینے اور بریانی کی حسرت دل میں لیے عید منانے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ معمولات میں تنوع کی خاطر' ہم نے شوربے کا پیالہ ہونٹوں سے لگایا اور خدا کا شکر بجالائے' اس طرح ہماری عید کا اختتام ہوا۔

☆☆☆☆
ادب سے انتخاب
☆☆☆☆

چمکیلی تصویریں

عذرا نقوی

چھٹیوں میں جب عفت گھر آتی تو ابا کے کمرے کو ڈرائنگ روم کی شکل دینے کی ہر ممکن کوشش کرتی۔ چار عدد پرانی آرام کرسیاں تھیں' ان پر رنگین کشن سجاتی' ابا کی بوسیدہ کتابوں کی الماری پر پردہ ڈال دیا جاتا تھا' مگر کونے میں رکھی میز پر دھرے ابا کے "قیمتی" پرانے رجسٹر' الم غلم سامان اور ابا کی دوائی کی بے شمار شیشیاں' سارا کام بگاڑ دیتی تھیں۔

روشنی اور سراب کی آویزش کی کہانی

اف! یہ گلیاں اتنی پُرپیچ کیوں ہیں۔ نالیوں میں اتنی سڑاند کیوں ہے۔ گلی میں آتے جاتے لوگوں کے چہرے دھواں دھواں کیوں ہیں۔ میں جس رکشے پر بیٹھی ہوں' اتنا بوسیدہ اور خستہ حال کیوں ہے..... عفت خود ہی الجھی جارہی تھی۔

رکشا گھر کے دروازے پر رُکا' آنگن کے دروازے کا پردہ خاصا بدرنگ ہوچکا تھا۔ عفت اندر داخل ہوئی۔ اماں برآمدے میں چارپائی پر بیٹھی ترکاری کاٹ رہی تھیں' سلیمہ چھوٹے سے باورچی خانے میں بیٹھی بُرادے کے انگیٹھی پر روٹیاں پکا رہی تھی۔ ابا کمرے کی چق ہٹا کر باہر آئے۔ پپو' چنو اور نشو نے آکر گھیر لیا: ''باجی آ گئیں..... عفت باجی آ گئیں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عفت کا جی اُمڈ آیا..... ابا کتنے کمزور ہو گئے ہیں..... عجیب بے رونقی سی چھائی ہوئی تھی گھر پر..... نہ جانے یہ بجلی کی وولٹیج کم آنے کی وجہ سے تھی یا خود عفت کے دل میں زیرو واٹ کا بلب جل رہا تھا۔!

شام کے چھ بجے تھے..... اس نے آنکھیں بند کر کے سوچا..... اس وقت چچی جان کے گھر دہلی میں کیا ہو رہا ہو گا؟..... بشیر نے لان پر بید کی کرسیاں لا کر رکھی ہوں گی۔ سامنے میز پر چائے کی ٹرے سجی ہو گی۔ گرین لیبل چائے کی خوشبو اس کے نتھنوں میں بھر گئی.....

''باجی یہ لیجیے چائے۔'' چھوٹی بہن نشو چائے کی پیالی لیے کھڑی تھی' اونٹی ہوئی چائے کے اوپر پتلی بالائی کی جھلی سی جم گئی تھی..... عفت کا جی متلا گیا' بہر حال چائے تو حلق سے اتارنی ہی تھی۔

سلیمہ' نشو' پپو اور چنو سب کے پاس آ کر جمع ہو گئے تھے۔ عفت نے چچی جان کے بھیجے ہوئے چھوٹے موٹے تحفے نکال کر دیے۔ پپو اور چنو کے لیے بستے اور سلیمہ اور نشو کے لیے شلوار سوٹ کا کپڑا اور پھر کئی پرانی مگر اچھی حالت کی ساڑیاں اور سوئٹر جن کا فیشن اب ختم ہو گیا تھا' وہ بھی چچی جان نے بھجوائی تھیں۔

رات کو عفت' سلیمہ اور نشو ایک کمرے میں سوئیں' دوسرے کمرے میں بڑے بھیا' چنو اور پپو۔ ابا ہمیشہ کی طرح اپنے کمرے میں اور رہیں اماں..... تو وہ تو جاڑا' گرمی' برسات' سدا برآمدے میں ہی سوتی تھیں۔ عفت کو اپنا دتی والا چھوٹا سا کمرہ بے حد یاد آ رہا تھا۔ صاف ستھرا نواڑ کا پلنگ' چھوٹی سی ڈریسنگ ٹیبل' پڑھنے کی میز' پردے' باتھ روم البتہ اٹیچ نہیں تھا اس کے کمرے میں' جیسا چچی جان کے کمرے میں تھا۔

اُف..... کیوں آخر؟ آج یہ سب اتنا بیزار کن لگ رہا ہے..... برآمدے میں بچھی کھری چارپائیاں' تین کمروں کا چھوٹا سا گھر..... آخر سولہ سال کی عمر تک تو میں یہیں رہی تھی' پھر چچی جان نے اپنے پاس دتی بلوا لیا تھا۔

چچی جان' ابا کے ماموں زاد بھائی کی بیوی تھیں۔ شوکت چچا اور صدیقہ چچی کا ایک ہی بیٹا تھا اور وہ بیوی بچوں سمیت امریکہ جا بسا۔ شوکت چچا دتی میں بہت بڑے سرکاری عہدے پر تھے' سرکاری بنگلہ ملا ہوا تھا۔ صدیقہ چچی نے اپنے اکیلے پن کی وجہ سے عفت کو اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ دلی کالج میں بی۔اے میں داخلہ کرا دیا تھا۔ اس گھر میں عفت کے فرائض کی اِک لمبی لسٹ تھی۔ ہر جگہ چچی کے ساتھ جانا' ان کے کپڑوں کی دیکھ بھال کرنا' فون اٹینڈ کرنا' مہمانوں کی خاطر مدارات' ڈرائنگ روم' اسٹڈی روم اور چچی جان کے بیڈ روم کی جھاڑ پونچھ۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ اس کے ذمے ہزاروں کام تھے۔ ہر گرمیوں کی چھٹی میں وہ کم سے کم ایک ماہ کے لیے ابا اور اماں کے پاس جا کر رہتی تھی۔ گرمی کی چھٹیوں کا باقی ایک مہینہ صدیقہ چچی کے ساتھ پہاڑوں پر گزرتا تھا۔ مسوری' شملہ' نینی تال' کہاں کہاں وہ چچی جان کے ساتھ نہیں گھومی' عفت کے بغیر تو صدیقہ چچی کے جیسے ہاتھ پاؤں کٹ جاتے تھے۔ کون ان کی پیکنگ کرائے گا' سامان کھلوائے گا' اگر عفت نہ ہو تو کون یہ سب کام کرے گا۔

چھٹیوں میں جب عفت گھر آتی تو ابا کے کمرے کو ڈرائنگ روم کی شکل دینے کی ہمکن کوشش کرتی۔ چار عدد پرانی آرام کرسیاں تھیں' ان پر رنگین کشن سجاتی' ابا کی بوسیدہ کتابوں کی الماری پر پردہ ڈال دیا جاتا تھا' مگر کونے میں رکھی میز پر دھرے ابا کے ''قیمتی'' پرانے رجسٹر' الم غلم سامان اور ابا کی دوائی کی بے شمار شیشیاں' سارا کام بگاڑ دیتی تھیں۔

اس بار تو عفت کو گھر اور بھی خستہ حال لگ

رہا تھا حالانکہ اب تو بھیا بھی ملازم ہو گئے ہیں..... ان کی تنخواہ بھی آنے لگی ہے لیکن گھر کا نقشہ وہی ہے..... عفت کا جی چاہ رہا تھا کہ خوب روئے..... مگر کیوں؟ وہ تو سب خواب ہے..... مسوری نینی تال' پنڈارا روڈ کا بنگلہ' کلچرڈ ماحول اور لوگ اور پھر وہ چمکتی ہوئی تصویریں جو چچی جان کے بیٹے اور بہو کی امریکہ سے آتی تھیں۔ خوبصورت کانچ نما مکان' اونچے درختوں سے گھرا ہوا' میاں بیوی اور دو بچے تصویر میں ہوتے۔ سب کے چہرے یوں چمکتے ہوئے لگتے تھے جیسے ان تصویروں کا چمکیلا چکنا کاغذ۔!

''مگر عفت تم نے کیوں خود کو ان تصویروں کا حصہ بنا لیا تھا..... زندگی رومینٹک افسانہ نہیں ہے' جو خواتین ڈائجسٹ میں چھپتا ہے..... کیوں بلاوجہ خواب بُننے لگتی ہو..... صرف یہ ہی تھا نا؟..... چچی جان کا بھانجا انور امریکہ سے آیا تھا..... تمہارے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانوں کی تعریف میں کہہ دیا ''خالہ جان..... عفت کی جس سے شادی ہو گی وہ تو بہت خوش قسمت آدمی ہو گا''..... تو عفت بی آپ چڑھ گئیں بلی پر..... اور دوڑ دوڑ کر اپنے سگھڑاپے کا مظاہرہ کرنے لگیں۔'

ایک دن انور نے کہہ دیا۔

''عفت کی جیسی فگر کے لیے امریکہ میں لڑکیاں ڈائٹنگ کر کے مری جاتی ہیں۔''

تو عفت جہاں تم نے سمجھ لیا کہ وہ تم پر عاشق ہی ہو گیا ہے..... نہ جانے یہ جملہ کتنے وقت انور کے دماغ میں اپنی کون سی امریکن گرل فرینڈ ہو گی' جو دُبلا ہونے کے لیے ڈائٹنگ کر رہی ہو گی..... شکر ہے کہ انور کی شادی میں تمہیں چچی جان کے ساتھ لکھنؤ نہیں جانا پڑا' امتحانوں کی وجہ سے صاف بچ گئیں تھیں اور پھر جب انور اپنی نئی نویلی' خوبصورت' انگریزی بولتی ہوئی ڈاکٹر دلہن کے ساتھ دتی آیا تو تب سمجھ میں آیا تھا کہ عفت بی۔!..... انور کی دلہن ثانیہ' ریٹائرڈ آئی اے ایس آفیسر کی بیٹی ہے' کونونٹ اسکول کی پڑھی ہوئی ہے اور اٹک اٹک کر اردو بولتی ہے..... اور پھر تم چچی جان کے بھانجے اور بھانجی بہو کی خاطر میں دوڑ رہی تھیں.....

ثانیہ نے کہا تھا۔

''عفت! آپ تو اتنا اچھا کھانا پکاتی ہیں' ہمیں تو کچھ نہیں آتا..... ہماری ممی نے سکھایا ہی نہیں' انور آپ کے کھانے کے بڑے فین ہیں۔''

'ہاں عفت بیگم..... تم کیوں بھول جاتی ہو کہ تم اشفاق حسین صاحب کی بیٹی ہو جو سہارنپور میں پرائمری اسکول کے ٹیچر ہیں اور ساتھ ساتھ تھوڑی بہت حکمت بھی کر لیتے ہیں..... کیوں دیکھتی ہو بار بار رنگیں' چمکیلی تصویروں کی طرف؟'

صبح سویرے ہی آنکھ کھل گئی عفت کی..... روز صبح چھ بجے چچی جان کو بیڈ ٹی دینی ہوتی تھی'

انداز فکر

☆ تکلیف اُٹھانا اتنا تکلیف دہ فعل نہیں' جتنا ذلت اُٹھانا تکلیف دہ عمل ہے۔

☆ چرب زبان آدمی جتنی جلدی دل میں اُترتا ہے اتنی ہی جلدی دل سے اُترتا بھی ہے۔

☆ تم اللہ تعالیٰ کے ذکر میں دل لگا لو سکون و اطمینان تم میں دل لگا لیں گے۔

☆ بعض لوگ خطرناک ہوتے ہیں پر چالاک نہیں ہوتے لیکن جو چالاک ہوتے ہیں' وہ خطرناک بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔

☆ ایک طرف دھیان لگانے کے لیے دوسری طرف سے دھیان ہٹانا لازمی ہے۔

☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شوکت چچا کے نہانے کے لیے گیزر آن کرنا ہوتا تھا' وہ آنکھیں ملتی ہوئی کمرے سے باہر آئی تو دیکھا اماں باورچی خانے میں بیٹھی چائے بنا رہی تھیں' ابا قریب ہی بچھی چارپائی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے' وہ کہہ رہے تھے:

''ارے بھئی صدیقہ بھابھی کو خدا خوش رکھے' انہوں نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔''

اماں ہمیشہ کی کم گو تھیں' ''ہوں'' کر کے رہ گئیں۔

عفت الجھ سی گئی' یہ کون سی کھچڑی پک رہی ہے اور کون سا مسئلہ ہے؟ ناشتے کے بعد وہ حسب معمول گھر کی صفائی میں جٹ گئی' ابا کے کمرے کی باری پہلے آئی۔ ان کی میز سے کتابیں سرکائیں تو ایک خط گر پڑا۔ صدیقہ چچی کی لکھائی تھی' اس نے خط کھول کر پڑھنا شروع کر دیا۔

بھائی صاحب
آداب!

امید ہے آپ اور بہن خیریت سے ہوں گے' عفت بیٹی تو آپ کی ہے لیکن کچھ حق میرا بھی بنتا ہے' حق کیوں' فرض کہنا چاہیے۔

بات یہ ہے بھائی صاحب کہ عفت کے لیے میں نے ایک لڑکا دیکھا ہے یہاں دلی میں۔ کارپوریشن کے اسکول میں ٹیچر ہے۔ خاندان بھی کوئی لمبا چوڑا نہیں' بڑی بہن اپنے گھر کی ہیں' ایک چھوٹا بھائی کالج میں ہے اور ایک چھوٹی بہن ہے' جو ماں کے ساتھ رہتی ہے' یہیں ذاکر نگر میں رہتے ہیں' سیدھے سادے لوگ ہیں مگر شریف۔ لڑکے کا نام بھی شریف ہے۔ جہیز کی بھی کوئی مانگ نہیں ہے۔ اگر آپ کی رائے ہو تو شادی یہیں دلی میں ہو جائے گی۔

بچوں کو دعائیں
آپ کی بھابھی صدیقہ

عفت نے آنکھیں بند کر کے کرسی سے ٹیک لگا لی..... 'ہاں! ہاں! نام کے بھی شریف ہیں..... دیکھا ہے میں نے..... اکثر آتے تھے چچا جان کے پاس کسی سفارش کے سلسلے میں.....' عفت نے ٹھنڈی سانس بھری..... 'ذاکر نگر اور پنڈارا روڈ میں بہت فاصلہ ہے..... تم کر بھی کیا لوگی عفت بی..... ابا کی گرتی ہوئی صحت' چھوٹے چھوٹے بہن بھائی' چچی جان کے احسانات..... جہیز کی کوئی مانگ نہیں..... کیا امر مانع ہو سکتا ہے' اس شادی میں..... بس عفت بی' زمین پر رہو۔'

شریف نے شادی کی تصویریں جلدی سے دُھلوا کر' فریم کروا کے بہت ذوق و شوق سے کمرے میں سجا دی تھیں۔ بڑے بڑے لوگ آئے تھے شادی میں..... منسٹر' وائس چانسلر' سیاسی شخصیات..... بڑا رعب پڑا تھا شریف کے گھر والوں پر۔

شادی کے ہنگامے نمٹا کر ابا' اماں اور سب لوگ جب سہارن پور جانے لگے تو چچی جان آزردہ ہو گئیں' بولیں:

''بھابھی جان! عفت کی شادی کے بعد سے تو گھر کاٹ کھانے کو دوڑے گا اور میں تو بالکل ہی بے دست و پا ہو جاؤں گی' سلیمہ نے ماشاء اللہ ہائی اسکول کر لیا ہے' اسے میرے پاس چھوڑ دیجیے۔''

عفت کی آواز سے سب چونک پڑے۔

''نہیں! بالکل نہیں! سلیمہ کو ابا اور اماں کے پاس ہی رہنے دیجیے۔''

عفت کو خود اپنے لہجے کی کاٹ پر حیرت ہو رہی تھی۔!

☆☆☆☆
ادب سے انتخاب
☆☆☆☆

محبت کا چراغ

دانش کمال

لیکن یہاں محبت کا ڈھب الگ تھا' وہ ایک لڑکی تھی جس کا اکثر وقت مختلف لوگوں کے لیے شام ساتھ گزارنے ان کو کمپنی دینے' ان کی جھوٹی باتوں پر سچ نظر سے دیکھنا اس کی ایکسٹرا کوالٹی تھی جس کی بہت ڈیمانڈ تھی کیونکہ وہ کسی کے جھوٹ سے سچ برآمد کرنے کی کوشش نہیں کرتی تھی' اس کی زلف سے جو پوریں اٹکتی تھیں وہ کس کس کا حسن چھو آئی ہیں۔

ادب سے انتخاب.....ایک دلگداز افسانہ

''محبت میں بڑا را کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔''

وہ یکدم کہتے کہتے مڑی اور وہ اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔

صاعقہ بھی یہی کہتی ہے لیکن وہ تمہاری طرح مولڈ نہیں ہوتی' وہ کہتی ہے 'تم کچھ بھی نہیں ہو' اور جب وہ یہ کہتی ہے تو میرا دل چاہتا ہے' میں اسے ہر جگہ ہر طرف نظر آؤں مگر میں کہیں نہیں ہوتا اور وہ ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔ میرے گھر' میرے کمرے میں' میرے کپڑوں کی چوائس میں' میرے بچوں کی باتوں میں وہ ہر جگہ ہے اور میں کہیں نہیں دکھائی دیتا' اس لیے میں یہاں چلا آتا ہوں کیونکہ تمہاری آنکھ میں میں ہوتا ہوں' تمہارے لفظوں میں میں ہوتا ہوں۔ تم کہتی ہو

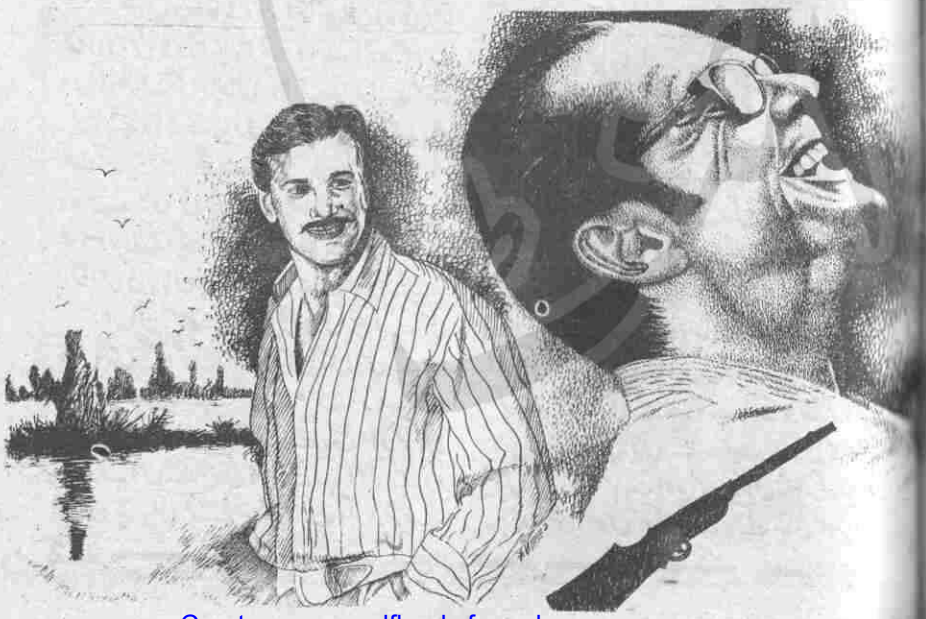

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محبت میں بٹوارا کوئی بھی برداشت نہیں کرسکتا لیکن تم مجھے آدھوں آدھ بانٹ کر اپنی پوری توجہ اور محبت دے دیتی ہو' یہ تمہارا مجھ پر فرض ہے جسے میں کبھی بھی اتارنا چاہوں تو نہیں اتار سکتا۔

ایک فقرے کا اتنا طویل جواب بنتا نہیں ہے لیکن جب ہر طرف خاموشی ہو تو فقرے سے فقرے جوڑنا' جملے بنانا' کہانی گھڑنے کو دل چاہتا ہے تاکہ ان لفظوں میں پورے کے پورے لمحوں سے ہم آجائیں اور کسی کی نظر ہمیں پاکر ہماری منت کرے' میں پانے کی ہوک میں مبتلا ہوں' ہمارے لیے ترسے ہمارے لیے تڑپے۔

لیکن یہاں محبت کا ڈھب الگ تھا' وہ ایک لڑکی تھی جس کا اکثر وقت مختلف لوگوں کے لیے شام ساتھ گزارنے ان کو کمپنی دینے' ان کی جھوٹی باتوں پر سچ نظر سے دیکھنا اس کی ایکسٹرا کوالٹی تھی جس کی بہت ڈیمانڈ تھی کیونکہ وہ کسی کے جھوٹ سے سچ برآمد کرنے کی کوشش نہیں کرتی تھی' اس کی زلف سے جو پوریں اٹکتی تھیں وہ کس کس کا حسن چھو آئی ہیں' اس سے اسے کوئی غرض نہیں ہوتی تھی۔

مگر یہاں معاملہ دوسرا تھا' یہاں وہ سچ بولتا تھا اور اس کا دل چاہتا تھا وہ ایک آدھ جھوٹ اس کی طرف بھی اچھال دیتا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے' وہ بہت پیاری ہے' اگر اچھی نہیں ہے تب بھی۔

وہ جب اس کی طرف دیکھتا ہے تو لگتا ہے خوبصورتی کو ایک نظر میں بھر لیا ہے مگر وہ جب بولتا اس کی زبان پر صاعقہ براجمان ہوتی۔

ارمان مسعودی کی اپنی بیوی جو اسے کسی قابل نہیں سمجھتی تھی' جو کہتی تھی' دنیا میں اس کے سوا ہے کون جو اچھا ہے۔ جس کی طرف وہ جب بھی قدم بڑھاتا وہ اس کی طرف سے رخ موڑ کر کہتی وہ صرف اس کے بچوں کا باپ ہے' اس لیے وہ اس کی پذیرائی کرنے پر مجبور ہے وگرنہ شراب اور شباب نے ان کے درمیان بہت سی نامحسوس دیواریں حائل کردی ہیں' وہ جب بھی اپنی محبت سے مجبور ہوکر اس کی طرف آتا تو کہتا۔

وہ نہیں سمجھتی مجھے اس کا انکار حلق میں کانٹے کی طرح چبھتا ہے مگر وہ کیکٹس پلانٹ ہوکر ہر سانس میں چبھ کر بھی اپنی اپنی سی لگتی ہے' یہ محبت کتنی ظالم ہے تمہیں نہیں پتا' میں نے جب اسے پہلی بار دیکھا تو مجھے لگتا تھا میرے وجود کا آدھا حصہ جو جدا تھا' مل گیا ہے۔ میں نے اس پالیا لیکن کچھ عرصے بعد ہمیں لگا جیسے محبت کہیں کھو گئی ہے اور صرف سمجھوتہ رہ گیا ہے۔ وہ بھی میری طرف نہیں آئی اور میں بھی اس کی طرف سے پورا مڑ ہی نہیں سکا لیکن اس محبت کو وہ نہیں سمجھتی اور میں یہ تم سے سمجھنے آتا ہوں' محبت ہے کیا' یہ کتنی ظالم ہے' یہ دل میں ہوکر دل کو ہی کتنا برباد کرتی ہے۔' وہ اسے سنتی رہتی' اس کو چھو کر اس کے اندر کے دکھ کو اپنے لفظوں سے مرہم کرتی رہتی اور دل کے اندر کوئی ہوتا۔

شاید محبت جو ہوک بھرتی' کاش وہ اس کی طرف سے مڑ آئے تو وہ دل سے اس کو خوش آمدید کہہ سکتی تھی لیکن محبت وہ سب کرتی ہی کب ہے جو دل چاہتا ہے' محبت تو وہ کرتی ہے ہمیشہ' جس کا گمان تک نہیں ہوتا۔ یہ آزاد بے مہار مسافر ہے جس سمت سے چاہے راستہ بنا لیتی ہے' جہاں سے چاہتی ہے سیندھ بنا کر اندر اتر جاتی ہے۔ کبھی دل میں' کبھی رگ رگ میں بھی' زندگی میں اور کبھی زندگی کو حسرت کرنے والی موت سے دوستی کرکے آپ کی سانس سانس پینے کو ہمکتی ہے۔ پیالہ لے کر آپ کو سامنے بٹھا کر آپ کے اندر کی روح پیے جاتی ہے' خواب چسکی چسکی کرکے چڑھا لیتی ہے اور آپ ہاتھ بڑھا کر اس کا پیالہ چھین بھی نہیں سکتے۔ محبت مجبوری کا نام نہیں' دل کا نام ہے اور بس یہ دل مجبور کر جاتا ہے' وہ بھی محسوس ہوکر اسے دیکھے جاتی اور وہ

کہے جاتا یہاں تک کے ایک شام اس کے فلیٹ کے دروازے پر دستک ہوئی' اس نے دروازہ کھولا سامنے ایک حسن طرحدار کھڑا تھا۔

''کیا تم ایمن ہو۔ وہی ایمن جس کی یاد اور محبت سے ارمان مسعودی کی آنکھ خواب بنتی رہتی ہے اور اسے میں کہیں دکھائی نہیں دیتی۔''

وہ جو نئی شام کے لیے نئے لباس کی ہر سلوٹ سے اپنی گئی شام کی تھکن حسرت مٹانے کی کوشش تھی' مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

''صاعقہ ارمان! یہ کسی کے دل کا بھی ارمان ہوسکتی ہے مگر آج یہ نئی بات کیا ہوئی کہ وہ ارمان مسعودی جیسے جھٹکے ہوئے مرد کے لیے اس کے گھر تک چلی آئی تھی۔

''تمہیں یہاں کس جذبے نے یا کیا محبت.....''

وہ تن تن کرتی اسے دیکھنے لگی پھر بولی۔ ''پتا نہیں یہ محبت ہے یا مجبوری ہے' سماجی مجبوری' اولاد کی مجبوری مگر بس میرا دل چاہا میں تمہیں دیکھ کر تو آؤں' تمہیں جس پر وہ گھنٹوں صرف کرتا ہے' تمہیں نہ صرف سوچتا ہے بلکہ ہمیشہ دکھ پریشانی میں تمہیں یاد کرتا ہے' اسے کبھی میرا کندھا' میرے لفظ یاد نہیں آتے' وہ کبھی تمہارے جیسا میرے لیے تڑپ کر نہیں آتا' وگرنہ اسے حق ہے وہ مجھے زبردستی بھی کہہ سکتا ہے' اسے مجھ سے محبت ہے اور ٹوٹ کر محبت ہے' کیا میں اسے اس جملے کے بعد انکار کرسکتی ہوں۔

وہ یوں رکی جیسے دل سانس میں اٹک گیا ہو یا آنکھوں میں آن بیٹھا ہو اور وہ اس کو دیکھے گئی' اس کو اس کی کم علمی پر ہنسی آنے لگی مگر اس ہنسی نے اس کی ذات میں پھندا ڈال دیا تھا' یوں جیسے کسی تہہ خانے میں کوئی قیمتی نوادرات دریافت کرنے اترے لیکن سیلن اور حبس اور ناکامی میں اپنی ذات کی بازیافتی کا حق بھی گنوا آئے' وہ بھی خالی ہاتھ کھڑی تھی اور وہ دامن بھر کر بھی خالی ہونے

انداز فکر

☆ ہر آدمی کی رائے اس کے ذاتی تجربے کے مطابق ہوتی ہے۔ (حضرت علیؓ)

☆ پُرامیدی سے سفر کرنا جلدی پہنچنے سے بہتر ہے۔ (سر جیمز جیسن)

☆ اگر تم چاہو تو اپنے خیالات کو بدل کر زندگی بہتر بنا سکتے ہو۔ (آسکر وائلڈ)

☆ زندگی کی خوشیاں ہمارے خیالوں پر منحصر ہیں۔ (کنفیوشس)

☆ وہ محبت یقیناً عظیم ہوتی ہے جو ایک دوسرے کی عزت پر مبنی ہو۔ (جانسن)

☆ کسی آدمی کو جب اس کی بساط سے زیادہ دُنیا مل جاتی ہے تو لوگوں کے ساتھ اس کا برتاؤ برا ہو جاتا ہے۔ (حکیم اقلیدس)

☆ ہم سفید کونجوں کا ایک غول ہیں جو نیلے آسمان میں اپنی اپنی منزل کی تلاش میں نکلتی ہیں۔ خوش خوش' پھر کسی کو اپنی منزل خوبصورت باغ میں ملتی ہے اور کوئی رات کی سیاہی میں سکت چٹانوں سے ٹکرا کر خارزاروں میں گر پڑتی ہیں۔ (خلیل جبران)

☆ دھوکا ہو یا دُکھ تب ان کا صدمہ زیادہ اور حملہ شدید ہوتا ہے جب انسان ذہنی طور پر تیار نہ ہو' کئی تو اس صدمے کے نتیجے میں جان ہی ہار جاتے ہیں۔ (اختر عباس)

☆ آدمی عزت اور اس سے زیادہ محبت کا آرزومند ہوتا ہے' اور یہ دونوں نعمتیں جب دولت کے بغیر ملنے لگیں تو اصل دولت ہوتی ہے۔

☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے وہم میں مبتلا تھی۔

”محبت میں بٹوارا برداشت نہیں ہوتا لیکن صاعقہ ارمان! اگر کوئی محبت کسی کا حصہ ہی نہ بنے تو تم...... پھر بھی اپنا دل جلاؤ گی۔“

”ہاں کیونکہ وہ تمہارے عام خال و خد کی تعریف مجھ سے بھی زیادہ کرتا ہے‘ آخر کیا ہے ایسا تم میں جو مجھ میں نہیں‘ کیا ہے تم میں جو وہ تمہارا ہو گیا اور میرا نہیں ہو پایا۔“

اس نے سنا تو وہ ہنس پڑی‘ کبھی کبھی خود پر خود ہی طنز سے ہنسنا اچھا لگتا ہے کیونکہ کسی اور کے اپنے اوپر ہنسنے سے بہتر لگتا ہے انسان خود ہی پر خود ہی ہنس لے‘ اس طرح تکلیف کم سے کم محسوس ہوتی ہے‘ حالانکہ دل کی رگیں ٹوٹ جایا کرتی ہیں لیکن اندر کی ٹوٹی رگوں سے زندگی پھر بھی رگوں میں بہتی رہتی ہے کہ اجل ابھی ایک سانس دور کھڑی ہوتی ہے یا شاید کچھ سالوں دور اور اس وقت...... وہ ناپنا چاہتی تھی یہ اجل سانس بھر دور کھڑی تھی یا کچھ سالوں دور۔

”تم...... تم مجھ پر ہنس رہی ہو‘ تم نے کبھی اپنی صورت دیکھی ہے‘ تم ہو کیا‘ تمہاری اوقات ہے کیا‘ ہر شام نئی شام ہے تمہاری‘ دوسروں کی زندگی چرا کر جھتی ہو تم زندگی جی رہی ہو۔“

وہ خود کرسی پر آن بیٹھی‘ تب وہ مڑ کر اس کی طرف آئی‘ اب وہ چوڑیاں پہن رہی تھی‘ ادھار کی زندگی اور خوشی کی طرح ادھار کی چوڑیاں جس کے رنگ اس کے چہرے کے غازے کے رنگ سے بھی زیادہ کچے تھے‘ اس رنگ کی چوڑیاں وہ ہمیشہ پہنا کرتی تھی جو پانی کی بوندوں سے آپ ہی آپ مٹ کر سفید براق ہو جاتی‘ نہ رنگ بچتا‘ نہ گزرنے والی شام کا عکس اور اس کی زندگی کے لیے یہی ڈھب جچتا تھا مگر یہ ارمان سعودی یہ جانے کیسے پکے رنگ آنچل کے پلو میں محبت کی حسرت بن کر بندھ گیا تھا‘ وہ سامنے بیٹھی تھی‘ تب اس نے پہلی بار دل کا سچ کہا۔ شاید کبھی اتنا جھوٹ بھی درد نہیں دیتا ہو گا‘ جھوٹ کہنے سننے کی تو اسے عادت تھی اور اب یہ سچ۔

تم نے مجھے جانے کیسے لیٹ ڈاؤن کیا‘ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ میں سمجھتی رہی‘ میں آج بھی ارمان کے دل میں ہوں لیکن شاید اب صرف اس کے والٹ کے علاوہ کہیں نہیں ہوں‘ ہیں ناں۔

وہ پھر سے ہسٹرک ہو گئی تھی۔ پتا نہیں وہ اطلاع دے رہی تھی اپنی ناکامی کی یا شاید اس سے کوئی امید بھیک میں چاہتی تھی۔ وہ اب اپنے کاندھے پر نیٹ کا گھنگھروں بندھا دوپٹہ لے رہی تھی۔ چھن چھن چھن اس کے چلنے سے صدا پھوٹ رہی تھی‘ محبت کی یا شاید کسی کے دل کی ناکامی کی۔

وہ تمہاری تعریف کیوں کرتا ہے۔

وہ اب سنبھل کر سامنے کھڑی تھی۔ آنچل کی چھن چھن میں دل کی حسرت پی لی تھی اس نے۔

تم بہت بے وقوف ہو صاعقہ ارمان! وگرنہ تم جان لیتیں کہ وہ کبھی بھی تمہارے سامنے میری تعریف نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے دل میں چھپی تمہاری محبت کی تعریف کرتا ہے‘ جو کچھ وہ تم سے کہنا چاہتا ہے‘ تمہارے طبیعت کے نخرے اور دھتکارے جانے کی عادت کی وجہ سے نہیں کہہ پاتا تو اس نے مجھے اوبجیکٹ کے طور پر ڈھونڈا‘ وہ مجھ سے تمہاری محبت شیئر کرتا ہے‘ نچھاور کرتا ہے۔ میں اس کے سامنے ہوتی ہوں تب بھی‘ یہاں بھی تم ہوتی ہو۔ میں ریسیور کے اس طرف ہو کر بھی اسے اپنی آواز میں سنائی نہیں دیتی کیونکہ وہ مجھے تمہیں سن رہا ہوتا ہے‘ محسوس کر رہا ہوتا ہے۔ شاید باہوش و حواس وہ کبھی مجھے اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ احترام سے ہی سہی چلتے چلتے میرے لیے راستہ چھوڑ دے‘ میں اس کی کلاس میں ہمیشہ مس فٹ ہوں‘ اس کی نظر میں میری کوئی عزت نہیں ہے‘ وہ بس اپنے دل کی

محبت کو باہر نکالنے کے لیے میرے لفظوں کے شیشے سے اپنے اور تمہارے بیچ کی دیوار کو تراشتا رہتا ہے اور جان نہیں پاتا۔ میں ذرہ ذرہ ہو کر اس کے قدموں میں گر کر مٹ جاتی ہوں‘ اس کے قدموں سے لپٹ کر حسرت سے اس کی بلندی کو ناپتی ہوں اور جھک کر اور بکھر جاتی ہوں۔ صاعقہ ارمان تم مجھ سے ڈرتی ہو یا اپنی محبت سے۔ ادھر دیکھو میں اس کی زندگی میں کہیں نہیں ہوں‘ میں صرف یہاں ہوں‘ یہاں۔“ اس نے شراب کی بوتل اٹھائی زمین پر پٹخ دی۔

ٹکڑے ٹکڑے تھا اس کا عکس اور داخلی دروازے کے سامنے کرسی پر بیٹھی صاعقہ ارمان مسعودی ہر ٹکڑے میں صاعقہ ارمان کا عکس تھا۔ اس کا چہرہ‘ اس کی آنکھیں لہرا رہی تھی اور وہ ایک کونے میں کھڑی تھی‘ بالکل اندھیرے میں۔ تب اندھیرے نے سانس بھری تھی‘ روشنی کی ایک کرن پی کر روشنی ہونے کی تمنا میں لیکن روشنی کنارہ موڑ گئی تھی‘ راستے سے مڑ گئی تھی اور وہ اندھیرا ہی رہ گئی تھی‘ تب اندھیرے نے شکوہ کیا تھا۔

تم بے خبر ہو‘ کس قدر بے خبر کہ تم اس کی اولاد پالتی ہو‘ تم اس کے دل میں ہی نہیں اس کے گھر میں بھی رہتی ہو اور مجھ سے لڑنے آئی ہو‘ مجھ سے لڑنے میں جو صرف اس پیالے کے اندر تیرتی ایک معمولی سی جھلک کے سوا کچھ نہیں‘ تم مجھ سے لڑنے آئی ہو‘ مجھ سے چھیننے آئی ہو۔ کیسے چھیننا چاہتی ہو‘ دیکھوں تو کیا ہے یہاں۔ خالی ہاتھوں میں کیا ہے‘ یہاں صرف نشے کی حالت میں کیے جانے والے وعدے یا وہ قرض کا احسان جو نیم مندی آنکھوں سے وہ کہتا ہے۔

”تم کس قدر اچھی ہو کہ محبت کو آدھو آدھ بانٹ لیتی ہو۔ یہ قرض میں کبھی نہیں اتار سکتا۔ اسے نہیں معلوم محبت کا قرض بہت بھاری ہوتا ہے مگر کبھی بھی کسی نے آج تک یہ قرض نہیں اتارا کیونکہ ہر شخص کو اپنا دل یاد رہتا ہے‘ دوسرے کی سکی بھرتی آنکھ اور حسرت ناتمام میں لپٹی آنچل کی محبت یاد نہیں رہتی۔ سب اپنا دامن بھرتے ہیں اور یہاں دینے والے ہمیشہ خالی رہ جاتے ہیں اور تم...... تم ہمارے حسرت بھرے خالی دامن پر بھی لڑنے چلی آئی ہو‘ محبت کرنا سیکھو صاعقہ ارمان! محبت کرنا سیکھو۔“

محبت میں جہاں سے انسان فنا ہو جاتا ہے‘ مر جاتا ہے‘ وہیں سے تو محبت شروع ہوتی ہے خود کو مار کر محبت کو جینا سکھاؤ‘ دنیا سیکھو صاعقہ ارمان مسعودی! دنیا سیکھو۔

صاعقہ ارمان مسعودی! خالی آنکھوں سے اس کے محبت سے بھرے دل کو دیکھے گئی۔ اس کی ذات کی کرچیاں بوتل کے ٹکڑوں کی اطراف میں بکھری پڑی تھیں۔ دکھ یہ تھا کہ اس لڑکی نے تمام عمران کرچیوں پر چلنا تھا اور کرچیوں کے ریزوں پر کس نے دل فگار کیا‘ کون رویا۔ کوئی نہیں۔

اس نے پشت موڑ لی تھی مگر محبت کو دعا کی طرح اس کے دروازے پر چھوڑ گئی تھی۔ دل فگاروں پر بھی کوئی نہیں رویا‘ محبت روئی ہے مگر سنا ہے روتی آنکھیں جب ہنس پڑیں تو زندگی اک نئی جہت کی سمت بڑھتی ہے۔ جہاں راستے ختم ہو جائیں‘ وہیں منزلیں پھوٹتی ہیں اور وہ ایک نئی منزل کی تمنا لے کر اسے ایک نئی منزل کی جہت مڑنے‘ بازیافت کرنے دینے کا نیک شگن لے کر باہر کے راستے کی طرف سیڑھیاں اتر رہی تھی۔

راستہ ایمن علوی کے لیے اتنا صاف و شفاف بھی نہیں تھا لیکن اتنا پرپیچ بھی نہیں تھا‘ منزل ہی کھو جاتی۔ اس کی محبت اس کے ساتھ تھی اور کوئی ایک دل تھا جو صرف اس کے لیے پگھلنے کے لیے ہارنے کے لیے تیار کھڑا تھا‘ بس دیر دستک کی تھی جو کبھی بھی ہو جاتی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

☆☆☆☆
ادب سے انتخاب
☆☆☆☆

دل زخمی ہے

عقرب سیف آبادی

عادل کو کہانیاں لکھنے کا شوق اسکول کے زمانے سے تھا۔ ایک دن شبیر رحمانی صاحب سے اس کی ملاقات ہوگئی' جو اس کی تحریر کے اسلوب سے بہت متاثر ہوئے۔ عادل نے اپنی مارکیٹنگ کی تکنیک استعمال کرتے ہوئے اپنا قلمی نام 'زخمی' رکھ لیا اور باقاعدگی سے کہانیاں لکھنی شروع کردیں' وہ عام طور پر رومانی موضوعات پر لکھتا تھا' جس کی وجہ سے نوجوانوں میں خاصا مقبول ہوگیا تھا۔

ادب سے انتخاب.....ایک حساس و دل گداز تحریر

حسب عادت عادل ٹھیک ایک بجے ماہنامہ ''ادبی سویرا'' کے دفتر پہنچا تو رسالے کے مدیر شبیر رحمانی اپنے کمرے میں لنچ بکس کھولے' لنچ پر اس کا انتظار کررہے تھے۔ عادل کی خواہش کے مطابق اس وقت کمرے میں کوئی اور نہیں تھا۔ اسے دیکھتے ہی رحمانی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے:

''یار گھڑی غلط ہوسکتی ہے مگر عادل لیٹ نہیں ہوسکتا۔''

''جو لوگ اپنے وقت کا صحیح استعمال نہیں جانتے' وقت انہیں ضائع کردیتا ہے۔'' عادل نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''یہ بھی خوب کہی۔'' شبیر رحمانی بولے: ''ویسے سیدھی سادی بات کو ایک غیر معمولی حسن کے ساتھ بیان کرنے کا فن تمہیں اچھی طرح آتا ہے..... یار اس ماہ تو حد ہی ہوگئی ہے۔''

''کیوں کیا ہوا؟''

''تمہاری کہانی ''دل ہار گیا'' اتنی مقبول ہوئی ہے کہ کیا بتاؤں۔ وہ سامنے کارڈ بورڈ کے بکس دیکھ رہے ہو' اس میں تمہارے نام آئے ہوئے 1248 خطوط ہیں' اس کے علاوہ 544 خط میرے نام آئے تھے۔ بہت سی لڑکیوں نے تو خاصے عاشقانہ قسم کے خط بھی لکھے ہیں۔''

''ہاں بھئی۔'' عادل نے ہنستے ہوئے کہا: ''اکثر نوجوان لڑکیوں کو ایسا بخار چڑھ ہی جاتا ہے' اس میں بھی تمہارا ہی فائدہ ہے۔ مجھ سے تو کوئی واقف نہیں' سب صرف میرا قلمی نام ہی جانتے ہیں اور یہ اسی سسپنس کا اعجاز ہے کہ تمہارے رسالے کی سیل بڑھتی ہی جارہی ہے۔''

''یار عادل۔'' شبیر رحمانی ایک لقمہ توڑتے ہوئے بولے: ''اب مجھ پر پریشر بھی بہت بڑھتا جارہا ہے۔ ایک طرف تو تمہارے فین ہیں جن کے تقریباً ہر خط میں یہ تقاضا ہوتا ہے کہ زخمی صاحب کی تصویر اور تعارف شائع کیا جائے اور دوسری طرف یہ ادبی حلقے ہیں' جب بھی یہ لوگ ملتے ہیں' پوچھتے ہیں کہ یہ زخمی کیا چیز ہے' کبھی ملواؤ تو سہی' بلکہ ایک دو اصحاب نے تو یہ کہنا بھی شروع کردیا ہے کہ زخمی میرا ہی قلمی نام ہے۔''

''بس ایسے ہی چلنے دو۔'' عادل نے منہ چلاتے ہوئے کہا: ''جب تک قارئین کے ذہن میں تجسس رہے گا' تمہارے رسالے کی ساکھ بنی رہے گی' ایک بار تم نے میرا نام ظاہر کردیا تو پھر پڑھنے والوں کی مجھ سے فیسی نیشن ختم ہوجائے گی۔ باقی رہے یہ ادبی حلقے تو شبیر' میں ان سے دور ہی بھلا! میں ذرا بے ادب قسم کا آدمی ہوں' ادب والے حلقوں میں میرا کیا کام؟''

شبیر نے اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا: ''تمہاری بات مانے بغیر میرے لیے کوئی اور چارہ بھی نہیں ہے' تم میرے رسالے کے اسٹار رائٹر ہو' تمہاری کہانیوں پر یہ رسالہ بکتا ہے' جو تم کہو گے' وہی ہوگا' ارے ہاں عادل پتا ہے نا' دو ماہ بعد ہمارا سالنامہ آرہا ہے' اس کے لیے مجھے بڑی خاص سی کہانی چاہیے۔''

''اس کی تم فکر مت کرو۔'' عادل نے کھانا ختم کرکے ہاتھ ٹشو پیپر سے صاف کرتے ہوئے کہا: ''اب میں چلتا ہوں' ٹرین کا وقت ہورہا ہے' میں یہ ویک اینڈ گاؤں میں گزارنا چاہتا ہوں۔''

''ٹرین سے جاؤ گے؟'' شبیر نے حیرت سے پوچھا: ''بس زیادہ بہتر نہیں رہتی؟''

''نہیں یار۔'' عادل اپنے مخصوص لہجے میں بولا: ''ریل کے سفر کا اپنا ایک رومانس ہے' بس کے سفر میں وہ بات کہاں؟''

''اچھا' اپنی فین میل تو لے جاؤ۔''

''اسے تم ہی پڑھو' میرے پاس اس کا وقت نہیں' ٹرین میں مجھے پوری ایک فیز یبلٹی رپورٹ پڑھنی ہے۔ اچھا خدا حافظ۔''

عادل' پچیس چھبیس برس کا ایک خوبرو نوجوان تھا' اپنے گاؤں میں بنیادی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ لاہور آگیا تھا' جہاں اس نے دن رات محنت کرکے' پارٹ ٹائم ٹیوشنز کرکے اپنی تعلیم مکمل کی تھی' وہ ایم بی اے کرچکا تھا اور اب ایک غیر ملکی کمپنی میں اسسٹنٹ مارکیٹنگ منیجر تھا۔ اپنی ذہانت' جاذب نظر شخصیت' انتھک محنت اور حسن سلوک کی وجہ سے بہت کم عرصے میں اس نے کمپنی میں اپنے لیے ایک خاص مقام بنالیا تھا۔ کمپنی والے اسے اعلیٰ تربیت کے لیے کچھ عرصے کے لیے امریکہ بھیجنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

عادل کو کہانیاں لکھنے کا شوق اسکول کے زمانے سے تھا۔ ایک دن شبیر رحمانی صاحب سے اس کی ملاقات ہوگئی' جو اس کی تحریر کے اسلوب سے بہت متاثر ہوئے۔ عادل نے اپنی مارکیٹنگ کی تکنیک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

استعمال کرتے ہوئے اپنا قلمی نام 'زخمی' رکھ لیا اور باقاعدگی سے کہانیاں لکھنی شروع کردیں' وہ عام طور پر رومانی موضوعات پر لکھتا تھا' جس کی وجہ سے نوجوانوں میں خاصا مقبول ہوگیا تھا۔

اس دن جب وہ گاؤں پہنچا تو شام ہوچکی تھی۔ گاؤں میں اب صرف اس کی ماں رہتی تھی۔ کبھی کبھار اس کی بہن رجو بھی اپنی سسرال سے آجاتی تھی۔ رجو بیوہ ہوچکی تھی مگر اس کے سسرال والے اسے اپنے پاس ہی رکھنے پر بضد تھے' اس کی دو سال کی ایک بچی بھی تھی۔ عادل کی خواہش کے باوجود اس کی ماں نے گاؤں کا گھر چھوڑ کر اس کے پاس شہر میں رہنے سے انکار کردیا تھا۔

گھر پہنچنے پر معلوم ہوا کہ رجو اور اس کی بیٹی بھی وہیں ہیں۔ اسے دیکھ کر سب خوش ہوگئے' ماں نے جلدی سے اس کا پسندیدہ سالن پکایا۔ جب تیار ہوگیا تو عادت کے مطابق ٹانگیں اٹھا کر چارپائی پر بیٹھ گیا' اسے اس طرح بیٹھا دیکھ کر ننھی ہنسنے لگی۔ عادل نے جھپٹ کر اسے بھی اٹھا لیا اور ساتھ ہی چارپائی پر بٹھالیا۔ ماں نے کھانا سامنے رکھا تو عادل ان کا ہاتھ چوم کر بولا: ''ماں یوں تو شہر میں بہت آرام ہے' خدا کا شکر ہے میری نوکری اچھی ہے' کرائے کا ہی سہی' اچھا سا فلیٹ ہے' صوفہ سیٹ ہے' ڈائننگ ٹیبل ہے' کرسیاں ہیں' مگر جو مزا اس چارپائی پر بیٹھ کر تیرے ہاتھ کی روٹی کھانے میں ہے' وہ کہیں نہیں ہے۔''

''بھیا!'' رجو بولی: ''آپ شہر میں ہو بھی تو اکیلے' بس اب اس کا بندوبست کرنا پڑے گا۔''

''کیسا بندوبست'' عادل انجان بن کر بولا: ''کیا تم میرے پاس آکر رہو گی؟''

''مجھے میری سسرال والے کہاں آنے دیں گے۔ بڑی مشکل سے تو چند دن ماں کے پاس گزارنے آتی ہوں۔'' رجو نے کہا: ''شہر میں تو آپ کے ساتھ کسی ایسی ہستی کو بھیجنا پڑے گا' جو آپ کو ماں کے ہاتھ کے کھانے کی یاد بھی بھلا دے۔''

''بھئی یہ تو بہت مشکل کام ہے۔'' عادل اب بھی انجان ہی بنا رہا: ''بلکہ ناممکن ہی ہے۔ اگر میری ماں فرانس میں ہوتی تو اتنے لذیذ کھانے پکاتے پکاتے اب تک کروڑ پتی بن چکی ہوتی۔''

''نہ بھئی نہ۔'' ماں اسے تازہ چپاتی دیتے ہوئے بولی: ''میں نہیں جاتی فرانس ورانس۔ میں یہاں شکر یلے میں ہی بھلی' مگر بیٹا اب تو شادی کرلے۔''

عادل نے جلدی سے گھڑی دیکھی اور بڑی حیرت سے بولا: ''واہ بھئی یہ تو ریکارڈ ہوگیا' میرے گھر پہنچنے کے پورے تین گھنٹے آٹھ منٹ بعد آپ نے میری شادی کا ذکر چھیڑا ہے' پچھلی بار تو ڈیڑھ گھنٹے میں شروع ہوگئی تھیں۔''

''یہ مذاق کی بات نہیں ہے بھیا۔'' رجو پیار سے بولی: ''اس بار ہم نے ایک بہت ہی اچھی لڑکی تلاش کی ہے۔''

''اچھا؟'' عادل کھانا کھاتے ہوئے بولا: ''اور ہیں کون یہ محترمہ؟''

''ہمارے زمیندار صاحب کی بیٹی ہے شانو۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی اسلام آباد سے آئی ہے' وہاں کالج میں پڑھتی تھی' سچ بھیا' اتنی خوبصورت' اتنی پیاری ہے کہ کیا بتاؤں..... پڑھی لکھی بھی ہے' سلجھی ہوئی ہے۔ تھوڑی بہت میری سہیلی بھی رہی ہے۔''

''شانو؟'' عادل نے مذاق اڑانے کے انداز سے کہا: ''واہ کیا سندر نام ہے! سنتے ہی آنکھوں میں ڈیڑھ پاؤ سرمہ اور بالوں میں ڈیڑھ سیر تیل اتر آیا ہے۔''

''آپ ایک نظر اسے دیکھ تو لیں۔'' رجو تنک کر بولی: ''پھر سچ مچ آپ کو سرمے اور تیل دونوں کی ضرورت پڑ جائے گی۔''

''اور وہ زمیندار صاحب؟'' عادل نے اپنا لہجہ برقرار رکھا: ''مجھے تو ان کی مونچھوں سے ہی ڈر لگتا ہے' وہ مان جائیں گے اپنی پڑھی لکھی' حور جیسی بیٹی کو چوہدری خاندان سے باہر بیاہنے پر؟''

''تو اس کی فکر نہ کر۔'' ماں بولی: ''زمیندار بڑا سمجھدار آدمی ہے۔ پھر اس گاؤں میں میرے بیٹے

جیسا ایک بھی لڑکا نہیں۔ یہ تو ماشاء اللہ خوبصورت ہے' اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے' اچھی نوکری ہے' تیرے پاس' ارے سارے گاؤں میں تیری دھوم ہے بیٹا۔ زمیندار کو اس سے بہتر رشتہ کہاں ملے گا؟''

''اچھا ماں۔'' عادل نے بات ٹالنے کے لیے کہا: ''مگر پہلے مجھے شانو کو دیکھ تو لینے دے۔''

''ہاں بھیا ضرور۔'' رجو خوش ہو کر بولی: ''کل صبح ہی سہی۔''

دوسرے دن صبح' عادل اپنے والد کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد واپس آرہا تھا۔ رجو اور ننھی بھی اس کے ہمراہ تھیں کہ راستے میں شانو نظر آگئی۔ رجو نے دونوں کا تعارف کروایا۔ شانو نے بڑی شائستگی سے اس کے ساتھ بات کی۔ عادل شانو کے حسن و جمال سے جتنا متاثر ہوا تھا' اس سے کہیں زیادہ' وہ اس کی سلجھی ہوئی شخصیت سے مسحور ہوا۔ شانو بہت حسین تھی۔ اس کے لباس سے' اس کی سوچ کی پختگی ظاہر ہوتی تھی۔ اس کی بات چیت کے انداز میں نہ دیہاتی پن تھا' نہ عامیانہ پن تھا۔ عادل کو یکدم یوں محسوس ہوا کہ وہ جس آئیڈیل کی تلاش میں تھا' وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

مختصر سی بات چیت کے بعد شانو اپنی حویلی کی طرف چلی گئی اور ایک سحر زدہ عادل رجو اور ننھی کے ہمراہ گھر آگیا۔ گھر پہنچتے ہی رجو نے ماں کو یہ مژدہ سنا دیا کہ بھیا ''کلین بولڈ'' ہوگئے ہیں۔ ماں نے پھر بھی تصدیق ضروری سمجھتے ہوئے عادل سے پوچھا:

''ہاں بیٹے تم بتاؤ' تمہیں شانو کیسی لگی۔''

''ارے ماں اگر تم دونوں کو پسند ہے تو پھر مجھے پسند ہی ہے۔''

''آخر ہیں نا' مرد۔'' رجو چھیڑنے کے انداز میں بولی: ''دل میں لڈو پھوٹ رہے ہیں مگر اتنی ہمت نہیں ہے کہ منہ سے اعتراف کرلیں۔!''

ماں کو اطمینان ہوگیا تو بولی: ''بس اب تو شہر واپس چلا جا' میں کل یا پرسوں چوہدری صاحب کے گھر جاؤں گی' مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔''

چوہدری صاحب نے عادل کی ماں کی بات بڑے تحمل سے سنی۔ انہوں نے کسی روایتی چوہدری کی طرح غصے کا اظہار نہیں کیا۔ ان کی بیگم بھی عادل کو جانتی تھیں اور اس کے اچھے کردار کی معترف تھیں۔ انہوں نے بہرحال فوراً رشتہ قبول کرنے سے معذرت کرتے ہوئے کہا: ''شانو ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے' ہم اس کی زندگی کا فیصلہ اس سے پوچھ کر ہی کریں گے۔ آپ ہمیں چند دن کی مہلت دے دیں' ہم شانو سے بات کرلیں' پھر اس کی جو بھی مرضی ہوگی' ہم آپ کو بتا دیں گے۔'' عادل کی ماں کے نزدیک یہ بالکل جائز بات تھی' وہ خوشی خوشی واپس آگئی۔

عادل جب سے گاؤں سے آیا تھا' بس شانو ہی کے تصور میں کھویا رہتا تھا۔ اس کی کیفیت کو شبیر رحمانی نے بھی نوٹ کیا۔ عادل نے اسے دل کی بات بتا ہی دی۔ ایک اچھے دوست کی طرح شبیر رحمانی خوش ضرور ہوا مگر اسے چھیڑتے ہوئے بولا: ''بھئی میرے رسالے کا کیا بنے گا۔ اب تم سارا وقت شانو بی بی کی توصیف میں گزار دو گے' افسانے لکھنے کا تمہیں وقت ہی نہیں ملے گا۔ ویسے بھی جب حقیقت سے واسطہ پڑ جائے تو افسانے سب ماند پڑ جاتے ہیں۔''

''تم اس کی فکر مت کرو۔'' عادل نے بھی اسی جذبے سے جواب دیا: ''میرا تم سے زندگی بھر کا معاہدہ ہے۔ جب تک تم چھاپنے پر تیار ہو' تمہیں ہر ماہ ایک کہانی ملتی رہے گی۔ شانو سے شادی کے بعد تم دیکھنا' میری کہانیاں مزید نکھر جائیں گی۔''

ایک ہفتے بعد چوہدری صاحب خود عادل کے گھر آئے اور عادل کی ماں سے معذرت کرگئے کہ شانو اس رشتے پر تیار نہیں ہے۔ رجو نے گاؤں کے پی سی او سے عادل کو اطلاع دی' تو عادل ایک دم بکھر گیا۔ اس کا ذہن بالکل ماؤف ہوگیا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شانو کو اس میں کیا خامی نظر آئی۔ اس نے جس قدر شانو کے کردار کا تجزیہ کیا تھا' اس کے مطابق شانو کے انکار کی وجہ ذات پات تو نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو سکتی تھی۔ گاؤں میں عادل کی جو شہرت تھی اور عادل کے بارے میں رجو نے جو کچھ بھی شانو کو بتایا ہوگا' اس کی روشنی میں شانو کا انکار بالکل ہی ناقابل فہم تھا۔ اس شام جب شبیر رحمانی اس کے گھر آیا تو اس کے چہرے پر بکھری ویرانی دیکھ کر وہ بھی گھبرا گیا:

"ارے عادل کیا ہوا؟"

"حقیقت سے واسطہ پڑ گیا ہے رحمانی صاحب۔"

"پہیلیاں مت بجھواؤ' کیا بات ہے؟"

"شانو نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔" عادل نے بمشکل کہا۔ آنسو اس کی آنکھوں میں بھر آئے' وہ ہمت کر کے انہیں بہنے سے روکتا رہا۔

"شانو نے یا چوہدری صاحب نے؟" شبیر نے تیزی سے پوچھا۔

"شانو نے!" عادل بولا: "چوہدری صاحب بے چارے تو خود چل کر ہمارے گھر آئے تھے اور معذرت کر کے گئے ہیں کہ شانو کی وجہ سے وہ مجبور ہیں۔"

"تم ان چوہدریوں کو نہیں جانتے عادل۔" شبیر اسے سمجھاتے ہوئے بولا: "یہ بہت عیار ہوتے ہیں' مجھے یقین ہے کہ چوہدری نے اپنا انکار شانو کے منہ سے کہلوایا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم فوراً گاؤں جاؤ اور کسی طرح شانو سے ملنے کی کوشش کرو' اس سے بات کر کے ہی تمہیں صحیح صورتِ حال کا پتا چلے گا۔"

عادل کو اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن نظر آ گئی۔ اس نے بھی سوچا تو یہی بات زیادہ صحیح محسوس ہوئی کہ شانو جیسی لڑکی اس سے شادی کرنے سے انکار نہیں کر سکتی۔ یہ یقیناً چوہدری صاحب کا ہی نسخہ ہوگا' وہ یقیناً اسے کسی بڑے زمیندار کے گھر بیاہنا چاہتے ہوں گے۔ اس نے فون کر کے دفتر سے تین دن کی چھٹی لی اور سیدھا گاؤں چلا گیا۔

رجو ابھی تک ماں کے ساتھ ہی تھی' اسے دیکھتے ہی رجو کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں: "بھیا..... شانو نے جو کچھ کیا' میں اس کے لیے شرمندہ ہوں۔"

"رجو' میں پہلے اس بات کا یقین کر لینا چاہتا ہوں کہ انکار شانو نے ہی کیا ہے۔" عادل بولا: "کہیں ایسا تو نہیں کہ چوہدری صاحب نے اپنا انکار اس کے منہ سے کہلوایا ہو۔"

"نہیں بھیا' ایسا نہیں ہے۔" رجو سسکیاں لے کر بولی۔ "میں اس سے پوچھ چکی ہوں۔"

"رجو تم شانو سے میری ملاقات کروا دو۔"

"اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے بھیا' انکار شانو نے ہی کیا ہے۔"

"فائدہ ہو یا نہ ہو' میں شانو کے منہ سے سننا چاہتا ہوں کہ اس نے انکار کیوں کیا ہے۔"

"مٹی پاؤ بھیا' میں نے ایک اور لڑکی دیکھی ہے جو....."

"رجو' کم از کم میرا یہ حق تو بنتا ہے کہ مجھے میری خامی سے آگاہ کیا جائے۔"

"بھیا' آپ مرد لوگ یہ بات نہیں سمجھ سکتے۔" رجو خلاؤں میں گھورتی ہوئی بولی: "شانو کو آپ میں کوئی برائی نظر نہیں آئی' بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس نے آپ کے بارے میں سوچا تک نہیں۔"

"کیا مطلب۔" عادل کو جھٹکا لگا۔ "اس نے میرے بارے میں سوچے بغیر ہی انکار کر دیا۔ آخر کیوں؟"

"وہ اس لیے بھیا۔" رجو رک رک کر بولی: "کہ وہ کسی اور سے پیار کرتی ہے۔"

"اوہ مائی گاڈ۔" عادل کو جیسے کسی ننگی تار نے چھو لیا: "یہ بات تو میں نے سوچی ہی نہ تھی۔"

"اگر اب بھی آپ چاہیں تو میں شانو سے آپ کی ملاقات کروا سکتی ہوں۔"

"نہیں رجو۔" عادل اٹھ کھڑا ہوا: "میرا نظر میں شانو کی قدر بہت بڑھ گئی ہے' اسے حق ہے کہ وہ اس سے شادی کرے جسے وہ پیار کرتی ہے' مجھے کسی اور کے حصے کا پیار مانگنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"یہی بات میں بھی آپ سے کہنا چاہتی تھی۔" رجو بھی کھڑی ہو گئی: "ایک بات اور بھی ہے۔"

"وہ کیا ہے؟"

"میں نے ایک اور لڑکی دیکھی ہے۔ بی اے پاس ہے' اچھی صورت اور اچھی عادات کی ہے۔ میرے دیور کی سالی ہے' اگر آپ کہیں تو....." رجو نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

"تم لڑکی کو جانتی ہو۔"

"اچھی طرح جانتی ہوں' بڑی شوخ اور پیاری لڑکی ہے۔ صبا ہے اس کا نام۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے' ہاں کر دو' بلکہ ایسا کرو کہ امی کو ساتھ لے جاؤ اور ان سے کہو میں جلد شادی کرنا چاہتا ہوں' رجو میں اپنے زخم کے ناسور بننے سے پہلے ہی اس پر مرہم رکھ دینا چاہتا ہوں۔"

"ٹھہریے میں اس کی تصویر لاتی ہوں۔"

"اس کی بھی ضرورت نہیں ہے۔" عادل فیصلہ کن انداز میں بولا: "بس تم لوگ جاؤ اور بات پکی کر دو۔"

صبا بہت اچھی لڑکی نکلی۔ شادی بڑی سادگی سے ہوئی۔ شادی کے دوسرے ہی دن عادل اور صبا' شبیر رحمانی کی کار میں گاؤں سے شہر آ گئے۔ اپنے فلیٹ پہنچ کر عادل نے صبا کو کمرے دکھاتے ہوئے کہا:

"صبا' یہ میرا مکان ہے' اسے تم نے گھر بنانا ہے۔"

"میں اس گھر کو ہم دونوں کے لیے جنت بنا دوں گی عادل۔" صبا نے اعتماد سے کہا تو عادل اپنا سارا غم بھول گیا۔ اس نے صبا کا ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگا لیا۔ ساتھ ہی کھنکارنے کی آواز ابھری۔ دروازے پر شبیر رحمانی کھڑا آنکھیں جھپکا رہا تھا۔

"سامان کہاں رکھنا ہے صاب؟" وہ ہوٹل کے بیل بوائے کی طرح بولا:

"سوری شبیر۔" عادل گڑبڑا کر بولا: "میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ سامان اتارنے۔"

"تم اس کی فکر مت کرو۔" شبیر مسکرایا: "سارا سامان ڈرائنگ روم میں پڑا ہے' فرصت ملنے پر خود ہی سیٹ کر لینا' ہاں عادل بس اب مجھے میری کہانی دے دو۔ سالنامے کی فائنل کاپی پریس کو جانے میں صرف دو دن رہ گئے ہیں۔"

"اوہ۔" عادل تاسف سے بولا: "وہ کہانی میں نے لکھ تو لی تھی مگر فائنل گاؤں ہی میں رہ گئی ہے۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔" شبیر اس کی ندامت مٹانے کے لیے بولا: "پرسوں تم دونوں کو مکلاوے کے لیے صبا کے گاؤں لے کر جانا ہے' رستے میں اٹھا لیں گے۔"

"تھینک یو یار۔" عادل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب تم غائب ہو جاؤ۔"

وہ ہی دنوں میں عادل کو احساس ہو گیا کہ صبا بہت اچھی لڑکی ہے اور اس سے شادی کر کے اس نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ اگرچہ وہ شانو کو مکمل طور پر بھلا نہ سکا تھا مگر اسے خوشی تھی کہ اس کا زخم ناسور بننے کی بجائے مندمل ہو رہا تھا۔

تیسرے دن جب ان کو مکلاوے کے لیے جانا تھا' صبا جلدی اٹھ کر تیار ہو گئی۔ عادل ابھی تک بستر میں ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ صبا نے فون اٹھایا:

"ہیلو! ارے رجو باجی' السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام' صبا کیسی ہو۔" رجو نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بالکل ٹھیک ٹھاک۔"

"ذرا فون بھیا کو دو۔" رجو کے لہجے میں اضطراب تھا' صبا نے کارڈلیس فون عادل کو تھما دیا:

"ہیلو رجو۔" عادل بولا: "کیا بات ہے؟"

"غضب ہو گیا بھیا۔" رجو کی آواز یکدم لرزنے لگی: "آج صبح شانو ہمارے گھر آئی تھی' اس کی نظر اس فائل پر پڑ گئی' جو آپ یہاں بھول گئے تھے۔ فائل دیکھ کر جب اسے یہ پتا چلا کہ آپ ہی "زخمی" کے نام سے افسانے لکھتے ہیں تو اس نے خودکشی کر لی۔ بھیا وہ زخمی سے پیار کرتی تھی' جس کی خاطر اس نے عادل کو ٹھکرا دیا تھا۔!"

فون عادل کے ہاتھوں سے گر پڑا۔ باہر ایک بھرپور سورج کی چمک اور اندر صبا جیسے چاند کی دمک کے باوجود کمرے میں یکدم اندھیرا چھا گیا تھا۔!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

☆☆☆☆
سچی کہانیاں
☆☆☆☆

خالی ہاتھ

نازش شاہین

ماں کے جنازے میں عبدالرحیم لاہور آیا تو اسے یہ شہر اچھا لگا تھا۔ لاہور نے پہلے سے کہیں زیادہ وسعت اختیار کر لی تھی۔ اسے لاہور اچھا لگا تو اس نے یہاں رہنے کا فیصلہ کیا۔ اسلام آباد کے سرد رو کھے ماحول سے اسے بے زاری محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے عبدالرحمان سے کہا تو اس نے بتایا کہ ماڈل ٹاؤن میں کچھ سستے پلاٹ مل رہے ہیں۔ وہ بھی لینا چاہتا ہے لیکن اس کے پاس اتنی گنجائش نہیں ہے کہ ایک ہزار گز کا پلاٹ اکیلے لے سکے۔ عبدالرحیم نے اسے فوراً پیشکش کی۔ ”میرے ساتھ مل کر لے لو۔“

اس شمارے کے لیے ہمارے معاشرے کی عکاس سچی داستان

عبدالرحیم نے برابر کے گھر سے آنے والی چہکاروں اور قہقہوں کو حیرت سے سنا اور اس سے بھی زیادہ حسرت بھری نظر اپنے سونے آنگن پر ڈالی۔ برابر والا گھر اس کے چھوٹے بھائی عبدالرحمان کا تھا اور چہکاریں اور قہقہے اس کے بچے بچیوں، پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کے تھے۔ آج عید کا دوسرا دن تھا اور سب ملنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔

بچے اور بچوں کے بچے تو عبدالرحیم کے بھی تھے اور اسی شہر میں تھے لیکن انہوں نے آنا تو ایک طرف رہا اسے فون کرنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ سب اپنی زندگیوں میں ایسے مگن تھے کہ اسے اور اس کی بیوی کو فراموش کر بیٹھے تھے۔ اس کی بیوی شگفتہ کی طبیعت کل سے خراب تھی اور وہ بستر پر پڑی تھی اور عبدالرحیم بھی اچھا محسوس نہیں کر رہا تھا کل عید کا پہلا دن تھا لیکن اس کے ہاں کچھ بنا نہیں تھا۔ شگفتہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور اسے کچھ بنانا آتا نہیں تھا۔ ہاں عبدالرحمان کے ہاں سے اس کا نو سالہ پوتا شیر خرما، دہی بڑے اور چنا چاٹ لے کر آیا تھا۔

اس کا دل تو چاہا کہ یہ سب لے لے۔ ان چیزوں میں اسے گھر کی اپنائیت اور خوشبو آ رہی تھی لیکن اس نے دل پر جبر کر کے انکار کر دیا۔

اسے معلوم تھا کہ شگفتہ کو اس بات کا پتا چل گیا تو وہ اپنی طبیعت کی خرابی کے باوجود ایک فساد کھڑا کر دے گی۔ اسی لیے اس نے نرمی سے اپنے بھائی کے پوتے کو منع کر دیا۔

”بیٹا ہم دونوں میاں بیوی کی طبیعت خراب ہے کوئی کھا نہیں سکے گا۔ ضائع جائے گا۔ تم اسے واپس لے جاؤ۔“

وہ بے چارہ اتنی بڑی سی ٹرے اٹھا کر لایا تھا۔ پھر اسے واپس لے کر جانا پڑا۔

عبدالرحیم کو یاد تھا اس کی حرص پر ماں اسے کہا کرتی تھی۔

”پتر رحیمے۔ انسان کتنی ہی کوشش کرے۔ ملتا اسے اتنا ہی ہے جتنا اس کی قسمت میں ہوتا ہے۔“

”ماں میں خوب سارے پیسے جمع کروں گا پھر دیکھنا میں ہر چیز لے لوں گا۔“

ماں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”پتر تیرا باپ بھی پیسے کے خواب دیکھتے دیکھتے مر گیا اور اب تو اس نامراد شے کے خواب دیکھ رہا ہے۔“

”خواب دیکھوں گا تو اس کی تعبیر ملے گی۔“ بارہ سالہ عبدالرحیم نے جواب دیا تھا۔

سوپورہ اسلام آباد سے کوئی بیس کلو میٹر دور نور پور کے پاس ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ چند درجن گھروں پر مشتمل عبدالرحیم اور عبدالرحمان کا باپ زمیندار تھا اگر محنت کرتا تو اپنی سولہ ایکڑ زمین سے اتنا پیدا کر سکتا تھا کہ اس کا کنبہ آرام سے گزر بسر کر سکے۔ اس کا کنبہ تھا ہی کتنا۔ ایک بیوی اور دو بچے۔ لیکن اس کے اندر جلد امیر ہو جانے کی ہوس تھی۔

وہ سونا بنانے کے نسخے کی تلاش میں رہتا تھا۔ اس کیمیا گری کے چکر میں اس نے بہت سے روپے برباد کیے۔ اپنی زمین تھوڑی تھوڑی کر کے بیچی۔ ریشماں کا سارا زیور بیچ دیا۔ اپنے دو بیل بیچ دیے اور جب گھر میں فاقوں نے ڈیرے ڈالے تو عبدالخالق پھیپھڑوں کے مرض میں مبتلا ہو چکا تھا۔

اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کسی کی رہی سہی زمین پر کام کرتا۔ بے چاری ریشماں نے اس موقع پر کر ہمت باندھی۔ اس نے پاس کے زمینداروں کے کھیتوں میں کام کرنا شروع کر دیا۔ وہ ابھی جوان تھی۔ خوب صورت بھی تھی۔ دو بچوں کی ماں مشکل سے لگتی تھی۔

کئی ہاتھ اس کی طرف بڑھے، کئی ہوس بھری آنکھوں نے اسے دیکھا۔ کئی ترغیب آمیز زبانوں نے اسے ان راستوں پر کھینچنا چاہا۔ جن پر چل کر وہ عورت نہ رہتی لیکن ریشماں کو اپنا عورت پن عزیز تھا۔ اس نے ہر ترغیب کو نظر انداز کر دیا۔ سارا دن کھیتوں میں کام کر کے اسے جو ملتا تھا اس سے اس کا اور اس کے گھر کا پیٹ مشکل سے بھرتا تھا۔ عبدالخالق کی بیماری بڑھی تو ریشماں نے اس کے علاج کے لیے رہی سہی زمینیں بھی بیچ دیں۔ مگر وہ پھر بھی نہ بچ سکا۔

جب راولپنڈی کے ایک اسپتال سے ریشماں عبدالخالق کی لاش لے کر آئی تو اس کے سامنے مستقبل کا عفریت منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ اسے اپنے دونوں بیٹوں کی پرورش اکیلے ہی کرنا تھی۔ عبدالرحیم سات برس کا تھا اور عبدالرحمان پانچ برس کا۔

عبدالرحیم کو پڑھنے کا شوق تھا۔ وہ نور پور میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا۔ عبدالرحمان ابھی اسکول داخل نہیں ہوا تھا۔ ریشماں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ بے شک اسے فاقے کرنے پڑیں لیکن وہ اپنے بچوں کو ضرور پڑھائے گی۔ شوہر کی موت نے اسے کچھ دن ضرور پریشان کیا تھا لیکن اس نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا۔ کمر ہمت کسی اور زندگی کی اس کشمکش کا مقابلہ کرنے لگی۔

شہر کا سائبان سر سے ہٹا تو اسے اندازہ ہوا کہ زمانے کی تیز دھوپ کتنی کڑی ہے۔ محنت مشقت نے اس کا رنگ روپ سنولا دیا تھا لیکن جوانی باقی تھی۔ زمانہ اس جوانی کو للچائی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے جیسے خود کو بچا کر رکھا یہ وہی جانتی تھی۔ کھیتوں سے کام کے ساتھ اس نے مکان کے ساتھ بچ جانے والے نصف ایکڑ کے ٹکڑے پر سبزی لگائی۔ اس کی فروخت سے اتنے پیسے ملنے لگے کہ اس کے دونوں بیٹوں کی تعلیم کا خرچ پورا ہونے لگا تھا۔

اپنی محنت سے وہ جو کرتی تھی اس سے گھر کی گاڑی چلتی تھی۔ ساتھ ہی وہ کچھ نہ کچھ پس انداز کرلیتی تھی گھر کی ضرورت پوری کرنے کے لیے اس نے بکریاں اور مرغیاں پال لی تھیں۔ ان کی دیکھ بھال اور کھلائی پلائی اس نے عبدالرحیم اور عبدالرحمان کے سپرد کردی تھی۔ وہ بچے تھے لیکن گاؤں کے بچے تھے کم عمری کے باوجود کچھ نہ کچھ کرتے رہتے تھے۔ عبدالرحیم بچپن سے تیز اور ہوشیار تھا۔ اسے ہمہ وقت پیسے جمع کرنے کی دھن لگی رہتی تھی۔

ایک روز اس نے ماں کو فخر سے اپنا گلا دکھایا۔ جو ایک پیسے کے سکوں سے بھرا تھا۔ (اس زمانے میں ایک پیسے کی اہمیت آج کے ایک روپے سے زیادہ ہوا کرتی تھی) اس نے گلا توڑ اندر سے ایک پیسے کے خاصے سکے برآمد ہوئے تھے۔ یعنی اس وقت کے حساب سے چھ روپے کیوں کہ اس زمانے میں ایک روپے میں سولہ آنے ہوتے تھے اور ہر آنے میں چار پیسے۔ ماں حیرت زدہ رہ گئی تھی اتنی رقم وہ مشکل سے ہفتے بھر میں کماتی تھی۔ اس نے عبدالرحیم سے پوچھا۔ ”تم نے اتنی رقم کیسے جمع کی۔“

اس نے فخر سے بتایا۔ میں نے روز ایک انڈہ بچایا اور اسے بیچ کر یہ پیسے جمع کیے۔

ریشماں روز صبح ناشتے میں دونوں بیٹوں کو ایک ایک ابلا انڈا دیتی تھی۔ عبدالرحمان اپنا انڈہ کھا لیتا تھا اور عبدالرحیم کہتا کہ وہ اسکول سے باہر کھائے گا مگر وہ اسے کھانے کے بجائے اسکول میں کسی لڑکے کو بیچ دیا کرتا تھا۔ اس سے حاصل ہونے والی رقم وہ جمع کرتا تھا اب اس رقم سے وہ اپنے لیے نیا یونی فارم، جوتے اور کتابوں کا بستہ لیتا۔ ریشماں خوش ہوئی تھی لیکن اس وقت اسے عبدالرحیم کی بات سے دھچکا لگا جب اس نے ماں سے کہا کہ اس رقم سے صرف اس کے کپڑے، جوتے اور بیگ آئے گا۔ عبدالرحمان کا نہیں۔

”ماں..... یہ رقم صرف میری ہے کیونکہ میں نے جمع کی ہے۔“

”عبدالرحمان تیرا چھوٹا بھائی ہے۔“ ماں نے سمجھایا۔ ”اور یہ رقم تو کافی ہے۔“

مگر عبدالرحیم کسی صورت نہیں مانا۔ مجبوراً ماں نے عبدالرحمان کے لیے یونیفارم، جوتے اور بستے کے لیے رقم اپنی تنخواہ سے لی۔ عبدالرحیم کی آدھی رقم بچ گئی تھی۔ جو اس نے سنبھال کر رکھ لی۔ یہ رقم وہ اسکول کے بچوں کو قرض دیا کرتا تھا اور ہر دس پیسے پر ایک پیسہ زیادہ لیتا تھا۔

کچھ عرصے میں اس کے پاس اتنی رقم ہوگئی کہ اس نے لڑاکا نسل کے دو جوڑے لے لیے اور ان کی پرورش کرنے لگا۔ اس قسم کے لڑاکا مرغ اچھی قیمت پر بک جاتے تھے۔ اس نے دونوں مرغ پچاس روپے میں بیچ دیے۔ اس رقم سے اس نے ایک بکری لے لی اور پھر جوڑے لے آیا بکری اس نے ماں کے حوالے کردی۔ اس شرط پر کہ اس کا آدھا دودھ اسے دے گی۔ یہ دودھ بھی عبدالرحیم

بیچ دیا کرتا تھا اس کی کاروباری صلاحیتیں حیران کن تھیں اس وقت اس کی عمر صرف دس سال تھی۔

اگلے سال مرغ بیچ کر وہ ایک بکرا اور ایک بکری لے آیا۔ خدا نے زمین بھی بے حد زرخیز دی تھی۔ جہاں پانی کا چھینٹا پڑتا تھا وہاں کچھ نہ کچھ سبزہ الگ ہی آتا تھا اس زمانے میں بارشیں بھی بے حساب ہوا کرتی تھیں۔ جھڑی لگتی تھی تو ہفتوں رکنے کا نام نہیں لیتی تھی اب تو بارشیں بھی سکڑ گئی ہیں۔ گھنٹے دو گھنٹے تک ہوگئی یا سارا دن وقفے وقفے سے کچھ بارش ہوگئی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ اگلے برس تک عبدالرحیم کی بکریوں کی تعداد بڑھ گئی تھی کیونکہ چرنے کے لیے سبزے کی کوئی کمی نہیں تھی۔

عبدالرحیم نے دو بکرے خاص طور سے پالے ان کو خوب کھلایا پلایا۔ وہ روز بھاڑ جھونکنے والے کے پاس جا کر اس سے بچے کھچے چنے اور دانے لے آتا۔ بکروں کی پرورش ان سے کرتا۔ دو سال میں وہ موٹے تازے ہوگئے۔ پھر جب بکرا عید قریب آئی تو ایک روز وہ ماں کے ساتھ نئے آباد ہونے والے شہر اسلام آباد کی طرف گیا اور ایک سرکاری افسر نے اس کے دونوں بکرے منہ مانگے داموں لے لیے کیونکہ وہ خود بھی اپنے سائلوں سے منہ مانگے دام لیا کرتا تھا۔ عبدالرحیم اس سرکاری افسر کے ٹھاٹھ بڑی سی کوٹھی اور نوٹوں سے بھرا بٹوہ دیکھ کر سخت متاثر ہوا تھا۔ اس نے سرکاری افسر سے پوچھا۔

”جناب افسر بننے کے لیے کتنا پڑھنا پڑتا ہے۔“

”بہت زیادہ..... پہلے گریجویشن کرو۔ پھر پی سی ایس کا امتحان دو..... گریجویشن سمجھتے ہو نا۔“

”کیوں نہیں جی..... میں چھٹی جماعت میں پڑھ رہا ہوں۔“ عبدالرحیم نے فخر سے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے پوری ۲۰ جماعتیں..... پر پی سی ایس کا کیا مطلب ہے صاحب۔“

”پاکستان سول سروس۔“ افسر نے جواب دیا۔ ”اس کا امتحان دے کر تم سرکاری افسر بن سکتے ہو۔“

عبدالرحیم نے اس وقت فیصلہ کرلیا کہ وہ سرکاری افسر بنے گا۔ اس کے لیے پڑھنا ہی تو تھا اور وہ پڑھنے کے معاملے میں اسکول کا ہوشیار ترین بچہ تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اتنے اچھے نمبروں کے پیچھے اس کے چھوٹے موٹے تحائف کا ہاتھ بھی تھا۔ کبھی انگریزی کے استاد کے لیے انڈے لے جاتا تھا اور کبھی ریاضی کے استاد کے لیے دودھ لے جاتا تھا۔

ہیڈ ماسٹر کے گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی کر دیا کرتا تھا۔ ساتویں تک اس نے شاندار نمبر حاصل کیے تقریباً ہر بار وہ اسکول میں پہلے نمبر پر آیا تھا۔ مڈل یعنی آٹھویں کے پرچے بورڈ کے تھے لیکن اس کے اسکول میں تھے اس لیے اسے ایک بار پھر امتیازی پوزیشن حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ تعلیم کے ساتھ ہی اس نے اپنا کام بھی جاری رکھا۔ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی وہ محفوظ کرتا جا رہا تھا اسے وہ کالج کی تعلیم کے لیے استعمال کرتا۔

عبدالرحمان اس سے ایک کلاس پیچھے تھا وہ محنتی طالب علم تھا لیکن زیادہ ذہین نہیں تھا۔ امتیازی نمبر حاصل کرتا تھا لیکن اس نے کوئی پوزیشن حاصل نہیں کی تھی۔ البتہ کسی کلاس میں رہا بھی نہیں تھا بلکہ دوسری جماعت میں اس نے اتنے اچھے نمبر حاصل کیے تھے کہ اسے چوتھی کلاس میں ترقی دے دی گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ عبدالرحیم سے صرف ایک سال پیچھے تھا۔

میٹرک کے امتحانات میں عبدالرحیم نے اتنی جان ماری کہ وہ پورے بورڈ میں ساتویں نمبر پر آیا تھا۔ اس زمانے میں اس کی تصویر اخبار میں چھپی تھی۔ اسے راولپنڈی کے بہترین کالج میں داخلہ ملا تھا۔ اس نے ہوسٹل میں رہائش رکھی۔ اپنا مضمون کامرس رکھا اور چار سال بعد اس نے شاندار نمبروں سے بی کام مکمل کیا اور پی سی ایس تیاری میں لگ گیا۔ تعلیم کے دوران وہ کماتا بھی رہا تھا۔ اس لیے اسے ماں کی مدد کی ضرورت نہیں پیش آئی شاید اسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وجہ سے وہ پورے عرصے میں تین چار بار ہی گاؤں گیا تھا۔ حالانکہ وہ چاہتا تو ہر ہفتے گاؤں جا سکتا تھا لیکن گاؤں جانے کے بعد وہ اتوار کے دن ایک جنرل اسٹور پر حساب کتاب کا کام کرتا تھا۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں جب کالج بند ہو جاتے تھے تو وہ مری چلا جاتا۔ وہاں اس کے ایک چاچے کا بیٹا ہوٹل میں سپر وائزر تھا۔ ان دونوں ملازموں کی مانگ بڑھ جاتی تھی۔ دو مہینے وہ مری میں کام کر کے اتنا کما لیتا تھا کہ باقی سال اپنے خرچے پورے کر لیا کرتا تھا۔ پی سی ایس کی تیاری کے دوران اس نے ایم کام میں داخلہ لے لیا۔ داخلہ اسے پنجاب یونیورسٹی میں ملا تھا۔ اس کے لیے یہ دور بے حد سخت تھا۔ اسے نہ صرف پی سی ایس کی تیاری کرنا تھی بلکہ اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے کام بھی کرنا تھا۔

یونیورسٹی کے بعد وہ ایک فرم میں شام کے وقت کام کرنے لگا اس زمانے میں بے روزگاری اتنی عام نہیں تھی۔ خاص طور سے پڑھے لکھے افراد کو آسانی سے ملازمت مل جایا کرتی تھی۔ اس ملازمت سے اسے اتنی تنخواہ مل جاتی تھی کہ ہوسٹل کے اخراجات اور فیس وغیرہ آرام سے ادا ہو جاتی تھی۔ اصل مقصد پی سی ایس کی تیاری کے لیے وقت نکالنا ہوتا تھا۔ صبح سات سے تین بجے تک وہ یونیورسٹی میں ہوتا تھا۔ چار سے رات کے آٹھ بجے تک فرم میں جاب کرتا تھا۔ وہاں سے آنے کے بعد کھانے اور اگلے روز کی تیاری میں نو بج جاتے تھے اس کے بعد وہ رات ایک بجے تک پڑھا کرتا تھا۔

اسے سونے کے لیے صرف پانچ گھنٹے ملتے تھے۔ اس کے علاوہ اسے صرف اتوار والے دن دیر تک سونے کا موقع ملتا تھا۔ ایک سال کا عرصہ اس نے بے حد مصروفیت میں گزارا تھا۔ خوش قسمتی سے ایم کام کے سال اول کے امتحانات کے بعد پی سی ایس کے پیپرز تھے۔

ان کی تیاری کے لیے اس وقت مل گیا تھا۔

اس کے بعد وہ دوسرے سال کی تیاری میں لگ گیا۔ تقدیر اس پر مہربان تھی جب تک وہ فائنل کے امتحانات دیتا اس کی ملازمت کے لیے کال آ گئی تھی۔ اس نے محکمہ خزانہ کا انتخاب کیا تھا۔ کیونکہ اس کا بیک گراؤنڈ خاص نہیں تھا اس لیے وہ معمولی پرمٹ حاصل کر سکا تھا۔

اس دوران میں عبدالرحمان بی ایس سی کر کے ایک کالج میں ایم ایس سی کر رہا تھا۔ ماں نے اس کی تعلیم کے لیے اپنا گاؤں والا مکان بیچ دیا تھا۔ دونوں ماں بیٹے ایک تنگ و تاریک سے مکان میں رہ رہے تھے۔ اس وقت تک عبدالرحیم کو اسلام آباد میں بنگلہ مل چکا تھا لیکن اس نے ماں یا بھائی کو اپنے پاس آ کر رہنے کی دعوت نہیں دی تھی۔ اس لیے انہوں نے بھی اس سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔

عبدالرحمان کالج کے بعد ٹیوشنیں پڑھاتا تھا اس سے جو آمدنی حاصل ہوتی تھی اس سے ماں بیٹے گزارا کرتے تھے۔ ایم ایس سی کرنے کے بعد عبدالرحمان نے ایم فل کے لیے پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ماں کے ساتھ لاہور آ گیا۔ اگلے دو سال اس کے لیے خاصے سخت گزرے۔ بعض دفعہ دونوں ماں بیٹے کو دن میں ایک بار کھانے پر گزارا کرنا پڑا تھا۔ پھر حالات بہتر ہونے لگے۔

عبدالرحمان کو یونیورسٹی میں لیکچر شپ مل گئی۔ پانچ سال میں وہ اسسٹنٹ پروفیسر ہو چکا تھا۔ اس نے پی ایچ ڈی بھی مکمل کیا تھا۔ ایک سال کے لیے بیرون ملک ایک یونیورسٹی میں فیلو شپ بھی کر آیا تھا۔ اسے یونیورسٹی کی طرف سے گھر مل گیا تھا۔ ماں بیٹے نے اچھے حالات دیکھے تو ماں کو بیٹے کی شادی کی فکر ستانے لگی۔ اس وقت عبدالرحیم نے بھی ان سے تعلقات خوشگوار کر لیے تھے کیونکہ بھائی اچھا مقام حاصل کر چکا تھا۔

اس نے ماں سے کہا کہ پہلے اس کی شادی کرائیے۔ گاؤں میں ان کے رشتے کے چاچے کی لڑکیاں تھیں۔ ماں نے بیٹوں سے کہا۔ ”ان میں سے جسے پسند کرا سے بیاہ کر لے آتی ہوں۔“

”چاچے رضوان کی لڑکیاں۔“ عبدالرحیم نے حقارت سے کہا تھا۔ ”وہ اس قابل ہیں کہ ہمارے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکیں۔ میرے لیے کسی بڑے گھر میں رشتہ تلاش کرو۔ میں اب اعلیٰ سرکاری افسر ہوں۔ گاؤں کی کسی جاہل لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا۔“

عبدالرحمان نے ماں سے کہا۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ پر ماں کیا ایک ان پڑھ لڑکی میرے ساتھ رہ سکے گی کیا وہ میرا مزاج سمجھ سکے گی اور کیا وہ میرے بچوں کی ٹھیک سے پرورش کر سکے گی۔ آگے جو تمہاری مرضی۔“

مجبوراً ماں نے چاچے کی لڑکیوں کا خیال ذہن سے نکال دیا۔ پہلے عبدالرحیم نے اسلام آباد کے ایک اونچے جاگیر دار گھرانے کی لڑکی سے شادی کی۔ اس شادی میں ماں مہمانوں کی طرح شریک تھی۔ البتہ عبدالرحمان کی شادی اس نے خود طے کی تھی۔

یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی زرینہ کی شادی عبدالرحمان سے ہوئی تھی۔ زرینہ بھی کالج میں لیکچرر تھی۔ ماں نے اسے دیکھا اور عبدالرحمان کے لیے پسند کر لیا۔ اس نے ماں کی پسند کو پسند کر لیا۔ شاید اس وجہ سے اس کی زندگی سکھ سے گزرنے لگی تھی۔

عبدالرحیم زیادہ تر اسلام آباد میں رہا۔ ایک دو بار وہ باہر بھی گیا لیکن جلد کوشش کر کے واپس آ گیا تھا۔ اسے جو مواقع اسلام آباد میں میسر تھے وہ کہیں اور کہاں بن سکتے تھے۔ شادی کے تین سال تک دونوں میاں بیوی نے اولاد سے پرہیز کیا تھا اس کے بعد ان کے ہاں پہلا بیٹا پیدا ہوا تھا۔ اس وقت تک عبدالرحمان دو بچوں کا باپ بن چکا تھا۔

پروفیسر بننے کے بعد اسے ایک بار پھر باہر جانے کا موقع ملا تھا۔ اس کی تیسری اور دوسری بیٹی کینیڈا میں پیدا ہوئی۔ وہاں تین سال رہنے کے بعد وہ واپس آ گیا۔ ماں بھی اس کے ساتھ گئی تھی۔ واپس آتے ہی وہ اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئی۔ اب وہ گاؤں کی معمولی ریشماں نہیں تھی بلکہ اکیس گریڈ کے افسر اور یونیورسٹی کے پروفیسر کی ماں تھی اسے میانی صاحب میں دفنایا گیا تو اس کے جنازے میں ہزاروں لوگ تھے۔

ماں کے جنازے میں عبدالرحیم لاہور آیا تو اسے یہ شہر اچھا لگا تھا۔ لاہور نے پہلے سے کہیں زیادہ وسعت اختیار کر لی تھی۔ اسے لاہور اچھا لگا تو اس نے یہاں رہنے کا فیصلہ کیا۔ اسلام آباد کے سرد روکھے ماحول سے اسے بے زاری محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے عبدالرحمان سے کہا تو اس نے بتایا کہ ماڈل ٹاؤن میں کچھ سستے پلاٹ مل رہے ہیں۔ وہ بھی لینا چاہتا ہے لیکن اس کے پاس اتنی گنجائش نہیں ہے کہ ایک ہزار گز کا پلاٹ اکیلے لے سکے۔ عبدالرحیم نے اسے فوراً پیشکش کی۔ ”میرے ساتھ مل کر لے لو۔“

زندگی میں پہلی بار دونوں بھائیوں نے کوئی مشترک شے لی تھی۔ ہزار گز کے پلاٹ پر عبدالرحیم نے فوراً اپنے حصے میں کوٹھی کی تعمیر شروع کرا دی تھی۔ عبدالرحمان بے خبر رہا تھا کہ اس نے نصف کے بجائے چھ سو گز کا ٹکڑا لیا تھا اور جب تک اسے خبر ہوئی تعمیر مکمل ہو چکی تھی۔

پیسے دونوں نے برابر کے لگائے تھے۔ اس نے بھائی سے شکوہ کیا کہ اس نے اپنے حصے سے بڑھ کر تعمیر کیوں کی۔

”تم نے بھی ماں کا مکان بیچ کر کھا لیا۔ میں نے تو کوئی شکوہ نہیں کیا۔“ عبدالرحیم بے پروائی سے بولا۔ ”ایک ذرا سا حصہ کیا زیادہ لیا تم شکایت کرنے آ گئے۔“

”بھائی زیادتی نہ کرو۔“ عبدالرحمان نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”ماں اگر میرے ساتھ رہی تو اس پر تمہیں کوئی اعتراض نہیں تھا پھر ایک مکان کی آڑ میں تم نے میری زمین کیوں دبالی۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عبدالرحیم ہنسا۔ ”اگر تمہیں اس پر اعتراض ہے تو تم شوق سے عدالت میں جا سکتے ہو۔ ویسے ایک پیشکش ہے۔ اپنی چار سو گز زمین مجھے بیچ دو۔ اسی قیمت پر۔ جس پر لی تھی۔“

دراصل عبدالرحیم ایک چکر میں آ گیا تھا۔ جس سے نکلنے کے لیے اسے بے دریغ رقم خرچ کرنا پڑی تھی۔ اس کو پتا تھا کہ یہ نوکری رہی تو وہ اس سے دوگنا کما لے گا نوکری چلی گئی تو کچھ نہیں رہے گا۔ اسی وجہ سے اس کے پاس رقم کم پڑ رہی تھی اور اسے بھائی کے ساتھ شراکت میں پلاٹ لینا پڑا۔ ورنہ یہ لوکیشن اسے اتنی اچھی لگی تھی کہ وہ پورا پلاٹ اکیلے ہی لینا چاہتا تھا۔

اسی وجہ سے اس نے تعمیر میں زیادہ زمین ہتھیالی تھی اور بقیہ حصے کو اس کا ارادہ عبدالرحمان سے لے کر لان بنانے کا تھا۔ چھ سو گز کا رقبہ تو کوٹھی اور سوئمنگ پول نے گھیر لیا تھا۔ یہ اس کے بچوں کے لیے تھا۔ دونوں لڑکے اور دونوں لڑکیاں تیراکی کے شوقین تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح بھائی مان جائے گا۔

عبدالرحمان جانتا تھا کہ سو گز کے اس ٹکڑے کے لیے عدالت میں جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس سے کئی گنا زیادہ وہاں خرچ ہو جائے گا۔ اس کا بھائی تو مقدمے بازی کا تحمل ہو سکتا تھا وہ نہیں۔ ساتھ ہی اس نے فیصلہ کیا کہ سو گز کی وجہ سے وہ چار سو گز سے دست بردار نہیں ہو گا۔ یہ جگہ اسے بھی اچھی لگی تھی اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ”بھائی تم خریدی ہوئی قیمت کی بات کر رہے ہو۔ میں اس جگہ کو چار گنا زیادہ قیمت پر بھی تمہارے ہاتھ نہیں بیچوں گا۔“

اس نے بینک سے قرض لے کر اس زمین پر مکان بنوانے کا سوچا لیکن پھر اسے اپنے بچوں کی تعلیم کا خیال آیا اس کا بڑا بیٹا اسکول جانے لگا تھا۔ اس سے چھوٹی بیٹی اس سال اسکول میں داخل ہو گئی۔ ان کی اعلیٰ تعلیم کے لیے اس نے انشورنس پالیسی لے رکھی تھی۔ ان کا خاصا پریمیم جاتا تھا۔ زرینہ پھر ماں بننے والی تھی اس کے خرچے الگ تھے۔ بھائی سے مقابلے کے چکر میں وہ اپنے بچوں کا مستقبل تباہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔

وقت کا پہیہ سست رفتاری سے گھومتا رہا۔ عبدالرحمان کے دو بیٹے اور ہوئے۔ اس کی اولادیں تعلیم حاصل کرتی رہی تھیں۔ گھر میں انہیں علمی فضا ملی تھی۔ جہاں ہر وقت کتابوں کا چرچا ہوتا تھا۔ اس نے خاصی شاندار لائبریری بنائی تھی۔ کتابیں ہی ان میاں بیوی کا اوڑھنا بچھونا تھیں۔

زرینہ نے بھی اپنے مضمون میں پی ایچ ڈی کر لیا تھا۔ بچوں کے باوجود وہ علم حاصل کرنے سے غافل نہیں ہوئے تھے۔ زرینہ بھی یونیورسٹی میں آ گئی تھی۔ ماں باپ کی دیکھا دیکھی بچے بچی تعلیم کی طرف راغب تھے۔ بڑے بیٹے عبدالعزیز نے اولیول میں ٹاپ کیا تھا۔ اس سے چھوٹی بہن اور بھائی بھی اپنی اپنی کلاسوں میں اول ہی آئے تھے۔ اسکول کے درجہ نصاب سے ہٹ کر میاں بیوی بھی بچوں کو پڑھاتے رہتے تھے۔

دوسری طرف عبدالرحیم کے بچے اسلام آباد کے اعلیٰ ترین اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ٹیوشنیں الگ تھیں۔ انہوں نے گھر میں ہمہ وقت دولت اور اختیارات کی باتیں دیکھی تھیں اور یہی ان کے ذہنوں میں بس رہی تھیں تعلیم سے ان کی دلچسپی اتنی تھی کہ انہیں اسکول یا کالج جانا ہے اور ایک ڈگری لے لینی ہے۔ ورنہ ان کے مشاغل وہی تھے جو کرپٹ سرکاری افسران کے بگڑے ہوئے بچوں کے ہوتے ہیں۔ دولت اور باپ کے اختیار نے انہیں بے لگام کر رکھا تھا۔

بڑے بیٹے عمران نے مشکل سے اسکول پاس کیا۔ اس کے بعد کالج میں وقت ضائع کرتا رہا۔ مجبوراً باپ نے اسے بزنس کرا دیا لیکن وہ بزنس کے بجائے باہر جانے کے چکر میں تھا۔ اس نے جعلی

ڈگریاں بنوائیں اور ایک معروف یونیورسٹی کی ایم بی اے کی ڈگری بنوائی جس کا بیرون ملک تک میں نام تھا۔ اس ڈگری کا باقاعدہ ریکارڈ تھا اور اس کے لیے عمران نے باپ کی دی ہوئی رقم استعمال کی پھر اس نے امریکہ میں مزید تعلیم کے لیے درخواست بھیج دی۔

اس زمانے میں امریکی ویزہ اتنی مشکل سے نہیں ملتا تھا خاص طور سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ آسانی سے امریکہ چلے جاتے تھے۔ عمران کو بھی ویزا مل گیا اس نے روانگی سے صرف دو دن پہلے ماں باپ کو بتایا۔ انہوں نے اس کی سخت مخالفت کی مگر عمران امریکہ جانے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اس کا تعلیم حاصل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا وہ تو ڈالر کمانے اور پھر اس سے عیاشی کرنے کے چکر میں تھا۔ اس لیے تعلیم کا پہلا سیمسٹر مکمل ہونے سے پہلے ہی سلپ کر گیا۔

عمران سے چھوٹا کامران زیادہ ہوشیار تھا۔ اس نے امریکہ جانے کے بجائے یہیں عیاشی سے زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ باپ کے پاس بدعنوانی کی بے پناہ دولت تھی۔ دونوں ہاتھوں سے ساری عمر لٹاتے رہتے تب بھی ختم نہ ہوتی۔ گریجویشن کر کے کامران نے لاہور میں گاڑیوں کا شوروم کھول لیا اس نے ایک معروف کارساز کمپنی کی ڈیلر شپ حاصل کر لی اور لاہور میں رہائش اختیار کر لی۔

اس کا اپنے چچا کے گھر آنا جانا تھا اور اس نے دوسرے نمبر کی لڑکی کو پسند کر لیا تھا۔ درحقیقت چچا کے ہاں وہ آتا اسی مقصد سے تھا ورنہ اس گھر میں اور اس کے ماحول میں کامران کے لیے کوئی دلکشی نہیں تھی۔ سوائے ایک کے وجود کے۔ اسے یقین تھا کہ اپنی دولت مندی اور پرکشش شخصیت سے وہ آسیہ کا دل جیت لے گا۔

کامران کے بعد مونا تھی۔ مغرور اور جتنی حسین تھی اس سے زیادہ نظر آنے کی کوشش کرتی تھی۔ دوران تعلیم ہی یونیورسٹی میں اس نے اپنے کلاس فیلو کو پسند کر لیا۔ وہ ایک بڑے بیوروکریٹ کا بیٹا تھا اس کا باپ محکمہ داخلہ میں سیکریٹری تھا۔ اس لیے مونا کے باپ نے اس کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ جیسے ہی مونا نے گریجویشن کیا اس کی دھوم دھام سے رخصتی کر دی گئی تھی۔ یہ اسلام آباد کی چند یادگار ترین شادیوں میں سے ایک تھی۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ ایک غریب ملک کے سرکاری افسر کی بیٹی کی شادی ہے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی شہزادی رخصت ہو کر جا رہی ہو۔ اسے تحفے میں قیمتی کاریں اور جواہرات سے مزین سیٹ ملے تھے۔

عبدالرحمان اس دھوم دھام کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ وہیں اسے اپنے تحفے کی بے وقعتی کا احساس ہوا۔ بیجی کے لیے سونے کا ایک سیٹ لایا تھا۔ ساڑھے تین تولے کا اپنی حیثیت کے مطابق مگر عبدالرحیم کے معیار سے یہ کچھ نہیں تھا۔ اس نے ایک سرسری سی نظر دیکھ کر اسے ایک طرف رکھ دیا تھا۔ عبدالرحیم کی بیوی سلطانہ نے حقارت سے سیٹ دیکھا۔

”لوگ تو ہماری بچی کو کاریں اور ہیرے کے سیٹ دے رہے ہیں۔“

”بھابھی صاحبہ وہ سب حرام مال والے لوگ ہیں جو مزید حرام کمانے کے لیے اسے تحفے میں کاریں اور ہیرے کے سیٹ دے رہے ہیں۔ یہ تحفے اصل میں بھائی صاحب کی پوزیشن کو دیے جا رہے ہیں لیکن یہ معمولی سا سیٹ میں انتہائی محبت سے اپنی بیجی کے لیے لایا ہوں۔“

اس سچائی پر دونوں میاں بیوی کے منہ بن گئے تھے لیکن وہ اس سچائی کو عبدالرحمان کے منہ پر جھٹلا نہیں سکتے تھے۔ وہ لوگ غیروں کی طرح سکی بیجی کی شادی میں شرکت کر کے چلے آئے۔ آسیہ نے سگے چچا اور چچی کا یہ روپ دیکھا تو اسی لمحے وہ جواب سوچ لیا تھا جو اسے کامران کو دینا تھا۔ جب اگلی بار کامران اس سے ملنے آیا تو اس نے صاف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لفظوں میں اسے کہہ دیا۔

"سوری کامران میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔ جس گھر میں میرے ماں باپ کی عزت نہ ہو وہاں میری کیا وقعت ہو سکتی ہے۔"

"لیکن تمہیں میرے ساتھ رہنا ہے میرے گھر والوں کے ساتھ نہیں۔" کامران نے بے تابی سے کہا۔

"لڑکی ایک فرد کے پاس نہیں ایک خاندان کے پاس جاتی ہے۔" آسیہ نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا پھر کامران نے بہت سر مارا لیکن آسیہ کی ناں۔ ہاں میں نہیں بدلی۔ دولت کی اس کی نظروں میں ویسے بھی خاص اہمیت نہیں تھی اسے کامران اچھا لگا تھا اور پھر اس کا کزن تھا مگر چچا اور چچی کا روپ دیکھ کر اس نے اپنا فیصلہ بدل دیا تھا۔ جب عبدالرحمان کو اس کے فیصلے کا علم ہوا تو اسے خوشی ہوئی تھی اس نے اور زرینہ نے اپنے پانچوں بچوں کی پرورش اس طرح کی تھی کہ وہ اپنی زندگی کے سارے اہم فیصلے خود کریں۔

عبدالعزیز نے ہائی اسکول کے بعد سرجن بننے کا فیصلہ کیا تھا اسے اعلیٰ ترین نمبروں کی وجہ سے ایک میڈیکل یونیورسٹی میں با آسانی داخلہ مل گیا تھا۔ چھ سال میں جنرل سرجن بننے کے بعد اس نے نیورو سرجری کا انتخاب کیا اور اس کی تعلیم کے لیے برطانیہ چلا گیا۔ جہاں اس نے رائل سرجن کالج سے نیورو سرجری کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اسے ایک اسپتال میں کام کرنے کی پیشکش ہوئی وہاں اس نے تجربہ حاصل کرنے کے لیے مزید دو سال گزارے اور پھر واپس وطن آ گیا۔

ان دنوں وہ اپنے کلینک کے ساتھ میو اسپتال کے نیورو سرجری کے شعبے میں کام کر رہا تھا۔ اس نے اپنے پیشے کو کمائی کا ذریعہ نہیں بنایا تھا۔ وہ ہفتے میں چار دن آپریشن کرتا تھا اور ایک دن وہ مفت آپریشن کرتا تھا جو لوگ فیس نہیں دے پاتے تھے وہ اس طرح اس کی خدمات سے استفادہ کرتے تھے۔

آسیہ سے بڑی رضیہ نے باپ کی طرح سائنس کے شعبے کا انتخاب کیا تھا۔ جن دنوں عبدالعزیز برطانیہ میں تھا اس نے رضیہ کی وہاں پی ایچ ڈی کے لیے اسکالرشپ حاصل کرنے میں مدد کی تھی۔ پی ایچ ڈی کے دوران وہ اپنے استاد پروفیسر جوزف کے نزدیک آ گئی تھی۔

پروفیسر جوزف چالیس برس کا تھا۔ تین سال پہلے اپنی اسٹیج کی اداکارہ بیوی کو طلاق دینے کے بعد وہ تنہا زندگی گزار رہا تھا۔ رضیہ اسے اچھی لگی اور جب اس نے رضیہ سے شادی کی خواہش ظاہر کی تو اس نے صاف گوئی سے جواب دے دیا۔ جوزف میں تمہیں پسند کرتی ہوں لیکن تم سے شادی نہیں کر سکتی کیونکہ میرا مذہب مجھے اس کی اجازت نہیں دیتا ہے۔

"کیا مذہب کی تمہارے نزدیک اتنی اہمیت ہے۔" جوزف نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"اس سے بھی کہیں زیادہ۔" رضیہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"اور اگر میں اپنا مذہب بدل لوں۔ مسلمان ہو جاؤں۔"

"تب میں تم سے شادی کروں گی لیکن محض ایک عورت کے لیے اسلام قبول کرنا اچھی بات نہیں سمجھی جاتی۔ ہمارے مذہب میں جبر نہیں ہے۔ پہلے تم مذہب کو سمجھو اور اچھا لگے تو قبول کرو۔ یقین کرو اس صورت میں مجھے کہیں زیادہ خوشی ہوگی۔"

پروفیسر نے رضیہ کے مشورے کو سنجیدگی سے لیا اس نے اسلام کے بارے میں پڑھا۔ پھر وہ یوسف اسلام سے ملا جو کسی زمانے میں معروف پاپ سنگر تھا اس نے اسلام قبول کیا اور اب وہ مسلمان تھا۔ اس نے کہیں زیادہ باعلم پروفیسر جوزف کے سامنے یوں اسلام کی وضاحت کی کہ وہ جب اس کے پاس سے اٹھا تو مسلمان ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا نام یوسف مسلم رکھا رضیہ نے بے حد خوشی سے یہ خبر سنی۔ جب اس نے اپنا تھیسس مکمل کر لیا تو

وہ یوسف مسلم کے ساتھ پاکستان آئی اور اسے ماں باپ سے ملوا دیا۔ اس کی توقع کے عین مطابق ماں باپ یہ سن کر بے حد خوش ہوئے تھے۔ انہوں نے بہ خوشی اس رشتے کی اجازت دے دی اور جب وہ تین مہینے بعد واپس جا رہے تھے تو میاں بیوی بن چکے تھے۔ انہوں نے برطانیہ میں سیٹل ہونے اور تبلیغ اسلام کا فیصلہ کیا تھا۔

آسیہ نے فائن آرٹس کا انتخاب کیا تھا۔ آرٹس کونسل جاتی تھی۔ یہاں فائن آرٹس کی کلاسز ہوا کرتی ہیں اس کا ارادہ تھا کہ گریجویشن کے بعد وہ کسی یونیورسٹی میں داخلہ لے گی یا اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک جائے گی۔

جب اس نے کامران کو فیصلہ کن جواب دیا وہ فائنل کی تیاری کر رہی تھی۔ امتحانات کے بعد اس نے یونیورسٹی کے فائن آرٹس کے شعبے میں داخلہ لیا تھا۔ اگرچہ لڑکیوں کے لیے یہ شعبہ معیوب سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس میں جنس کو بھی موضوع بنایا جاتا ہے لیکن عبدالرحمان نے اسے اجازت دی تھی کہ وہ جو شعبہ اپنے لیے مناسب سمجھے منتخب کرے۔ ماسٹرز کے دوران آسیہ کا ایک رشتہ آیا۔ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر جو عبدالرحمان کے گہرے دوست تھے اپنے بیٹے کا رشتہ لائے۔

ان کی ایک ہی اولاد تھی۔ بیوی کئی سال پہلے گزر چکی تھیں۔ بیٹا نصیر احمد ایجوکیشن منسٹری میں تھا۔ وہ باہر سے اس شعبے میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آیا تھا۔ عبدالرحمان اور زرینہ کو یہ رشتہ مناسب لگا۔ انہوں نے آسیہ سے پوچھا تو اس نے ہاں کر دی۔ ماسٹرز کے بعد وہ بھی رخصت ہو کر چلی گئی۔ آسیہ سے چھوٹا حمیر انجینئرنگ یونیورسٹی میں تھا اور اس سے چھوٹا سمیر آئی ٹی پڑھ رہا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے عبدالرحمان کی ریٹائرمنٹ کا وقت آ گیا تھا اس کی اعلیٰ خدمات اور طلباء میں ہر دل عزیزی کی وجہ سے اسے مزید دو سال کے لیے ایکسٹینشن دینے کی پیشکش ہوئی لیکن اس نے ریٹائر ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کا موقف تھا کہ نئی نسل کو سامنے آنا چاہیے۔ ورنہ علم کی ترقی رک جاتی ہے البتہ اس نے یونیورسٹی کی لیکچرز دینے کی پیش کش قبول کر لی تھی۔

اس سے پہلے بھی اپنے موضوع پر دو کتابیں لکھ چکا تھا اور اب وہ اپنی نئی کتاب پر کام کر رہا تھا لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے وہ اسے مکمل نہیں کر پا رہا تھا۔ عبدالعزیز شادی کے بعد الگ گھر میں شفٹ ہو گیا تھا۔ انہوں نے خود اسے جانے کی اجازت دے دی تھی کیونکہ چار کمروں کے اس مکان میں زیادہ گنجائش نہیں تھی۔

عبدالرحمان کا ارادہ تھا کہ ریٹائرمنٹ سے ملنے والی رقم سے وہ پلاٹ پر اپنا مکان بنوانے کے بعد بیٹے کو بھی اپنے پاس بلوا لے گا لہٰذا جب اسے اپنے فنڈ کی رقم ملی تو اس نے ایک معروف آرکیٹیکٹ فرم سے مکان بنوانا شروع کر دیا۔ عبدالعزیز نے باپ سے کہہ دیا کہ وہ مکان کا اوپری حصہ اپنے خرچ پر بنوائے گا۔ یہ مناسب نہیں کہ باپ سارا خرچ خود کرے۔

ابھی زرینہ کی ریٹائرمنٹ میں وقت تھا اس لیے وہ بدستور یونیورسٹی کے مکان میں رہ سکتے تھے۔ حمیر انجینئرنگ کر کے این ڈی سی میں چلا گیا تھا اور سمیر ایم سی ایس کر کے لاہور کی ایک مقامی سافٹ ویئر کمپنی میں کام کر رہا تھا۔

عبدالرحمان خدا کا بے حد شکر گزار تھا کہ اس کے سارے ہی بچے اپنی اپنی فیلڈ میں اچھے مقام پر تھے۔ اس نے اور زرینہ نے ایک اچھے خاندان میں دو سگی بہنوں سے حمیر اور سمیر کی منگنیاں کر دی تھیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ جب وہ اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو جائیں گے تو ان کی شادی کریں گے۔

ابھی زرینہ کی ریٹائرمنٹ میں دو سال باقی تھے۔

اسی دوران میں عبدالرحیم ریٹائر ہو کر اپنے بنگلے میں شفٹ ہو گیا تھا۔ اس نے کئی بار بھائی کو پیش کش کی کہ وہ اپنے حصے کا پلاٹ اسے بیچ دے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن عبدالرحمان نہیں مانا۔ بلکہ اس نے پلان پر مکان کی تعمیر شروع کروادی تھی۔

عبدالرحیم کے تینوں بچے ان سے دور اپنی دنیا میں مگن تھے۔ کبھی کبھار ملنے آجاتے تھے ورنہ دونوں میاں بیوی اکیلے ہی پڑے رہتے تھے۔ بوریت دور کرنے کے لیے انہوں نے کلبس جوائن کرلیے۔ عبدالرحیم کلب چلا جاتا تھا اور سلطانہ سوشل ورک کرنے والی این جی اوز کی میٹنگز میں شرکت کرتی تھی۔

زرینہ نے وقت پورا ہوتے ہی ریٹائرمنٹ لے لی۔ وہ چاہتی تھی کہ اب اپنے گھر میں رہے۔ اپنا وقت اپنے شوہر' بچوں اور ان کے بچوں کو دے۔ اس وقت تک گھر مکمل ہوگیا تھا۔ نیچے تین بیڈ رومز تھے اور اوپر دو بیڈ رومز یہ مکان ان کے خاندان کے لیے کافی تھا۔ رضیہ نے ایک ہزار پونڈز بھیجے تھے کہ اس رقم سے امی ابو کا بیڈ روم فرنش کیا جائے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد عبدالرحمٰن کی آمدنی میں کمی نہیں آئی تھی اس کی اور زرینہ کی پنشن گزارے کے لیے کافی تھی اس کی کتابوں کی رائلٹی ملتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ مہینے میں دس بارہ لیکچر بھی دیتا تھا اس سے بھی خاصی آمدنی ہوجاتی تھی گویا سکون سے گزر رہی تھی۔

اپنے گھر میں آنے کے چند مہینے کے اندر انہوں نے حمیرا اور سمیر کی شادی بھی کردی تھی۔ حمیر بیوی کو لے کر اسلام آباد چلا گیا۔ اسے وہیں ادارے کی طرف سے رہائش ملی تھی۔ سمیر ماں باپ کے ساتھ تھا اور اوپری منزل عبدالعزیز کے پاس تھی۔ اس کے دو بچے تھے۔ آسیہ کا ایک بیٹا تھا۔ جب وہ سب جمع ہوتے تھے تو گھر کی رونق پر بہار آجاتی تھی۔

دونوں بھائیوں کے گھر کی درمیانی دیوار چھوٹی تھی۔ ذرا اچاک کر دیکھا جاتا تو باآسانی سارا منظر نظر میں آجاتا تھا۔ اکثر ویک اینڈ پر سوائے رضیہ عبدالرحمان کے سارے ہی بچے جمع ہوتے تھے۔ مختصر سے لان میں کھانا کھایا جاتا یا باربی کیو کا انتظام ہوتا تھا۔

سلطانہ اپنی کوٹھی کے ٹیرس یا برآمدے سے یہ سب دیکھا کرتی تھی اور جلتی بھنتی رہتی تھی۔ عبدالرحیم دیکھتا اور سوچتا کہ کاش اس کے ہاں بھی یہ سارے ہنگامے ہوتے۔ اس کے بچے تو جیسے ان میاں بیوی کو بھول ہی گئے تھے۔ مہینوں میں ایک بار جا کر اپنی صورت دکھاتے تھے بڑا بیٹا امریکہ جا کر بالکل ہی بھول گیا تھا وہ ابھی تک روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے ڈالرز خوب کمائے تھے لیکن اس کے لیے اپنے ملک آنا ممکن نہیں تھا۔

کامران نے ایک معروف ماڈل گرل سے شادی کی تھی جو محض تین مہینے چل سکی۔ اب وہ اکیلا رہ رہا تھا اور دوبارہ شادی کی 'حماقت' کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

مونا اپنے شوہر کے ساتھ اسلام آباد میں ہی تھی۔ اسے ماں باپ کے پاس آنا تو ایک طرف رہا انہیں کال کرنے کا وقت نہیں ملتا تھا۔ سب اپنی دنیا میں مگن تھے۔

عبدالرحیم کے پاس بے شمار دولت تھی مگر اتنی دولت کے باوجود آج وہ اپنے وسیع گھر میں اکیلے تھے۔

عید قریب تھی۔ عبدالرحیم کو توقع تھی کہ اس روز اس کے بچے ضرور آئیں گے لیکن یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ سلطانہ کی طبیعت خراب تھی۔ وہ اکیلا ٹیرس میں بیٹھا دھوپ سینکتا رہا اور برابر والے گھر سے آنے والی آوازیں سنتا رہا۔

اچانک اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اس نے زیر لب خود سے کہا۔ ''عبدالرحیم تو نے بھائی کی سوگز زمین لی ہے لیکن تیرے پاس اس زمین میں ایک خوشی بھی نہیں ہے۔''

☆☆☆☆
سچی کہانیاں
☆☆☆☆

تلافی

ہما صفدر

دو دن کی بجائے سات دن گزر گئے مگر وہ کمبخت واپس نہیں آیا تھا۔پھر یکایک پتا چلا کہ پاکستانی فوج کا کھیم کرن پر قبضہ ہوگیا ہے باہر والا پھرے دار بھی کہیں بھاگ گیا تھا۔کلونتی موجود تھی۔پانچ سات فوجی جن کی وردیاں سبز نہیں خاکی تھیں' احاطے میں گھس آئے۔کلونتی کھکھیا کر ہاتھ جوڑنے لگی۔''لے بھیا مجھے مت مارنا۔وہ کلمونہا مجھے یہاں چھوڑ گیا ہے۔''

اس شمارے کے لیے ایک دلگداز سچی کہانی

کھلی کچہری میں کھڑی ہوئی وہ معمر عورت چہرے سے ہی مظلوم لگ رہی تھی۔ چالیس بیالیس سالہ عورت کا زرد چہرہ اور ملگجے کپڑے اس کی غربت کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ عورتوں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ ارد گرد لیڈی پولیس کی عورتیں مستعدی سے چوکس کھڑی باری باری عورتوں کو اندر بھیجنے کا فریضہ ادا کررہی تھیں۔ اندر بھیجنے کے ساتھ ساتھ انہیں ڈانٹ ڈپٹ بھی کررہی تھیں۔ ''سیدھی کھڑی رہو۔ تم قطار سے کیوں نکلی ہو۔ آجاتی ہیں گھروں سے فریاد لے کر.....''

''بی بی اللہ تعالیٰ کا خوف کرو۔ ہم یہاں مٹھائی کھانے تو نہیں آئیں' مجبور ہو کر آئے ہیں۔'' ایک نسبتاً دلیر عورت نے پولیس والی کو غصے سے جواب دیا۔

''اچھا' اچھا خاموش رہو۔ زیادہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔'' پولیس والی شاید ڈر گئی تھی کہ کہیں ساری عورتیں ہی نہ شروع ہوجائیں اس لیے ذرا نرم لہجے میں بولی۔

ہر قسم کی دکھی عورتیں اپنی اپنی درخواستیں پکڑے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چیونٹی کی چال سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ اندر ٹھنڈے کمرے میں وزیراعظم کے سیکریٹری درخواستوں پر حکم لکھ رہے تھے۔ کبھی کہیں ٹیلیفون اٹھا کر متعلقہ محکموں سے بھی موقعہ پر باز پرس کر لیتے۔

اب وہ زرد رو عورت اندر پہنچ گئی تھی۔ اس نے اپنی درخواست سیکریٹری صاحب کے آگے رکھ دی۔ درخواست کے اوپر موٹے موٹے لفظوں میں لکھا ہوا تھا۔ ”مجھے انصاف چاہیے۔ میں ایک غازی کی بیوہ ہوں۔ میری جوان بچی غنڈوں نے اٹھالی ہے۔ میری بچی واپس دلائی جائے۔“ درخواست کے نیچے اس کا نام لکھا تھا۔ راجکماری شیلا دیوی۔

سیکریٹری صاحب نے درخواست پڑھ کر غور سے عورت کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ”بی بی تم کون ہو؟ ہندو ہو یا عیسائی۔“

”میں جی آج سے ایک ماہ پہلے تو مسلمان تھی مگر اب ہندو ہی سمجھ لیں۔“ وہ پراسرار سے لہجے میں بولی۔

”یہ کیا بات ہوئی بی بی! اچھا تم چند منٹ بیٹھو۔ میں یہ درخواستیں دیکھ لوں۔ پھر تم سے بات ہوگی۔ ادھر بنچ پر بیٹھ جاؤ۔“

وہ عورت قطار سے نکل کر ادھر بیٹھ گئی۔ اب دوسری عورتیں آگے آ رہی تھیں۔ اغوا کے کیس، بے گناہ جیلوں میں پڑے ہوئے مظلوم قیدیوں کی بھوک مرتی مائیں، بہنیں دکھوں کی پوٹلیاں اٹھائے کچہری میں انصاف طلب کر رہی تھیں۔

یہ سیکریٹری صاحب ایک جوان عمر آدمی اور حساس دل کا مالک سمیع الدین تھا۔ ہر درخواست پڑھ کر اس کے دل پر چوٹ سی لگتی اور وہ درخواست پر فوری کارروائی کی سفارش لکھتا جس کی منظوری بعد میں وزیراعظم کے قلم سے ہوتی تھی مگر یہ درخواست جو اس راجکماری شیلا دیوی نے پیش کی تھی اک معما بن کر اس کے ذہن میں کھٹک رہی تھی۔ وہ جلد از جلد فارغ ہو کر اس سے تفصیل جاننا چاہ رہا تھا۔

پھر اس نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی سے کچھ بات کی اور اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس بنچ کی طرف بڑھا جہاں وہ عورت خاموش بیٹھی لوگوں کو تک رہی تھی۔ ”آؤ بی بی میرے ساتھ۔ مجھے تفصیل سے بتاؤ کیا بات ہے۔“

وہ عورت اٹھ کر اس کے ساتھ ہو گئی۔

سامنے بنے ہوئے برآمدے میں اسے کرسی پر بٹھا کر وہ بھی پاس بیٹھ گیا۔ اسے اس عورت سے نا معلوم سی ہمدردی ہو رہی تھی۔ ”بی بی! میرا نام سمیع الدین ہے۔ آپ جو بات ہے کھل کر بتائیں۔ میں انشاء اللہ خود وزیراعظم صاحب سے خصوصی طور پر آپ کے لیے انصاف طلب کروں گا۔ بے فکر ہو کر آپ بات کریں۔“

”بیٹے جیتے رہو۔ مجھے تمہارا لہجہ بھی اپنے مرحوم خاوند کی طرح لگ رہا ہے۔ میں سب کچھ ٹھیک ٹھیک بتاؤں گی۔ میں دہلی کے ایک رئیس گھرانے کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ میرا نام راجکماری شیلا دیوی تھا۔ ۱۹۶۵ء ستمبر کی جنگ میں میری عمر بمشکل پندرہ سال کی تھی اور میں میٹرک کی طالبہ تھی۔ ہمارے علاقے میں ایک غنڈہ راجن تھا جس کی دھاک علاقے میں بندھی ہوئی تھی۔ کسی کی عزت محفوظ نہیں تھی۔ وہ بدبخت دکانوں سے غنڈہ ٹیکس وصول کرتا۔ غیر قانونی طور پر منشیات کی خرید و فروخت کرتا اور سب سے بڑھ کر کسی کی بہو بیٹی کی عزت پامال کرنا اس کی جواں مردی تھی۔ ہمارے بڑے بوڑھے اس سے ڈرتے تھے۔ پولیس والوں کو ہاتھ ڈالنے کی جرات نہ تھی۔ ہر قسم کی اخلاقی برائی اس میں موجود تھی۔ مجھے نجانے کیوں اس کے کالے کرتوتوں سے شدید نفرت تھی بلکہ میرا دل چاہتا تھا کہ میں اسے خود اپنے ہاتھوں گولی سے اڑا دوں۔ میں وقتاً فوقتاً اپنی اس نفرت کا اظہار اپنی ہم جماعت لڑکیوں سے کرتی رہتی تھی۔ یہ باتیں اس کے کانوں تک بھی پہنچ گئیں۔ ایک دن میں گھر کے دروازے میں کھڑی تھی کہ وہ آ گیا اور بولا۔ ”شیلا دیوی! بہت غرور ہے تمہیں اپنے آپ پر۔ اب تمہارا یہ غرور راجن ہی توڑے گا۔“ اس وقت اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ شاید وہ نشہ کر کے آیا تھا۔

”جا۔ جا زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے چیخ کر جواب دیا۔ اتنے میں ماتا جی آواز سن کر باہر آ گئی تھیں۔ راجن کو کھڑا دیکھ کر وہ مجھے کھینچ کر اندر لے گئیں اور پھر بہت دیر تک سمجھاتی رہیں کہ شہدوں کے منہ نہیں لگنا چاہیے وغیرہ وغیرہ مگر میرے دل میں نفرت پہلے سے بھی بڑھ گئی تھی۔

دن گزرتے رہے۔ وہ ستمبر کا مہینہ تھا جب اس راجن نے مجھے اسکول سے آتے ہوئے اغوا کر لیا تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں امرتسر کے قصبے کھیم کرن میں تھی۔ پتا نہیں کتنی دیر تک میں بے ہوش پڑی رہی تھی۔ جب ہوش میں آ کر آنکھ کھلی تو میرے پاس ایک بوڑھی عورت بیٹھی تھی۔ میں کچھ دیر ادھر ادھر دیکھتی رہی پھر یکلخت اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”میں کہاں ہوں۔ یہ کون سی جگہ ہے۔“

”چپ! خاموش ہو کے پڑی رہو لڑکی۔ تمہیں راجن چھوڑ گیا ہے یہاں۔ بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ یوں بھی بھاگ کر کہاں جاؤ گی۔ بارڈروں پر تو جنگ لگی ہوئی ہے۔“ وہ خود بخود ہی باتیں کرتی جا رہی تھی۔

دوپہر کو وہ اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ میں نے اٹھ کر ادھر ادھر دیکھا۔ ایک چھوٹا سا دروازہ کھولا تو ادھر باتھ روم تھا۔ اندر جا کر میں نے ہاتھ منہ دھو کر خود کو آئینے میں دیکھا تو میرا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ دو گھونٹ پانی پیا تو حواس قائم ہوئے اور بھوک کا احساس بھی جاگ اٹھا۔ میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ راجن کے آنے سے پہلے ہی اگر نکل جاؤں تو میری عزت محفوظ رہ سکتی تھی۔ یہ سوچتی سوچتی میں باتھ روم سے نکل آئی تو بوڑھی عورت ایک تھال میں بھاجی اور دو روٹیاں رکھ کر لے آئی تھی۔ ”یہ لو روٹی کھالو“ کرخت لہجے میں اس نے کہا اور تھال میری چارپائی پر رکھ دیا۔

بھوک نے نڈھال تو پہلے ہی کر رکھا تھا۔ میں جلدی جلدی کھانے لگ گئی۔ پیٹ میں پانی اور اناج گیا تو کچھ سکون سا محسوس ہوا۔

”بوا جی یہ کون سی جگہ ہے۔“ میں نے بوڑھی کو خوشامدانہ لہجے میں پوچھا۔

”اری یہ کھیم کرن کا قصبہ ہے، ترن تارن کے علاقے میں اور دیکھ تو سہی ہمارے سورما جوانوں نے تو لاہور پر قبضہ بھی کر لیا ہوگا۔ یہ راجن بھی اسی سلسلے میں ادھر گیا ہوا ہے بارڈر کی طرف۔ اسے بھی دعوت نامہ ملا تھا کہ لاہور کے جیم خانہ کلب میں شراب پائیں گے۔ یہ مسلوں کی ناریاں بھی بہت خوب صورت ہوتی ہیں ناں۔ بالکل تمہاری طرح۔“ مجھے یوں لگا جیسے بوڑھے کا دماغ چل گیا ہے۔ خود بخود بولتی جا رہی تھی۔

سارا دن گزر گیا۔ میں یہاں سے نکلنا چاہتی تھی۔ مگر وہ عورت اور دروازے کے باہر لمبی لمبی مونچھوں والا آدمی ہر وقت چوکس رہتے۔ بوڑھی عورت جس کا نام کلونت کور تھا کبھی میرے پاس بیٹھ جاتی اور کبھی اس آدمی کے پاس چلی جاتی مگر جاتے سے وہ باہر سے تالا لگانا نہ بھولتی۔

اب یوں لگ رہا تھا جیسے جنگ اپنے عروج پر ہو۔ دن رات توپوں کی دنادن ہو رہی تھی۔ کان پھاڑ آوازیں بے چین کر دیتیں۔ دوسرے دن دوپہر کو راجن آ گیا۔ وہ کچھ حواس باختہ ہو رہا تھا۔

”کیا ہوا رے راجن۔ لاہور دیکھ آیا ہے تو۔“ بوڑھی عورت بولی۔

”کلونتی تو ایسا کر کہ لڑکی کا دو دن خیال رکھ۔ میں دہلی سے ہو کر پرسوں آ جاؤں گا اور یہ لاہور دیکھنے کی بھی اچھی کہی۔ مسلوں کی فوج نے تو ہمارے آدمیوں کو پوں پیچھے دھکیلا ہے جیسے چیونٹیوں کو سیلاب کا پانی۔ اب تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی جنتا بھی لڑائی میں شامل ہے۔ بڑے سخت ہیں ان کے فوجی۔ لوگ تو علاقہ خالی کر کے بھاگ رہے ہیں۔“

”رام رام! تو پھر ہم کیا کریں گے بھیا۔“ وہ ڈر کر بولی۔

”تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ تم آرام سے رہو یہاں۔ مگر اس کا خیال رکھنا کہیں بھاگ نہ جائے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حرامزادی۔" اتنا کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں گھس گیا۔

میں کھڑکی کے پاس کھڑی سن رہی تھی اور پرماتما کا شکر ادا کر رہی تھی کہ یہ کلمونہا دو دن کے لیے ٹل رہا تھا۔ شاید بھگوان مجھے یہاں سے نکلنے کا موقعہ دے دیں۔

دو دن کی بجائے سات دن گزر گئے مگر وہ کمبخت واپس نہیں آیا تھا۔ پھر یکا یک پتا چلا کہ پاکستانی فوج کا کھیم کرن پر قبضہ ہو گیا ہے باہر والا پہرے دار بھی کہیں بھاگ گیا تھا۔ کلونتی موجود تھی۔ پانچ سات فوجی جن کی وردیاں سبز نہیں خاکی تھیں' احاطے میں گھس آئے۔ کلونتی گھگھیا کر ہاتھ جوڑنے لگی۔ "اے بھیا مجھے مت مارنا۔ وہ کلمونہا مجھے یہاں چھوڑ گیا ہے۔"

"اے بی بی ہم تمہیں کیوں ماریں گے۔ تسلی رکھو۔ بتاؤ یہاں اور کون ہے۔ اور آرام سے رہو۔ ہم عورتوں اور بچوں کو پناہ دیتے ہیں مارتے نہیں۔" ایک فوجی بڑے نرم لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"ایک میں ہوں اور اندر ایک نصیبوں جلی قید ہے۔ راجن بدمعاش اسے یہاں قید کر گیا ہے۔" کلونتی کہہ رہی تھی۔

"ساجد اس عورت کو اندر سے نکالو۔" فوجی نے اپنے ساتھی سے کہا۔

ایک فوجی نے آ کر دروازہ کھولا اور بولا۔ "لڑکی باہر آ جاؤ۔"

میں باہر آ گئی۔ وہ سب کلونتی کے گرد کھڑے تھے۔ ان کے افسر نے مجھ سے پوچھا۔ "تم یہاں کیوں قید ہو۔"

میں نے جلدی جلدی اسے سب بات بتائی تو وہ حیران ہو گیا۔ "اتنی بدمعاشی! تمہارے ماں باپ نے تمہیں ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی۔"

"نہیں جی۔ راجن بہت بڑا بدمعاش ہے اور میرے ماتا پتا جی انتہائی بزدل اور ڈرپوک ہیں۔ وہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

"اچھا! اچھا کوئی بات نہیں۔ تم لوگ آرام سے رہو۔ راستے کھل جائیں گے تو تم اپنے ماں باپ کے پاس چلی جانا۔ ہم لوگ بھی یہاں ہی رہیں گے۔" فوجی افسر نے حویلی میں نظر دوڑا کر اندازہ لگایا۔

پھر وہ لوگ بھی حویلی میں پھیل گئے۔ ایک کمرا میرے اور کلونتی کے پاس تھا۔ صبح شام ان کی لاتگری سے ہمیں کھانا مل جاتا۔ پھر جنگ بندی کی اطلاعیں ملنے لگیں۔ فوجیں اپنے اپنے مقام پر واپس جانے لگیں۔ ان پانچ چھے دنوں میں میں نے مسلمان فوجیوں کا سلوک دیکھا تھا۔ وہ ہمیں اپنی ماؤں بہنوں کی طرح عزت دیتے تھے۔ کلونتی کو ہر شخص ماں جی کہتا جب کہ اس کے اپنے اسے اوبڑھیا کہہ کر پکارتے تھے۔ ان کی شرافت دیکھ کر مجھے اپنے مذہب سے نفرت ہو رہی تھی۔ وہ مذہب جہاں پر میں جب بھی بیمار ہو جاتی تو میری ماتا جی مجھے کچی بھر گائے کا پیشاب پلا دیتی تھی۔ ہماری رسوئی میں ہر صبح گائے کے گوبر کا لیپ کر کے کھانا پکتا تھا جس سے مجھے شدید بو آتی مگر مجبوری تھی کہ وہ میرے ماں باپ کا گھر تھا۔ اور ایک یہ مسلمان تھے جن کی ہر چیز میں صفائی ہوتی۔

پھر پتا لگا کہ جنگ بندی ہو گئی ہے۔ دونوں ملکوں کی فوجیں اپنے اپنے مقام پر واپسی کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔ ان لوگوں نے تمام سامان ٹرک پر رکھ لیا تھا۔ ان کا بڑا فوجی افسر اور ساجد ہمیں خدا حافظ کہنے آئے۔ میرا دل نجانے کیوں اتنا اداس تھا۔ اب مجھے پھر دوبارہ نجانے کہاں جانا پڑے گا۔ وہ راجن کب مجھے چھوڑے گا۔ یہ سوچ کر میرا دل سہما جا رہا تھا۔

"اچھا ماں جی اگر کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دینا۔" ان کا بڑا افسر کلونت کور سے کہہ رہا تھا۔

"نہیں' نہیں بیٹا تم نے تو سگوں سے بڑھ کر سلوک کیا ہے۔ پرماتما تمہیں خوش رکھے۔" اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

پھر وہ میری طرف بڑھا۔ "ہاں بیٹی! تمہارا

کیا خیال ہے۔ اک دو دنوں تک آپ کے لوگ آ جائیں گے۔ وہ آپ کو آپ کے ماں باپ کے پاس پہنچا دیں گے۔" ساتھ اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس ہاتھ کی محبت اور شفقت نے مجھے نجانے کہاں پہنچا دیا۔ میں تڑپ اٹھی۔ "آپ نے مجھے بیٹی کہا ہے۔ آپ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔ وہ راجن بدمعاش مجھے نہیں چھوڑے گا۔" میں رو کر کہہ رہی تھی۔

"بیٹی یہ خلاف اصول ہے ہمیں اگر اجازت ہوتی تو ہم آپ کو دہلی پہنچا دیتے۔" وہ کہہ رہے تھے۔

"نہیں' کچھ نہیں ہو گا سر! آپ مجھے ساتھ لے جائیں۔ ماں باپ کی نظروں میں اب میں وہ نہیں ہوں اس لیے میں اب اپنوں میں نہیں جا سکتی۔ میں سچ کہتی ہوں میں مسلمان ہو جاؤں گی۔"

میرے لہجے کی سچائی سے ان کا دل پسیج گیا اور انہوں نے ساجد کو یہ ڈیوٹی ادا کرنے کا حکم دیا کہ وہ مجھے ساتھ لے کر لاہور ان کی رہائش گاہ پر پہنچا دے۔ میں نے نظر اٹھا کر ساجد کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر دبی دبی سی خوشی جھلک رہی تھی۔ شاید وہ بھی یہی چاہتا تھا۔ پھر وہ مجھے ساتھ لے کر رسد والے ٹرک پر بیٹھ گیا۔ کلونت بڑی حسرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ راجن کے خوف سے پریشان ہو گئی تھی۔

جنگ ختم ہو گئی۔ دونوں ملکوں میں امن و امان ہو گیا تھا۔ لاہور کی شاہی مسجد کے امام نے مجھے مسلمان کیا تھا اور میرا اسلامی نام عائشہ رکھا گیا تھا۔ پھر وہاں پر ہی میرا نکاح ساجد حسین سے ہو گیا تھا۔ وہ مجھے اپنی ماں جی کے پاس لے گیا۔ کرنل نسیم صاحب وہی فوجی افسر تھے جن کے گھر میں دو تین ماہ رہی تھی۔ انہوں نے سگی بیٹیوں کی طرح مجھے رخصت کیا تھا۔ مجھے ماں جی کی محبت میں اپنا ماضی بھول گیا تھا۔ دو سال کے بعد خدا نے مجھے ایک بیٹی سے نوازا۔ ان دو سالوں میں ماں جی نے مجھے قرآن پاک پڑھا دیا تھا۔ نماز تو انہوں نے شروع میں ہی سکھا دی تھی۔ بیٹی کا نام ہم نے دلنواز رکھا۔ اس کے بعد میرے ہاں کوئی اور اولاد نہ ہوئی ماں جی فوت ہو گئیں۔ ساجد نوکری سے ریٹائر ہو گیا اور گھر کے ساتھ ہی اس نے ایک چھوٹی سی دکان کھول لی تھی۔ مگر اب حالات وہ پہلے سے نہ رہے تھے۔ ساجد کی دکان خوب چلنے لگی تھی۔ محلے کے ایک دو دوکاندار حسد کا شکار ہونے لگے تھے۔ وہ پہلی سی مہر و محبت مفقود ہو کر رہ گئی تھی۔ لوگوں میں لالچ بڑھ گیا تھا اس لیے ہمیں طرح طرح سے ذہنی کوفت میں پھنسا کر علاقہ بدر کرنا چاہتے تھے۔ ساجد بعض اوقات پریشان ہو جاتے۔ یہ مکان ان کا ذاتی تھا ورنہ شاید ہم کسی اور محلے میں چلے جاتے۔ میرے کہنے پر ساجد نے کرنل صاحب کو بھی بتایا اور انہوں نے آ کر ان لوگوں کو سختی سے منع کیا۔ بظاہر تو وہ خاموش ہو گئے مگر دل ہی دل میں کینہ پروری بڑھ گئی تھی۔ میری دلنواز اب اسکول جانے لگی تھی۔ وہ ہم میاں بیوی کی آنکھوں کی روشنی تھی۔ گھر بھر میں اس کے دم سے رونق تھی اور ہم اسے دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔

دلنواز آٹھویں میں تھی۔ ساجد نے آج منڈی جانا تھا۔ نجانے صبح سے میرا دل کیوں گھبرا رہا تھا۔

وہ دونوں باپ بیٹی گھر سے نکل گئے۔ میں ان کی بخیر واپسی کی دعائیں مانگتی ہوئی گھر کے کاموں میں لگ گئی۔ دس بجے کے قریب کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ شاید کوئی دکان پر سودا لینے آیا تھا میں دروازے پر گئی۔ سائیکل پر ایک آدمی کھڑا تھا۔

"کیا بات ہے بھائی۔" میں نے پوچھا۔

"یہ ساجد صاحب کا مکان ہے ناں۔"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"میں جی میو ہسپتال سے آ رہا ہوں۔ ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے' یہ کارڈ ان کی جیب سے نکلا ہے۔ میں آپ کو ساتھ لے جاؤں گا۔" وہ آدمی ایک ہی سانس میں کہہ رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا۔کیا وہ ٹھیک تو ہیں۔" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"ڈاکٹر اپنی کوشش کر رہے ہیں آگے جو اللہ تعالیٰ کو منظور۔" اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔میری ساتھ والی پڑوسن رفیعہ بھی باہر آ گئی تھی۔پل بھر میں محلے میں سب کو پتا لگ گیا کہ ساجد اسپتال میں ہے۔دو تین عورتیں اور آدمی بھی جو ہمارے ہمدرد تھے' میرے ساتھ اسپتال چل پڑے۔وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ساجد دنیا سے رخصت ہو چکا ہے۔میری دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔مجھے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ان لوگوں نے ہی ایمبولینس میں رکھ کر ساجد کو گھر پہنچایا۔تکفین کے بعد سب لوگوں نے ان کو قبرستان پہنچا دیا۔دلنواز بے ہوش تھی۔مجھے اسے بھی سنبھالنا تھا۔رفیعہ اور اس کا خاوند رات گئے تک گھر میں رہے۔وہ ہمیں حوصلہ دے رہے تھے مگر میرے حوصلے ختم ہو چکے تھے۔

محبتوں کا وقت رخصت ہو گیا اور مصیبتوں کا دور شروع ہو گیا۔ساجد کی موت کے دس دن بعد ہی ایک دکاندار نے پیغام بھیجا کہ دکان قیمتاً مجھے دے دو۔"

"بھیا ہم نے بھی تو زندہ رہنا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تو کیا دکان تم چلاؤ گی۔" پیغام لانے والا حیرت سے بولا۔

"بھوک سارے کام سکھا دیتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

پھر سچ مچ ہی میں نے خود دکان چلانے کا فیصلہ کر لیا۔دلنواز نے کہا۔"امی آپ یہ کیسے کریں گی۔"

"بیٹی مجھے تمہارے لیے خود کو زندہ رکھنا ہے۔سب کچھ ہو جائے گا۔" یہ میرا عزم تھا۔اور پھر دوسرے دن میں نے دکان کا دروازہ کھولا۔یہ ایک قسم کا جنرل اسٹور تھا۔میرا ارادہ دیکھ کر محلے بھر کی وہ عورتیں جو ہماری ہمدرد تھیں' خوش ہو گئیں اور خود بخود ہی دکان سے سودا لینے لگیں۔وہ دکان والا پہلے سے زیادہ جل بھن گیا۔ہمیشہ الٹی سیدھی باتیں کرتا رہتا۔

دلنواز نے بی اے کر کے بی ایڈ کر لیا۔پھر ایک اسکول میں ٹیچر لگ گئی۔وہ مجھے کہتی تھی کہ امی آپ دکان وغیرہ چھوڑ دیں مگر میں نے اس کا جہیز بھی تو بنانا تھا۔دن گزرتے رہے۔زمانہ بدل گیا تھا۔وہ پہلے والے اخلاق اور شرافت کے دن نجانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔میں چاہتی تھی کہ دلنواز کی شادی کر کے میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔

پھر ایک دن میری بچی اسکول پڑھانے گئی تو واپس نہیں آئی۔میں نے محلے والوں سے فریاد کی مگر کوئی میری مدد کرنے کو تیار نہ ہوا۔تھانے میں گئی تو کسی نے کچھ نہیں کیا۔میں تو مسلمانوں کی شرافت دیکھ کر مسلمان ہوئی تھی مگر یہ کیسے مسلمان ہیں' مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے وہ کل کا وقت ہو۔جب ایک شریف آدمی نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھے راجن جیسے غنڈے سے نجات دلوائی تھی۔جن لوگوں نے میری بیٹی کو غائب کرایا ہے' وہ بھی مسلمان ہیں۔میں نے اپنا نام بدل دیا ہے میں وہی شیلا دیوی ہوں جو وطن سے دور شرافت کی چار دیواری میں زندگی گزارنے آئی تھی۔مگر یہ سب کیا ہوا رہا ہے۔صاحب جی مجھے بتائیں ناں۔" اس کا لب و لہجہ سمیع الدین کو جھنجھوڑ رہا تھا۔

"ماں جی میری قوم کو معاف کر دیں۔اب یہاں غنڈے اور بدمعاش پیدا ہو رہے ہیں۔" سمیع الدین جھکی ہوئی نگاہوں سے درخواست کو دیکھ رہا تھا اور شاید شرمسار بھی ہو رہا تھا۔

سمیع الدین کی ذاتی کوششوں سے دلنواز مل تو گئی مگر اس کی حالت دیکھ کر ماں تیورا کر گری اور دوبارہ نہ اٹھ سکی۔یہ اس کی موت نہ تھی بلکہ اس اعتماد کی موت تھی جو وہ پاکستان لے کر آئی تھی۔البتہ دلنواز کی زندہ لاش آج بھی اپنے اس گھر کی ویرانی میں موجود ہے جو اس کی تنہائیوں کی ساتھی تھی۔

☆☆☆☆
سچی کہانیاں
☆☆☆☆

قربانی

صائمہ کاردار

اور اس دن کے بعد سے اس بڑے آدمی سے میرے بڑے اچھے تعلقات بحال ہوگئے۔ مجھے میری منزل مل گئی تھی۔ میرا وہ ڈر خوف دور ہوگیا تھا کہ کہیں وہ کسی اور کو تو نہیں چاہتا ہے۔ اب ہم ملتے تو محض پڑھائی لکھائی کی باتیں نہیں کرتے تھے۔ تھوڑا وقت نکال کر پیار و محبت کی باتیں بھی کر لیتے تھے۔ مستقبل کے بارے میں کچھ پروگرام بھی بنا لیتے تھے۔

اس شمارے کے لیے ایک دلگداز سچی کہانی

امی کے انتقال کے بعد ابو نے اپنی دوسری شادی کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ان کا خیال تھا کہ ان کے لیے نکاح ثانی بہت ضروری ہے۔ کیونکہ ان کی لڑکیوں کی نگرانی کے لیے دوسری ماں کی اشد ضرورت ہے۔ وہ سیانی لڑکیوں کو گھر میں تن تنہا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔انہوں نے یہ بات ہمیں خود کہنے کے علاوہ عزیزوں' رشتے داروں کی زبانی بھی سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

مجھے ابو بہت عزیز تھے لیکن ان کے اس فیصلے نے ان کی محبت کا گراف بہت گرا دیا تھا اور سوتیلی ماں کے آنے سے پہلے ہی میں اس سے نفرت کرنے لگی تھی ابو کسی مناسب خاتون کی تلاش میں تھے جو بقول ان کے' ان کے بچوں کی صحیح نگہداشت کر سکے۔تھوڑی سی جستجو کے بعد ایک بیوہ خاتون انہیں مل گئیں جن سے ابو نے نکاح کر لیا۔ظاہر ہے اس عمر میں ابو کو کوئی کمسن اور کنواری لڑکی تو مل نہیں سکتی تھی۔

ہماری سوتیلی ماں میں ظاہری حسن نام کی کوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چیز نہیں تھی مگر اندر سے وہ بہت خوب صورت تھیں۔ یہ میرا نہیں میرے ابو کا خیال تھا۔ مجھے تو وہ ابتدائی دنوں ہی سے انتہائی بور اور بکواس لگتی تھیں۔ نکاح کے دوسرے تیسرے روز ہی سے انہوں نے ابو کو یہ الٹی میٹم دے دیا تھا کہ زرینہ اور سکینہ کے لیے مناسب لڑکے تلاش کریں۔ لڑکیوں کو گھر بٹھا کر بوڑھی کرنے سے کیا مل جائے گا۔ میری دونوں بہنوں کو نئی امی کی یہ بات بہت اچھی لگی تھی۔ ''ماں پھر ماں ہوتی ہے۔'' انہوں نے کہا تھا۔ اپنی ہو یا سوتیلی۔ جوان بیٹی کے فرض سے جلد از جلد سبکدوش ہونا چاہتی ہے۔'' مگر مجھے ان کی یہ بات کسی سازش سے کم نہیں لگی تھی۔ میں نے کچھ لوگوں سے اس کا اظہار بھی کیا تھا۔ ''سوتیلی بیٹیوں کو گھر سے دھکے دے کر نکالنے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔ انہیں گھر سے باہر نہیں نکالیں گی تو گھر پر راج کیسے کر سکیں گی۔''

ایک دن سکینہ نے مجھ سے کہا۔ ''نگینہ! تم امی کے خلاف منفی انداز میں کیوں سوچتی ہو۔ وہ ہماری سوتیلی ماں ضرور ہے مگر عام سوتیلی ماؤں جیسی نہیں۔ ہم تینوں اکے علاوہ ہمارے دونوں چھوٹے بھائیوں کا بھی کس قدر خیال رکھتی ہیں۔''

''بڑی سیانی اور شاطر خاتون ہیں۔ اپنی محبت کا ڈھونگ رچا کر ایک دن سہم سب کو ٹھکانے لگا دیں گی۔''

''خوامخواہ ان کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا نہ رہا کرو۔ اچھی خاصی تو ہیں بے چاری۔''

''ہنہ..... بے چاری۔''

مجھ پر کسی کے سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اپنی سوتیلی ماں کے لیے میرے جو جذبات تھے وہ برقرار رہے۔ ابو نے تھوڑے ہی دنوں میں اپنی دونوں بیٹیوں کے لیے دو لڑکے تلاش کر لیے تھے۔ ابو نے ان لڑکوں کے بارے میں اپنی اہلیہ سے مشورہ کیا۔

''لڑکے تو اچھے ہیں۔ بس ان میں اگر کمی ہے تو یہ کہ بڑی تنخواہوں پر ملازم نہیں اور جن اداروں میں کام کرتے ہیں وہ بھی پرائیویٹ ہیں۔''

''ہاں زلیخا! یہ کمی تو ہے ان میں مگر یہ بھی تو سوچو اگر وہ بڑے گھروں کے چشم و چراغ ہوتے بڑی ملازمتوں پر فائز ہوتے تو ہم غریبوں کے گھر کیوں رشتہ کرتے۔''

''ہاں آپ کا یہ کہنا بھی غلط نہیں اور پھر انہوں نے جہیز کی بھی کوئی پابندی نہیں لگائی ہے۔ اس طرح ہمارے لیے بچیوں کی شادی کا مسئلہ اور آسان ہو گیا ہے۔''

''تو پھر تمہارا کیا ارادہ ہے۔'' ابو نے بیوی سے پوچھا۔

''میں تو یہی کہوں گی کہ اللہ کا نام لے کر یہ رشتے قبول کر لیں۔''

اور زرینہ اور سکینہ جبار اور اسلم کے ساتھ بڑی سادگی کے ساتھ بیاہ دی گئیں۔ ابو بہت خوش تھے۔ خاندان کے کئی دوسرے لوگ بھی بہت خوش تھے کہ سوتیلی ماں ہونے کے باوجود زلیخا اصلی ماں کا کردار کس خوش اسلوبی کے ساتھ نبھایا۔ صرف میں تھی جس نے ان شادیوں کو سوتیلی ماں کی سازش قرار دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ان کی ہر سازش ایک نہ ایک دن ظاہر ہو جائے گی۔

ہمارے گھر جیسی خوش حالی زرینہ اور سکینہ کے گھر میں نہیں تھی کیونکہ ہمارے دونوں بہنوئی چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کرتے تھے۔ ان کی تنخواہ بہت تھوڑی تھی لہٰذا ان کا سنسار بڑی تنگ دستی سے چلتا تھا۔ ابو اور امی کو اس بات کا دکھ تھا۔ جب ان کی بیٹیاں گھر آتیں تو وہ انہیں اچھے سے اچھا کھلاتے پلاتے اور جہاں تک ممکن ہوتا دے دلا کر رخصت کرتے۔ میں اس موقع پر بھی بہنوں کو ورغلانے سے باز نہیں آتی۔

''تم لوگوں کو تو میری بات کا یقین نہیں تھا نا۔ تمہاری امی نے جان بوجھ کر تم لوگوں کو غربت کی دلدل میں دھکیل دیا نا۔ جہاں تم لوگ اتنے برسوں

سے باپ کے گھر رہ رہی تھیں۔ وہاں اچھے لڑکوں کا کچھ روز اور انتظار نہیں کر سکتی تھیں۔ ضرور کر سکتی تھیں مگر تمہاری سوتیلی اماں نے اس کا موقع ہی نہیں دیا اور بھلا وہ ایسا موقع کیوں آنے دیتیں۔ آخر انہیں سوتیلی ماں کا کردار بھی تو ادا کرنا تھا۔''

''تم تو خوامخواہ بات کا بتنگڑ بنا رہی ہو نگینہ! جس کے نصیب میں جو ہوتا ہے وہی ملتا ہے۔'' وہ بے وقوف اپنی قسمت کو دوش دیتیں مگر سوتیلی ماں کو برا نہیں سمجھتی تھیں۔

وقت گزرتا رہا۔ میری سوتیلی ماں میرے باپ پر ہی نہیں۔ پورے خاندان پر حاوی ہوتی چلی گئیں۔ کوئی بات بھی ہو ابو ان کی مرضی کے خلاف نہیں کرتے تھے۔ یہ کہنا چاہیے ابو ان پر ساری ذمے داریاں ڈال کر بالکل آزاد ہو گئے تھے۔ وہ بھی ملازمت پیشہ تھے مگر ان کی نوکری سرکاری تھی۔ لیکن اپنا کام وہ دیانت داری سے کرتے تھے اس لیے شام کو گھر لوٹتے تو بہت تھکے ہوتے تھے اور جسمانی و ذہنی سکون کے لیے کسی معاملے میں اپنے آپ کو ملوث کرنا نہیں چاہتے تھے۔ امی نے بھی مکمل انہیں سکون اور آرام دینے کے لیے ان کی بہت سی گھریلو ذمے داریاں بھی خود سنبھال رکھی تھیں۔ میں اس بات پر بہت کڑھتی تھی کہ اس چالاک اور شاطر عورت نے کس خوش اسلوبی کے ساتھ ہمارے پورے گھر پر قبضہ کر لیا ہے۔

میرا ایک بڑا اچھا رشتہ آیا تھا۔ لڑکا میرے ماموں کا تھا۔ وہ لوگ بڑے کھاتے پیتے گھرانے کے تھے۔ ان کا اپنا بزنس تھا۔ اپنا مکان تھا۔ گھر میں گاڑیاں تھیں۔ ابو نے حسب عادت امی سے کہا۔

''کیا خیال ہے تمہارا اس رشتے کے بارے میں۔''

''آپ نگینہ کی شادی اتنی جلدی کیوں کرنا چاہتے ہیں۔ کم از کم اسے بی اے تو کر لینے دیجیے۔''

''ارے زلیخا بیگم! بی اے کرنے کے بعد بھی اسے گھر داری ہی کرنی پڑے گی۔ اسے سسرال جا کر کون سی نوکری کرنی ہے۔ انٹرمیڈیٹ کر لیا ہے۔ کیا اتنی تعلیم کافی نہیں۔''

''میرے خیال میں تو سارے ہی ماں باپ کو اپنی لڑکیوں کو زیادہ سے زیادہ تعلیم دلوانی چاہیے اور یہ جو آپ کہتے ہیں اسے سسرال جا کر کون سی نوکری کرنی ہے۔ یہ ٹھیک ہے ابھی اسے ملازمت کی کوئی ضرورت نہیں پڑے گی مگر خدانخواستہ اگر کبھی ضرورت پڑی تو اس کی زیادہ سے زیادہ تعلیم اس کے کام آئے گی۔'' میں نے دیکھا۔ ابو ان کی بات بڑے غور سے سن رہے تھے۔ چند لمحوں کے بعد وہ بولے۔

''تمہاری یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا تم اس کی وضاحت کرو گی۔''

''میں یہ بات یونہی نہیں کہہ رہی ہوں۔ اپنے تجربے کے تحت کہہ رہی ہوں۔ میرے والدین نے مجھے صرف میٹرک تک پڑھایا تھا۔ میٹرک کا نتیجہ آیا ہی تھا کہ ایک اچھا رشتہ آ گیا اور میرے ابو امی نے مجھے بیاہ دیا۔ شادی کے دس سال بعد میں بیوہ ہو گئی۔ اب میرے بچوں کی ساری ذمے داری میرے کاندھوں پر آ گئی۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ اب جو میں نوکری کرنے گھر سے نکلی تو مجھے کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اگر میں زیادہ پڑھی لکھی ہوتی تو مجھے اچھی ملازمت ملتی۔ اچھے پیسے ملتے۔''

میری سوتیلی امی کے سسرال والے بقول ان کے بہت اچھے لوگ تھے کہ انہوں نے دو سال کے بعد بچوں کی ساری ذمے داریاں خود لے کر ان کا نکاح ثانی ابو سے کروا دیا۔

امی شاید پہلے بھی اپنی بیوگی کے زمانے کے قصے ابو کو سنا چکی تھیں۔ اس لیے انہوں نے ماموں ممانی سے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ بی اے کرنے سے پہلے ہم نگینہ کی شادی نہیں کر سکتے۔

میں نے امی کی اس کامیاب سازش پر انہیں بہت برا بھلا کہا تھا۔ بہت کوستی تھی مگر ان باتوں کا کھل کر اظہار نہیں کیا تھا۔ مجھ میں اس وقت اتنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہمت نہیں تھی کہ اپنے منہ سے اپنے باپ سے کہتی کہ اپنی چہیتی کے کہنے پر میرے بہتر مستقبل کو تباہ نہ کریں۔ وہ تو سوتیلی ماں ہیں۔ وہ کیوں چاہیں گی کہ کسی اچھے گھر میں میرا رشتہ ہو۔ اتنی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آتی۔ مگر اس وقت میرے اندر اتنا حوصلہ نہیں تھا۔ لہٰذا میں اندر ہی اندر کڑھ کر رہ گئی اور کچھ دنوں کے بعد خبر آئی کہ ماموں ممانی نے اپنے بیٹے نبیل حسن کی شادی کہیں اور کر دی ہے۔

اس واقعے کے بعد اپنی سوتیلی ماں سے میرے دل میں لگی نفرت کی آگ اور بھڑک اٹھی۔ میرا بس چلتا تو میں انہیں قتل کر کے ان کی بوٹیاں چیل کوؤں کو کھلا دیتی مگر اس بات کے لیے بڑے حوصلے اور بڑی ہمت کی ضرورت تھی جو مجھ میں موجود نہیں تھی۔

نبیل حسن کی شادی کے کچھ عرصہ کے بعد ایک دن ابو امی کو بتا رہے تھے۔ ”ایک بہت بری خبر ملی ہے۔“

”اللہ خیر کرے۔ کون سی خبر۔“

”میرے سالے جمیل حسن کا لڑکا پولیس مقابلے میں بہت بری طرح زخمی ہونے کے بعد گرفتار کر لیا گیا ہے۔“

”کون جمیل حسن۔“

”ارے بھئی میری پہلی بیوی کے بھائی جمیل حسن..... وہی جمیل حسن جن کے بیٹے نبیل حسن کا رشتہ نگینہ کے لیے آیا تھا۔“

”نہیں۔“

”ہاں زلیخا وہی۔“

”مگر یہ جو آپ نے پولیس مقابلے کی بات کہی ہے۔ یہ کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔“

ابو نے ایک ٹھنڈی آہ بھری پھر بولے۔ ”پتا نہیں کھاتے پیتے گھرانوں کے لڑکے بری صحبت میں کیوں پڑ جاتے ہیں اور چوری ڈکیتی اور دہشت گردی جیسی مجرمانہ باتیں اور عادتیں کیوں اپنا لیتے ہیں۔ اب یہ تو بعد میں ہی پتا چلے گا کہ یہ سب کچھ وہ محض ایڈونچر کی خاطر کرتا تھا یا اس کا تعلق کسی سماج دشمن یا ملک دشمن گروہ سے تھا۔ کیونکہ ایسے بہکے ہوئے نوجوانوں کو مجرموں کا گروہ اپنا آلہ کار بنا لیتا ہے۔“

”اب کیا ہوگا۔“ امی نے بے حد تشویش کے ساتھ پوچھا تھا۔

”ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔“

”آپ کو ان باتوں کا علم کیسے ہوا۔“

”جمیل حسن میرے دفتر آیا تھا۔“

”مگر وہ تو رشتے سے انکار کرنے پر آپ سے ناراض تھے۔“

”ہاں مگر اس وقت اسے شاید میری مدد کی ضرورت تھی۔“

”تو آپ نے کچھ کیا۔“

”اپنے ایک آفیسر سے میں نے بات کی تھی۔ انہوں نے اپنے ایک عزیز جو قومی اسمبلی کے ممبر ہیں ان سے فون پر رابطہ کیا۔ مگر ان کا کہنا ہے کہ دہشت گردی کا مسئلہ بڑا سنگین ہوتا ہے اگر اس کا تعلق کسی تنظیم یا گروہ سے ہوا تو اس کا گلا خلاصی ممکن نہیں ہوگی اور اگر وہ محض شوقیہ کام کرتا تھا تو اس کی سزا میں نرمی کرائی جا سکتی ہے۔“

”یعنی وہ سزا سے کسی صورت بھی بچ نہیں سکے گا۔“

”نہیں جرم آخر جرم ہے۔ اس کی سزا تو ملے گی۔“

کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ پھر ابو بولے۔ ”زلیخا تمہاری دور اندیشی نے ہمیں بچا لیا اگر ہم نگینہ کا رشتہ دیتے تو آج۔“

”بچانے والی ذات اللہ کی ہے۔“ امی نے بڑی عقیدت کے ساتھ کہا۔ پھر بولیں۔ ”میں نے تو بچی کے بہتر مستقبل کو پیش نظر رکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔“ وہ ایک لمحے کو رکیں پھر بولیں۔ ”سکینہ اور زرینہ کی شادی کے موقع پر میں نے جمیل حسن بھائی کے لڑکوں کو دیکھا تھا تو وہ مجھے

اچھے نہیں لگے تھے۔ ان کی شوخیاں بدتمیزی کی سرحد عبور کر رہی تھیں۔ ان کی چھچھوری اور بے ہودہ حرکتیں کئی لوگوں کو ناگوار لگ رہی تھیں۔ جب نبیل حسن کا رشتہ آیا تو یہ باتیں بھی میرے پیش نظر تھیں مگر میں نے اس موقع پر ان کا تذکرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔“

ہمارا گھر چونکہ چھوٹے چھوٹے کمروں پر مشتمل تھا اس لیے ابو امی کی بہت سی باتیں میں بڑی آسانی سے سن لیتی تھی۔

کئی دنوں کے بعد یہ افسوس ناک خبر ملی تھی کہ نبیل حسن زخموں سے جانبر نہ ہو سکا اور پولیس اسپتال ہی میں اس کا انتقال ہو گیا۔

ایک دن میں ابو سے کسی بات پر الجھ پڑی تھی کہ آپ تو بس امی کی بات ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ کسی اور کی سنتے ہی نہیں۔“ ایسی باتیں میں اپنی سوتیلی ماں کی عدم موجودگی میں کرتی تھی۔ ابو نے حسب عادت ان کا دفاع کیا۔

”میں یونہی تمہاری امی کی بات نہیں مانتا۔ وہ ہر بات بہت سوچ سمجھ کر اور اس کے دور رس نتائج کو پیش نظر رکھ کر کہتی ہے۔ مثال کے طور پر تمہارے ماموں کے گھر سے نبیل کا جو رشتہ آیا تھا۔ تمہاری امی ہی کے کہنے پر میں نے انکار کر دیا تھا۔ ذرا سوچو تو اگر تمہاری امی اس رشتے کی مخالفت نہ کرتیں اور یہ شادی ہو جاتی تو آج.....“

”ابو اس کا کریڈٹ آپ امی کو نہ دیجیے۔ امی نے تو محض یہ سوچ کر مخالفت کی تھی کہ وہ اپنی کسی سوتیلی بیٹی کو کسی خوش حال گھرانے میں کیسے بیاہ دیں گی۔ انہیں تو زرینہ اور سکینہ باجی کی طرح کسی کنگلے کے ہاتھوں میرا رشتہ کرانا منظور ہے۔“

”یہ تمہاری بھول ہے۔ تمہاری غلط سوچ ہے۔ وہ تم لوگوں کی بدخواہ نہیں، تم لوگوں پر اپنی جان چھڑکتی ہے۔“

بی اے آنرز کے آخری سال میں میری زندگی میں ایک زبردست انقلاب آیا۔ مجھے دانیال سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ میرے ساتھ ہی پڑھتا تھا۔ بڑا خلیق، بڑا ملنسار، بہت مہذب، عام لڑکوں کی طرح اس میں کوئی چھچھورا پن نہیں تھا۔ بہت دنوں کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ میں دانیال کو چاہنے لگی ہوں۔ مگر مجھے اس بات کا حوصلہ نہیں تھا کہ میں اس بات کا اظہار اس سے کرتی۔ مجھے اس بات کا بھی ڈر تھا کہ کہیں وہ یہ نہ کہہ دے کہ میں تو کسی اور کو چاہتا ہوں۔ اس نے مجھ سے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی جس سے اندازہ ہوتا کہ وہ میرے بارے میں کچھ سوچتا ہے۔

ایک دن باتیں کرتے ہوئے میں نے شہلا سے پوچھا۔

”آنرز کے بعد تمہارا کیا ارادہ ہے۔“

”ارادہ تو تھا شادی کر کے پڑھائی لکھائی کا یہ سلسلہ ختم کر دوں گی مگر۔“

”مگر کیا۔“

”مگر اس نے انکار کر دیا۔ جس کے بارے میں سوچا تھا کہ جب میں اس سے اپنی محبت کا اقرار کروں گی تو وہ انکار نہیں کرے گا۔“

”اوہ تو اس نے تم سے کیا کہا۔“

”اس نے کہا سوری شہلا میرے دل کا مکان خالی نہیں۔ اس میں پہلے سے کوئی براجمان ہے۔“

”اچھا پہلے سے کون براجمان ہے یہ اس نے نہیں بتایا۔“

”نہیں اس نے تو نہیں بتایا لیکن میں نے اپنی کوششوں سے معلوم کر لیا۔“

”اچھا کس طرح معلوم کیا۔“

”ایک دن میں اس کی عدم موجودگی میں اس کے گھر پہنچ گئی۔ میں اس کے ساتھ ایک دو بار اس کے گھر جا چکی تھی۔ اس لیے وہاں کے لوگ مجھے اس کی کلاس فیلو کی حیثیت سے جانتے تھے۔ میں نے اس کے کمرے میں ایک چھوٹے سے فریم میں ایک لڑکی کی تصویر دیکھی۔ تو میں نے اس کی بہن سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پوچھا۔ ”سعدیہ! یہ کس کی تصویر ہے۔ کون ہے یہ۔“

”بھائی جان کی پسند۔“ سعدیہ بولی۔ ”ہم لوگ تو یہی سمجھتے تھے کہ آپ ان کے ساتھ پڑھتی ہیں۔ ان کی دوست بھی ہیں۔ شاید کل کلاں کو ہمارے گھر میں بھابی بن کر آنے والی ہیں۔ ایک دن امی بولیں۔ ”ارے یہ کون لڑکی ہے اگر اس کے ساتھ شادی بیاہ کا کوئی ارادہ ہے تو ہمیں اس کے گھر لے چل ہم بات چیت کر کے تو رکھ لیں۔“

اس پر بھائی جان بولے۔ ”ایسی کوئی بات نہیں امی! یہ تو محض میری کلاس فیلو ہے۔“

”تو اگر کوئی محض کلاس فیلو نہ ہو کچھ اور ہو تو ہمیں بتا دے۔“

اور اس کے جواب میں بھائی جان نے چند روز بعد اپنے کمرے میں اس فریم کے اندر یہ تصویر لگا کر اسے آویزاں کر دیا۔

میں نے پوچھا۔ ”یہ کون ہے بھائی جان۔“

بولے۔ ”یہ وہ ہے جو محض میری کلاس فیلو نہیں۔ میری پسند بھی ہے۔“

میں نے شہلا کی زبانی یہ باتیں سنیں تو پر اشتیاق انداز میں اس سے پوچھا۔ ”وہ کس کی تصویر ہے۔“

”تیری۔“ اس نے بے دھڑک کہہ دیا۔

”نہیں۔“ میں نے قدرے شرماتے ہوئے کہا۔ ”کیوں مجھے بے وقوف بنا رہی ہو۔ سچ سچ بتاتی کیوں نہیں‘ اس نے اپنے کمرے میں کسی کی تصویر لگا رکھی ہے۔“

”ارے بابا اور کیسے بتاؤں۔ اس نے تیری تصویر اپنے کمرے میں لگا رکھی ہے اور تجھے اپنے دل میں بسا رکھا ہے۔“

میں نے ایک دم تیور بدل کر کہا۔ ”میں اس کی خبر لیتی ہوں۔ اس نے یہ جرات کیسے کی۔ مجھ سے پوچھے بغیر میری تصویر اپنے کمرے میں کیوں لگائی۔“

اور میں نے واقعی ایک دن اس سے پوچھ ہی لیا۔ ”آپ نے یہ حرکت کیوں کی۔“

”کون سی حرکت۔“

”مجھ سے پوچھے بغیر میری تصویر اپنے کمرے میں کیوں لگائی۔ میں تو آپ کو بہت شریف آدمی سمجھتی تھی۔ آپ کو میری تصویر ملی کہاں سے۔ کس نے دی آپ کو میری تصویر۔“

اس نے بڑے پرسکون انداز میں کہا۔ ”آپ کے پرس سے چوری کی تھی۔“

”سبحان اللہ! کس ڈھٹائی سے فرما رہے ہیں۔ چوری کی تھی کیا یہ بری بات نہیں۔“

”چور کے گھر میں چوری کرنا بری بات نہیں۔“

”کیا کہا..... کیا آپ مجھے چور کہہ رہے ہیں۔“

”ہاں چور کہہ رہا ہوں۔ آپ نے میرا دل نہیں چرایا۔ چور بہرحال چور ہوتا ہے وہ مرغی چور ہو یا دل کا چور۔“

”جایئے میں آپ سے نہیں بولتی۔ آپ بہت برے آدمی ہیں۔“

”ہاں بھئی چور جو ہوں۔ چور کوئی اچھا آدمی تو نہیں ہوتا۔“

اور اس دن کے بعد سے اس برے آدمی سے میرے بڑے اچھے تعلقات بحال ہو گئے۔ مجھے میری منزل مل گئی تھی۔ میرا وہ ڈر خوف دور ہو گیا تھا کہ کہیں وہ کسی اور کو تو نہیں چاہتا ہے۔ اب ہم ملتے تو محض پڑھائی لکھائی کی باتیں نہیں کرتے تھے۔ تھوڑا وقت نکال کر پیار و محبت کی باتیں بھی کر لیتے تھے۔ مستقبل کے بارے میں کچھ پروگرام بھی بنا لیتے تھے۔

آنرز کا امتحان دے کر ہم نے یہ پروگرام بنایا کہ دانیال اپنی والدہ کو ہمارے گھر بھیج کر رشتے کی بات طے کرے گا اور جیسے ہی اسے ملازمت مل جائے گی ہم شادی کے بندھن میں بندھ جائیں گے۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ دانیال کی ابو امی دونوں ہمارے گھر آئے اور میرے والدین سے میرا رشتہ

مانگا۔ جس پر ابو بولے ٹھیک ہے۔ ہم ذرا سوچ کر جواب دیں گے۔ مگر ان دونوں کی سوچ خاصی طویل ہو گئی۔ کئی ہفتے انہوں نے سوچ بچار میں لگا دیے۔ اس عرصہ میں ابو امی کیا باتیں کرتے تھے مجھے اس کی بھنک بھی نہیں ملی۔ شاید وہ میری غیر موجودگی میں باتیں کرتے تھے یا شاید سرگوشی کے انداز میں۔ پھر ایک دن دانیال نے مجھے یہ بری خبر سنائی کہ تمہارے ابو نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔

”مجھے جو ڈر تھا وہی ہوا۔“ میں نے کہا۔

”میری سوتیلی ماں میری خوشیوں کے راستے میں دیوار ضرور کھڑی کرے گی۔“

”مگر میری امی تو کہہ رہی تھیں نگینہ کی امی نے ہماری آؤ بھگت میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔ بے حد محبت کے ساتھ پیش آئی تھیں۔“

”ہاں ایسی ہی محبت کو میٹھی چھری کا نام دیا جاتا ہے۔ میری سوتیلی ماں اپنا ہر وار میٹھی چھری ہی سے کرتی ہیں۔“

”اب کیا کیا جائے۔“ دانیال نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

”دانیال اگر آپ میرا ساتھ دیں تو میں ہر رکاوٹ کو ہر دیوار کو گرا دوں گی۔ یہ خالص میرا ذاتی مسئلہ ہے میں کسی کی پسند ناپسند کا کوئی خیال نہیں کروں گی۔“

”ساتھ نہ دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ یہ تمہارا ہی نہیں میری زندگی کا بھی مسئلہ ہے۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گا۔“ اتنا کہہ کر وہ رکا۔ پھر بولا۔ ”بتاؤ ایسے حالات میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔“

میں نے ذرا سوچ کر جواب دیا۔ ”یہ کام ہم خود کر لیں گے۔ میرا مطلب ہے کورٹ میرج کر لیں گے یا گھر سے بھاگ جائیں گے یا۔“

دانیال نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکتے ہوئے کہا۔ ”نگینہ زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ جذبات کی رو میں بہہ کر غلط فیصلے ہو جاتے ہیں۔ ہم جو کچھ کریں گے بہت سوچ سمجھ کر کریں گے۔ تاکہ ہمیں بعد میں پچھتانا نہ پڑے۔“

اور ایک ہفتے بعد دانیال نے ایک راستے کی نشاندہی کی۔ ”میری امی نے ایک بزرگ کا نام پتا بتایا ہے اور کہا ہے کہ ان سے جا کر کہو۔ شاید وہ کوئی سچا اور سیدھا راستہ بتائیں۔“

”تو ٹھیک ہے چلو ایک دن ان کے پاس۔“

اور ہم دونوں ایک دن ان کے آستانے پر پہنچ گئے۔ راستے میں دانیال نے بتایا تھا کہ یہ کمانے کھانے والے بزرگ نہیں۔ ضرورت مندوں کو فیض پہنچانے والے بزرگ ہیں۔

ہم اپنی باری آنے پر جب ہم بزرگ کے حجرے میں پہنچے تو ان کی نورانی شکل دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ اللہ کے نیک بندے ہیں۔

چند رسمی باتوں کے بعد انہوں نے پوچھا۔ ”بتایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”یا حضرت! ہم شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ دانیال نے بغیر کسی تمہید کے کہہ دیا۔

”آپ دونوں کی کیا عمر ہے۔“

”میری ستائیس سال۔“ دانیال نے جواب دیا۔ ”اور ان کی اکیس برس۔“

”ٹھیک ہے آپ دونوں شادی کر سکتے ہیں۔“

اس بار دانیال ذرا ہچکچایا۔ پھر ہمت کر کے کہہ دیا۔ ”حضور اس سلسلے میں ہم آپ کی مدد چاہتے ہیں۔“

”آپ دونوں کے والدین ہیں۔“

”جی ہاں ہیں۔“

”تو ان سے کہیں یہ کام تو انہی کے کرنے کا ہے۔“

”بات دراصل یہ ہے بابا جی!“ اس بار میں بول پڑی۔

”ان کے والدین ان کا رشتہ لے کر ہمارے گھر آئے تھے لیکن میرے والدین نے انکار کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیا۔"

"انکار کی کوئی وجہ ہوگی۔ انہیں یہ لڑکا پسند نہیں ہوگا یا اس کا خاندان۔"

"جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ میری سوتیلی ماں میری خوشیاں نہیں دیکھ سکتی۔ وہ نہیں چاہتی کہ میں اپنی پسند کی شادی کروں۔"

بزرگ نے فوراً ہی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر تک آنکھیں بند کیے سوچتے رہے پھر بولے۔

"ایسی صورت میں' میں کیا کرسکتا ہوں۔"

"ہم بالغ ہیں' پڑھے لکھے ہیں' اپنے متعلق فیصلے کرنے کا ہمیں قانونی اور مذہبی حق حاصل ہے۔" دانیال نے کہا۔ "ہم خود بھی یہ کام کرسکتے ہیں۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ یہ کام آپ کے تعاون سے ہو۔"

بزرگ نے دانیال کو گھور کر دیکھا۔ پھر مجھے مخاطب کر کے بولے۔ "کیا تمہارا بھی یہی خیال ہے بیٹی۔"

"جی ہاں ہم اس مقصد سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔"

بزرگ نے ذرا توقف کے بعد کہا۔ "میرے بچو تم لوگوں کی یہ بات مجھے بہت اچھی لگی کہ یہ کام تم خود بھی کرسکتے تھے مگر تم چاہتے ہو کہ یہ کام ہمارے تعاون سے ہو۔ تمہاری اس سوچ کا یہ مطلب ہے کہ تم لوگ واقعی سوجھ بوجھ کے مالک ہو اور چاہتے ہو کہ مستقبل میں کسی طرح کی کوئی بدمزگی نہ ہو۔"

"جی ہاں۔"

"تو میرے عزیزو میرا مشورہ ہے کہ اس کام کے سلسلے میں جوش سے زیادہ ہوش سے کام لینا چاہیے۔ میں تم کو ایک ایسا تعویذ دوں گا جو اگر کسی طرح تم اپنی سوتیلی ماں کو گھول کر پلا دو تو انشاء اللہ وہ اس ضمن میں رکاوٹ نہیں بنے گی۔ اگر تمہاری شادی تم دونوں کے والدین کی رضامندی اور نگرانی میں ہوجائے تو کیا یہ برا ہوگا۔"

"جی نہیں۔" ہم دونوں نے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں ایسا ایک تعویذ تیار کرتا ہوں۔ تم اگلے ہفتے آ کر وہ تعویذ لے جاؤ۔"

ہم بہت پر امید لوٹے تھے کہ بزرگ کے تعویذ سے اگر میری سوتیلی امی موم کی ناک کی طرح سیدھی ہوجاتی ہیں تو اس سے اچھی بات کیا ہوگی۔

ٹھیک ایک ہفتے کے بعد دانیال بزرگ کے پاس تعویذ لینے پہنچا۔ اب میرے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے میں اس کے ساتھ نہیں گئی۔ لہٰذا اس موقع پر بزرگ سے دانیال کی جو باتیں ہوئیں وہ اب دانیال ہی کی زبانی سنیے۔ جو اس نے بعد میں مجھے بتائی تھیں۔

☆☆

میں نے بزرگ سے علیک سلیک کے بعد جب تعویذ کے بارے میں کہا تو وہ بولے۔ "بیٹا! میں جو باتیں تم سے کہوں گا اسے غور سے سنو اور اپنی فہم و فراست کے مطابق بتاؤ تمہارا کیا فیصلہ ہے۔"

اس کے بعد بزرگ ذرا دیر کے لیے خاموش ہوگئے۔ "تم دونوں کے جانے کے بعد۔" بزرگ نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں نے آدمی بھیج کر اس لڑکی کے والد کو بلوایا۔ کیا نام ہے اس لڑکی کا۔"

"نگینہ بیگم۔"

"میں نے تم لوگوں سے باتوں باتوں میں تم دونوں کے بزرگوں کا نام پتا معلوم کرلیا تھا۔" بزرگ بولے۔ "نگینہ کے والد آئے تو میں نے ان سے کہا۔ "میں ایک مسئلے میں آپ کے تعاون کا طلب گار ہوں۔"

"فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔ یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہوگی کہ میں آپ کے کسی کام آسکوں۔"

"میرے پاس ایک لڑکی اور ایک لڑکے کی شادی کا کیس آیا ہے کہ میں اپنی نگرانی اور سرپرستی میں ان کی شادی کرادوں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ کام آپ کی نگرانی میں ہو۔"

"فرمایئے۔ وہ کون لڑکے لڑکی ہیں اور میں ان کے لیے کیا کرسکتا ہوں۔"

"وہ آپ کی لڑکی نگینہ اور دانیال نام کا وہی لڑکا ہے جس کا رشتہ آیا تھا مگر آپ میاں بیوی نے انکار کردیا تھا۔"

"کیا وہ دونوں آپ کے پاس اس مسئلے کے لیے آئے تھے۔"

"پہلے یہ بتایئے۔ شادی سے انکار کرنے کی کیا وجہ تھی۔ میرے خیال میں تو لڑکے میں کوئی برائی نہیں اور پھر آپ کی لڑکی اسے پسند بھی کرتی ہے۔"

بزرگ کی بات پر نگینہ کے والد سوچ میں پڑ گئے۔ پھر ذرا توقف کے بعد بولے۔ "یا حضرت! میری اہلیہ کا خیال ہے کہ یہ شادی کامیاب نہیں ہوگی۔ اس سے کسی طرح کا نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔"

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ سوتیلی ماں ہونے کے ناتے وہ نہیں چاہتی ہو کہ کسی اچھی جگہ آپ کی بیٹی کا رشتہ ہو۔"

"جی نہیں ایسی بات نہیں۔ وہ بڑی نیک خاتون ہے اور میرے بچوں سے محبت کرتی ہے۔ وہ ان کا برا نہیں چاہ سکتی۔"

"آپ نے یہ نہیں پوچھا۔ انہیں کس طرح کے نقصان کا ڈر ہے۔"

"پوچھا تھا حضور اور اس نے بتایا تھا۔ اس لڑکے کے والدین جب رشتے کے لیے آئے تھے تو ہم دونوں کو وہ لوگ برے نہیں لگے تھے لیکن ان کے جانے کے بعد میری بیوی نے کچھ ایسے خواب دیکھے کہ وہ ڈر گئی۔"

"کیسے خواب۔"

"اس نے اپنی بیٹی کو ایک بیوہ کی صورت میں دیکھا۔ کبھی دیکھا وہ روتی دھوتی اپنی چوڑیاں توڑ رہی ہے۔ کبھی دیکھا وہ اجڑی ہوئی حالت میں ہمارے گھر واپس چلی آئی ہے۔"

"اور آپ نے ان کی باتوں پر اعتبار کرلیا۔"

"یا حضرت میں نے عرض کیا نا وہ جھوٹی نہیں ہے اور نہ ہی عام سوتیلی ماؤں جیسی ہے اور میرے بچوں سے حقیقتاً سچی محبت کرتی ہے۔"

بزرگ نے کہا۔ میں سوچ میں پڑ گیا اور پھر نگینہ کے والد سے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ آپ تین دن بعد تشریف لائیں۔ اس کے بعد ہم فیصلہ کریں گے کیا کرنا چاہیے۔"

اور وہ گزشتہ روز ہی آ کر واپس گئے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ "فرمایئے آپ نے کیا غور و فکر کیا۔ کیا فیصلہ کیا۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

میں نے ان سے کہا۔ بزرگ بولے۔ "یہ شادی واقعی نہیں ہونی چاہیے۔ اس شادی سے نقصان کا خدشہ ہے۔"

"تو کیا میری بیوی کے خواب....."

"جی ہاں میں نے ان کے خواب کی حقیقت جاننے ہی کے لیے استخارہ ڈالنے کا فیصلہ کیا اور.....اور میں نے بھی ایسی ہی باتیں دیکھیں جیسا آپ کی اہلیہ نے خواب میں دیکھا تھا۔" بزرگ بولے۔ "میں نے مسلسل تین بار استخارہ ڈالا اور تینوں بار میں نے آپ کی لڑکی کو شادی کے بعد برے حالات میں دیکھا۔"

"تو اب آپ کا کیا حکم ہے۔" نگینہ کے والد بولے۔

"اب یہ شادی ہونی چاہیے یا نہیں۔"

"نہیں یہ شادی کسی صورت میں بھی نہیں ہونی چاہیے۔"

بزرگ کی زبانی یہ ساری باتیں سن کر میں نے کہا۔ "یا حضرت! اگر آپ نے بھی استخارہ میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہی کچھ دیکھا ہے جو نگینہ کی والدہ نے خواب میں دیکھا ہے تو میں نگینہ سے شادی کر کے ہرگز اس کے مستقبل کو تباہ نہیں کروں گا۔'' یہ کہہ کر میں بزرگ کے پاس سے واپس آ گیا۔

دانیال کے واپس جانے کے تیسرے دن میں آندھی اور طوفان کی طرح بزرگ کے آستانے پہنچ گئی اور میں نے انتہائی بدتمیزی کے ساتھ چیخ چیخ کر ان سے کہا۔ ''میرے ابو نے آپ کو کتنے پیسے دیے تھے کہ آپ نے دانیال کو پٹی پڑھائی کہ وہ شادی سے انکار کر دے۔''

''میری بچی! ایسی کوئی بات نہیں۔'' بزرگ نے نہایت اطمینان سے مجھے سمجھایا۔ ''کیا میں تمہیں ایسا ہی نہیں نظر آتا ہوں۔ اگر ایسی بات ہوتی اگر پیسہ ہی میرا دین دھرم ہوتا تو میں تم دونوں سے نذر نیاز کے نام پر معقول رقم لے کر پہلے ہی دن تم دونوں کا نکاح پڑھا دیتا' لیکن میں نے تم دونوں کے لیے اتنی تگ و دو کیوں کی۔ اس لیے کہ تمہاری شادی باعزت طریقے پر ہو اور تم دونوں شادی کے بعد خوش و خرم زندگی بسر کرو۔ تمہارے والد کو میں نے اسی لیے بلایا تھا مگر انہوں نے یہ بتایا کہ ہم تو دانیال سے شادی پر رضامند تھے لیکن اس کی والدہ نے ایسے خواب دیکھے جو تمہارے مستقبل کے تشویش ناک نشاندہی کرتے تھے۔''

''اور آپ نے ابو کی زبانی' امی..... میری سوتیلی امی کے خواب پر یقین کر لیا۔'' میں نے تیز لہجے میں بزرگ سے سوال کیا۔ ''یہ نہیں سوچا کہ یہ سوتیلی ماں کا جھوٹا خواب بھی ہو سکتا ہے۔''

''سوچا تھا میری بچی سوچا تھا' اس لیے میں نے تمہارے باپ کو تین دن بعد بلایا تھا اور ان تین دنوں میں' میں نے تمہاری شادی کے بارے میں استخارہ ڈالا اور تینوں بار مجھے بھی ایسے ہی خطرے کی نشاندہی کی گئی۔ میں نے دانیال کی آمد پر اسے بھی بتا دیا تھا کہ یہ شادی نگینہ کو راس نہیں آئے گی۔ جلد ہی وہ بیوہ ہو جائے گی اور دانیال نے اسی لیے تم سے شادی سے انکار کیا کہ وہ تمہیں شادی کی خوشی کے بعد اتنا بڑا دکھ دینا نہیں چاہتا تھا۔''

میرا غصہ ٹھنڈا ہو چکا تھا اور میں سوچ رہی تھی۔ بزرگ غلط نہیں کہہ سکتے۔ وہ ہمارے بدخواہ نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا میں نے ان سے ہاتھ جوڑ کر اپنی گستاخی کی معافی مانگی اور واپس آ گئی۔

گھر آ کر بستر پر لیٹی تو پھر اٹھ نہ سکی۔ مجھے تیز بخار آ گیا تھا اور پھر اس کے بعد کے حالات کا مجھے علم نہیں۔ لیکن ظاہر ہے اس دوران کچھ نہ کچھ ہوا ہوگا۔ میری بے خبری کے دوران کے حالات واقعات کی روداد ایک بار پھر دانیال کی زبانی سنیے جو اس کی زبانی مجھے بہت بعد میں معلوم ہوئے۔

☆☆

بزرگ کی باتوں سے تمہارے دل پر یقیناً بہت برا اثر پڑا تھا۔ جب تمہیں یہ معلوم ہوا کہ شادی کے بعد تمہیں بیوگی کا دکھ جھیلنا پڑے گا تو تم نے غالباً یہی سوچا ہوگا کہ شادی دانیال سے ہو یا کسی اور سے۔ جب بیوگی ہی میرا مقدر بنے گی تو بہتر ہے زندہ ہی نہ رہا جائے۔ تم بستر پر لیٹیں تو پھر اٹھنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ تمہاری طبیعت روز بروز بگڑتی ہی گئی۔ ڈاکٹروں اور حکیموں کے تمام نسخے بے کار ثابت ہوتے گئے۔ تمہاری اس بیماری سے تمہارے ابو اور بھائی بہن تو پریشان تھے ہی مگر تمہاری سوتیلی ماں کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی۔ وہ رو رو کر تمہاری صحت یابی کی دعائیں مانگتی تھیں لیکن جب ہر طرف سے مایوسی ہی ہوئی۔ تمہاری بیماری گھٹنے کی بجائے بڑھتی ہی گئی تو ایک دن وہ تن تنہا بزرگ کے آستانے پر پہنچ گئیں اور آہوں اور سسکیوں کے دوران تمہاری بیماری کا ذکر کیا اور ان سے التجا کی۔ ''یا حضرت! میری بیٹی میرے جگر کے ٹکڑے کی صحت یابی کے لیے دعا کریں۔''

بزرگ نے انہیں دلاسا دیا۔ ''خاتون صبر کیجیے۔ اس کی صحت یابی بھی اس کے لیے بے سود ہوگی۔ وہ صحت یاب ہو کر بھی کیا کرے گی جب اسے معلوم ہے کہ اس کے مقدر میں شادی کی خوشی نہیں۔ دانیال نہ سہی کوئی دوسرا بھی اس کا شریک سفر بن کر اس کا ساتھ نہیں دے سکے گا۔ تو وہ جی کر بھی کیا کرے گی۔''

یہ باتیں تو تمہاری والدہ کو بھی معلوم تھیں۔ اس کے باوجود وہ بزرگ کے پاس گئی تھیں۔ تو ان کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔ کچھ دیر انہوں نے خاموش رہ کر اپنے منتشر اعصاب کو سنبھالا پھر بولیں۔ ''یا حضرت آپ نے مقدر کی بات کی ہے۔ مجھے بھی معلوم ہے قسمت کا لکھا بہرصورت سامنے آتا ہے مگر مجھے کتابوں کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جس نے مقدر لکھا ہے اس کے لیے اس میں ردوبدل کرنا ناممکن نہیں۔ کسی کو اس میں تبدیلی کا اختیار نہ ہو لیکن مقدر لکھنے والے کو تو اس کا اختیار ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب ایک عورت کو یہ بتایا تھا کہ تمہارے مقدر میں اولاد نہیں تو اس نے صبر کر لیا تھا لیکن ایک دن جب ایک سائل نے صدا لگائی تھی۔ ''جو ایک روٹی کھلائے گا اسے ایک اولاد کی خوش خبری دوں گا۔'' تو اس عورت نے سائل کو سات روٹیاں دی تھیں اور پھر اللہ نے اس عورت کو سات بیٹے دیے تھے۔''

اتنا کہہ کر تمہاری والدہ نے بزرگ سے کہا۔ ''وہ سائل یقیناً اللہ کا کوئی پیارا بندہ تھا۔ جس کی درخواست وہ رد نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اس نے اس عورت کے مقدر میں بے اولادی لکھی تھی اسے بدلنا پڑا۔''

''آپ کہنا کیا چاہتی ہیں خاتون۔'' بزرگ نے فکرمند لہجے میں پوچھا۔ ''ویسے میں آپ کو بتا دوں کہ میں ایک گناہ گار اور ناہنجار شخص ہوں۔ اس لیے میری دعاؤں میں ہرگز وہ اثر نہیں ہوگا کہ مقدر لکھنے والا اس میں ترمیم پر آمادہ ہو۔''

تمہاری والدہ نے چند لمحوں تک خاموش رہ کر کچھ سوچا۔ پھر بزرگ سے بولیں۔ ''یا حضرت! آپ مجھے کوئی ایسی دعا' کوئی ایسی ترکیب' کوئی ایسی تدبیر بتائیں جس پر میں عمل کر سکوں۔ میں ماں ہوں بے شک سوتیلی ماں سہی لیکن ماں پھر ماں ہوتی ہے۔ میرے سینے میں ممتا کا نور بھرا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری درخواست' میری التجا وہ رد نہیں کرے گا۔ ایک ماں کی ممتا کو وہ مایوس نہیں کرے گا اور میری بچی' میری نگینہ کے مقدر کے لکھے کو ضرور بدل دے گا۔''

بزرگ نے چونک کر تمہاری والدہ کو دیکھا۔ وہ یقیناً تمہاری سوتیلی ماں کے جذبے سے متاثر ہوئے تھے۔ چند لمحے خاموش رہ کر انہوں نے کہا۔ ''ہاں کچھ ایسی ترکیب' کچھ ایسا طریقہ ہے۔'' ایک لمحہ رک کر انہوں نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''کتابوں میں' میں نے پڑھا ہے کہ اللہ کو قربانی بہت عزیز ہے۔ کئی لوگوں نے اپنی جان کی قربانی دے کر مقدر لکھنے والے کو مقدر کے لکھے پر ترمیم کرنے پر رضامند کر لیا ہے۔''

''اور تمہاری والدہ نے گھر آ کر وہی کیا جو مغل شہنشاہ ہمایوں نے اپنے بیٹے اکبر کی جان بچانے کے لیے کیا تھا۔''

''کیا۔'' میں نے تڑپ کر کہا۔ ''میری سوتیلی امی نے جنہیں میں نے ہمیشہ اپنا دشمن سمجھا۔''

''ہاں وہ تمہاری غلطی تھی۔ انہوں نے تمہارے مقدر کے لکھے کو مٹانے کے لیے اپنی زندگی تم پر نچھاور کر دی اور آج ہم انہی کی قربانی کی وجہ سے خوش گوار ازدواجی زندگی بسر کر رہے ہیں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرشمہ ساز

ایم اے راحت

یہ اتفاق ہی تھا کہ باقی رات پٹرول پمپ پر کوئی کار یا ٹرک نہیں آیا تھا۔ ورنہ شاید ڈاکے کا پتا پہلے چل جاتا۔ بہر حال صبح سات بجے کے قریب جب اسے ہوش آیا تو وہ پٹرول پمپ کی عمارت کے اندر ایک بنچ پر لیٹا ہوا تھا۔ سر درد کے مارے پھٹا جارہا تھا۔ نقاہت سے چکر آرہے تھے۔ مگر رات کی بات یاد کرکے وہ کسی نہ کسی طرح اٹھا۔ اس نے دیکھا کہ کیش بکس کھلا پڑا ہے اور اس میں رکھے ہوئے پچاس لاکھ سے زیادہ روپے غائب ہیں۔ کچھ نقدی میز کی ایک دراز میں پڑی رہتی تھی۔ اتنا ہی نہیں ڈاکوؤں نے اس کی جیب سے بھی تقریباً دس ہزار روپے نکال لیے تھے۔ پیٹرول پمپ کا اپنا فون خراب تھا اس لیے اس نے باہر لگے ہوئے پبلک فون بوتھ سے پولیس ہیڈ کوارٹر فون کرکے ڈاکے کی رپورٹ کی اور وہاں سے ملنے والی ہدایت کے مطابق پولیس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ حالانکہ اس کے سر میں شدید تکلیف تھی۔ پچھلے حصے میں کوئی زخم آیا تھا۔ جس کی مرہم پٹی کے لیے اسے کسی ڈاکٹر کے پاس جانا چاہئے تھا۔

ایک معاشرتی کہانی، عمران ڈائجسٹ کے آخری صفحات کے لیے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تحسین کو پتہ بھی نہیں چلا کہ کوکس طرح وہ لڑکی کے کندھے تک پہنچا اور کس طرح زمین پر آرہا۔ البتہ اس نے لڑکی کو دوپٹہ کمر پر کستے ہوئے دیکھا گویا وہ اب اس کی اچھی طرح پٹائی کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

تحسین کی ریڑھ کی ہڈی میں چوٹ لگی تھی۔ اگر لڑکی نے کچھ اور مشق آزمائی کی تو شاید ہاتھ پاؤں سلامت نہ رہیں۔ بہترین حل تھا کہ بیہوش ہوجائے۔ چنانچہ اس نے آنکھیں چڑھا کر گردن ڈال دی۔

''صحیح فیصلہ کیا آپ نے۔'' لڑکی کی شوخ آواز سنائی دی اور پھر جاتے ہوئے قدموں کی آواز پھر گاڑی اسٹارٹ ہوکر آگے بڑھنے لگی۔

ڈرتے ڈرتے اس نے ایک آنکھ کھول کر دور جاتی ہوئی گاڑی کو دیکھا اور کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ان جوڈو کراٹے کلبوں کو گندی گندی گالیاں دیں۔ جنہوں نے ان خوبصورت لڑکیوں کو بھی بروسلی بنا دیا تھا۔

''ہائے کتنی حسین لڑکی تھی۔ ہائے۔'' دوسری ہائے اس نے کمر کے درد سے کی تھی۔

تحسین ایک کامیاب بزنس مین تھا۔ اس کا بچپن یتیم خانے میں اور لڑکپن سڑکوں پر آوارہ گردی میں گزرا تھا پھر دفعتاً قسمت اس پر اس بھرپور انداز میں مہربان ہوئی کہ خود اس کے بقول اس نے مٹی کو بھی ہاتھ لگایا تو وہ سونا بن گئی۔ کہتے ہیں دولت اندر کے انسان کو باہر لے آتی ہے۔ اگر وہ اندر سے شریف ہے تو دولت پاکر وہ اور زیادہ شریف بن جاتا ہے اور گر اندر سے ذلیل اور خبیث ہے تو دولت اس کی تمام خباثتوں کو اچھال کر سطح پر لے آتی ہے۔ تحسین بھی دولت پاکر خبیث سے خبیث تر بنتا چلا گیا۔ وہ انتہائی چالاک اور مکار آدمی تھا۔ جسے دولت کے مقابلے میں نہ انسان کی پرواہ تھی اور اخلاق کی۔ یوں بظاہر وہ اپنے آپ کو بہت سنبھالے رکھتا تھا اور اس کے ارد گرد کے چند مخصوص افراد کے علاوہ کسی کو اس کی سیاہ باطنی کا حال معلوم نہ تھا لیکن جب بھی شراب کے معمول سے چند زیادہ گھونٹ اس کی احتیاط کی گرہ ڈھیلی کردیتے تھے تو پھر اس کی دست درازیاں کہیں رکنے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ یہ دوسری بات تھی کہ وہ اس کا موقع بہت کم آنے دیتا تھا۔

دولت کمانے کی ہوس نے اس نے زندگی کے پینتالیس سالوں تک کسی رشتے کی زنجیر اپنے پیروں میں نہیں پڑنے دی۔ خریدی ہوئی راتوں سے جوانی کے تقاضے سیراب کرتا رہا لیکن اب کچھ دنوں سے وہ سنجیدگی کے ساتھ گھر بسانے کے بارے میں اور لاہور سیٹل ہونے پر غور کررہا تھا۔ یہی خیال اس صبح اس کے لاہور جانے کا محرک بنا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہاں پہلے کوئی خوبصورت سا بنگلہ خرید کر اسے اپنے ذوق کے مطابق آراستہ کرے اور پھر بے شمار رشتوں میں سے کسی کا بھی انتخاب کرکے زندگی کے اس دور کی بہاریں بھی لوٹے جسے گھر سنسار کہا جاتا ہے۔

تحسین اپنی شاندار کار میں بڑی آہستہ خرامی کے ساتھ لوئر وے لاہور کی طرف رواں دواں تھا۔ موسم بہت خوشگوار اور ابر آلود تھا۔ اپنی کار کے خفیہ خانے میں محفوظ اعلیٰ درجے کی فرانسیسی شراب کے گھونٹ بھرتے ہوئے وہ پچاسویں میل تک پہنچا تھا کہ اس نے سڑک پر ایک نوجوان لڑکی کو ہاتھ ہلا ہلا کر رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے دیکھا۔ وہیں لڑکی کے قریب بائیں جانب ایک سیکنڈ ہینڈ کار بھی کھڑی نظر آرہی تھی۔ تحسین زندگی میں کسی کو لفٹ دینے کا عادی نہیں تھا۔ مگر رنگین موسم تقریباً سنسان سڑک اور ایک جوان لڑکی۔ اس کا پاؤں خود بخود بریک پر پہنچ گیا۔ کار لڑکی کے پاس پہنچ کر رک گئی۔

''کیا بات ہے۔'' اس نے کھڑکی سے

سر نکال کر لڑکی کو غور سے گھورا۔

لڑکی بلا کی حسین تھی۔ بائیس چوبیس سال کی عمر سرو قد، گداز و متناسب جسم قدرے گول چہرہ، سفید رنگت سیاہ چمکیلی آنکھیں کشادہ پیشانی، ستواں ناک، موتی جیسے دانت، دونوں گالوں میں چھوٹے چھوٹے خوبصورت گڑھے، لانبے سیاہ بال اس نے بلو جینز پر ایک ڈھیلی ڈھالی قمیض پہن رکھی تھی۔ اس سے ظاہر تھا کہ وہ آزاد خیال اور مغرب پسند طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔

''معاف فرمایئے گا۔'' لڑکی بولی تو تحسین کو اس کی آواز بھی دلکش محسوس ہوئی۔

''میں راولپنڈی جارہی تھی۔ مگر یہاں پہنچ کر میری کار خراب ہوگئی۔ ظاہر ہے میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں کہ واپس گھر جاکر کسی میکینک کو کار لانے کے لیے بھیجوں۔ کیا آپ مجھے لاہور تک لفٹ دے دیں گے۔''

''آپ فرمائیں تو میں آپ کو پنڈی بھی چھوڑ سکتا ہوں۔'' تحسین نے بڑی آمادگی سے کہا۔

''شکریہ۔ اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے پنڈی جانے کا ارادہ ملتوی کردیا ہے۔ آپ بس مجھے لاہور کی حدود میں کسی جگہ اتار دیں۔''

''جیسی آپ کی مرضی۔ تشریف لایئے۔''

''ذرا ٹھہریے۔ میں اپنی کار لاک کردوں۔'' لڑکی نے کہا۔ اور اپنی کار کی طرف گھوم گئی۔

تحسین نیچے اتر آیا۔ سڑک پر ٹریفک برائے نام تھی۔ اتنی دیر میں ایک ٹیکسی صرف ایک ٹیکسی گزری تھی جو پنڈی جارہی تھی۔ لڑکی کار مقفل کرکے لوٹی تو تحسین نے جلدی سے قدم بڑھا کر اگلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ لڑکی ایک ثانیے کے لیے ہچکچائی مگر تحسین کے پاس سے گزرتی ہوئی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ تحسین نے کسی فرماں بردار ڈرائیور کی طرح جھک کر دروازہ بند کیا اور گھوم کر اپنی جگہ آ بیٹھا۔

''آپ اپنا تعارف نہیں کرائیں گی۔'' اس نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تعارف کرانا ضروری ہے۔'' لڑکی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں۔ بہت ضروری ہے۔ خاص طور سے میرے لیے.....''

''خاص طور سے آپ کے لیے کیوں۔''

''دیکھئے ناں۔'' تحسین نے بڑی بے تکلفی سے اپنا ہاتھ پھیلا کر لڑکی کے شانے پر رکھ دیا۔ ''میں پنڈی کا ایک مشہور و معروف بزنس مین ہوں۔ لاکھوں روپے کا کاروبار ہے۔ آدھی سے زیادہ زندگی دولت کمانے میں صرف کردی، کبھی گھر بسانے کا خیال نہیں آیا۔ ذرا غم روزگار سے فرصت ملی ہے تو سوچ رہا ہوں کہ اب یہ تنہائی ختم ہونی چاہیئے۔ شادی کرکے لاہور سیٹل ہونے کا ارادہ ہے۔ یہ سفر بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ایسی صورت میں آپ جیسی حسین دوشیزہ حسن اتفاق سے یوں راستے میں مل جائے تو فطری طور پر خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اس کے بارے میں جانا جائے۔''

یہ گفتگو کرتے ہوئے تحسین کا گستاخ ہاتھ بڑی آزادی اور بے باکی سے خریدی ہوئی رنگین راتوں کے یاد کیے ہوئے اسباق دہرا رہا تھا۔ لڑکی کی مسکراہٹ غائب ہوچکی تھی۔ اس کے چہرے پر شدید نفرت و کراہیت کا گہرا تاثر پیدا ہوا مگر فوراً ہی ایک سرد و سپاٹ کیفیت میں تبدیل ہوگیا۔

''تو آپ مجھ سے شادی کے خواہش مند ہیں۔'' اس نے بے رنگ لہجے میں پوچھا۔

''اتنی جلدی نہیں۔'' تحسین کی باچھیں پھیل گئیں۔ ''شادی سے پہلے ایک دوسرے کو جاننے اور پہچاننے کے مختلف مرحلے آتے ہیں۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"غالباً آپ کا دست مبارک اس وقت اسی قسم کے کسی مرحلے سے گزرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"بالکل' بالکل۔ تم تو بہت سمجھ دار معلوم ہوتی ہو۔" تحسین آپ سے تم پر آ گیا۔

"آپ میری ایک بات مانیں گے۔"

"بات نہیں ڈارلنگ تم حکم دے سکتی ہو۔"

"کار واپس موڑ لیں۔"

"کیوں۔" تحسین نے چونک کر پوچھا۔

"میں اپنی کار میں ایک چیز بھول آئی ہوں۔"

"وہ۔ ابھی لو۔" تحسین نے کار روکی گھمائی اور واپس چل دیا۔ تین منٹ کے بعد وہ اسی جگہ آ گئے جہاں سے چلے تھے۔ تحسین نے کار کا رخ دوبارہ لاہور کی جانب کرتے ہوئے بریک لگا دیا۔ لڑکی کے ساتھ وہ بھی کار سے باہر اتر آیا۔ لڑکی اپنی کار کی طرف جانے کے بجائے اس کے قریب آئی اور پوچھا۔

"آپ مجھ سے تعارف حاصل کرنا چاہتے ہیں ناں۔"

"ضرور' ضرور۔"

"تو میں اپنا تعارف کرا دوں۔"

اور اس کے بعد یہ سب کچھ ہو گیا تھا۔

لاہور میں تحسین کے چار گھنٹے بہت مصروف گزرے۔ سب سے پہلے این آئی بی بینک گیا۔ جہاں اس نے اپنے اکاؤنٹ سے ایک کثیر رقم ٹرانسفر کرائی تھی۔ وہاں اپنا اکاؤنٹ کھولنے کی دفتری کاروائی سے فارغ ہو کر اور نئی چیک بک وصول کر کے وہ ایک بڑی اسٹیٹ ایجنسی کے دفتر گیا۔ جس سے اس کی گزشتہ کچھ دنوں سے بات چیت چل رہی تھی اور اسٹیٹ ایجنسی کے مالک کے ساتھ جا کر کئی برائے فروخت کو دیکھا۔ ان میں ایک بنگلہ جو قدرے اونچائی پر سرسبز گھنے درختوں کے درمیان میں روڈ سے کچھ ہٹ کر بنا ہوا تھا۔ اسے بہت پسند آیا تھا۔

"اس کا مالک کون ہے۔" اس نے اسٹیٹ ایجنٹ سے پوچھا۔

"چوہدری جلال دین۔" ایجنٹ نے جواب دیا۔ "سابق ایم پی اے۔"

"کیا مانگ رہا ہے۔"

"ڈھائی کروڑ۔"

"ہوں۔" تحسین نے سر ہلایا۔ "خیر قیمت پر بعد میں بات کریں گے۔ آیئے ذرا اس کے گھر چلتے ہیں۔"

"میں معذرت چاہوں گا۔" ایجنٹ نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ "میں نے ایک پارٹی کو ٹائم دیا ہے۔ وہ آنے ہی والی ہو گی۔ میرا فوراً دفتر پہنچنا ضروری ہے' آپ کو زحمت نہ ہو تو کل پھر آ جائیں۔ میں چوہدری جلال دین کو بھی اپنے آفس بلا لوں گا۔"

"میں آج کا کام کل پر چھوڑنے کا قائل نہیں ہوں۔" تحسین نے جواب دیا۔ "آپ مجھے اس کا پتہ بتائیں میں خود تلاش کر لوں گا۔"

"لیکن آپ یہاں تقریباً اجنبی ہیں۔ آپ کو پتہ تلاش کرنے میں بڑی دشواری ہو گی۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ جہاں مجھے پہنچنا ہوتا ہے۔ پہنچ جاتا ہوں۔" تحسین مسکرایا۔

"آپ مجھے صرف چوہدری جلال دین کے بارے میں یہ بتائیں کہ وہ کیسا آدمی ہے' کسی شخص سے کاروباری سلسلے میں ملنے سے پہلے اس کے کمزور پہلوؤں سے واقف ہونا بہتر ہوتا ہے۔"

"بہت خود غرض اور لالچی آدمی ہے۔" ایجنٹ نے جواب دیا۔ "سابقہ حکومت کے دور میں پارلیمنٹ کا ممبر تھا۔ خوب خوب ہاتھ رنگے ہیں۔ یہاں کی ساری جائیداد اسی زمانے کی حاصل کردہ ہے' لالچی اتنا ہے کہ چند ہزار کا فائدہ ہو رہا تو دوسرے کا گلا کاٹنے سے بھی باز نہ آئے۔ سننے میں آیا ہے معلوم نہیں کہاں تک سچ

ہے کہ کسی سابقہ وزیر کے اشارے پر اس نے کئی سیاسی قتل کرائے ہیں۔ دیسی شراب اور عورت کا رسیا ہے اور اسی شوق کے ہاتھوں تباہ ہو رہا ہے۔ تین بنگلوں میں سے دو فروخت ہو چکے ہیں۔ پہلے وہ خود اس بنگلے میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا لیکن اب انہیں اپنی ماں کے پاس بھجوا دیا ہے۔ نجانے کتنے لوگوں کا مقروض ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر چند روز تک بنگلا فروخت نہ ہوا تو اس کے قرض خواہ عدالت تک پہنچ جائیں گے۔"

"بہت خوب۔" تحسین معنی خیز لہجے میں بولا۔ "پھر تو آدمی دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ اس سے مل کر لطف آئے گا۔"

"اچھا میں چلتا ہوں۔" ایجنٹ نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "آپ اس سے بات کر کے میرے پاس آئیں گے یا واپس چلے جائیں گے۔"

"اگر سودا پکا ہو گیا تو لازماً تمہارے پاس آؤں گا۔" تحسین نے جواب دیا۔

پتا تلاش کرنے کے معاملے میں رئیس نے غلط نہیں کہا تھا۔ ایجنٹ کے جانے کے بعد اس نے نقشہ نکالا اور پندرہ منٹ میں مطلوبہ مقام پر پہنچ گیا۔ اتفاق سے چوہدری جلال دین گھر پر ہی مل گیا۔

"میرا نام تحسین ہے۔ پنڈی کا ایک بزنس مین ہوں۔" تحسین نے اپنا تعارف کرایا۔ "ذاتی وجوہات کی بنا پر لاہور میں رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور اسی سلسلے میں آپ سے ملنے آیا ہوں۔"

"فرمایئے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔" چوہدری صاحب نے سر سے پیر تک اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے آپ کا بنگلہ دیکھا ہے اگرچہ اس کی تعمیر میری پسند سے کچھ مختلف ہے۔ مگر خریدنا چاہتا ہوں۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے ضرور خریدیئے۔"

"پھر فرمایئے آپ اس کی کیا قیمت طلب کر رہے ہیں۔"

"دیکھئے تحسین صاحب' میرے پاس تین بنگلے ہیں اور وہ ان سب میں بہتر ہے۔" چوہدری صاحب نے جواب دیا۔ "میں نیا سے شوق سے بنوایا تھا۔ مگر بدقسمتی سے میرے اہل و عیال کو یہ جگہ راس نہیں آئی اور میں نے انہیں سیالکوٹ بھجوا دیا۔ کہنے کا مطلب ہے کہ مجھے ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے۔ قیمت مناسب مل گئی تو بیچ دوں گا۔ ورنہ پھر کرائے پر اٹھا دوں گا۔"

"اور آپ کے خیال میں مناسب قیمت کیا ہونی چاہیے۔"

"کم از کم ڈھائی کروڑ۔"

"بہت خوب۔" تحسین عجیب انداز میں مسکرایا۔ "بنگلے کی قیمت کا تعین کرنے سے پہلے ہم ایک دوسرے کی پوزیشن کو سمجھ لیں تو بہتر ہے۔ کسی زمانے میں آپ ایم پی اے تھے لیکن آج کل کیا ہیں۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ اب آپ کے پاس تین نہیں صرف ایک بنگلا ہے اور آپ کے اہل و عیال اس لیے یہاں سے گئے ہیں کہ ان کی موجودگی آپ کو راس نہیں آ رہی تھی۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ اس بنگلے کا جلد سودا نہ ہوا تو آپ کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑ سکتی ہیں۔ گویا آپ اسے بیچنے کے لیے مجبور ہیں۔ جبکہ میں اسے خریدنے کے لیے مجبور نہیں ہوں۔ اس کے باوجود میں نے آپ کے بارے میں جو کچھ سنا ہے۔ اس سے میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ کئی اعتبار سے میرے ہم ذوق ہیں۔ ہم مشرب ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آپ کہ زوال پذیر ہیں اور میں نصف النہار پر چمک رہا ہوں۔ اس اعتبار سے مجھے آپ سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے لیکن ہم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مشرب ہونے کی رعایت سے میں آپ کو زیادہ نقصان بھی نہیں پہنچانا چاہتا آپ میری بات سمجھ رہے ہیں۔"

چوہدری جلال دین حیرت سے اس انوکھے گاہک کو دیکھ رہا تھا۔ تحسین کی شاندار کار دیکھ کر اس کی آنکھوں میں جو چمک پیدا ہوئی تھی۔ وہ اس گفتگو سے بالکل بجھ گئی تھی۔ ایک گھنٹہ قبل اس کا ایک قرض خواہ بڑی گالیاں اور دھمکیاں سنا کر گیا تھا اور اسے یقین تھا کہ کل شام تک کہیں سے دس لاکھ کا بندوبست نہ ہوا تو وہ دھمکیاں عملی جامہ بھی پہن سکتی ہیں۔

"میں سمجھ رہا ہوں۔" اس نے نظریں اس کے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔ "میں صرف ایک پیش کش کروں گا۔"

"فرمایئے۔"

"ڈیڑھ کروڑ نہ ایک روپیہ کم نہ ایک روپیہ زیادہ۔"

"یہ تو بہت کم ہیں۔"

"پھر خدا حافظ۔" تحسین صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ دو کروڑ بھی نہیں دے سکتے۔" تحسین نے کوئی جواب نہیں دیا اور دروازے کی طرح گھوم گیا۔ تحسین کا ایک قدم دروازے کے اندر تھا اور دوسرا باہر۔ جب اچانک اس نے پلٹ کر کہا۔ "پونے دو کروڑ دے سکتا ہوں۔"

"مجھے منظور ہے۔" چوہدری صاحب بے تابی سے بولے۔ "مگر آپ کو فوری اور یکمشت ادائیگی کرنا ہوگی۔"

"نہیں۔" تحسین نے دروازے میں رکتے ہوئے کہا۔ "رقم کاغذات کی تکمیل کے بعد ملے گی۔"

"آپ آ کر بیٹھیں تو سہی۔" چوہدری اس کا ہاتھ پکڑ کر صوفے تک لایا۔ "کاغذات تو مکمل ہو سکتے ہیں۔"

"اس سے پہلے میرے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ آپ نے اس بنگلے پر کسی سے قرض تو نہیں لیا ہے۔"

"میں دوسروں کا مقروض ضرور ہوں۔ مگر بنگلہ اس میں کسی طرح ملوث نہیں۔"

"یہ بات میں آپ کی زبان سے نہیں، اپنے ذرائع سے معلوم کروں گا۔"

"لیکن مجھے روپے کی شدید ضرورت ہے۔"

"میں بیعانہ دے سکتا ہوں۔"

"کتنا۔"

"پچاس لاکھ۔"

"آپ واقعی بہت کامیاب بزنس مین ہیں۔" چوہدری صاحب نے ایک گہری سانس لی۔ "چلیئے ایک کروڑ کر دیجئے۔"

"یونہی سہی۔" تحسین کے ہونٹوں پر ہنسی ابھری۔ "چیک لکھ دوں۔"

"برا نہ مانیں۔ میں تو کیش کو ترجیح دوں گا۔"

"مگر بینک تو بند ہو چکا ہوگا۔" تحسین نے رسٹ واچ دیکھی جس میں تین بج رہے تھے۔

"آپ کا اکاؤنٹ کس بینک میں ہے۔"

"آر کے بینک میں۔"

"اس کے منیجر مرزا رحمان میرے دوست ہیں۔" چوہدری نے کہا۔ "آپ میرے ساتھ چلئے وہ چیک کیش کر دیں گے۔"

"جیسے آپ کی خوشی۔" تحسین نے ادھر ادھر دیکھا۔ "مگر گیا اس سودے کی خوشی میں حلق بھی تر نہیں کرائیں گے۔"

"گھر میں کوئی اچھی شراب نہیں۔" چوہدری صاحب نے بتایا۔ "بینک سے فارغ ہونے کے بعد میں آپ کو یہاں کے ایک خفیہ کلب میں لے چلوں گا۔"

"جو ہے۔ وہی لے آئیں۔ بعد میں کلب

چلیں گے۔"

چوہدری نے بے بسی سے کندھے اچکائے اور اٹھ کر الماری کی طرف چلا گیا۔

بینک کاروبار کے لیے تو ایک بجے بند ہو جاتا تھا۔ مگر بیشتر عملہ دوسرے ضروری کاموں کے لیے ساڑھے تین چار بجے تک مصروف رہتا تھا۔

منیجر مرزا رحمان نے ایک سابقہ گاہک سے کہیں زیادہ ایک نئے اور بڑے اکاؤنٹ ہولڈر کی خوشنودی کے خیال سے قدرے ہچکچاہٹ کے بعد چیک کیش کر دیا۔

تحسین نے رقم چوہدری جلال کو دے دی اور چوہدری حسب وعدہ اسے لاہور کے سب سے بڑے اور خفیہ کلب میں لے گیا۔ تحسین بہت خوش تھا۔ اتنا خوش کہ صبح اس لڑکی کے ہاتھوں اٹھائی ہوئی شکست کو بھی بھول چکا تھا۔ اسے لاہور کی مارکیٹ کا بخوبی اندازہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جو بنگلہ اس نے پونے دو کروڑ کا خریدا ہے مارکیٹ کی موجودہ قیمت کے اعتبار سے وہ کسی طرح بھی تین کروڑ سے کم کا نہیں تھا' یوں اسے تقریباً سوا کروڑ کا فائدہ ہوا تھا اور وہ اس فائدے کو اپنی کاروباری سوجھ بوجھ اور بزنس ٹیکٹ سے کام لینے کا نتیجہ خیال کر رہا تھا۔ خوشی کی اس ترنگ میں اس نے رہوار نفس کو بالکل آزاد چھوڑ دیا۔ اتنا آزاد کہ چوہدری جیسا بلانوش بھی حیران رہ گیا۔

مگر وہ تحسین سے زیادہ موقع شناس تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کلب میں شراب نوشی کی اجازت تو ہے۔ مگر پی کر بہکنے کی گنجائش نہیں۔ اسے اندیشہ ہوا کہ تحسین جس طرح گلاس پر گلاس خالی کر رہا ہے اسے دیکھتے ہوئے کسی ہنگامے کی آمد غیر متوقع نہیں۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ تحسین مسلسل اپنی حسن پرستی اور خوبصورتی عورتوں کا ذکر کر رہا تھا۔

مسکرائیے

ایک صاحب کو ان کے سیکریٹری نے انٹرکام پر اطلاع دی کہ ایک خوبصورت سی لڑکی آپ سے ملنے آئی ہے۔ تو ان صاحب نے کہا

"اسے چند سیکنڈ کے بعد بھیج دینا۔"

اس کے بعد انہوں نے ریسیور اٹھا لیا۔ اسی اثناء میں وہ لڑکی اندر داخل ہوگئی۔ وہ صاحب باتیں کرنے لگے۔ "ہاں بھئی وزیراعلیٰ اگر بات کرنا چاہتے ہیں تو کہو میں مصروف ہوں۔ پھر کسی وقت بات کریں اور گورنر صاحب سے کہو۔ میں فارغ ہو کر ان سے ملوں گا۔ اور ہاں وہ پچاس لاکھ کے چیک کا کیا بنا کیش ہوا یا نہیں۔ اچھا جلدی سے مجھے اس کے بارے میں معلوم کر کے بتاؤ۔ خدا حافظ۔" اب انہوں نے لڑکی سے پوچھا۔

"جی فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" وہ لڑکی طنزیہ انداز میں بولی۔ "میں ٹیلی فون کے محکمے میں ملازم ہوں اور آپ کا فون ٹھیک کرنے آئی ہوں۔ جو کل سے ڈیڈ ہے۔"

ترقی

پکڑ دھکڑ شروع ہونے سے پہلے سیاسی اثر و رسوخ رکھنے والے ایک صاحب کو بینک نے قرضے کی ادائیگی کے سلسلے میں خط لکھا تو انہوں نے جواب دیا۔

"مکرمی! ہم نے اپنے قرض خواہوں کو تین درجوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ پہلے درجے میں وہ لوگ اور ادارے شامل ہیں جن کے قرضے جلد ادا کر دیے جائیں گے۔ دوسرے درجے میں وہ ہیں جن کے قرضے شاید کبھی ادا کر دیے جائیں۔ تیسرے درجے میں وہ ہیں جن کے قرضے ادا کرنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ آپ کے خط کے عاجزانہ اور دوستانہ مضمون کی وجہ سے ہم نے آپ کو تیسرے درجے سے نکال کر دوسرے درجے میں شامل کر لیا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میرا خیال ہے۔ تحسین صاحب اب بس کریں' کریں۔" وہ بولا۔ "یہ شرفاء کا کلب ہے۔ اگر آپ لاہور رہنے آرہے ہیں تو یہاں ہائی کلاس سوسائٹی پر آپ کا تاثر اچھا ہی پڑنا چاہیے۔"

"میں بہکنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ چوہدری صاحب۔" تحسین نے اپنی سرخ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم اس سے تین گنا بھی زیادہ پلا دو تو مجال ہے قدموں میں لغزش آجائے۔"

"یہ تو اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔" چوہدری صاحب نے کہا۔ "آپ ضرور اعلیٰ ظرف ہوں گے مگر عام لوگوں کے لیے یہ ایک اچنبھے کی بات ہے۔ دیکھئے بار میں کے علاوہ دوسرے افراد بھی آپ کو گھور رہے ہیں۔ پھر آپ کو ابھی پنڈی بھی جانا ہے۔"

"اچھا بھئی اچھا۔ تم کہتے ہو تو نہیں پیتے بس چلو اٹھو۔"

وہ اٹھا تو واقعی اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ نہیں تھی۔ بار روم سے نکل کر وہ صدر دروازے کی طرف چلے۔

راستے میں ان ڈور گیمز کا ہال پڑتا تھا۔ تحسین قدم بڑھا کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"ہیلو ڈرالنگ۔" اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر لڑکی کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔ "دیکھو! تقدیر ہمیں ایک بار پھر ایک دوسرے کے راستے پر لے آئی ہے۔"

لڑکی کے چہرے پر ناگواری کے ساتھ ہی غصے کے تاثرات نمودار ہوئے اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا کہ کسی اور نے تو یہ بات نہیں سن لی' راہداری میں دونوں طرف کچھ افراد موجود تھے۔ اگرچہ ان کے انداز سے یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ وہ خصوصیت سے اس کی طرف متوجہ ہیں۔ دوسری جانب چوہدری حیران و پریشان سا کھڑا ہوا تحسین کو گھور رہا تھا۔ اسے غالباً یقین نہیں آرہا تھا کہ ان دونوں میں کوئی واقفیت ہو سکتی ہے۔

"معلوم ہوتا ہے صبح کا دیا ہوا سبق یاد نہیں رہا۔" لڑکی کا لہجہ غصیلا ہوتے ہوئے بھی نرم تھا۔ "مکتب عشق کا دستور نرالا دیکھا۔" تحسین نے لپک کر شعر پڑھا۔ "اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا۔"

"میرا خیال تھا آپ میں کچھ شرافت ہوگی۔" لڑکی بولی۔ "مگر آپ تو اول درجے کے لوفر معلوم ہوتے ہیں۔"

"لوفر کو شوہر میں بدل دو تو تمہاری پہچان کی داد نہیں دی جا سکتی۔"

"میں آپ کے منہ نہیں لگنا چاہتی۔ میرا راستہ چھوڑیے۔"

"اپنے چاہنے والوں کو یوں نہ ٹھکراؤ ڈیئر۔ آخر میں وہی تو ہوں' تم آج صبح جس کا پہلو گرم کر رہی تھیں۔"

"بکواس بند کرو۔" لڑکی نے غصیلے انداز میں ریکٹ مارنے کے لیے اٹھایا۔

اب تک کئی لوگ پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ لڑکی نے ریکٹ مارا تو تحسین نے بڑی پھرتی سے اسے پکڑ لیا۔ چوہدری بوکھلا کر آگے بڑھا۔ کچھ اور لوگ بھی لپکے۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں تحسین صاحب۔" چوہدری صاحب نے اس کا بازو پکڑ کر پوری قوت سے ایک طرف کھینچا۔

لڑکی کو موقع مل گیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے ریکٹ چھڑا لیا اور جلد ہی سے گیمز ہال میں گھس گئی۔ چوہدری تحسین کو گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ لوگ گیمز ہال کے سامنے آکر رک گئے۔

"کلب میں ہر ایرے غیرے کو شراب نوشی کی اجازت دینا ہی غلط ہے۔" کسی نے کہا۔

"یہ کوئی مقامی شخص نہیں ہے۔ میں آپ اسے پہلے مرتبہ کلب میں دیکھ رہا ہوں۔" ایک

اور آواز آئی۔

"کوئی بھی ہو لیکن اسے کلب کے قاعدے قانون کا خیال رکھنا چاہیے۔"

"تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ ضرور لڑکی نے اس کی حوصلہ افزائی کی ہوگی۔"

"کی ہو یا نہ کی ہو۔ مگر آج مرزا رحمان کی ناک تو کٹ گئی۔"

چوہدری اس سے زیادہ کچھ نہ سن سکا۔ اس وقت وہ تحسین کو کھینچتا ہوا باہر لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ صدر دروازے سے نکل کر اس نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ تحسین کا بازو چھوڑ کر اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھنے لگا۔ تحسین یوں کھڑا ہوا تھا۔ جیسے کوئی خاص بات نہ ہوئی ہو۔

"یار چوہدری' تم نے مجھے اس سے بات بھی نہیں کرنے دی۔" وہ جیسے شکایتی لہجے میں بولا۔

"تحسین صاحب' ایک بات بھی اور زبان سے نکالتے تو وہیں جوتے پڑ جاتے۔" چوہدری نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "کچھ پتا ہے وہ کون ہے۔"

"کون ہے۔" تحسین نے آنکھیں چندھیاتے ہوئے پوچھا۔

"ندا مرزا' آر کے بینک کے سینئر منیجر رحمان مرزا کی بیٹی اور....." چوہدری معنی خیز طور پر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"اور کیا۔" تحسین نے پوچھا۔

"اور ایس پی کرامت شاہ کی ہونے والی بہو۔"

"ایس پی۔" تحسین نے گھبرا کر چوہدری کی طرف دیکھا۔ "یعنی' یعنی سپرنٹنڈنٹ پولیس لاہور۔"

"ہاں لاہور....." چوہدری نے جواب دیا۔ "اور اتنا ہی نہیں اس کا منگیتر دلاور شاہ آرمی میں میجر ہے۔"

"آرمی میں میجر۔ پولیس میں سپرنٹنڈنٹ۔" تحسین کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ "پھر تو مارے گئے تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔"

"کیسے بتاتا۔ تم نے بتانے کا موقع ہی نہیں دیا۔ بہر حال اب سلامتی اسی میں ہے کہ چپ چاپ نکل جاؤ اور چار چھ ماہ تک کلب میں قدم نہ رکھنا۔"

چوہدری کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی تحسین پارکنگ شیڈ کی طرف بڑھ چکا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے چوہدری نے اس کی کار کلب سے نکلتے ہوئے دیکھی۔ چوہدری جلال دین نے ہونٹوں پر ایک تیکھی مسکراہٹ آگئی اور وہ خود بھی سیٹی بجاتا ہوا گیٹ کی طرف چل دیا۔ اس وقت شام کے ساڑھے چھ بجے تھے۔

اس کے ٹھیک آٹھ گھنٹے بعد رات کے ڈھائی بجے گشتی پولیس کی ایک جیپ کو جس میں ایس آئی داؤد علی دو کانسٹیبلوں کے ساتھ گشت لگا رہا تھا۔ ایک نئی مرسیڈیز کار کھڑی دکھائی دی۔ کار پر راولپنڈی کی رجسٹریشن پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ اس کے انداز سے مشکوک ہو کر داؤد علی نے اندر دیکھا تو اسے اگلی سیٹ پر ایک لاش نظر آئی' لاش کی جیبوں میں پائے جانے والے کاغذات سے پتہ چلا کہ وہ راولپنڈی کا ایک معروف بزنس مین تحسین انصاری تھا۔

سب انسپکٹر شمشیر خان نے ابھی دفتر میں قدم رکھا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی اس نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا۔

"ایس آئی شمشیر خان۔" اس نے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

"شمشیر خان نکلسن روڈ پر واقع کالٹیکس پٹرول پمپ پر پہنچ جاؤ۔" دوسری طرف سے انسپکٹر ظفر کی آواز ابھری۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''رپورٹ ملی ہے کہ کچھ نامعلوم افراد کل رات تین بجے اس کا کیش بکس لوٹ کر لے گئے ابھی ابھی اس کے انچارج' ظہیر کا فون ملا تھا۔ ڈاکو اسے بیہوش کر کے ڈال گئے تھے' ہوش آنے پر اس نے ہمیں فون کیا تھا۔''

''بہت بہتر' میں ابھی جا رہا ہوں۔''

''ایک فنگر پرنٹ عملے کا آدمی بھی ساتھ لے جانا۔'' ظفر نے ہدایت کی۔ ''اور تفتیش سے واپس آتے ہی مجھے رپورٹ۔ دینا آج کل پٹرول پمپ لوٹنے کی وارداتیں بہت بڑھتی جا رہی ہیں۔ ہمیں ان کا کچھ نہ کچھ تدارک کرنا پڑے گا۔''

''یس سر!'' شمشیر خان نے مستعدی سے جواب دیا اور یہ دیکھ کر کہ دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا ہے۔ اس نے بھی ریسیور رکھ دیا۔

باہر جانے کے دروازے پر شمشیر نے آفس کا دروازہ کھولا تو سامنے سعود احمد کھڑا ہوا تھا' وہ دونوں تیسری جماعت سے میٹرک تک ایک دوسرے کے کلاس فیلو رہے تھے۔ میٹرک کے بعد شمشیر چونکہ اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے تعلیم چھوڑ کر پولیس میں بھرتی ہو گیا تھا۔ اس لیے سات آٹھ سال تک ان کے تعلقات تقریباً منقطع سے رہے۔ یہاں تک کہ سعود نے کرمنالوجسٹ کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا۔

اس وقت تک شمشیر اے ایس آئی بن چکا تھا۔ راولپنڈی میں وہ کئی سال تک ایک دوسرے کی مدد کرتے رہے تھے۔ ان کے تعلقات پھر بہترین دوستوں جیسے ہو گئے۔

عام پولیس افسروں کی طرف شمشیر خاں کو تحقیقات جرائم کے نجی اداروں یا اشخاص سے کوئی خدائی بیر نہیں تھا۔ وہ ڈاکٹر سعود کی ذہانت اور ہوشیاری کا بھی بہت مداح تھا۔ یہاں تک کہ گزشتہ سال اے ایس آئی کے عہدے پر ترقی دے کر اس کا تبادلہ لاہور کر دیا تھا۔ اس کے بعد سے ان کی پہلی ملاقات تھی۔

سعود کو دیکھ کر شمشیر خان کے ہونٹوں پر پرتپاک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''ارے' آپ یہاں کیسے۔'' اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے۔''

''گھبراؤ نہیں۔ کسی کیس کے سلسلے میں نہیں آیا ہوں۔'' سعود نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ''تفریحی دورہ ہے۔ سوچا کہ تمہاری ملاقات سے ابتدا کروں۔ کہیں جا رہے ہو۔''

''ہاں۔ نکلسن روڈ پر ایک پٹرول پمپ کو لوٹ لیا گیا ہے۔ تفتیش کے لیے جا رہا ہوں۔''

''اچھا تو پھر میں چلتا ہوں۔ دوپہر کو ایک چکر اور لگا لوں گا۔ اس وقت تک تو آ جاؤ گے۔''

''میرے ساتھ کیوں نہیں چلتے' تمہاری موجودگی سے کچھ فائدہ ہی ہو گا۔''

''بھائی میں یہاں تفریح کے لیے آیا ہوں۔ دماغ سوزی کے لیے نہیں۔''

''تو پھر کیا ہوا۔ ایسی چھوٹی موٹی وارداتیں تو تمہارے لیے تفریح ہی کا درجہ رکھتی ہیں۔'' شمشیر خان نے اصرار کیا۔

''تم نہیں مانو گے۔ اچھا چلو۔''

نکلسن روڈ کے جنوب میں ایک مضافاتی سڑک تھی۔ جو کافی چکر کھا کر ہائی وے سے جا ملتی تھی۔ اس لیے ایسا ٹریفک جسے شہر کے جنوبی حصے میں جانا ہوتا تھا۔ ہائی وے سے اس روڈ پر مڑ جایا کرتا تھا۔ یہ سڑک عام طور پر سنسان رہتی تھی۔ بہت کم ٹریفک چلتا تھا۔ سوائے ان اوقات کے جب راولپنڈی سے آنے والے گڈز ٹرک اس روڈ سے گزرتے تھے کیونکہ لاہور کی منڈی تک پہنچنے کے لیے یہ قریب ترین راستہ تھا۔ جس پٹرول پمپ میں ڈاکے کی رپورٹ ملی تھی۔ اس سڑک کے تقریباً وسط میں واقع تھا۔ یہاں

پٹرول کی فراہمی کے علاوہ کاروں اور لڑکوں کی صفائی سروس اور مرمت کا بھی معقول انتظام تھا۔ اگرچہ کام بہت کم آتا تھا۔

پٹرول پمپ پہنچ کر شمشیر نے تحقیقات شروع کی۔ سعود نے خود کوئی حصہ نہیں لیا۔ صرف اس کی کارروائی کو دیکھتا رہا اور سوال جواب سنتا رہا۔ معلوم ہوا کہ پٹرول پمپ پر عام طور سے صرف دو آدمی موجود ہوتے ہیں۔ ایک انچارج کلرک اور ایک سروس مین جو پٹرول وغیرہ دیتا ہے۔ مرمت اور سروس کا کام صرف دن میں ہوتا ہے۔ جس کی ذمہ داری ایک میکینک اور اس کے مددگار کے سپرد ہے' اس رات اتفاق سے سروس مین کی طبیعت خراب تھی۔ وہ ڈیوٹی پر آیا تھا لیکن انچارج کلرک ظہیر نے اسے چھٹی دے دی کہ وہ گھر جا کر آرام کرے۔

سیل اور سروس وہ اکیلا ہی سنبھال لے گا۔

ظہیر کے بیان کے مطابق رات کے تین بجے جبکہ وہ وقت گزاری کے لیے اپنی کار کی صفائی کر رہا تھا۔ اس نے گزشتہ دنوں ایک پرانی کار سستے داموں خرید لی تھی اور اب پٹرول پمپ کے مالک کی اجازت سے اس کی اوور ہالنگ کرا رہا تھا۔ اس نے بڑی وضاحت سے بتایا کہ یہ اوور ہالنگ میکینک اپنے فارغ اوقات میں کرتا ہے کہ ایک خالی ٹرک پٹرول پمپ میں داخل ہوا' ٹرک میں تین افراد سوار تھے اور تینوں اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ظہیر ٹرک کو دیکھ کر اس کی طرف بڑھا۔

اگلی سیٹ پر ایک لمبا تڑنگا سیاہ فام آدمی جس کے بال چھوٹے اور گھنگریالے تھے اور جس نے صرف شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ نیچے اترا اور اس نے سخت لہجے میں ظہیر سے ٹرک میں پٹرول ڈالنے کے لیے کہا۔ ظہیر نے ابھی مشن سے پائپ اٹھایا ہی تھا کہ اسے اپنے سر پر ایک پہاڑ سا گرتا ہوا محسوس ہوا۔ اسے یوں لگا جیسے

مسکرائیے

بیوی نے ایک خبر پڑھنے کے بعد اخبار سے نظر ہٹا کر شرابی شوہر کی طرف دیکھا اور بولی۔

''ام الخبائث نے ایک اور انسان کی جان لے لی۔ ذرا یہ خبر پڑھو۔

کیماڑی سے ایک شخص منوڑہ کی سیر کے لیے لانچ میں بیٹھا۔ نشے میں ہونے کی وجہ سے وہ الٹی سیدھی حرکتیں کر رہا تھا۔ آخر کار سمندر میں گر پڑا اور ڈوب گیا۔ کوششوں کے باوجود اسے بچایا نہیں جا سکا۔ بدنصیب اگر شرابی نہ ہوتا تو آج زندہ ہوتا۔''

''سمندر میں گرنے تک وہ زندہ تھا نا؟'' شوہر نے پوچھا۔

''ہاں۔'' بیوی نے جواب دیا۔

''پانی میں گر کر ڈوبنے کے بعد مرا ہو گا۔'' شوہر نے مزید تصدیق چاہی۔

''ہاں۔'' بیوی کو تسلیم کرنا پڑا۔

''تو پھر یوں کہو نا کہ وہ پانی کی وجہ سے مرا۔ شراب کو کیوں الزام دے رہی ہو۔؟'' شوہر نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

☆

حمید نے ایک مرتبہ بتایا کہ اس نے ایک محفل میں اکچاس اُبلے ہوئے انڈے کھا کر ایک ریکارڈ قائم کر دیا تھا

''تو ایک انڈا اور کھا لیتے تاکہ پورے پچاس ہی ہو جاتے۔'' سلیم نے مشورہ دیا۔

''کیوں کھا لیتا ایک اور انڈا؟'' حمید ذرا خفگی سے بولا۔ ''تم چاہتے ہو کہ میں ایک انڈے کی خاطر اپنے آپ کو وہاں پٹوا مشہور کر لیتا۔؟''

☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کی کھوپڑی ٹوٹ کر بکھر گئی ہے۔ شدید تکلیف کے احساس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

اور پھر اسے کچھ معلوم نہیں کہ کیا ہوا۔

یہ اتفاق ہی تھا کہ باقی رات پٹرول پمپ پر کوئی کار یا ٹرک نہیں آیا تھا۔ ورنہ شاید ڈاکے کا پتا پہلے چل جاتا۔ بہر حال صبح سات بجے کے قریب جب اسے ہوش آیا تو وہ پٹرول پمپ کی عمارت کے اندر ایک بنچ پر لیٹا ہوا تھا۔ سر درد کے مارے پھٹا جا رہا تھا۔ نقاہت سے چکر آ رہے تھے۔ مگر رات کی بات یاد کر کے وہ کسی نہ کسی طرح اٹھا۔ اس نے دیکھا کہ کیش بکس کھلا پڑا ہے اور اس میں رکھے ہوئے پچاس لاکھ سے زیادہ روپے غائب ہیں۔ کچھ نقدی میز کی ایک دراز میں پڑی رہتی تھی۔ اتنا ہی نہیں ڈاکوؤں نے اس کی جیب سے بھی تقریباً دس ہزار روپے نکال لیے تھے۔ پٹرول پمپ کا اپنا فون خراب تھا اس لیے اس نے باہر لگے ہوئے پبلک فون بوتھ سے پولیس ہیڈ کوارٹر فون کر کے ڈاکے کی رپورٹ کی اور وہاں سے ملنے والی ہدایت کے مطابق پولیس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ حالانکہ اس کے سر میں شدید تکلیف تھی۔ پچھلے حصے میں کوئی زخم آیا تھا۔ جس کی مرہم پٹی کے لیے اسے کسی ڈاکٹر کے پاس جانا چاہئے تھا۔

شمشیر خان نے ظہیر کا بیان سنا۔ ضروری باتیں نوٹ کیں۔

کیش بکس کا جائزہ لیا۔ اسے چابی سے کھولا گیا تھا جو ظہیر کے کہنے کے مطابق میز کی کسی دراز میں دوسری چابیوں کے ساتھ رکھی رہتی تھی۔ اس وقت وہ چابی کیش بکس کے قفل سے لگی ہوئی ملی تھی۔ شمشیر خان نے چابی احتیاط سے نکال کر ایک کاغذ میں لپیٹ کر جیب میں رکھ لی کہ شاید اس پر انگلیوں کے نشانات ہوں اور ان سے کوئی سراغ مل سکے۔ کیش بکس کو بھی محفوظ کر دیا گیا۔

پٹرول پمپ کی تلاشی لی گئی۔ اس کے دو حصے تھے۔ ایک میں عمارت پٹرول ڈالنے کی مشینیں اور پبلک فون بوتھ تھا۔

دوسرے حصے میں سروس ہوتی تھی۔ کاریں دھونے اور صفائی کرنے والے پلیٹ فارم پر آہنی پلر کے سہارے ایک پرانی شیورلیٹ کار ہوا میں معلق تھی۔ ظہیر کے کہنے کے مطابق یہ اس کی کار تھی۔ اس کی اوور ہالنگ اور سروس وغیرہ ہو چکی تھی۔ صرف دھو کر پالش کرنا باقی تھا۔

پٹرول پمپ اور سروس والے حصے کی اچھی طرح تلاشی لینے کے بعد بھی کوئی مفید سراغ نہیں ملا تھا۔ ویسے شمشیر خان کو اس کی امید بھی کم تھی۔ اس کا اندازہ تھا کہ ڈاکو آئے، ظہیر کو بے ہوش کیا۔ جتنی نقدی جہاں جہاں موجود تھی لوٹی اور رفو چکر ہو گئے۔ ظہیر نے اس آدمی کا جو حلیہ بتایا تھا۔ وہ تقریباً وہی تھا جو گزشتہ ماہ میں ہونے والی کئی وارداتوں کے بعد وہاں کے عملے نے بتایا تھا۔ اس لیے ظاہر تھا کہ یہ ڈاکہ بھی اس گروہ کا کارنامہ تھا۔

''ہمارا یہاں کا کام ختم ہو چکا ہے۔'' شمشیر خان نے ظہیر سے کہا۔ ''ہم چابی اور کیش بکس لیے جا رہے ہیں کہ شاید ان پر انگلیوں کے نشانات مل جائیں اگرچہ دوسری وارداتوں کے پیش نظر اس کی امید کم ہی ہے۔ تم پٹرول پمپ بند کر کے کسی ڈاکٹر سے اپنے زخم کی مرہم پٹی کرا لو اور اس سے اپنے زخم کے بارے میں رپورٹ لے کر مجھے ہیڈ کوارٹر پہنچا دینا۔''

''بہت اچھا۔'' ظہیر نے جواب دیا۔ ''مگر میں بارہ ایک بجے سے پہلے نہیں آ سکوں گا۔ ڈاکٹر سے پٹی کروا کر مجھے پٹرول پمپ واپس آنا ہوگا۔ تاکہ جب دن کی ڈیوٹی والا عملہ آئے تو میں انہیں موجود ملوں پھر مالک کو بھی ڈاکے کی اطلاع دینا ہے۔''

''دن کا عملہ کب آتا ہے۔'' شمشیر خان نے پوچھا۔

''دس بجے۔''

''اچھی بات ہے۔ جب تمہیں فرصت ملے آ جانا۔'' شمشیر خان نے کہا اور سعود کی طرف دیکھا۔ ''تم خاموش ہو۔ اس واردات کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔''

''کیا میری رائے جاننا ضروری ہے۔'' سعود نے خفیف تبسم کے ساتھ پوچھا۔

''استادوں سے مشورہ لینا بہر حال اچھا ہوتا ہے۔''

''بہت خوب پھر میں دو چار سوال پوچھنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار کروں گا۔'' سعود نے ظہیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم جتنے چاہو سوال کرو۔'' شمشیر خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہارے کپڑوں پر گریس کے اتنے دھبے کیوں ہیں۔'' سعود نے ظہیر سے پوچھا۔

''میں نے بتایا ناں کہ میں کار کی صفائی کر رہا تھا۔'' ظہیر نے جواب دیا۔

''صفائی میں کپڑے اس طرح اور اتنے زیادہ تو خراب نہیں ہوتے۔ یہ تو ایسا لگتا ہے جیسے صفائی کرتے ہوئے تمہارا پیر پھسل گیا ہو اور تم گر پڑے ہو۔''

''جی ہاں۔ گر بھی گیا تھا۔'' ظہیر نے جیسے شرمندہ ہوتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا تم کہتے ہو کہ ڈاکو سب کچھ لے گئے یہاں تک کہ تمہاری جیبوں میں بھی کچھ نہیں چھوڑا۔''

''میں کہتا ہوں جناب آپ خود دیکھ لیں۔'' ظہیر بولا۔ ''انسپکٹر صاحب نے بھی تلاشی لی ہے۔ کہیں ایک پائی بھی ملی۔''

''سچ کہہ رہے ہو۔'' سعود نے سر ہلایا۔ ''ہوش میں آنے کے بعد تم نے خود بھی تو اپنے اطمینان کے لیے تلاشی لی ہوگی۔''

''جی ہاں سب جگہ دیکھا تھا۔''

''پھر کیا اس وقت بھی کہیں کوئی نقدی نہیں ملی تھی۔''

''اگر کچھ ہوتا تو میں ضرور انسپکٹر صاحب کو بتاتا۔'' ظہیر نے کہا اور پھر چونک کر سعود کو دیکھا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ سوچ رہے ہوں کہ ڈاکو جو کچھ چھوڑ کر گئے وہ میں نے چرا لیا۔ اگر ایسا ہے تو آپ اپنی رائے کے مالک ہیں، جو چاہیں سمجھیں لیکن ایک غریب آدمی کی بھی کچھ عزت ہوتی ہے۔''

''ضرور ہوتی ہے۔ بشرطیکہ اس نے اپنی عزت نفس کا سودا نہ کر لیا ہو۔''

سعود نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔ ''دیکھو ظہیر میں ایک بار پھر تم سے پوچھتا ہوں اور اس مرتبہ خوب اچھی طرح غور کر کے جواب دو، کیا واقعی ڈاکو سب کچھ لے گئے اور انہوں نے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔''

''جی ہاں جو سچ تھا میں نے بتا دیا۔ آپ ہزار مرتبہ پوچھیں گے تب بھی میرا جواب یہ ہوگا۔'' ظہیر نے ناگواری سے کہا۔

''اور تمہارے ہوش میں آنے کے بعد سے پولیس کی آمد تک یہاں کوئی دوسرا گاہک بھی نہیں آیا۔'' سعود نے پوچھا۔

''جی نہیں۔'' ظہیر نے اس عجیب سوال پر کچھ حیرت ظاہر کی۔

''اگر یہ بات ہے۔ تو پھر شمشیر تم ظہیر کو گرفتار کر لو۔'' سعود کی بات قدرے غیر متوقع تھی کہ ظہیر اور شمشیر خان ہی نہیں دونوں کانسٹیبل بھی چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

''مگر کیوں۔'' شمشیر خان نے حیرت سے پوچھا۔

''میں اس نوعیت کی دوسری وارداتوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' سعود نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ''لیکن جہاں تک اس پٹرول پمپ کا تعلق ہے تو یہاں کوئی ڈاکہ نہیں پڑا۔ ظہیر جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کی داستان خودساختہ اور فرضی ہے بات یہاں تک تو درست ہے کہ اتفاقاً سروس مین کی طبیعت خراب ہوگئی اور ظہیر نے اسے چھٹی دے دی۔ اس کے جانے کے بعد یہ اپنے بیان کے مطابق بلاشبہ اپنی کار کی صفائی بھی کررہا تھا لیکن صفائی کرتے ہوئے اس کا پیر پھسلا اور یہ پیٹھ کے بل پلیٹ فارم کے نیچے گرا۔ وہاں یقیناً لوہے کا کوئی بھاری نوکیلا اوزار مثلاً وہ آہنی پٹری جس پر میکینک ٹھوکنے پیٹنے کا کام کرتے ہیں' پڑا تھا۔ وہ اس کے سر کے پچھلے حصے میں لگا اور یہ غالباً کچھ دیر کے لیے بیہوش ہوگیا۔ ہوش میں آیا تو تنہائی اور شیطان نے اس کے دماغ میں یہ انوکھا خیال پیدا کردیا کہ اگر یہ چاہے تو اپنی چوٹ سے مالی فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے۔ ممکن ہے اس کے ذہن میں پہلے سے ایسا کوئی خیال موجود ہو۔ بہرحال اسے خیال آیا کہ پیٹرول پمپوں پر ڈاکے کی وارداتیں ہورہی ہیں' اس نے وہ خبریں گواہوں کے بیانات اور شاید ڈاکوؤں یا ان میں سے کسی ایک کا حلیہ وغیرہ بھی پڑھا ہوگا۔ اس نے سوچا کہ اگر یہ اپنی چوٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ کہہ دے کہ ڈاکوؤں نے اسے بیہوش کرکے ڈال دیا تھا۔ تو پھر کیش بکس کی رقم آسانی سے ہضم کرسکتا ہے۔''

شمشیر نے ظہیر کی طرف دیکھا۔ جس کا چہرہ مسعود کی یہ باتیں سن کر فق ہوگیا تھا۔

''ممکن ہے۔ اس کی سر پر چوٹ پھسل کر گرنے سے ہی آئی ہو۔'' شمشیر نے کہا۔ ''لیکن اس کے علاوہ جو کچھ تم نے کہا وہ محض ایک انداز ہے۔ آخر تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہاں ڈاکہ نہیں پڑا اور ظہیر جھوٹ بول رہا ہے۔''

''حیرت ہے کہ خود تمہاری توجہ اس طرف کیوں نہیں گئی۔'' سعود مسکرایا۔ ''ظہیر کہتا ہے اور بااصرار کہتا ہے کہ ڈاکو سب کچھ لے گئے۔ نہ اس کے پاس اور پٹرول پمپ میں کسی اور جگہ نقدی کے نام کی کوئی شے موجود ہے نہ ہی یہاں کوئی گاہک اور آدمی آیا۔ اگر یہ سچ ہے تو اس سے پوچھو کہ اس نے پولیس ہیڈ کوارٹر فون کرنے کے لیے پیسے کہاں سے حاصل کیے۔ یقیناً وہ اس کے پاس تھے اور جب وہ اس کے پاس تھے تو باقی رقم بھی اس کے پاس ہوئی۔ اس کا یہ معمولی سا جھوٹ سارے بیان کو جھوٹا ثابت کردیتا ہے۔''

شمشیر خان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے ایک بار پھر ظہیر کی طرف دیکھا جس کا چہرہ اب سفید پڑچکا تھا اور آنکھوں سے خوف کا اظہار ہورہا تھا۔

''مگر سعود۔'' شمشیر نے کہا۔ ''اگر اس نے چوری کی ہے تو رقم کہاں گئی۔ ہم نے اس جگہ کا ایک ایک کونہ' ایک ایک گوشہ تلاش کرلیا کہیں تم یہ تو نہیں کہنا چاہتے کہ اس درمیانی مدت میں ظہیر نے رقم کہیں چھپادی یا اپنے گھر رکھ آیا۔''

''جہاں تک میرا اندازہ ہے۔'' سعود نے جواب دیا۔ ''رقم یہیں موجود ہے۔''

''مگر کہاں۔''

''تم نے ہر مقام تو دیکھ لیا۔'' سعود ہنسا۔ ''مگر پلیٹ فارم پر ایک ستون کے سہارے ہوا میں معلق ظہیر کی کار میں بھی جھانکا۔ چوری کی رقم چھپانے کے لیے اس سے بہترین جگہ اور کیا ہوسکتی ہے۔''

ظہیر نے ایک جست لگائی اور کسی خوفزدہ خرگوش کی طرح جان توڑ کر بھاگا۔ مگر دونوں کانسٹیبل اس سے کہیں زیادہ تیز رفتار تھے۔ انہوں نے ایک فرلانگ کے اندر ہی اسے جالیا۔

بعد میں کار کی تلاشی لینے پر اگلی سیٹ کے نیچے چھپی ہوئی وہ ساری رقم بھی برآمد ہوگئی۔ جس میں کیش بکس کی نقدی ہی نہیں۔ بلکہ شاید

ظہیر کے پیسے بھی شامل تھے۔

شمشیر خان ہیڈ کوارٹر پہنچا تو سعود کی ذہانت کے حیرت انگیز مظاہرے سے اس قدر جوش میں بھرا ہوا تھا کہ ظہیر کو حوالات میں بند کرنے کے بعد وہ سعود کو تقریباً گھسیٹ کر اپنے انچارج انسپکٹر ظفر کے آفس میں لے گیا۔ اتنے اپنے جوش میں اس بات کی بھی زیادہ پرواہ نہیں کی کہ اس وقت انسپکٹر ظفر کے دفتر میں ایس پی کرامت شاہ ان کا بیٹا میجر دلاور شاہ اس کی منگیتر ندا مرزا اور اس کے والد مرزا رحمان موجود تھے اور یہ کہ ان سب کی موجودگی اور اس سے زیادہ ان کی سنجیدگی بذات خود ایک عجیب بات تھی۔

''ظفر صاحب۔'' وہ مسعود کی طرف اشارہ کرکے بولا۔ ''ان سے ملیئے یہ ہیں۔ میرے بہترین دوست اور ملک کے مایہ ناز کرمنالوجسٹ مسعود احمد صاحب جب آپ کا فون ملا تو اتفاق سے اسی وقت آئے تھے۔ راولپنڈی میں بھی یہ ہماری مدد کرتے رہتے تھے۔ میں انہیں اپنے ساتھ پٹرول پمپ پر لے گیا اور جانتے ہیں۔ انہوں نے نصف گھنٹے میں سارا معمہ حل کرلیا۔ میں ابھی مجرم کو جو کوحوالات میں بند کرکے آرہا ہوں۔ رقم بھی برآمد کرلی گئی ہے۔''

ظفر اور ایس پی صاحب اگر اس مداخلت پر کچھ ناراض ہونے کی تیاری بھی کررہے تھے تو یہ عجیب بیان سن کر چونک پڑے۔ کرامت شاہ صاحب اور باقی سب لوگوں نے حیرت سے سعود کی طرف دیکھا۔

''اچھا۔'' ظفر بھی مسکرا کر بولا۔ ''پھر تو واقعی کمال ہے۔ مجرم کون نکلا۔''

''ظہیر اس پٹرول پمپ کا انچارج کلرک۔'' شمشیر نے اور زیادہ خوش ہوتے ہوئے جواب دیا اور پٹرول پمپ پر پیش آنے

مسکرائیے

''اتنی زیادہ رقم کا بل.....؟'' آپریشن کے بعد ایک مریض نے سرجن کا بل دیکھ کر احتجاج کیا۔

''میرے دوست!'' سرجن نے مشفقانہ لہجے میں کہا۔ ''اگر تمہیں معلوم ہوجاتا کہ تمہارا کیس کتنا پیچیدہ تھا اور کس طرح میں نے تمہارے آپریشن کو پوسٹ مارٹم میں تبدیل ہونے سے روکا۔ تو تم اس سے تین گنا بل بھی خوشی سے ادا کردیتے۔''

تعلیم

ایک سرمایہ دار نے دوسرے سرمایہ دار سے کہا۔ ''تم نے اپنے بیٹے کو بھی اپنی فرم میں رکھ لیا ہے۔ اس کی کالج کی تعلیم تو اس کے کچھ کام آرہی ہوگی۔؟''

''ہاں..... یقیناً.....'' دوسرے سرمایہ دار نے جواب دیا۔ ''دفتر میں جب بھی کوئی میٹنگ وغیرہ ہوتی ہے تو کولڈ ڈرنکس اور برگر وغیرہ وہی لاتا ہے۔''

دلیل

کثرت شراب نوشی کے الزام میں گرفتار ہونے والے ایک شخص نے لاس اینجلس کی عدالت میں مؤقف اختیار کیا کہ اسے طبی بنیادوں پر معافی دے جائے۔ اس سے جب اس کی وضاحت چاہی گئی تو اس نے بتایا کہ ڈاکٹر نے اسے بھڑ کے کاٹنے پر وہسکی لگانے کا مشورہ دیا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہسکی باہر کے بجائے اندر سے بہتر اثر کرے گی۔ چنانچہ وہ تکلیف دور ہونے کے انتظار میں پیے جارہا تھا۔''

☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

والی ایک ایک بات تفصیل سے بتائی' اس نے ایک عجیب حرکت اور بھی کی ٹھیک اس جگہ رک گیا۔ جہاں اس نے سعود سے اس کی رائے پوچھی تھی اور پھر ظفر سے دریافت کیا کہ اتنے واقعات سن کر اور پھر یہ جان کر بھی کہ ظہیر مجرم ہے کیا اس کے ذہن میں کوئی ایسا نکتہ آتا ہے۔ جس کی بنیاد پر ظہیر کو چور قرار دیا جا سکتا ہو۔

ظفر نے کچھ ذہن پر کچھ زور دیا اور پھر مسکراتے ہوئے شمشیر خان سے کہا کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ وہی انکشاف کرے۔ ایس پی صاحب اور دلاور شاہ بھی خاموش بیٹھے رہے۔ اس پر شمشیر خان نے کچھ اور فخریہ انداز میں اس نکتے کی پوری وضاحت کرتے ہوئے اپنی داستان انجام تک پہنچائی۔

''اب آپ بتائیے ہے ناں حاضر دماغی کی بہترین مثال۔''

''سچ کہہ رہے ہو۔'' ظفر نے ہنستے ہوئے جواب دیا اور پھر بڑی گرم جوشی سے سعود احمد سے ہاتھ ملایا۔ ''آپ کا نام تو پہلے بھی سنتا رہا ہوں۔ آج اس انداز میں ملاقات کر کے واقعی بڑی مسرت ہوئی۔''

ایس پی صاحب' دلاور شاہ' ندا اور مرزا رحمان نے بھی اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

''ابو جی!'' اچانک ندا بول اٹھی۔ ''کیوں نہ اپنے کیس میں بھی سعود احمد صاحب سے مشورہ کیا جائے۔ رائے لینے میں تو کوئی نقصان نہیں۔''

مرزا رحمان نے سوالیہ نظروں سے ایس پی صاحب کی طرف دیکھا۔

''نام نہاد ماہرین جرائم یا پرائیویٹ جاسوسوں کے بارے میں میری رائے کچھ اچھی نہیں رہی۔ ایس پی جن سے اختلاف کے باوجود میں ان کی قدر کرتا ہوں۔ ڈاکٹر سعود بھی ان میں سے ایک ہیں۔ میرے خیال میں ان سے بات کی جا سکتی ہے۔''

''اس کے علاوہ۔'' دلاور نے کچھ پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔ ''کل تک یہ بات یقیناً اخبارات میں آ جائے گی اور ہمارا معاملہ نجی نہیں رہے گا۔ پھر کیوں نہ سعود صاحب کو وہ باتیں ابھی بتا دی جائیں جنہیں کل یہ اخبارات میں دیکھ لیں گے۔''

''کمرے میں قدم رکھتے ہی مجھے احساس ہو گیا تھا۔'' سعود نے آہستہ لہجے میں کہا۔ ''کہ آپ لوگ کسی بے حد نازک اور سنجیدگی مسئلے میں الجھے ہوئے ہیں۔ اگر میرا بس چلتا تو میں اس بھلے آدمی کو بھی اس بچکانہ انداز میں اپنا تعارف کرانے نہیں دیتا اور اب جو بات ہو گئی ہے اس کے باوجود ضروری نہیں کہ آپ اپنے کسی نجی معاملے میں مجھے شریک کریں۔ میں یہاں محض تفریح کے لیے آیا تھا۔ کسی کیس میں الجھنے کا وہم گمان بھی نہ تھا۔''

''نہیں..... نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' دلاور شاہ نے جلدی سے کہا۔ ''کم سے کم میں سچ مچ آپ کا مشورہ لینا چاہتا ہوں۔''

''بہتر ہے۔ آپ مجھے اس اعتماد کا اہل سمجھتے ہیں تو مجھے کوئی خدمت کر کے خوشی ہو گی۔''

''بات یہ ہے سعود صاحب۔'' ایس پی صاحب نے کھنکار کر گلہ صاف کرتے ہوئے گفتگو کی ذمے داری خود سنبھال لی۔ ''کہ کل صبح یہ بچی ندا جو مرزا صاحب کی بیٹی اور میرے بیٹے دلاور شاہ کی منگیتر ہے۔ اپنی خالہ سے ملنے راولپنڈی جا رہی تھی۔ لاہور سے تقریباً بیس میل آگے جا کر اس کی کار خراب ہو گئی۔ اس نے راولپنڈی سے آنے والے ایک شخص سے جس کا نام ہمیں اب بعد میں معلوم ہوا کہ تحسین انصاری تھا۔ واپسی کے لیے لفٹ لی۔ مگر وہ شخص باوجود ایک بڑا بزنس مین ہونے کے انتہائی شہدا اور بدمعاش ثابت ہوا۔ ندا نے بڑی ذہانت سے کام

لیا۔ اس کی کسی حد تک پر اعتراض یا ناراضگی کا اظہار کرنے کے بجائے اس نے بہانے سے اسے واپس اپنی کار تک چلنے کے لیے کہا اور وہاں اتر کر اس کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ تحسین انصاری نے دست درازی کو کوشش کی تو اس کا چہرہ نوچ لیا۔ اتفاق سے اسی وقت کچھ اور کاریں آتی نظر آئیں۔ جنہیں دیکھ کر وہ شخص بھاگ نکلا۔ ندا ایک اور شریف آدمی سے لفٹ لے کر واپس آئی۔ مگر گھر پر اس حادثے کا ذکر نہیں کیا کہ والدین بلاوجہ پریشان ہوں گے۔

بظاہر بات ختم ہو گئی تھی اور ندا کو توقع نہ تھی کہ اس بدمعاش سے دوبارہ آمنا سامنا ہو گا لیکن یہ شام کو کلب گئی تو وہ تحسین انصاری وہاں موجود تھا اور بڑی طرح شراب پیئے ہوئے تھا۔

اس نے ندا کو دیکھ کر پھر شرارت کرنے کی کوشش کی۔ کچھ سوخیانہ فقرے کسے لیکن اس سے پہلے کہ بات کچھ اور زیادہ بڑھتی۔ چوہدری جلال دین نامی ایک آدمی نے جسے ہم لوگ بھی جانتے ہیں اور جو اس وقت تحسین مرزا کے ساتھ تھا اسے روک لیا اور اسے پکڑ کر باہر لے گیا۔ اب چونکہ بات پھیل گئی تھی۔

کلب میں کئی افراد نے یہ منظر دیکھا تھا۔ اس لیے ندا نے اپنے والد اور دلاور سے اس واقعے کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھا۔ قدرتی طور پر اس حادثے پر مرزا رحمان کو غم و غصہ ہونا چاہیے تھا اور دلاور کا تو نوجوان خون ہے۔ یہ دونوں الگ الگ اپنے طور پر چوہدری جلال دین کے گھر گئے اور اس سے تحسین انصاری کے بارے میں دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ راولپنڈی کا ایک بڑا بزنس مین ہے اور یہاں رہائش اختیار کرنے کے لیے بنگلہ خریدنے آیا تھا۔ بلکہ چوہدری صاحب نے ایک بنگلے کا سودا کر گیا ہے اور خود واپس راولپنڈی چلا گیا ہے۔

چوہدری صاحب نے اس کی طرف سے معذرت چاہی اور اطمینان دلایا کہ وہ اسے سمجھے دے گا۔ یہ لوگ واپس آ گئے اور مناسب یہ ہی سمجھا کہ بات کو یہیں ختم کر دیا جائے لیکن قسم کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ گزشتہ رات ڈھائی بجے پولیس کی گشتی جیپ کو تحسین انصاری کی اپنی کار میں اس کی لاش ملی' کسی نے گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کر دیا تھا۔ یہ خبر ابھی عام نہیں ہوئی۔

لیکن کل شام کا واقعہ تقریباً پوری ہائی سوسائٹی میں پھیل چکا ہے۔ اب اگر تحسین انصاری کے قتل کیے جانے کا حال اخبارات میں آیا تو لوگ کرامت شاہ صاحب یا دلاور شاہ یا پھر دونوں کو ملوث کرنے سے باز نہیں آئیں گے۔ خاص طور سے اس صورت میں کہ ہماری اطلاع کے مطابق چوہدری جلال دین ابھی سے سب جگہ یہ کہتا پھر رہا ہے کہ کرامت شاہ صاحب اور دلاور شاہ دونوں اس کے پاس تحسین کو پوچھتے ہوئے آئے تھے اور وہ دونوں اتنے غصے میں معلوم ہوتے تھے کہ اگر تحسین راولپنڈی نہ چلا گیا ہوتا تو ضرور اس کی ہڈی پسلی ایک کر دیتے۔ اتنا ہی نہیں وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اس نے رات کے ایک بجے جبکہ وہ سینما سے سیکنڈ شو دیکھ کر واپس آ رہا تھا۔ دلاور شاہ کو ٹھیک اسی جگہ کھڑے دیکھا تھا۔ جہاں بعد میں تحسین کی کار کھڑی ملی اور یہ کہ دلاور شاہ نے اسے دیکھ کر چھپنے کی کوشش کی اور ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا اور وہ بھی اسے دیکھ لینے کے باوجود نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

''ایک منٹ۔'' سعود احمد نے جو بڑی توجہ سے پوری گفتگو سن رہا تھا' ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''کیا چوہدری کو تحسین کے قتل ہونے کا علم ہے۔''

''چونکہ یہ خبر ابھی ہیڈ کوارٹر میں بھی چار' پانچ افراد سے زیادہ کسی کو نہیں معلوم' اس لیے یہ ہی کہا جا سکتا کہ اسے قتل کی واردات کا علم نہیں ہو سکتا۔'' ایس پی نے جواب دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''پھر وہ یہ کس طرح کہتا ہے کہ اس نے دلاور کو اس جگہ دیکھا۔ جہاں بعد میں کار کھڑی ملی۔''

''یہ وہ نہیں کہتا ہے میرا مطلب ہے کہ اسے کار کے ملنے کا پتا نہیں' یہ تو میں نے آپ کو سمجھانے کے لیے کہہ دیا تھا۔ اس کا تو کہنا یہ ہے کہ اس نے دلاور کو اسی جگہ دیکھا جہاں سے ایک نیم پختہ سڑک اس کے بنگلے تک جاتی ہے اور اس نے تحسین انصاری سے اسی بنگلے کا سودا کیا تھا۔''

''اور تحسین کی کار بھی اسی جگہ پائی گئی تھی۔'' سعود نے پوچھا۔

''جی ہاں..... آپ سمجھ سکتے ہیں کہ صورت حال کتنی نازک ہے۔'' ایس پی کرامت شاہ نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''مرزا صاحب تو حسب معمول اپنے گھر میں تھے۔ اپنے بیوی بچوں کی ہی نہیں بلکہ ملازموں کی بھی گواہی پیش کر سکتے ہیں کہ وہ رات کے نو بجے سے صبح آٹھ بجے تک اپنے گھر میں تھے اور کسی بھی وقت کہیں باہر نہیں گئے' لیکن شومئی قسمت سے دلاور شاہ نے ایسی کوئی شہادت پیش نہیں کر سکتا۔''

''کیوں۔'' سعود نے پوچھا۔

''اتفاق سے ہمارے ایک قریبی عزیز کی بیٹی کی شادی ہونے والی ہے۔ کل رات ان کے گھر مہندی کی رسم تھی۔ میرے تمام گھر والے وہاں گئے ہوئے تھے اور دلاور شاہ گھر میں اکیلا تھا۔ خود میں ایک ضروری کام سے راولپنڈی گیا ہوا تھا اور آج صبح واپس آیا ہوں۔''

''آپ کے گھر والے تقریب سے کب واپس پہنچے تھے۔''

''کوئی دو بجے رات۔''

''گویا' اس طرح کوئی بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ دلاور رات کے ایک بجے وہاں ہو سکتے تھے۔ جہاں چوہدری جلال دین ان کا دیکھنا بیان کرتا ہے۔''

''ظاہر ہے۔''

''مگر یہ خود کیا کہتے ہیں۔'' سعود احمد نے دلاور کی طرف دیکھا۔

''آپ یا کوئی اور میری بات پر یقین کرے یا نہ کرے۔'' دلاور نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''مگر خدا جانتا ہے کہ میں رات سوا دس بجے گھر میں قدم رکھنے کے بعد آج صبح ساڑھے نو بجے اس وقت باہر نکلا ہوں۔ جب ظفر صاحب نے مجھے فون کر کے یہاں بلایا ہے۔''

''چنانچہ اب ہمارے سامنے یہ مشکل سوال درپیش ہے۔'' ایس پی صاحب نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''کہ اس صورتحال میں کیا کریں۔ ایک طرف ہمیں یقین ہے کہ دلاور شاہ نے یہ جرم نہیں کیا۔ دوسری طرف واقعاتی شہادتیں یا تو مشکوک ہیں یا اس کے خلاف ہیں اور یہ بھی اندیشہ ہے کہ میرے دشمن یہ الزام لگانے سے بھی باز نہیں آئیں گے کہ دلاور کو اس جرم کی ہمت اس لیے ہوئی کہ وہ پولیس اور فوج دونوں کو اپنا پشت پناہ خیال کرتا ہے اور اب بھی اس کے خلاف کوئی کارروائی اس لیے نہیں کی جا رہی ہے یا نہیں کی جائے گی کہ اس کا باپ اس شہر کا ایس پی ہے۔ کیس کا چارج ظفر کے پاس ہے اور اس غریب کے لیے بھی یہ مسئلہ دردسر بنا ہوا ہے کہ ان حالات میں کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ بظاہر' دلاور شاہ اسی صورت میں بچ سکتا ہے کہ پولیس اصل قاتل کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ مگر موقع واردات پر کوئی ایسا سراغ نہیں ملا جو قاتل کی شناخت یا گرفتاری میں مدد دے سکے۔ اب آپ یہ بتائیے کہ ان حالات میں ہمارے لیے بہترین لائحہ عمل کیا ہو سکتا ہے۔'' مرزا رحمان نے کہا۔ ''نیز اگر آپ اصل قاتل کی گرفتاری کے سلسلے میں کوئی مدد کر سکتے ہوں تو بھی ہم آپ کے بہت ممنون

ہوں گے۔''

''اس بارے میں آپ کی جو بھی فیس ہوگی۔ وہ ہم ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔'' دلاور بولا۔

''دیکھیے' میں اتنی جلدی نہ کوئی رائے قائم کر سکتا ہوں نہ کچھ مشورہ دے سکتا ہوں۔'' سعود احمد نے کہا۔ ''البتہ کیس مجھے دلچسپ معلوم ہو رہا ہے اور آپ نے اجازت دی تو میں اس کو حل کرنے کی ضرور کوشش کروں گا۔''

''ہماری طرف سے نہ صرف اجازت ہے۔ بلکہ ہم آپ کے تعاون کی قدر کریں گے۔'' ظفر نے جواب دیا۔

''اس صورت میں میں کچھ سوالات پوچھ سکتا ہوں۔''

''ضرور پوچھیے۔ مجھے جو کچھ معلوم ہوگا۔ بتانے سے دریغ نہیں کروں گا۔'' ظفر نے کہا۔

''سب سے پہلی بات تو یہ کہ.....'' سعود نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ سب لوگوں کی یہاں اس طرح موجودگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسپکٹر ظفر' آپ نے دلاور شاہ کو حراست میں لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ میٹنگ کسی ایسے ہی بڑے مسئلے کے پیش نظر ہو سکتی ہے لیکن ایس پی صاحب نے مجھے جو حالات بتائے ان کی روشنی میں دلاور شاہ کے خلاف ایک قوی شک تو پیدا ہوتا ہے لیکن وہ شک گرفتاری کا جواز نہیں بن سکتا۔ یا تو یوں کہنا چاہیے کہ ممکن تھا کہ کسی عام آدمی کی بات ہوتی تو ظفر صرف اس شک پر اسے گرفتار کر لیتے لیکن آرمی کے ایک میجر اور ایس پی کے بیٹے پر ہاتھ ڈالنے کے لیے انہیں کچھ اور ثبوت درکار ہونا چاہیے' اس لیے میرا خیال ہے کہ آپ نے ابھی مجھے پوری بات نہیں بتائی۔''

ظفر نے معنی خیز نظروں سے ایس پی کی طرف دیکھا جو کسی قدر حیرت سے سعود کو گھور

مسکرائیے

☆ ''نیو میکسیکو'' نامی ایک اخبار کے دفتر میں فون کر کے ایک شخص نے کہا کہ اس نے اپنی شادی کا جو اطلاع نامہ بطور اشتہار چھپنے کے لیے دیا تھا' اسے روک لیا جائے۔ اخبار والوں نے بتایا کہ کاپی پریس جا چکی ہے اور اخبار چھپنا شروع ہو گیا ہے۔

تب وہ شخص مایوسی سے بولا۔ ''اوہ..... اس کا مطلب ہے مجھے اس منحوس عورت سے شادی کرنا ہی پڑے گی۔''

☆ پولیس اسٹیشن پر فون کی گھنٹی بجی۔ ہیڈ کانسٹیبل نے فون اُٹھایا۔ کسی نے کہا۔

''میری بیوی اچانک غائب ہو گئی ہے۔ کیا کروں؟'' ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔ ''سب سے پہلا کام یہ کرو کہ ہمیں اس کا حلیہ بتاؤ۔''

''قد پانچ فٹ دو انچ۔ وزن ایک سو باسٹھ پونڈ معمولی سے جھینگی۔ دو دانت باہر نکلے ہوئے۔'' شکایت درج کرنے والے نے بتایا۔

''تم نے پہلے رپورٹ کیوں نہیں کی۔؟''

''بات یہ ہے کہ دو ہفتے تک میں یہی سمجھتا رہا ہوں کہ ایک خوشگوار خواب دیکھ رہا ہوں۔''

☆ ایک معروف قانون دان عدالت میں اپنے مؤکل کے حق میں دلائل کے انبار لگا رہے تھے۔ جب قانون دان کو دلائل پیش کرتے ہوئے چار گھنٹے ہو گئے تو جج نے تنگ آ کر قانون دان سے کہا۔

''کیا فاضل وکیل یہ بتائیں گے کہ وہ کب تک اپنا شغل جاری رکھیں گے۔؟''

وکیل نے برجستہ جواب دیا۔

''جناب والا! یہ تو فاضل عدالت پر منحصر ہے کہ وہ کتنی دیر میں اس نکتے کو سمجھتی ہے۔ ویسے ایک اور جج صاحب پانچ منٹ میں میری گزارشات کو سمجھ سکتے تھے۔''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہے تھے۔

''آپ واقعی بہت ذہین ہیں۔ سعود احمد صاحب۔'' دلاور شاہ نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔ ''آپ کا انداز درست ہے۔ پولیس کی جس گشتی جیپ نے تحسین انصاری کی لاش دریافت کی تھی۔ اس کے اے ایس آئی کو وہیں کار کے قریب ایک پیانو کا بال پین بھی ملا ہے جو کہ میرا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ بال پین وہاں کیسے پہنچا۔ بلکہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ میرے پاس سے گم ہو چکا ہے۔''

''لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ آپ ہی کا ہے۔'' سعود نے پوچھا۔

''بالکل نہیں' نہ صرف یہ کہ میں اسے پہچانتا ہوں بلکہ اس پر میرا نام بھی کھدا ہوا ہے۔''

''اس صورت میں آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میری پوزیشن کتنی نازک ہوتی جا رہی ہے۔'' انسپکٹر ظفر بولا۔

''میں سمجھ رہا ہوں۔'' سعود نے سر ہلایا۔

''اب آپ یہ بتائیں کہ آپ کو چوہدری جلال کے بارے میں کیسے معلوم ہوا اور اس نے دلاور شاہ کو واقعی دیکھا تھا۔''

''میرا ایک ہیڈ کانسٹیبل چوہدری جلال دین کے محلے میں رہتا ہے۔ چوہدری نے اپنے اہل وعیال کو سیالکوٹ بھجوا دیا ہے اور اکیلا رہتا ہے۔ اسی طرح وہ ہیڈ کانسٹیبل شمیم گل بھی غیر شادی شدہ ہونے کی وجہ سے اکیلا رہتا ہے۔ دونوں عموماً صبح کا ناشتہ وہیں ایک قریب کے ریسٹورنٹ میں کرتے ہیں۔ جب آج صبح شمیم ناشتہ کرنے گیا تو اس نے چوہدری کو لوگوں سے اس بارے میں باتیں کرتے سنا۔ وہ انہیں کلب کے واقعے اور مرزا رحمان اور دلاور شاہ کے اپنے گھر آنے کا حال بتا رہا تھا۔ اب اتفاق سے کل شام شمیم کی ڈیوٹی اس کلب پر تھی۔ جہاں جلال دین اور تحسین انصاری تھے اس نے یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا تھا مگر سنا ضرور تھا۔''

''اتنا ہی نہیں اس نے تحسین کو بھی اپنی کار میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ جس کے بارے میں اسے بعد میں کلب کے دو تین افراد نے بتایا کہ اس آدمی نے مرزا رحمان کی بیٹی کو چھیڑنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے چوہدری سے تو کچھ نہیں کہا۔ البتہ ڈیوٹی پر آتے ہی مجھے بتایا کہ چوہدر جلال دین لوگوں میں بیٹھ کر اس قسم کی باتیں کر رہا ہے۔ میں اس وقت تحسین انصاری کے وہ فوٹو دیکھ رہا تھا جو پولیس فوٹو گرافر نے اتارے تھے۔ شمیم کی نگاہ ان پر پڑی تو وہ چونکا اور اس نے مجھے بتایا کہ اسی آدمی نے کلب میں ندا سے بدتمیزی کی تھی۔ ظاہر ہے۔ مجھے اس پر چونکنا چاہئے تھا۔ میں نے اسے فوراً بھیج کر چوہدری جلال دین کو یہاں بلایا اور اس سے تفصیلی گفتگو کی۔ اس گفتگو کے دوران چوہدری نے یہ انکشاف کیا کہ اس نے دلاور شاہ کو رات ایک بجے اس روڈ پر دیکھا ہے (جہاں پر تحسین کی گاڑی لاش سمیت دیکھی گئی تھی) اور یہ کہ یہ بات بھی وہ ریسٹورنٹ میں لوگوں کو بتا چکا تھا۔''

''کیا آپ نے اس وقت اسے بتایا تھا کہ تحسین مرزا کی لاش مل چکی ہے اور یہ کہ اسی جگہ ملی ہے۔''

''جی نہیں' میں نے اس سلسلے میں اس سے کوئی گفتگو نہیں کی تھی۔'' ظفر نے جواب دیا۔ ''بلکہ اس کے برعکس اس سے یہ سوال کیا تھا کہ کیا اسے معلوم ہے اب تحسین مرزا یہاں کب آئے گا۔ اس کا جواب اس نے یہ دیا کہ چونکہ اسے بنگلے کا سودا مکمل کرنا ہے۔ اس لیے زیادہ سے زیادہ تین دن میں اس کی واپسی متوقع ہے اور یہ کہ میں مطمئن رہوں۔ وہ اسے تاکید کر دے گا کہ آئندہ اس طرح کی کوئی حرکت نہ کرے۔ میں نے اپنے سرزنش کی وہ شہر کے

شرفاء کے بارے میں ایسی باتیں نہ پھیلائے اور پھر جانے کی اجازت دے دی۔''

''بہت خوب۔'' سعود نے کہا۔ ''یہ تو ہوا اس معاملے کا ایک پہلو۔ اب میں دلاور شاہ سے بھی کچھ پوچھنا چاہوں گا۔''

''ضرور' آپ جو چاہیں پوچھ سکتے ہیں۔'' دلاور شاہ بڑی آمادگی سے بولا۔

''ہر چند کہ مجرم بھی اپنی بے گناہی پر اصرار کرتے ہیں۔'' سعود نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں آپ سے پہلے سوال یہی کروں گا کہ آپ اس معاملے میں ملوث ہیں یا نہیں اور میں تو کس حد تک ہیں۔''

''اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں نے تحسین انصاری کو قتل کیا ہے یا نہیں تو اس کا جواب یقینی طور پر نفی میں ہے۔'' دلاور شاہ نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''میں نے اسے دیکھا تک نہیں تھا۔ نہ اسے پہچانتا تھا اور نہ کبھی کسی جگہ کسی وقت میری اس سے ملاقات ہوئی۔ ندا کی زبانی اس کی غنڈہ گردی کا حال سن کر مجھے بے شک بہت غصہ آیا تھا اور میں اسی ارادے سے چوہدری جلال دین کے گھر گیا تھا کہ اگر وہ آدمی مل گیا تو اسے مزہ چکھا دوں گا۔ قتل کا خیال اس وقت بھی میرے دماغ میں نہیں تھا۔''

''آپ کو چوہدری جلال دین کے بنگلے کا پتہ معلوم تھا۔'' سعود نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے۔ اس بنگلے کا جس کا سودا ہوا تھا۔''

''جی ہاں بلکہ میں خود ایک مرتبہ اسے خریدنے کے خیال سے دیکھنے بھی گیا تھا۔ مگر قیمت زیادہ تھی۔ اس لیے ارادہ ملتوی کر دیا۔''

''وہ بال پین جو تحسین کی کار کے قریب پایا گیا۔ آپ کو کچھ یاد نہیں کہ وہ آپ سے کب اور کہاں گم ہوا تھا۔''

''جی نہیں۔''

''یہ بھی یاد نہیں کہ آپ نے اسے آخری بار کب دیکھا تھا۔''

''دراصل میرے پاس اس طرح کے تین بال پین تھے۔ مختلف رنگوں کے یہ بال پین میری میز کی دراز میں پڑے رہتے ہیں۔ جب بھی میں گھر سے باہر نکلتا ہوں کوئی ایک پین نکال کر جیب میں لگا لیتا ہوں اور واپسی میں کپڑے تبدیل کرتے ہوئے اسے پھر دراز میں ڈال دیتا ہوں۔ ممکن ہے کبھی ایسا ہوا ہو کہ کوئی جیب سے گر گیا ہو مگر مجھے اس کا احساس نہ ہو سکا۔ کیونکہ تین قلموں کی وجہ سے مجھے ان کی کمی محسوس نہ ہوئی۔ اس لیے میں اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا کہ وہ پین جو کار کے پاس ملا۔ مجھ سے کب اور کہاں گم ہوا تھا۔ شاید وہ بھی کلب میں ہی گر گیا ہو۔''

''آپ کل رات کسی بھی وجہ یا کسی بھی کام سے اس روڈ پر نہیں گئے۔''

''سوا دس بجے گھر میں قدم رکھنے کے بعد میں باہر نکلا ہی نہیں۔''

''پھر چوہدری جلال دین نے آپ کو اس روڈ پر کس طرح دیکھ لیا۔''

''اس کے بارے میں میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' دلاور شاہ نے جواب دیا۔ ''دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں یا تو چوہدری جلال جھوٹ بول رہا ہے۔ یا پھر اس نے مجھے نہیں کسی اور کو دیکھا تھا اور اس پر اسے میرا دھوکہ ہوا تھا۔''

سعود نے کچھ سوچتے ہوئے کمرے کے باقی حاضرین کی طرف باری باری دیکھا۔

''دلاور شاہ کے بارے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔'' وہ بولا۔ ''لیکن آپ لوگ انہیں مختلف حیثیتوں سے جانتے ہیں اور بہت قریب سے انہیں دیکھا ہے۔ کیا آپ پوری دیانت داری سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس معاملے میں کسی غلط بیانی سے کام نہیں لے رہے ہیں۔''

''ایک باپ کی حیثیت سے کہا جا سکتا ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ مجھے دلاور شاہ کی طرف داری ہی کرنا چاہیے۔'' ایس پی صاحب نے کہا۔

''لیکن یہ میرا بیٹا نہ بھی ہوتا اور میں اسے اسی قدر جانتا ہوتا جتنا اب جانتا ہوں تو بلاشک و شبہ کہہ سکتا تھا کہ یہ جو کچھ کہہ رہا ہے۔ اسے لازمی سچ ہونا چاہیے۔''

''میرے نزدیک بھی دلاور شاہ صاحب ایک بلند کریکٹر نوجوان ہیں۔''

ظفر بولا۔ ''مجھے امید نہیں کہ یہ اپنی جان بچانے کے لیے جھوٹ بول رہے ہیں۔''

''مجھے دلاور کی بے گناہی کا اتنا یقین ہے۔'' مرزا رحمان نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر ضرورت پڑی تو میں اسے بچانے کے لیے اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔''

''میں نے انہیں کبھی شدید غم و غصے کے عالم میں بھی عقل و ہوش سے بیگانہ ہوتے نہیں دیکھا۔'' ندا کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''اس لیے خواہ تمام ثبوت و شواہد ان کے خلاف ہوں اور یہ ان سے بری الذمہ ہونے کا اظہار کریں تو میں ان سب کو رد کر کے ان کے کہنے پر یقین کرلوں گی۔''

''یہ جاننا کتنا خوش آئند ہے کہ ایسے شریف اور مخلص لوگ میرے بارے میں کتنی اچھی رائے رکھتے ہیں۔'' دلاور شاہ ہنسا تو اس بار اس کی مسکراہٹ پھیکی نہیں تھی۔

اس کے بعد سعود نے ندا سے تحسین کے بارے میں کچھ تفصیلی سوالات کیے۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے چند منٹ سوچا اور پھر انسپکٹر ظفر کی طرف دیکھا۔

''میرے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں ایک مخصوص طریقے سے اسے پرکھنا چاہتا ہوں۔ آپ چوہدری جلال دین کو بلائیں، جو شخص اسے بلانے جائے وہ اسے بتادے کہ تحسین انصاری کو قتل کردیا گیا ہے۔ بس صرف اتنا ہی اور کوئی بات بالکل نہیں کرنا ہے اور چونکہ اس کی لاش مین جی ٹی روڈ پر پائی گئی ہے۔ اس لیے دلاور شاہ کے بارے میں اس کا بیان کافی اہمیت کر گیا ہے اور اسی سلسلے میں مزید تفصیلی بیان کے لیے اسے ہیڈ کوارٹر بلایا گیا ہے۔''

''اس سے آپ اور کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔'' ایس پی صاحب نے سوال کیا۔

''اسے آنے دیجیے۔'' سعود نے جواب دیا۔ ''اگر میرا اندازہ درست نکلا تو میں ایک گھنٹے کے اندر تحسین انصاری کے قاتل کو آپ کے حوالے کردوں گا۔''

چوہدری جلال دین انسپکٹر ظفر کے آفس میں داخل ہوا تو ظفر نے قدرے سرد مہری سے اس کا استقبال کیا جو کانسٹیبل اسے ساتھ لے کر آیا تھا۔ وہ بھی واپس جانے کے بجائے ایک جانب کھڑا ہوگیا۔

''یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ انسپکٹر صاحب۔'' چوہدری صاحب نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کیا سنا ہے آپ نے۔''

''یہی کہ تحسین مرزا کو قتل کردیا گیا ہے اور اس کی لاش مین جی ٹی روڈ پر پائی گئی ہے۔''

''یہ آپ کو کس نے بتایا۔'' ظفر نے کچھ چونکتے ہوئے کہا۔

''آپ کے اس آدمی نے جو مجھے لینے گیا تھا۔'' چوہدری صاحب نے کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔

''میں نے تمہیں انہیں بلانے کے لیے بھیجا تھا۔'' ظفر نے کانسٹیبل کو گھورتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ ''یہ نہیں کہا تھا کہ تم انہیں پولیس کی کارروائی کی رپورٹ بھی سنادو۔''

''معافی چاہتا ہوں جناب۔'' کانسٹیبل نے جوب دیا۔ ''مجھے اس بارے میں کوئی ہدایت

نہیں دی گئی تھی۔ جب چوہدری صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ آپ نے انہیں کیوں بلایا ہے تو مجھے بتانا پڑا۔''

''ہر بات میں ہدایات نہیں دی جاتیں۔'' ظفر نے ڈانٹا۔ ''کبھی اپنی عقل سے بھی کرم لے لیا کرو۔ جاؤ اور آئندہ خیال رکھنا۔'' پھر اس نے چوہدری صاحب کی طرف دیکھا اور کہا۔

تحسین بولا۔ ''جی ہاں۔ آپ کو درست بتایا گیا ہے۔ ہمیں رات کے ڈھائی بجے مین جی ٹی روڈ سے انصاری کی لاش ملی ہے اور اس کی لاش اسی جگہ سے ملی ہے جہاں آپ دلاور شاہ کو دیکھنا بیان کرتے ہیں۔ ظاہر ہے اس کے بعد آپ کے بیان کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ میں نے اسی سلسلے میں مزید تفصیلات جاننے کے لیے آپ کو زحمت دی ہے۔''

''چچ۔ چچ۔'' چوہدری صاحب نے افسردگی سے سر ہلایا۔ ''جب دلاور میرے گھر آیا تھا تو اس کا غصہ دیکھ کر مجھے اسی وقت یہ خیال ہوا تھا کہ کہیں یہ فوجی جوان اپنے جوش میں حد سے تجاوز نہ کر جائے۔ آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ بہرحال جو کچھ ہوا بہت برا ہوا۔''

''آپ کا مطلب ہے۔ دلاور شاہ نے تحسین کو قتل کردیا۔''

''ظاہر ہے اور میرا ہی کیا۔ آپ کا خود بھی یہ ہی خیال ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو مجھے دوبارہ کیوں بلاتے۔''

''ہم نے ابھی کوئی یقینی رائے قائم نہیں کی ہے۔'' ظفر نے کہا۔ ''آپ کو بلانے کا مقصد تفصیل سے درست حالات جاننا ہے۔ تحسین انصاری کلب سے کس وقت رخصت ہوا تھا۔''

''میں نے گھڑی نہیں دیکھی تھی لیکن میرا خیال ہے کہ اس وقت ساڑھے چھ پونے سات بجے ہوں گے۔''

''کلب میں اس نے جس وقت ندا کا

مسکرائیے

☆ اردو کے ایک معروف شاعر کو گفتگو کے دوران اپنے ہر جملے میں انگریزی کا کوئی نہ کوئی لفظ ٹانکنے کی عادت تھی۔ وہ جب انگریزی کا کوئی نیا لفظ سنتے تو فوراً اپنے کسی ساتھی سے اس کے معنی بھی پوچھ لیتے۔ ایک دن دوران گفتگو لٹریچر کا لفظ سنا تو فوراً اپنے ساتھی سے پوچھ بیٹھے۔

''یار! یہ لٹریچر کے کیا معنی ہیں؟''

ساتھی نے جواب دیا۔ ''ادب''

اسی شام کافی ہاؤس میں مولانا چراغ حسن حسرت نے شاعر مذکورہ سے کہا۔

''عزیزم! سنا ہے کہ تم میرے بارے میں بڑی بک بک کرتے رہتے ہو۔''

''مولانا! یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میں تو آپ کا بے پناہ لٹریچر کرتا ہوں۔'' لٹریچر کی یہ ترکیب استعمال سن کر مولانا دم بخود ہوگئے۔

☆ ایک دن دو چیونٹیاں خوراک تلاش کررہی تھیں اچانک راستے میں ان کو ایک ہاتھ ملا۔ ایک چیونٹی دوسری سے تیزی سے بولی۔

''وہ دیکھو سامنے سے ہاتھی چلا آرہا ہے۔ آج اس کو مار گرائیں۔''

یہ سن کر دوسری نخوت سے ناک چڑھا کر بولی۔

''رہنے دو پھر کبھی سہی۔ آج وہ بے چارا اکیلا ہے۔ اور ہم دو ہیں۔''

☆ ایک عورت کے گھر میں چور گھس آیا لیکن جب وہ واپس جانے لگا تو بھاری بھرکم عورت اُسے دیکھ کر پیچھے لپکی اور دروازے کے پاس جا کر دھم سے گرتے ہوئے چور کے اوپر بیٹھ گئی اور شوہر کو پولیس کی طرف دوڑانا چاہا۔

''بیگم میری چپل نہیں مل رہی۔'' شوہر کافی دیر تلاش کرنے کے بعد بولا۔

''اللہ کے بندے میری چپل پہن کر جلدی سے جاؤ۔'' چور کرلاتے ہوئے بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

راستہ روکا تھا تو کہا اسے معلوم تھا کہ یہ لڑکی کون ہے۔"

"میرا خیال ہے نہیں معلوم تھا۔ ہوتا تو شاید وہ اس چھیڑنے کی ہمت نہ کرتا۔" چوہدر صاحب نے جواب دیا۔ "کیونکہ جب میں نے اسے ندا کے بارے میں بتایا کہ وہ مرزا رحمان کی بیٹی' ایس پی صاحب کی ہونے والی بہو اور میجر دلاور شاہ کی منگیتر ہے تو وہ کافی خوفزدہ ہو گیا تھا۔"

"آپ کو معلوم ہے کہ وہ کلب سے نکل کر کہاں گیا تھا۔"

"مجھے تو سو فیصدی یقین تھا کہ وہ راولپنڈی گیا ہے۔"

"لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہیں گیا تھا۔ یا گیا تھا تو واپس آ گیا تھا۔ آپ کو اس کی واپسی کے بارے علم تھا۔" ظفر نے پوچھا۔

"جی نہیں۔"

"اس نے دوبارہ آپ سے رابطہ قائم نہیں کیا۔"

"جی نہیں۔"

"آپ کہتے ہیں کہ آپ نے ایک بجے دلاور شاہ کو مین جی ٹی روڈ پر اس جگہ دیکھا جہاں سے ایک نیم پختہ سڑک آپ کے بنگلے تک جاتی ہے۔" ظفر نے کہا۔ "سوا یہ ہے کہ آپ خود اس وقت وہاں کیا کر رہے تھے۔"

"میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ سینما سے سیکنڈ شو دیکھ کر واپس آ رہا تھا۔"

"آپ کو یقین ہے کہ جسے آپ نے دیکھا وہ وہ دلاور شاہ ہی تھا۔"

"جی ہاں۔ اس میں غلط فہمی کا کوئی امکان ہی نہیں۔ میں دلاور کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ اس کو بارہا دیکھ چکا ہوں۔ مل چکا ہوں وہ قطعی طور پر دلاور شاہ تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر درخت کی آڑ میں چھپنے کی کوشش کی۔ اس وقت مجھے یہ بات عجیب معلوم ہوئی تھی لیکن اب سمجھ میں آتا ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا یقیناً یا تو اس وقت تک وہ محسین کو قتل کر چکا تھا۔ یا قتل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور فطری طور پر چاہتا تھا کہ کسی واقف کار کی نظر اس پر نہ پڑے۔ میرا تو خیال ہے کہ اگر میں اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھنے کے بجائے اس سے بات کر لیتا تو محسین کی لاش اسی وقت مل جاتی یا اگر اس وقت تک یہ جرم نہیں ہوا تھا تو میری مداخلت اسے قاتل بننے سے روک لیتی۔"

"میں حیران ہوں کہ اگر آپ کا یہ بیان درست ہے تو کیا رائے قائم کروں۔" ظفر نے کہا۔ "کیونکہ ہم نے ایک اور شخص کو بھی گرفتار کیا ہے۔ جو کچھ اور ہی کہتا ہے۔"

"کون ہے۔ وہ اور کیا کہتا ہے۔" چوہدر جلال دین نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی آپ خود ہی دیکھ لیں گے۔" ظفر کانسٹیبل کی طرف گھوما۔ "جاؤ اسے لے آؤ۔" اور ایک منٹ کے بعد کانسٹیبل کے ساتھ کمرے میں جو شخص داخل ہوا وہ سعود احمد تھا۔ مگر کس حال میں' اس کے بال بکھرے ہوئے' چہرہ ستا ہوا اور آنکھیں اس طرح سرخ تھیں جیسے رات بھر نہ سویا ہو۔ جسم پر صرف پتلون اور قمیض تھی۔ پتلون سلوٹوں سے بھری ہوئی اور قمیض نصف سے زیادہ باہر نکلی ہوئی تھی۔ مزید یہ کہ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی بھی پڑی ہوئی تھی۔ اس نے دفتر میں قدم رکھتے ہی پہلے چوہدری صاحب کو دیکھا اور جیسے چونک گیا۔ اس کی آنکھیں قدرے پھیل گئیں۔

"ہاں۔ انسپکٹر صاحب۔" وہ جوش سے بولا۔ "یہی ہے وہ آدمی میں اسے ہزاروں میں پہچان سکتا ہوں۔"

چوہدری صاحب بوکھلا کر کھڑے ہو گئے۔ اس نے پہلے بڑے غور سے سعود کو گھورا اور پھر ظفر کی طرف دیکھا۔

"یہ کیا تماشا ہے۔ انسپکٹر صاحب۔" اس نے تیزی سے کہا۔ "کون ہے یہ اور کیا بکواس کر رہا ہے۔ میں اسے نہیں جانتا۔"

"جوش میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیٹھ جائیے۔" ظفر نے کہا۔ "ساری بات ابھی آپ کے سامنے آ جائے گی۔"

"مگر یہ ہے کون۔" چوہدری صاحب نے دوبارہ بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"جائے واردات پر ہمیں ایک بال پین ملا ہے۔" ظفر نے کہا۔ "ہم نے اس پر پائے جانے والے انگلیوں کے نشانات اپنے ریکارڈ سے چیک کئے تو وہ اس شخص کی انگلیوں کے نشانات سے مل گئے۔ ہمیں معلوم تھا کہ یہ لاہور آیا ہوا ہے۔ چنانچہ اسے فوراً گرفتار کر لیا۔ تھوڑی باز پرس کے بعد ہی اس نے قبول کر لیا۔ کہ محسین کو اسی نے قتل کیا ہے۔"

"کیا!" چوہدری صاحب کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"مگر اسی کے ساتھ یہ ایک اور داستان بھی سنا رہا ہے۔"

وہ کیا۔" چوہدری غور سے سعود کو دیکھ رہا تھا۔

"بہتر ہے کہ آپ اسی کی زبان سے سنیں۔" ظفر نے کہا اور سعود کی طرف دیکھا۔ "اپنا بیان شروع سے دہراؤ۔"

"انسپکٹر صاحب' داستان کیا۔ بیان کیا۔" سعود کا لہجہ بڑا تھکا ہوا تھا۔ "بی محسین انصاری کی موت میرے ہاتھ سے لکھی تھی۔ اب سے دو برس پہلے کی بات ہے کہ میں اس کی ایک دکان پر کام کرتا تھا اور اپنی بیوی کے ساتھ اس کے دیئے ہوئے ایک کوارٹر میں رہتا تھا۔ میری بیوی بہت خوبصورت تھی۔ محسین نے کہیں اسے دیکھ لیا اور اس سیدھی سادی عورت کو اپنی دولت سے پرچا کر اغوا کر لیا۔ میں نے شور مچایا تو مجھے چوری کے جھوٹے الزام میں پھانس کر جیل بھجوا دیا۔

میری بیوی بہکنے کے باوجود ایک عزت دار خاتون تھی۔ محسن نے اسے شادی کا لالچ دیا تھا لیکن اغواء کرنے کے بعد جب اس نے ناجائز طور پر دست درازی کرنا چاہی تو میری بیوی نے اپنی عزت بچانے کے لیے اس کے شاندار مکان کی دوسری منزل سے کود کر خودکشی کر لی۔ مجھے یہ حالات معلوم ہوئے تو میں نے محسین سے انتقام لینے کا فیصلہ کیا۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد میں نے اسے کئی بار ٹھکانے لگانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔

ادھر راولپنڈی کی پولیس محسین کے اشارے پر مجھے بلاوجہ پریشان کرتی رہتی تھی۔ تنگ آ کر میں کچھ دن پہلے یہاں لاہور آ گیا اور محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ بھرنے لگا۔

کل رات میں مقامی سینما گھر میں فلم دیکھنے چلا گیا۔ وہاں سے واپس لوٹ رہا تھا کہ میں نے محض اتفاق سے محسین کو دیکھ لیا۔ وہ سڑک پر یوں کھڑا ہوا تھا۔ جیسے کسی کا انتظار کر رہا ہو۔ مجھے یہ موقع غنیمت معلوم ہوا۔ میں نے وہیں روڈ سے ایک بھاری پتھر اٹھایا اور دبے پاؤں سے جا کر اپنی پوری قوت سے اس کے سر پر وار کیا۔ وہ ایک ہی ضرب میں گر پڑا اور شاید مر بھی گیا۔ مگر میرے اوپر خون سوار تھا۔ میں متواتر اور مسلسل اس کے سر پر پتھر مارتا رہا۔ اسی اثناء میں یہ آدمی بھی آ گیا۔" سعود نے رک کر چوہدری صاحب کی طرف اشارہ کیا۔

"محسین شاید اسی کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔" اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "مگر میرے ہاتھ اس کی آمد پر بھی نہیں رکے اس وقت میرے دل میں ایک عجیب طرح کا جوش بھرا ہوا تھا۔ شاید میں اپنی معصوم بیوی کے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانے میں بڑی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ بہرحال میں نے اس آدمی کے آنے کی بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پرواہ نہیں کی اور اس وقت تک تحسین کے سر پر پتھر مارتا رہا۔ جب تک لہولہان نہیں ہوگیا اور مجھے اس کے مرنے کا یقین نہیں آ گیا۔

یہ آدمی بھی حیرت سے کھڑا مجھے دیکھتا رہا۔ جب میں نے تحسین کو فارغ کر دیا تو پتھر لے کر اس کی طرف بڑھا اور اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے پولیس سے یا کسی سے بھی اس بات کا ذکر کیا تو میں اسی طرح اس کا بھی سر پھاڑ دوں گا۔ میں نے تحسین کی جیبوں کی تلاشی لی۔ مجھے اس کی دو تین جیبوں میں کافی بڑی رقم ملی مجھے روپے کا لالچ نہیں تھا۔ میں نے وہ ساری رقم اس آدمی کے حوالے کر دی اور ایک بار پھر اس دھمکایا کہ اپنی زبان بند رکھے۔ ورنہ تحسین کی طرح اسے بھی ختم کر دوں گا۔ اس پر اس آدمی نے مجھے جواب دیا کہ میں گھبراؤں نہیں' وہ نہ صرف میرے متعلق کسی سے کچھ نہیں کہے گا۔ بلکہ کوشش کرے گا کہ اس قتل کو کسی اور کے سر منڈھ دے۔ بس اس کے بعد ہم دونوں اپنی اپنی راہ چلے گئے۔ مجھے بالکل احساس نہیں تھا کہ میرا بال پین اسی جگہ گر گیا ہے اور جب یاد آیا تو بہت دیر ہو گئی تھی۔ مجھے ہمت نہیں پڑی کہ میں دوبارہ وہاں جا کر اسے تلاش کروں۔ میں اسے اپنی شامت اعمال ہی کہہ سکتا ہوں کہ ایک معمولی بال پین کی وجہ سے قانون کی گرفت میں آ گیا۔ بہر حال مجھے پھر بھی کوئی غم نہیں بلکہ خوشی ہے کہ میں نے دنیا سے ایک بدترین گناہ گار کا بوجھ ہلکا کر دیا۔''

چوہدری جلال دین جو حیرت سے منہ پھاڑے یہ داستان سن رہا تھا۔ ایک دم اچھل کر اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے خوف اور غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔

''یہ شخص بکواس کر رہا ہے۔'' وہ چیخ کر بولا۔ ''اس نے جو کچھ بھی کہا ہے اس کا ایک ایک لفظ جھوٹ ہے۔ میں نے آج سے پہلے اسے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا۔''

''ہم اس کے بیان کی کئی باتوں کی تصدیق کر چکے ہیں۔'' ظفر نے سکون سے جواب دیا۔ ''مثلاً ہمیں اس کے قبضے سے سینما کے ٹکٹ کا نصف حصہ ملا اور ہم نے سینما کے منیجر کو وہ نصف ٹکٹ دکھا کر معلوم کر لیا کہ وہ ٹکٹ واقعی کل رات کے سیکنڈ شو میں فروخت کیا گیا تھا۔ پھر ہم نے بینک منیجر مرزا رحمان سے پوچھا۔ وہ تائید کرتے ہیں کہ تحسین نے کل اپنے اکاؤنٹ سے رقم نکلوائی تھی مگر اس کی لاش سے ہمیں رقم نہیں ملی۔ پھر ہم اس آدمی کو موقع واردات پر لے گئے اور اس نے از خود ہمیں وہ جگہ دکھائی' جہاں اس نے تحسین کی لاش پھینکی تھی۔ اتنا ہی نہیں ہم نے اس کی نشان دہی پر وہ خون آلود پتھر بھی برآمد کر لیا ہے جو ارتکاب جرم میں استعمال کیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں ہم مجبور ہیں کہ اس کے بیان کا وہ حصہ بھی درست تسلیم کر لیں جس کا تعلق آپ سے ہے۔''

''اب میں سمجھ گیا۔'' چوہدری جلال دین تیزی سے بولا۔ ''دلاور شاہ آرمی میں میجر اور لاہور کے ایس پی کرامت شاہ کا بیٹا ہے' پولیس نے اسے قتل کے جرم کی پاداش سے بچانے کے لیے میرے خلاف سازش کی ہے۔ ایک جرائم پیشہ سزا یافتہ آدمی کو خدا جانے کتنی بھاری رقم کا لالچ دے کہ یہ بیان دینے پر آمادہ کیا گیا ہے' اس سے صرف اعتراف جرم کرانے میں خطرہ تھا کہ کہیں قانون اسے قتل کی انتہائی سزا نہ دے دے۔ اس لیے اسے بچانے کے لیے جرم میں مجھے بھی ملوث کیا جا رہا ہے آپ نے جب آج صبح مجھے بلا کر اپنی زبان بند رکھنے کی ہدایات کی تھی تو مجھے اسی وقت سمجھ لینا چاہئے تھا کہ پولیس ایک ایس پی کے بیٹے کو بچانے کے لیے ہر حربہ استعمال کر سکتی ہے۔ پولیس کو ہمیشہ مجھ سے دشمنی رہی ہے۔ دلاور شاہ میرے بنگلے پر دانت لگائے بیٹھا ہے۔ مگر میں کہے دیتا ہوں انسپکٹر کہ آپ کی

یہ سازش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ تحسین کا قتل اس آدمی نے نہیں دلاور شاہ نے کیا ہے۔''

''مجھے افسوس ہے چوہدری جلال دین کہ صرف جذباتی باتوں سے ہماری تسلی نہیں ہو سکتی۔'' ظفر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''یہ محض جذباتی باتیں نہیں ہیں۔'' چوہدری جلال دین جوش میں چلایا۔ ''میں ثابت کر سکتا ہوں کہ یہ آدمی جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ وہ بال پین اس کا تھا۔ مگر وہ اس کا نہیں دلاور شاہ کا تھا۔ اس پر دلاور شاہ کا نام کندہ ہے۔ پھر یہ کہتا ہے کہ اس نے ایک بھاری پتھر سے تحسین انصاری کو ہلاک کیا۔ جبکہ تحسین انصاری کو گلا گھونٹ کر قتل کیا گیا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ اس نے لاش سڑک پر پھینک دی تھی۔ جبکہ پولیس کو تحسین کی لاش اس کی اپنی کار میں ملی تھی۔ نہیں انسپکٹر آپ مجھے اپنی سازش میں نہیں پھانس سکتے۔ قاتل دلاور ہے اور دنیا کی کوئی عدالت ان ثبوت و شواہد کی روشنی میں اسے اسی جرم سے بری نہیں کر سکتی۔''

انسپکٹر ظفر اور سعود دونوں نے ایک دوسرے کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔ ظفر نے اطمینان سے گہری سانس لی۔ ''اسے اس جرم سے تو خود آپ نے بری کر دیا۔''

چوہدری جلال دین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تحسین کے قتل کی تفصیلات پولیس نے ابھی کسی کو نہیں بتائیں۔ اس بارے میں کوئی خبر نہ اخبارات میں آئی ہے اور نہ ریڈیو پر خود میں نے بھی آپ کو اس سے زیادہ نہیں بتایا کہ اسے قتل کر دیا گیا ہے اور اس کی لاش اسی کی گاڑی میں پائی گئی پھر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ اس بال پین پر دلاور شاہ کا نام کندہ ہے آپ کو کیسے پتہ چلا کہ اسے کسی بھاری پتھر سے نہیں بلکہ گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا ہے آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ اس کی لاش سڑک سے نہیں اس کی کار میں ملی۔ یہ سب کی سب وہ باتیں ہیں جن کا حال ابھی تک پولیس اور چند دوسرے متعلقہ افراد کو معلوم تھا یا پھر قاتل کو معلوم ہو سکتا تھا۔ اپ ان چند افراد میں شامل نہیں اس لیے لازمی طور پر یہ سب آپ کو معلوم ہونے کی طرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ آپ خود تحسین انصاری کے قاتل ہیں۔''

چوہدری صاحب کو بعد از وقت اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے احمقانہ جوش میں پولیس کو خود اپنے خلاف تمام ثبوت فراہم کر دیئے تھے۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ آنکھوں سے شدید خوف و ہراس ظاہر ہونے لگا۔

''میں۔ میں مجبور تھا۔ انسپکٹر۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''اس بزدل نے کلب والے واقعے سے خوفزدہ ہو کر لاہور میں قیام کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا اور..... اور بنگلے کا سودا منسوخ کر کے مجھ سے بیانے کی رقم واپس لینے آیا تھا۔ میں اسے کہاں سے دیتا۔ جبکہ گھر پہنچتے ہی میرے قرض خواہ مجھ سے وہ رقم چھین کر لے گئے تھے۔''

چوہدری جلال دین سے اس کا اقبالی بیان حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ سعود نے جس عجیب طریقے سے اس سے اعتراف جرم کرایا تھا۔ اس نے اس سے مزاحمت یا مقابلہ کرنے کی تمام طاقت سلب کر لی تھی۔ گواہوں کی موجودگی میں اس نے اپنا جو بیان دیا اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

''خدا جانے میرے قرض خواہوں کو کس طرح یہ پتا لگ گیا کہ میرے بنگلے کا سودا ہو چکا ہے۔ جس وقت میں کلب سے گھر واپس پہنچا تو دو قرض خواہ میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں ان کا پچاس لاکھ کا مقروض تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ ابھی بنگلا فروخت نہیں ہوا۔ صرف بات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئی ہے جیسے ہی مجھے اس کی قیمت وصول ہوگی میں ان کی پائی پائی ادا کردوں گا۔ مگر وہ خالی ہاتھ واپس جانے کے موڈ میں نہیں تھے۔

چنانچہ میں نے ان دونوں کو دس' دس لاکھ روپے دے کر ٹالا اور باقی رقم ایک ہفتے میں ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ ابھی وہ گئے ہی تھے کہ تحسین کا فون آ گیا۔ وہ راولپنڈی جاتے جاتے آدھے راستے سے واپس آ گیا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ ندا والے واقعے سے بہت زیادہ خوفزدہ ہے' اپنی تمام زندگی وہ پولیس اور قانون سے بچتا رہا ہے کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی کہ اس کا واسطہ پولیس سے پیش آئے لیکن اب شراب کے نشے میں وہ ایک ایس پی کی ہونے والی بہو اور ایک آرمی منیجر کی منگیتر سے دست درازی کر بیٹھا ہے۔ اسے یقین ہے کہ یہ دونوں اسے لاہور میں چین سے نہیں رہنے دیں گے۔ اس لیے اس نے یہاں سیٹل ہونے کا ارادہ ترک کردیا ہے اور جب اسے یہاں رہنا ہی نہیں ہے تو وہ بنگلہ خرید کر کیا کرے گا۔

اس نے کہا کہ وہ میرے پاس آ رہا ہے اور میں اس کی بیعانے کی رقم واپس کردوں۔ تاکہ وہ صبح ہونے سے پہلے راولپنڈی واپس پہنچ جائے۔ مجھے چند گھنٹوں کی ملاقات سے ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ تحسین ایسا آدمی نہیں جو اپنی ایک پائی بھی چھوڑنے یا بنگلہ فروخت ہونے کی مہلت دینے کے لیے تیار ہوجائے گا۔ اس لیے میں نے اسے ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ کام بنگلے پر بہت آسانی اور پوشیدگی سے ہوسکتا تھا۔ اس لیے میں نے اس سے کہا کہ وہ میرے بنگلے پہنچے۔ میں ایک دو گھنٹے میں رقم کا انتظام کرکے اس کے پاس آؤں گا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ جو بیعانہ اس نے مجھے دیا تھا۔ وہ میرے قرض خواہ مجھ سے چھین کرلے گئے ہیں۔ اس نے کہا کہ وہ دس بجے تک بنگلے میں میرا انتظار کرے گا۔ اگر اس وقت تک میں رقم لے کر نہیں آیا تو وہ میرے خلاف پولیس میں رپورٹ کردے گا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اسے ٹھکانے لگانے کا بہترین طریقہ کیا ہوسکتا ہے کہ پہلے مرزا رحمان اور پھر میجر کرامت شاہ مجھ سے ملنے آئے۔ وہ دونوں تحسین کا پتہ پوچھ رہے تھے۔ خاص طور پر دلاور شاہ بہت غصے میں تھا۔

ایک دم سے مجھے خیال آیا کہ اگر کسی طرح انہیں اس واردات میں ملوث کیا جاسکے تو اس کے لیے حالات بہت ہی سازگار ہیں۔ پھر کچھ تقدیر بھی ساتھ دیتی معلوم ہورہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ کچھ دن پہلے مجھے کلب کے ٹینس کورٹ سے ایک بال پین ملا تھا۔ جس پر دلاور شاہ کا نام کندہ تھا۔

چنانچہ میرے ذہن میں پورا پلان مرتب ہوگیا۔ میں نے بنگلے جاکر تحسین کو گلا گھونٹ کر ہلاک کردیا۔ اس کی لاش خود اسی کی کار میں ڈال کر مین روڈ تک لایا۔ رومال سے اپنی انگلیوں کے تمام نشانات صاف کردئے۔ بال پین وہیں کار کے پاس ڈال دیا اور خود فلم دیکھنے چلا گیا' سینما کا منیجر میرا گہرا دوست ہے۔ میں اکثر اس سے ملنے جاتا رہتا ہوں' سینما کا تمام عملہ مجھے جانتا ہے۔ اس لیے مجھے ٹکٹ خریدنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں جب چاہتا ہوں اور جس کلاس میں چاہتا ہوں بیٹھ کر فلم دیکھ سکتا ہوں۔ میں نے سوچا تھا کہ میں صبح اٹھتے ہی کلب کے واقعے کا چرچا شروع کردوں گا۔

مجھے معلوم تھا کہ ہیڈ کوارٹر کا ہیڈ کانسٹیبل نسیم گل روزانہ صبح اسی ریسٹورنٹ میں ناشتا کرتا ہے جہاں میں جاتا ہوں چنانچہ اسے دیکھتے ہی میں نے کلب والے واقعے کی بات چھیڑ دی۔ مجھے امید تھی کہ اس کے ذریعے یہ بات ہیڈ کوارٹر تک پہنچ جائے گی۔

میرے تمام اندازے بڑے حد تک

درست ثابت ہوئے مگر افسوس کہ معلوم نہیں انسپکٹر ظفر کو کس طرح مجھ پر شبہ ہوگیا کہ انہوں نے ایک سزا یافتہ مجرم کو اپنے ساتھ ملا کر بڑی چالاکی سے مجھے میرے ہی پھیلائے ہوئے دام میں الجھا کر جرم کا اعتراف کرالیا۔''

چوہدری صاحب سے اس کے تحریری بیان پر دستخط کرانے کے بعد جب اسے حوالات بھیج دیا گیا تو سب لوگ سعود کی طرف متوجہ ہوگئے جو اس دوران اپنے اصلی حلیے میں واپس آچکا تھا۔ سارے ہی متعلقہ افراد اس کی ذہانت کی تعریف کررہے تھے دلاور شاہ اور ندا کی خوشیوں کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔

''لیکن میں ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔'' انسپکٹر ظفر نے کہا۔ ''کہ آپ کو چوہدری صاحب پر کیسے شک ہوا۔''

''سیدھی سی بات ہے۔'' سعود نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''آپ سب لوگ اس بات پر متفق تھے کہ دلاور شاہ صاحب غصے اور اشتعال کے عالم میں بھی یہ جرم نہیں کرسکتے۔ کسی ایک شخص کے بارے میں یہ یک وقت اتنے افراد کی اور افراد بھی وہ جو اس سے بے حد قریب ہوں۔ رائے غلط ہونے کا امکان بہت کم ہوتا ہے میں نے اسی نکتے کو یہ گتھی سلجھانے کے لیے بنیاد بنایا۔ ظاہر تھا کہ اگر قتل دلاور صاحب نے نہیں کیا تو انہیں یہ جھوٹ بولنے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ وہ رات کے ایک بجے جی ٹی روڈ پر نہیں گئے تھے اور اگر وہ وہاں نہیں گئے تھے۔ تو لازماً چوہدری جلال دین نے انہیں نہیں دیکھا تھا لیکن وہ یہ اصرار یہ بات کہہ رہا تھا۔ اس کا صرف ایک ہی مطلب تھا کہ وہ کسی خاص مقصد اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتا تھا کہ وہ خود کو یا کسی اور کو تحسین کے قتل کے الزام سے بچالیا اس بات سے میں نے سمجھ لیا کہ یا تو وہ خود قاتل ہے یا قاتل کی پشت پناہی کررہا ہے اسی ایک بات کو صاف کرنے کے لیے میں نے یہ ڈرامہ کھیلا۔''

''مگر یہ ڈرامہ ہی کیوں کیا۔ کیا کسی اور طریقے سے اس سے اقبال جرم نہیں کرایا جاسکتا تھا۔'' دلاور شاہ نے سوال کیا۔

''ممکن ہے۔ کرالیا جاتا مگر وہ اتنا آسان بہر حال نہ ہوتا۔'' سعود نے جواب دیا۔ ''جب کوئی شخص جرم کرتا ہے تو وہ ذہنی طور پر جہاں تک اس کی سوچ ساتھ دے' اپنے آپ کو ہر ممکن صورت حال کے لیے تیار رکھتا ہے۔ وہ اپنے ذہن میں طے کرلیتا ہے کہ اگر فلاں صورت حال پیش آئی تو وہ اس سے یوں نمٹے گا اور یوں نہ ہوا کچھ اور ہوا تو وہ اس سے اس طرح عہدہ

غور و فکر

☆ گلیوں میں پھرنے والے آوارہ لوگ سنجیدہ افراد کے لیے بڑی سبق آموز نصیحتیں ہیں۔ (ارڈن ایڈمن)

☆ بعض لوگ پیدائشی بڑے ہوتے ہیں۔ بعض بڑے بن جاتے ہیں اور باقی خوامخواہ بزرگی کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔ (بوسٹن برسٹ)

☆ زندگی کے جس چاک کو عقل نہیں سی سکتی' محبت اُسے تار اور سوئی کے بغیر سی لیتی ہے۔ (علامہ اقبال)

☆ خالص اور مکمل غم، خالص اور مکمل خوشی کی طرح ناممکنات میں سے ہے۔ (ٹالسٹائی)

☆ کچھ چیزیں جلد کھو جانے کے لیے ہی ہوتی ہیں اس لیے چیزوں کو کھونے کا فن سیکھ کر خوش رہنے کا ڈھنگ سیکھیں۔ (الزبتھ بشپ)

☆ جو گھر حاجت مند کو روٹی کا ایک ٹکڑا اور ضرورت مند کو ایک بستر کی جگہ دینے میں بخل سے کام لے' وہ بربادی کے قابل ہے۔ (خلیل جبران)

☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

برآ ہوگا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے جوابات پہلے سے سوچ لیتا ہے کہ کسی صورت حال میں اسے کیا جواب دینا ہے ایسے شخص کو اگر بالکل اچانک کسی ایسی صورت حال سے دوچار کر دیا جائے جس کا اس نے تصور بھی نہیں کیا ہو تو بوکھلاہٹ میں سچی بات اس کی زبان سے نکل جاتی ہے۔

میں نے خود فرضی طور پر یہ اعتراف جرم کر کے پہلے اس کے شعور اور تحت الشعور دونوں کو یہ اطمینان دلایا کہ پولیس اس پر قتل کا شبہ تو کسی طرح کر ہی نہیں رہی تھی لیکن چونکہ اس نے ایک ایس پی کے بیٹے کے خلاف اسکینڈل کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے پولیس اسے کسی نہ کسی طرح لپیٹ میں لے کر اس گستاخی کی سزا دینی چاہتی ہے۔ اس کے تحت الشعور کو جیسے ہی یہ اطمینان ہوا کہ اس پر قتل کا الزام نہیں آ رہا ہے تو فطری طور پر وہ بزعم خود پولیس کی سازش کو ناکام کرنے پر تل گیا اور چونکہ اس نے پہلے سے اس مسئلے پر نہیں سوچا تھا۔ اس لیے فوری طور پر اپنے بچاؤ کے لیے جو دلائل سب سے پہلے اس کے ذہن میں آئے۔ اس نے بغیر یہ غور کیے کہ ان سے کیا منطقی نتیجہ برآمد ہوگا انہیں اپنی صفائی میں پیش کر دیا۔''

''واقعی اب آپ کی وضاحت کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ اس سے اعتراف جرم کرانے کا اس سے اچھا کوئی دوسرا طریقہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔'' انسپکٹر ظفر نے بھی تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''کہیے ایس پی صاحب۔'' سعود احمد نے مسکراتے ہوئے کرامت شاہ کی طرف دیکھا۔ ''اب تو آپ کو ہم نام نہاد ماہرین جرائم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔''

''اگر سارے ہی سراغ رساں اور کرمنالوجسٹ آپ کی طرح ہوں یا ہو جائیں تو شکایت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''خیر یہ تو نہ کہیے۔'' سعود احمد نے شوخ لہجے میں کہا۔ ''اس کہیں میں اتفاق سے آپ کی مصلحت اور انصاف کے تقاضے ہم آہنگ تھے۔ ورنہ یوں بھی ہوتا ہے کہ پولیس اپنے مخصوص حالات اور مزاج کے مطابق کام کرنا زیادہ پسند کرتی ہے اور چونکہ ہم لوگ ان مصلحتوں کا خیال نہیں رکھتے اس لیے آپس میں ٹکراؤ ناگزیر ہو جاتا ہے۔''

ایس پی صاحب کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔

مرزا رحمان نے یہ کیفیت دیکھی تو جلدی سے بول اٹھے۔

''اس دور میں زندگی اتنی الجھ گئی ہے کہ معاشرے کے ہر طبقے میں تھوڑا بہت بگاڑ پیدا ہو چکا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ دینا اچھے لوگوں سے خالی ہو گئی ہے۔ اگر پبلک ماہرین جرائم میں آپ جیسے افراد موجود ہیں تو پولیس میں انسپکٹر ظفر اور ایس پی کرامت شاہ جیسے ذمے دار افسران بھی سکتے ہیں۔''

''آپ یہ کس بحث میں الجھ گئے انکل۔'' ندا نے ایک دم کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''سعود صاحب اگر ہم سے کسی فیس کا مطالبہ نہیں کر رہے ہیں تو ہم کم از کم انہیں ایک شاندار دعوت تو دے ہی سکتے ہیں۔ میری تجویز ہے کہ ہم سب یہاں سے کسی اچھے سے ہوٹل چلیں، معلوم نہیں آپ لوگوں میں سے کسی کو بھوک لگی ہے یا نہیں مگر میری پیٹ میں تو چوہدری جال دین کے اعتراف جرم کے بعد ہی چوہے دوڑنا شروع ہو گئے تھے۔''

اور جواباً بلند ہونے والے قہقہوں نے اعلان کیا کہ یہ لذیذ تجویز متفقہ طور پر منظور کر لی گئی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk